عوام کا پسندیدہ
سیل
یہ حقیقت ہے۔ وجہ
——— جیپ 505
اپنی طرز کا ایک ہی سیل
ہے جو کتنی طرح سے
استعمال کیا جاتا ہے
ٹارچ ہو یا ٹرانسسٹر
دونوں کیلئے مناسب۔
جیسے فیکٹری سے ابھی آیا ہو۔
بہترین کوالٹی اور نہایت
کفایتی۔ اسی لئے عوام
میں مقبول ہے۔
لاکھوں لوگ جیپ 505
کے استعمال سے مطمئن ہیں۔
آپ بھی آزمائیے۔
آپ کے پیسوں کی
پوری قیمت
GEEP
EXTRA
POWER
(اے شیروانی انٹرپرائز)

polydor
पेश करते हैं
जगजीतसिंह और चित्रासिंह
पहली बार जिनकी धुनें इन्होंने बना के गाई है, वह रोशन बधेरा की फ़िल्म
"मैं और मेरी तन्हाई" है,
उसमें भी दोनों ने शानदार
सफलता पाई है। जगजीत और
चित्रा की युगल जोड़ी ने 'मैं और
मेरी तन्हाई' की धुनों को सुरों में
सजाया है। ग़ज़ल का सम्पूर्ण
कलात्मक रूप संगीत में निखर
आया है। साथ दिया है सरदार
अली जाफ़री और रोशन
नादान' के अनमोल गीतों ने।
सब मिलकर गूँज उठा है
अपने ढंग का एक अनूठा
कर्णप्रिय संगीत।
स्टीरिओ एल पी
नं. २३९२ २११
रेकॉर्ड्स अब उपलब्ध हैं।
polydor
सर्वोत्तम संगीत का संगम, पोलिडॉर
संगीत की दुनिया में अनुपम, पोलिडॉर
Concept-P-4807-HIN

جاری شدہ ۱۹۳۰ء
بانی علامہ سیماب اکبرآبادی مرحوم
مبنی یادگار اعجاز صدیقی (مرحوم)
اردو کا اکیاون سالہ علمی ادبی اور تہذیبی ماہنامہ

جلد: ۵۱ —— شمارہ: ۴-۵-۶

خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر

مدیران
تاجدار احتشام صدیقی
افتخار امام صدیقی

۱۹۸۰ء

مہتمم
ناظر نعمان صدیقی
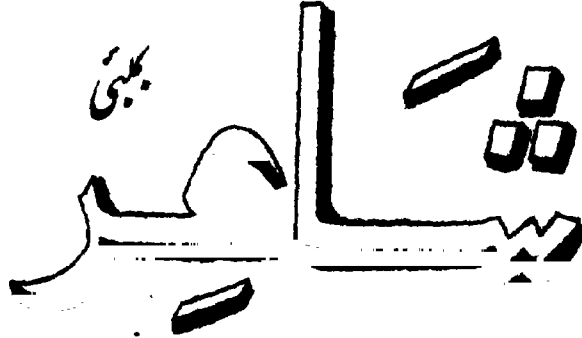
ادارۂ تحریر و مشاورت
ڈاکٹر محمد حسن
آغا رشید مرزا

زر سالانہ	معاونین سے	تاعمر خریداری	ممالک غیر سے
۲۰ روپے	۵۰ روپے	۲۵۰ روپے	بحری ڈاک سے ۲ پونڈ

قیمت: ۷ روپے
فون ۳۵۹۹۰۴

ترسیل زر کا پتہ:
ماہنامہ شاعر
مکتبہ قصر الادب، بمبئی ۴۰۰۰۰۸

خط و کتابت کا پتہ:
ماہنامہ شاعر
مکتبہ قصر الادب، پوسٹ بکس نمبر ۴۵۲۶، بمبئی ۴۰۰۰

ترتیب

منظوم خراجِ عقیدت

خلیل الرحمٰن اعظمی پر ایک بحث

اوراقِ پارینہ

پردۂ دل پر ابھی باقی ہے تو

انتظاریہ

مشاہیر کے خطوط

شعری انتخاب

مرتبہ :- شہریار

سرورق —— شکیل اعجاز (اولہ)

خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر ۸ء

ہم عصر اردو ادب نمبر ۱۹۷۸ء کے بعد یہ خصوصی اشاعت خلیل نمبر کی شکل میں نذرِ قارئین ہے۔ شاعر کی اس روایت میں تسلسل برقرار رہا ہے جس میں ہر سال نہایت ہی خصوصی اور وقیع سالنامہ اور خاص نمبر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ اس کا سب سے بڑا سبب حضرت اعجاز صدیقی کا ہم سے جدا ہو جانا ہے جنہوں نے بلاشبہ اردو کے ادبی رسائل میں شاعر کے ضخیم اور یادگار نمبروں کے ذریعے ایک نئی طرح مرتب کی۔ ان کا مزاج، طریقۂ کار اور ترتیب و تدوین میں انفرادی شعور اور انفرادیت کے نت نئے رنگ ابعاد کا سلیقہ کسی اور کو نصیب نہیں۔ شاعر کے تمام سابقہ نمبر جو ان کی سرپرستی میں شائع ہوئے تھے اس سے ادبی دنیا واقف ہے۔ اپنے انتقال سے قبل بھی وہ ایک ضخیم اور یادگار نمبر ترتیب کرنے کا خواب دیکھ رہے تھے۔ خاکے تیار ہو رہے تھے۔ قلم کاروں سے احباب سے مشورے کر رہے تھے ساتھ ہی خلیل اعجاز صاحب اپنے مستقبل میں چند نہایت ہی اہم اور فقید المثال نمبر شائع کرنے کے متعلق بھی غور کر رہے تھے مگر افسوس سب کچھ ادھورا ہی رہ گیا۔

قبلہ اعجاز صاحب کے انتقال کے بعد ہم اس موقف میں ہرگز نہیں تھے کہ کوئی خاص نمبر شائع کر سکیں اور ہم نے یہ طے بھی کر لیا تھا کہ کوئی نمبر اگر شائع ہوگا تو وہ اعجاز صدیقی نمبر نکلتا ہوگا جبکہ خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم پر کسی خصوصی اشاعت کے اہتمام کا تصور ۔۔۔ صفحات سے زیادہ کا نہ تھا کیونکہ کسی شخصیت پر نمبر اور وہ بھی شاعر کے ذریعہ پیش کرنے کا مطلب ہے کرشن چندر نمبر اور غالب نمبر جیسا معیار، تنوع، ضخامت اور زرِ کثیر، اور ان سب کے لئے ہم قطعی آمادہ نہیں تھے۔ مگر بھلا ہو اس ذوق و سلیقے کا جو ہمیں ورثہ میں ملا ہے کہ جوں جوں وقت آگے بڑھتا گیا خلیل نمبر کی ضخامت میں اضافہ ہوتا گیا اور دشواریوں نے بھی قدم قدم پر گھیرنا شروع کر دیا۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی اور کاغذ کی گرانی کے ساتھ ہی کتابت و طباعت کی دشواریاں بے طرح حائل رہیں اور غیر معمولی تاخیر کی اذیتوں میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ شاعر چونکہ اپنے قارئین کا ایک بے حد وسیع حلقہ رکھتا ہے اور [illegible] اسے پڑھتے ہیں لہٰذا ادبی رسائل کے ساتھ لفظ تاخیر جیسا بھیانک ہی چلا جائے تو پھر اضطراب و اندیشوں کا پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ہم شاعر کے تمام قارئین سے معذرت کرتے ہوئے نہایت ہی اعتماد کے ساتھ خلیل نمبر ان کی خدمت میں پیش کر رہے ہیں۔

اس سے قطع نظر کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر پر کیا کیا اعتراضات ہوئے صرف یہ کہہ دینا مناسب ہے کہ خلیل مرحوم ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان ایک پل کی طرح تھے۔ شاعری اور تنقید دونوں ہی میں انہوں نے ایک نئی راہ متعین کرنے کی کوشش کی اور یہ حقیقت ہے کہ ترقی پسند ادب کے فروغ اور جدیدیت کے صحت مند رجحانات کی تشہیر میں انہوں نے بھرپور کردار ادا کیا۔ ادب کے ایسے ہی اہم فنکاروں کو خراجِ عقیدت پیش کرنا ہم اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ ہم اپنی ایسی ہی کوششوں کو آئندہ بھی جاری رکھیں گے۔

اس نمبر کی ترتیب و تدوین کے سلسلے میں ہم نے اپنی سی تمام کوششیں کی ہیں اور بھرپور کی ہیں تاہم تعاون اور عدم تعاون کے طویل سلسلوں نے قدم قدم پر مایوس بھی کیا۔ خلیل صاحب کے احباب، ان کے پرستار، ان کی شاعری اور تنقید نگاری کو پسند کرنے والوں کی طویل فہرست میں شامل ہونے والے قلم کاروں سے طویل مراسلت کے باوجود کئی اہم نام معذرتوں اور اندیشوں کی نذر ہو گئے، یہ ایک طویل داستان ہے جس کا ذکر نہ کرتے ہوئے خلیل نمبر کے مندرجات کے متعلق چند باتیں عرض کرنی ہیں۔

خلیل نمبر کے مندرجات کی پیشکش میں ہم نے ایسا نہیں کیا ہے کہ محض مضامین جمع کر دیئے ہوں۔ دو چار تاثراتی مضامین کے علاوہ جو کچھ بھی ہم نے دینے کی کوشش کی ہے اس میں تقدیم و تاخیر کے بجائے ایک خاص فضا پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ابوابی تقسیم نہ ہونے کے باوجود شروع سے آخر تک ایک تسلسل ہے جو شخصیت کی تفہیم میں معاون ہوگا۔ طویل فیچر "پر وہ دل پر ابھی باقی ہے تو" اپنے طرز کی پہلی کوشش ہے جسے قارئین ضرور پسند کریں گے۔ اسی طرح اوراقِ پارینہ، مکاتیب مشاہیر کا انتخاب اور حیاتِ خلیل کو بھی پسند کیا جائے گا۔ ہاں ایک خاص کمی ضرور محسوس کی جائے گی جس کا ہمیں بھی احساس ہے اور وہ ہے خلیل صاحب کے تنقیدی مضامین کا انتخاب۔ باوجود خواہش کے نمبر کے اس حجم میں اس کی گنجائش نہیں نکل سکی۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ کوئی معقول جواز نہیں ہے مگر ہم یہ بھی یقین دلانا چاہتے ہیں کہ ایسا ہونے میں وہ حالات و اشخاص زیادہ حائل رہے جس کی داستان طویل ہے

خلیل نمبر بہتر شکل میں آپ کی خدمت میں پیش ہے آپ خود فیصلہ کیجئے اور اپنی گرانقدر رائے سے نوازیئے۔

شاعر کے معزز خریداروں سے: ہمیں اس بات کا احساس ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر کی اشاعت میں غیر معمولی تاخیر کی وجہ سے عام شمارے شائع نہ ہو سکے۔ خلیل نمبر اپریل مئی جون تین اشاعتوں پر مشتمل ہے۔ جن خریداروں کے زر سالانہ اپریل، مئی، جون میں ختم ہو چکے ہیں وہ ازراہ کرم زر سالانہ ارسال فرما کر ہمیں شکریہ کا موقع دیں آپ کا یہ تعاون شاعر کے استحکام کو مزید تقویت دے گا۔

باقیات: بیشتر خریداروں کے زر سالانہ پچھلے شماروں کے ساتھ ختم ہو گئے تھے مگر انہیں عام شمارے باقاعدگی کے ساتھ بھیجے جاتے رہے اور اب خلیل نمبر بھی بلاتکلف بھیجا جا رہا ہے امید ہے کہ ہمارے معزز خریدار تجدید خریداری کر سکیں۔

عام شمارے: خلیل نمبر کی تکمیل کے دوران عام شماروں کی ترتیب بھی جاری تھی اور اب نمبر کے بعد وقفے وقفے سے یہ شمارے آپ کو ملتے رہیں گے اس طرح ہم بہت جلد شاعر کو وقت پر لے آئیں گے۔ یہ عام شمارے مواد اور ہیئت کے لحاظ سے آپ کو یقیناً متاثر کریں گے اور کسی ادبی رسالے سے جو توقع کی جا سکتی ہے وہ مزید پوری ہوگی۔

قلم کاروں سے: شاعر میں اشاعت کے لئے مضامین نظم و نثر کی بہت بڑی تعداد جمع ہو گئی ہے۔ روزانہ ڈاک سے یہ سلسلہ برابر جاری رہتا ہے لہٰذا ان سب کا بیک وقت پڑھ لینا ممکن نہیں ہو پاتا اور نہ ہی تخلیقات ایک دو شماروں میں سما پاتی ہیں۔ شاعر وہ خوش قسمت رسالہ ہے جسے جدید و قدیم اور ہر مکتبۂ فکر کے قلم کاروں کا بھرپور تعاون حاصل ہے۔ ہر طرح کی عصبیت، گروہ بندی اور احباب نوازی سے پاک اس رسالے کی ہمیشہ یہی کوشش رہی کہ نئے اور پرانے فن کاروں کی پوری پوری نمائندگی ہو سکے۔ گزشتہ شماروں میں جو تخلیقات پیش کی گئیں اور آئندہ جو کچھ بھی پیش کیا جائے گا وہ ہمارے اس خیال کی مکمل تائید ہوگا ——— شاعر میں کسی تخلیق کی اشاعت کا مطلب ہے ہزاروں لوگوں کی نگاہ سے اس کا گزرنا اور ہر فن کار یہی چاہتا ہے کہ اس کی نگارشات کو بڑی تعداد میں لوگ پڑھیں اس لئے اگر آپ کی تخلیقات کی اشاعت میں تاخیر ہو رہی ہو تو اسے ہماری مجبوری سمجھتے ہوئے انتظار کی زحمت گوارا فرمائیں۔

ڈاک کی بڑھتی ہوئی شرح نے ہمیں مجبور کر دیا ہے کہ ہم آپ سے یہ بھی التماس کریں کہ تخلیقات کے ساتھ مناسب ڈاک ٹکٹ یا جوابی لفافہ ضرور ارسال فرمائیں ورنہ جواب طلب امور میں ہماری طرف سے خاموشی آپ کے لئے بدگمانی کا سبب بھی بن سکتی ہے۔

اعجاز صدیقی نمبر: شاعر کے اعجاز صدیقی نمبر کے لئے اصرار دن بہ دن شدید ہوتا جا رہا ہے اور ہم خود بھی اسے پیش کرنا چاہتے ہیں لیکن اس نمبر کو جو شکل ہمارے ذہن میں ہے اس کے لئے وقت اور زر کثیر درکار ہے پھر بھی ہم جنوری ۱۹۸۱ء سے اس نمبر کے کاموں کا آغاز کر رہے ہیں اور کوشش یہی ہوگی کہ اسے شاعر کے گزشتہ نمبروں کی طرح مثالی بنا سکیں۔

گولڈن جوبلی سال: فروری ۱۹۸۰ء میں شاعر نے اپنی اشاعت کے پچاس سال مکمل کر لئے ہیں اور اب ۵۱ ویں سال میں اشاعت پذیر ہو رہا ہے۔ شاعر کو نکھارنے اور سنوارنے کے لئے اور اسے مزید استحکام دینے کے لئے ہمارے سامنے کئی منصوبے ہیں جن میں شاعر کے لئے آفس اور پریس کا قیام بھی شامل ہے۔ ساتھ ہی توسیع اشاعت کے سلسلہ میں ایک منصوبہ بنایا ہے اس میں تمام اردو والوں سے تعاون کی درخواست ہے۔ ہمارے نمائندے آپ کے شہر میں جب بھی آئیں انہیں اپنا اشتراک دیجئے۔ بڑی تعداد میں خریدار مہیا کیجئے اور اردو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کی تمام زبانوں کے ادبی ماہناموں کی تاریخ مرتب کرنے والے شاعر کو اپنا ہر ممکنہ تعاون دیجئے۔ شاعر کو خوب سے خوب تر بنانے میں ہمیں آپ سب کی مدد درکار ہے۔

ایک آخری درخواست: علم دوست حضرات سے ہماری گزارش ہے کہ خلیل نمبر اپنے احباب و اعزا تک پہنچائیں کیونکہ ۱۹۸۰ء کا اس سے بہتر کوئی اور تحفہ ہو ہی نہیں سکتا۔

اردو کے دیگر جرائد کے شائع ہونے والے نمبروں کے مقابلے میں شاعر نے اپنی خصوصی اشاعتوں کی قیمت ہمیشہ کم ہی رکھی ہے۔ خلیل نمبر کی قیمت بھی کم رکھی گئی ہے تاکہ زیادہ سے زیادہ ہاتھوں تک یہ نمبر پہنچ سکے۔ ہم چاہتے تو اس کی قیمت ۱۵ روپے بھی رکھ سکتے تھے مگر محض اس خیال سے کہ اردو کے سکڑتے ہوئے قارئین کو اور زیادہ دور نہ کیا جائے لہٰذا صرف سات روپے میں خلیل نمبر پیش کیا جا رہا ہے تاکہ قارئین کو خلیل نمبر خریدنے میں کوئی دشواری نہ ہو۔

افتخار

عبدالقوی دسنوی
شعبۂ اردو۔ سیفیہ کالج۔ بھوپال۔

حیات خلیل الرحمٰن اعظمی

چند اہم تاریخیں، واقعات اور تحریریں

پیدائش: ۹ راگست ۱۹۲۷ء

مولد و خاندان: "وہ اعظم گڑھ کے مردم خیز خطہ سے تعلق رکھتے تھے۔ سرائے میر کے قریب ایک گاؤں سیدھا سلطانپور کے رہنے والے تھے۔ اُنکے والد محترم ملانا محمد شفیع صاحب مرحوم بڑے نیک نفس اور مقدس بزرگ تھے۔ مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کا قیام اُنھیں کی جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ جس کے نظم و نسق کی ذمہ داری ترجمان القرآن مولانا حمید الدین فراہی نے بعد میں علامہ شبلی مرحوم کی ایما سے قبول کر کے اس کو بڑی شہرت و ترقی دی تھی۔ مولانا محمد شفیع مرحوم کے پانچ صاحبزادوں میں خلیل صاحب سب سے چھوٹے مگر اپنی صلاحیتوں کے اعتبار سے سب میں ممتاز تھے۔" [۱]

خلیل الرحمٰن اعظمی کا تعلق ایک علمی و دینی گھرانے سے تھا۔ اُن کے والد بزرگوار متورع عالم تھے۔ چاروں بڑے بھائی بھی دینی تعلیم حاصل کر کے علم و دین کی خدمت میں مشغول رہے۔ افسوس ہے کہ اب مولانا طیب الرحمٰن اور پروانہ اصلاحی کے سوا سب اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔ خلیل صاحب کی نشو و نما اسی علمی و دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ [۲]

"سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں ایک دینی مدرسہ ہے، مدرسۃ الاصلاح، خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم اس مدرسہ کے بانی مولوی محمد شفیع اصلاحی کے نور نظر تھے۔ اور علمی ذوق ورثہ میں پایا تھا۔ مدرسۃ الاصلاح کے فارغ التحصیل اپنے نام کے ساتھ اصلاحی لکھتے ہیں۔ اور مذہب میں جو بدعتیں رائج ہیں اور ہو رہی ہیں اُن کی اصلاح اس مدرسہ کے مولویوں کا مشن ہے، تعجب نہ ہوتا اگر خلیل الرحمٰن اعظمی بجائے اعظمی لکھنے کے اپنے کو اصلاحی لکھتے۔ لیکن مرحوم نے مدرسہ کی اس روایت کو تو برقرار رکھا کہ بجائے تقلید کے درایت کو ترجیح دی۔ لیکن یہ درایت اور اجتہاد مذہب کے بجائے ادب میں اپنا شعار بنایا۔ اور جیسا کہ انقلاب ان کی زبان و قلم سے شعر و ادب میں ظہور پذیر ہوا۔ غالباً اسی سنجیدہ تربیت کے زیر اثر تھا۔ جو وہ اپنے وطن سے اپنے ساتھ لائے تھے" [۳]

مذہب کے خلاف بغاوت: "میں ایک بہت ہی گھٹے ہوئے مذہبی ماحول میں پیدا ہوا تھا اس لئے سب سے پہلی میری شعوری بیداری مذہب کے خلاف بغاوت سے شروع ہوتی ہے" [۴]

کتب بینی کا شوق: "کتب بینی اور دارالمطالعہ کا شوق بچپن سے تھا۔ رات رات بھر جاگ کر کتابیں پڑھتے تھے اسی میں ان کی صحت خراب ہو گئی۔ جب شبلی اسکول میں زیر تعلیم تھے تو پابندی سے دارالمصنّفین کے کتب خانہ میں آکر اخبار رسالہ اور کتابیں پڑھا کرتے تھے" [۵]

اسی مطالعہ اور ادب سے دلچسپی کی وجہ سے پرویز شاہدی کے نام سے اسکول کی تعلیم کے زمانہ ہی سے واقفیت ہوئی:

---

[۱] یادِ خلیل۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ "معارف" اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۷۸ء صفحہ ۶

[۲] یادِ خلیل۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ "معارف" اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۷۸ء صفحہ ۶۹

[۳] ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے۔ کوکب قدر سجاد علی مرزا۔ ہماری زبان۔ دلی۔ ۱۵ راگست ۱۹۷۸ء صفحہ ۹

[۴] آئینہ خانہ میں از خلیل الرحمٰن اعظمی صفحہ ۱

[۵] یادِ خلیل۔ ضیاء الدین اصلاحی۔ معارف۔ اعظم گڑھ۔ جولائی ۱۹۷۸ء صفحہ ۷

پرویز شاہدی کے نام سے اسکول کی تعلیم کے زمانہ میں واقف ہوا جب میں اسکول کی جماعتوں کا طالب علم تھا۔ اس زمانے میں پرویز کلکتہ سے "جدید اردو" کے نام سے ایک ہفتہ وار ادبی رسالہ نکالتے تھے۔ میرے ایک عزیز عبدالرحمٰن ناصر جو اس زمانہ میں سیکرٹری رہتے تھے۔ اس رسالہ کے مستقل قلمی معاون تھے۔ اور ان کے مضامین بغرض اور توسیع "جدید اردو" میں پابندی سے چھپا کرتے تھے۔ غالباً اسی زمانے میں پرویز کی بعض نظمیں جوش ملیح آبادی کے رسالہ کلیم میں بھی پڑھی تھیں جو دہلی سے نکلا کرتا تھا۔"[۵]

ابتدائی تربیت: مضمون نویسی اسکول کی تعلیم کے زمانے میں شروع کی۔ اتفاق سے مولوی عبدالباری جیسے بزرگ مل گئے۔ جن کی فیض تربیت میں کہاں سے کہاں پہنچ گئے۔

"لکھنے لکھانے کا چسکا مجھے ہائی اسکول کے زمانۂ طالب علمی میں پڑ گیا تھا۔ میری ابتدائی تربیت میرے محترم بزرگ مولوی عبدالباری صاحب کی مرہونِ منت ہے۔ یہ کون صاحب ہیں اور کس منصب پر فائز ہیں؟ اس کا جواب انکی شخصیت کی پہچان کے لئے کافی نہیں۔ ویسے تو وہ "دارالمصنفین" اعظم گڑھ سے وابستہ ہیں۔ اور آستانۂ شبلی و سلیمان کی خاک روبی کو اس پیرانہ سالی میں باعثِ امتیاز سمجھتے ہیں۔ مگر حقیقت یہ کہ وہ ان "خاصانِ خدا" میں ہیں جو اپنی گمنامی کو ناموری پر ترجیح دیتے ہیں۔"[۶]

اُسی زمانے میں خلیل الرحمٰن اعظمی نے بچوں کے لئے نظمیں کہی تھیں جو پیام تعلیم میں شفیع الدین نیر صاحب کی اصلاح کے بعد شائع ہوئی تھیں۔ ۱۹۴۵ء میں شبلی نیشنل ہائی اسکول اعظم گڑھ سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور پھر علیگڑھ چلے آئے جہاں آتے ہی مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کی خدمت میں حاضری کا موقع ملا۔

"حسنِ اتفاق سے علی گڑھ آتے ہی مجھے مرحوم کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع مل گیا۔ میں بچپن ہی میں نواب صاحب کے علم و فضل اور انکی عظمت سے واقف ہو چکا تھا۔ میرے والد مولوی محمد شفیع صاحب مرحوم نے علامہ شبلی نعمانی اور مولوی حمید الدین فراہی کے ایماء سے بیسویں صدی کے اوائل میں ایک عربی درسگاہ "مدرسۃ الاصلاح" کے نام سے سرائے میر (اعظم گڑھ) میں قائم کی تھی اور مسلمانوں کی معاشرتی اور تمدنی اصلاح کے لئے ایک انجمن "اصلاح المسلمین" کی بنیاد بھی رکھی تھی۔ اس درسگاہ سے نواب ... بھی دلچسپی تھی یہی وجہ ہے کہ جب میں اعظم گڑھ سے علی گڑھ کے لئے روانہ ہونے لگا تو مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم نے مجھے نواب صاحب کے نام ایک تعارفی خط دیا اور یہ فرمایا کہ علی گڑھ جا کر سب سے پہلے نواب صاحب کی خدمت میں حاضر ہونا۔ اس زمانہ میں نواب صاحب ایجوکیشنل کانفرنس کے بھی روحِ رواں تھے اس لئے مجھے کانفرنس سے عربی کے ایک وظیفہ کے ملنے کی بھی توقع تھی۔ چنانچہ میں علی گڑھ کے ایک سینئر طالب علم مولوی محمد صابر ندوی اندوری کی معیت میں نواب صاحب کے یہاں حاضر ہوا۔ انہیں دیکھ کر مجھ پر تھوڑی دیر کے لئے ایک رعب سا چھا گیا۔ سرخ و سپید رنگ، لمبا قد، خوش پوش اور خوب صورت آدمی تھے۔ سفید نورانی داڑھی تھی لیکن چہرہ عام علماء جیسا نہیں تھا۔ شائستگی اور نفاست کا ایک پیکر میرے سامنے تھا بڑی نرم آواز میں اُنہوں نے مجھ سے کچھ پوچھا، لیکن میں سُن نہ سکا۔ کچھ بولا تو کسی نے کہا کہ زور سے بولئے نواب صاحب اونچا سنتے ہیں۔ تھوڑی دیر میں میں اپنے حواس پر قابو پا گیا۔ کیونکہ نواب صاحب کے لب و لہجہ میں تمکنت کے بجائے شفقت و محبت تھی۔ اس ملاقات کے بعد بھی مجھے اپنے زمانۂ طالب علمی میں نواب صاحب کے یہاں جانے کا موقع ملا، لیکن کسی نہ کسی ضرورت سے۔ اُس زمانے میں میری علمی استعداد اتنی نہ تھی کہ مرحوم سے کچھ استفادہ کر سکتا۔ کئی امور ایسے تھے جن کے بارے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن ہمت نہ پڑی۔ نواب صاحب کی شرافت، وضعداری اور رکھ رکھاؤ اور ان کی علم دوستی کے چرچے علی گڑھ میں عام تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ نواب صاحب کے یہاں شام کو دیوان خانے میں نشست ہوتی تھی۔ جس میں علی گڑھ کے اکثر اہلِ علم حضرات جایا کرتے تھے۔ وہاں کیا کیا علم و ادب کے خزانے لٹتے ہوں گے، کاش اس میں میرا بھی حصہ ہوتا۔ نواب صاحب کی مجلس روزانہ شام کو میں دیکھتا تھا۔ جو مفتی عبداللطیف

---

۵ "مضامینِ نو" از خلیل الرحمٰن اعظمی صفحہ ۲۲۳
۶ کچھ نجی باتیں۔ مضامینِ نو۔ صفحہ ۱۲
شاعر، بمبئی

صاحب کے مکان "نور ولا" کے سامنے رکھی تھی اور انہیں لیکر مولوی بدرالدین صاحب علوی (استاد شعبۂ عربی) کے یہاں جاتی اور پھر یہ دونوں حضرات نواب صاحب کے یہاں تشریف لے جاتے. ٹھیک ساڑھے نو بجے رات میں یہی بگھی ان دونوں بزرگوں کو اپنے مکانوں میں واپس لاتی تھی. اس معمول میں کبھی فرق نہیں آیا۔" ؎۵
۱۹۴۰ء میں جذبی صاحب سے ملاقات ہوئی. اسکول کے طالب علمی کے زمانہ ہی سے وہ جذبی کی شاعری کے دلدادہ تھے. :

"۱۹۴۵ء میں شعبۂ اردو میں لکچرر کی حیثیت سے ان (جذبی) کا تقرر ہو گیا. میں اسی سال علی گڑھ میں نیا نیا وارد ہوا تھا لیکن جذبی صاحب کی شاعری کا بہت دنوں سے پرستار تھا. اور انہیں دیکھنے اور ان سے ملنے کی بڑی آرزو تھی. کچھ دنوں تک اس کی کوئی سبیل نہ نکل سکی. کئی مہینوں کے بعد سید یوسف حسن کے توسط سے میں جذبی صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا. جذبی صاحب سے ملنے کے بعد تھوڑی دیر کے لئے میرے ذہن کو کچھ دھکا سا لگا. کیونکہ میں نے ان کی جو خیالی تصویر بنا رکھی تھی وہ اور ہی تھی، انکی شخصیت اور ان کے طرز گفتگو نے پہلی بار کچھ مایوس کیا لیکن دو ہی چار ملاقاتوں میں یہ احساس ہونے لگا کہ جذبی صاحب ایک سیدھے سادے ملنسار اور بے تکلف آدمی ہیں. وہ اپنے ملنے والوں پر اپنی شاعری یا اپنی قابلیت ذہانت کا رعب نہیں جماتے. اور نہ ہی اس پر اپنی شخصیت کو مسلط کرنا چاہتے ہیں. انہیں جو آدمی اچھا اور معقول نظر آتا فوراً اس سے دوستانہ اور برابر کی سطح پر تعلقات پیدا کر لیتے ہیں چاہے وہ طالب علم ہی کیوں نہ ہو. اس کے لئے چائے منگواتے ہیں اور سگریٹ پینے پر اصرار کرتے ہیں اور بے دھڑک پوچھ بیٹھتے ہیں "کہیے حضرت کوئی عشق وغیرہ بھی کیا ہے؟" ان کے اس طرز ادا نے بہت جلد علی گڑھ کے نوجوانوں کو جو ادب کے دیوی کے پجاری تھے، آہستہ آہستہ ان کے گرد جمع کر دیا. اشرف ملیح آبادی مرحوم، قاضی سلیم، اصغر عباس زیدی، سید منہاج الدین، فرید بخش قادری، ریاض الدین قیصر، باقر مہدی، تصدق حسین ....

وہ زمانہ واقعی عجیب زمانہ تھا. نئی نئی کتابوں اور نئے رسالوں کی تلاش رہتی اور جوں ہی جذبی کی ڈاک میں کوئی چیز آتی ہم سب اسے چاٹ جاتے، لکھنے کا جنون تھا (آپ شتاب صفحے سیاہ کئے جاتے. انجمن کے جلسے المجرا میں ہوتے جو اس زمانے کا ایک خوبصورت ریستوران تھا جہاں ہر جلسہ میں حاضرین کو چائے بڑی اور نمک پارے سے تواضع کی جاتی. جذبی صاحب کی وجہ سے انجمن کے ہر جلسے میں خواجہ منظور حسن صاحب تشریف لاتے، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین اور انور انصاری وغیرہ بھی آ نکلتے. باہر سے مولوی عبدالحق صاحب، قاضی عبدالغفار، حیات اللہ انصاری، اختر حسین رائے پوری یا کوئی بھی ادیب آ جاتا تو جذبی صاحب انہیں انجمن کے جلسے میں کھینچ کر لاتے. اس موقع پر ہم سب یوسف حسن صاحب کو فوری جلسہ کے لئے آمادہ کرتے اور تمام ممبروں کو اطلاع دینے کیلئے بڑے شوق سے سارا علی گڑھ چھان مارتے. اس زمانے میں یہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین ہی سب سے بڑا ادبی مرکز اور شعر و سخن کی نشست بن گئی. اس میں جو مضامین پڑھے جاتے جو تنقیدیں ہوتیں اور جو بحثیں آپس میں کی جاتیں ان کا کئی کئی دن تک چرچا رہتا.

جذبی صاحب بعض اوقات ہم لوگوں کے یہاں ہوسٹل میں پہنچ جاتے. اور اس وقت جو بھی مل جاتا سب کو لیکر اسٹاف کلب کے کمرے میں جہاں ان کا قیام تھا آتے اور اپنے نوکر نذر علی کو چائے بنانے کیلئے آواز دیتے، اور پھر گپ شپ، شعر و شاعری اور شخصیات پر گفتگو چھڑ جاتی. جذبی صاحب شعر و ادب کے متعلق اپنے نظریات اور تخلیقی عمل سے متعلق اپنے ذاتی تجربات بیان کیا کرتے اور ہم لوگوں کو اپنی نظم و نثر کو زیادہ سے زیادہ مؤثر اور خوبصورت بنانے کے مشورہ دیتے. انکی گفتگو میں اکثر خواجہ منظور کے اقوال کا حوالہ ہوتا. کبھی کبھی مجاز، سردار جعفری، سبط حسن، مخدوم، اختر حسین رائے پوری، فیض، تاثیر، راشد، میراجی وغیرہ کا ذکر چھیڑ دیتے اور پچھلی صحبتوں کا ذکر بڑے لطف سے کرتے. ان شاعروں، ادیبوں کی پرائیوٹ زندگی، ان کی آپس کی چشمکیں، ان کا خلوص اور محبت اور ان کے ساتھ گذرے ہوئے لطیفے جذبی صاحب کے خاص موضوع ہوتے. اب یہ اندازہ ہوا کہ جذبی صاحب

؎۵ "علی گڑھ کی چند شخصیتیں" خلیل الرحمن اعظمی. نقوش شخصیات نمبر۲ ص ۱۳۱۶-۱۳۱۷

بہت دلچسپ اور باغ و بہار آدمی ہیں...... جذبی صاحب ہر طرح سے ہم لوگوں کو چاہتے۔ وہ صرف ادبی معاملات میں ہی نہیں بلکہ ہر معاملے میں رہبری کرتے۔ فیس اور مراعات کا مسئلہ، ڈائننگ ہال سے کھانا بند ہو جانے کا اندیشہ، یونیورسٹی کا اکاؤنٹ جمع نہ ہونے اور نام کٹ جانے کی فکر، امتحان آنے پر ایڈمٹ کارڈ حاصل کرنے کا انتظام؛ غرض جذبی صاحب ہمارے ہر دکھ سکھ کے ساتھی ہو گئے۔ میں جب بی۔اے میں پہونچا تو میری سیاسی سرگرمیوں کی بنا پر مجھے ہوسٹل سے نکال دیا گیا — جذبی صاحب فوراً مجھے اپنے گھر لے آئے اور کہا آج سے تم میرے ساتھ رہو گے۔ میں قریب قریب دو سال تک جذبی صاحب کے ساتھ اس طرح رہا کہ مجھے ایک لمحہ کے لئے بھی یہ محسوس نہ ہوا کہ میں کسی اور کے گھر پر پڑا ہوں اور اس کا ممنونِ احسان ہوں۔ اس گھر میں خاندان کے ایک ممبر کی حیثیت سے تھا۔ اسی زمانہ میں جذبی صاحب کی بھوپال میں شادی ہوئی ان کی بیوی کے آ جانے کے بعد بھی جذبی صاحب کے معمولات میں فرق یا دوست احباب سے تعلقات اور ملاقاتوں میں فرق نہیں آیا اسی طرح محفلیں گرم ہوتیں، چائے کا دور چلتا اور ہر طرح کے ادبی پروگرام بنائے جاتے۔

جذبی صاحب کے ساتھ رہ کر مجھے تھوڑا بہت ان کے شعری عمل کو سمجھنے میں آسانی ہوئی۔ اوّل تو وہ کم کہنے کے عادی ہیں۔ آئے دن کے واقعات پر سیاسی پالیسی کے تحت نظمیں لکھنے کو وہ شاعری نہیں سمجھتے......... "میری شاعری اور نقاد" کے عنوان سے ان کی نظم میرے سامنے لکھی گئی اور اس کی تکمیل میں کئی سال لگ گئے۔"⁹

سنہ ۱۹۴۶ء کا ایک اہم واقعہ: "غالباً فروری ۱۹۴۶ء کی بات ہے میں انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا۔ ایک دن اچانک میں نے اپنے دل میں ایک ایسی خلش محسوس کی جس کا سبب مجھے خود نہیں معلوم تھا میں نے محسوس کیا جیسے مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے۔ لطف کی بات یہ کہ محبوبہ کا کوئی وجود نہیں تھا۔ نہ تو اس کی کوئی شکل و صورت تھی اور نہ کوئی نام اور پتہ مگر ایک مبہم سی کسک نے میرے اندر ایک تبدیلی سی پیدا کر دی تھی۔ ایسا محسوس ہوتا جیسے مجھے گرفتہ تنہائی کی ضرورت ہو جہاں میرے سوا ہم جیسی اور عزیز ترین دوست بھی نہ ہوں لیکن اس زمانہ میں زندگی کچھ اس ڈھب سے گزر رہی تھی جہاں ایک گوشہ کی بے حد کمی تھی۔ میں ایک ایسے ہوسٹل میں رہتا تھا جہاں میرے ساتھ کئی اور ساتھی میرے کمرے میں مقیم تھے۔ رات گئے تک ہم سب یا تو کتابیں پڑھتے یا گپ شپ اور [illegible] جب کمرے کی روشنی گل کر کے ہم سب اپنے اپنے بستروں میں چلے جاتے تو مجھے وہی بے نام صورت یاد آنے لگتی اور میں اسکے خیال میں رات سے پچھلے پہر تک جاگتا رہتا۔ کئی بار ایسا لگا کہ میں اس کو ایک لمبا خط لکھنا چاہتا ہوں مگر پھر سوچتا یہ کیا حماقت ہے، کس کو خط لکھوں گا اور کہاں بھیجوں گا؟ انھیں کیفیتوں سے گزر رہا تھا کہ ایک دن کلاس میں بغیر کسی ارادے کے سب سے پچھلی بنچ پر جا بیٹھا۔ میں اس سے پہلے اس بنچ پر کبھی نہیں بیٹھا تھا کیونکہ عام طور پر وہاں میرے وہ ساتھی بیٹھتے تھے۔ جنہیں نصاب کی کتابوں سے زیادہ دلچسپی نہیں تھی۔ یہ لوگ اپنی کاپیوں پر دوستوں کی تصویریں یا کارٹون بناتے یا ڈیسک کی اوٹ میں رکھ کر کوئی ناول یا افسانے کی کتاب پڑھا کرتے تھے۔ میں بھی اپنی نوٹ بک پر ساتھیوں کی نظر بچا کر کچھ لکھنے لگا۔ بعض نے میری طرف توجہ کی لیکن یہ سمجھ کر مطمئن ہو گئے کہ میں شاید استاد کے دیئے ہوئے لکچر کے نوٹس لے رہا ہوں۔ کلاس ختم ہونے کے بعد میں نے اپنے چند بے تکلف دوستوں سے یہ انکشاف کیا کہ میں نے ابھی ابھی ایک نظم لکھی ہے۔ نظم کا عنوان تھا "نقشِ ناتمام" اور وہ اس طرح شروع ہوئی تھی ؎

پیکرِ حسن و حیا آہ یہ تصویر تری
میری تخئیل کا ہے ایک ادھورا شاہکار

یہ نظم سب نے پسند کی اور سننے کے بعد اپنے جو تاثرات ظاہر کئے ان سے اندازہ ہوا کہ ان لوگوں نے اپنے اپنے طور پر اس نظم کے ایسے ایسے معنی و مفہوم نکالے ہیں جن کا علم خود مجھے بھی نہ تھا۔ خیر وہ نظم میں نے چپکے سے ایک لفافے میں بند کر کے ممتاز شیریں کو بھیج دی جو اس زمانہ میں بنگلور سے "نیا دور" نام کا ایک سہ ماہی رسالہ نکالتی تھیں۔ کوئی ایک ہفتہ بعد ان کا خط آیا کہ نظم انہیں بہت اچھی لگی ہے اور وہ نظم نیا دور کے شمارہ نمبر ۵ میں شائع ہوگی۔ اس خط کے بعد میرا معمول کچھ ایسا بن گیا کہ چلتے پھرتے نظموں کے خیال اور ان کے عنوان ذہن

⁹ "علیگڑھ کی ادبی شخصیتیں" از خلیل الرحمٰن اعظمی۔ نقوش شخصیات نمبر حصہ دوم صفحہ ۱۲۳۴ شاعر بمبئی

میں گونجنے لگتے اور مجھے ان کے کاغذ پر منتقل کرنے کی فکر رہتی۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ رات میں جب میرے کمرے کے ساتھی روشنی گُل کرکے سو گئے تو اس خیال سے کہ اُن کی نیند میں خلل نہ پڑے میں نے اندھیرے میں ہی کسی پنسل سے نظم لکھ ڈالی، صبح اٹھ کر دیکھا تو کاغذ پر ساری سطریں اور سب الفاظ ایک دوسرے کے گڈمڈ ہو گئے ہیں۔ اس زمانے میں عجیب عجیب نظمیں کہی۔ "زلیخا کی آنکھیں" "آورش" "جنسی سائے" "تخیل کے دیوتا" "خیام کے نام" "حبسِ دوام" اور جانے کیا کیا عنوان ہوتے تھے۔ یہ سب نظمیں پہلے دوستوں کو سنائیں۔ اُنکی تعریف اور اُن کے بتائے ہوئے مطلب سُن کر خوش ہوا اور پھر اُنہیں رسالوں میں چھپنے کے لئے بھیجی۔ "حبسِ دوام" کے عنوان سے جو نظم تھی وہ میرے ایک دوست نے جو پٹنہ کے رہنے والے تھے کسی طرح کلیم الدین احمد کے پاس بھجوائی بعد میں معلوم ہوا کہ موصوف نے یہ نظم بہت پسند کی ہے۔ کچھ ہی دنوں بعد وہ معاصر میں چھپی۔" [۱۰]

مشقِ سخن کا ابتدائی دور: جس زمانہ (۱۹۴۲ء) کا میں ذکر کر رہا ہوں اس وقت میں اور میرے دوست اُردو کے جو رسالے پابندی سے پڑھا کرتے تھے وہ "ادبی دُنیا" "ہمایوں" "نیا ادب" "ساقی" اور "ادب لطیف" وغیرہ تھے۔ اُردو کے جدید شاعروں کی آوازیں فضا میں گونج رہی تھیں اور ان کے ارتعاشات میں اپنے جسم و جان میں محسوس کرتا تھا۔ نظم میں اسلوب اور ہیئت کے نت نئے تجربے ہو رہے تھے۔ اور جی یہ چاہتا تھا کہ جو نظم لکھی جائے وہ نئی سے نئی ہو۔ اس کوشش میں یہ محسوس ہونے لگا کہ میری نظموں میں دھندلا پن بڑھ گیا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا جیسے میں جو خلش اپنے دل میں محسوس کر رہا ہوں وہ کاغذ پر منتقل نہیں ہو رہا ہے۔ ایک عجیب طرح کی نارسائی اور ناتمامی کا احساس دامنگیر ہوتا۔ انہیں دنوں کی بات ہے کسی صحبت میں میری تازہ ترین نظم اور دوستوں کے تجزیے سننے کے بعد میرے ایک ہم سبق اور عزیز دوست علی حماد عباسی نے مجھ سے کہا کہ جب تم اپنا مجموعہ کلام چھپوانا تو ان نظموں کے ساتھ ان کی شرح بھی شائع کر دینا کیونکہ تم یا تمہارے بعض دوست ان کے جو معنی سمجھ رہے ہیں وہ دوسروں کے لئے ممکن نہ ہوگا۔ میں نے عباسی کی یہ بات اس وقت تو ہنس کر ٹال دی لیکن پہلی بار مجھے محسوس ہوا کہ میں جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ نہیں لکھ رہا ہوں۔ میں نے کچھ دنوں کے لئے خاموشی اختیار کر لی اور روزانہ نئی نظمیں لکھنے کا جو پروگرام تھا وہ ختم ہو گیا۔" [۱۱]

ایک اہم واقعہ: "ایک روز "نگار" کا ایک پرچہ پڑھ رہا تھا کہ امۃ الرؤف نسرین کا یہ شعر نظر سے گزرا ؎

آئینہ دیکھ کر خیال آیا

تم مجھے بے مثال کہتے تھے

اس شعر نے مجھے نہ جانے کس عالم میں پہونچا دیا۔ بظاہر اس سادہ سے شعر میں کتنی کہانیاں چھپی ہوئی ہیں" یہ پہلا اتفاق تھا جب غزل کے ایک شعر نے مجھ پر ایسا جادو کیا۔" [۱۲]

اس واقعہ کو خلیق انجم صاحب نے اس طرح بیان کیا ہے:

"اگرچہ ہم خلیل سے عمر میں چھوٹے تھے۔ لیکن یہ انکی عظمت تھی کہ بحث و مباحثہ میں وہ ہماری گفتگو اور ہماری رائے کا احترام کرتے تھے، چاہے انھیں اختلاف ہی کیوں نہ ہو۔ اگر ناواقفیت کی بنا پر ہم کچھ کہتے تو وہ بزرگ کی حیثیت سے نہیں ایک برابر کی دوست کی حیثیت سے ہماری غلط فہمی دور کرتے۔ انہیں دنوں خلیل کو کسی خاتون کا ایک شعر بہت پسند آیا۔ شعر تھا ؎

آئینہ دیکھ کر خیال آیا

تم مجھے بے مثال کہتے تھے

وہ دن بھر کبھی تحت اللفظ میں اور کبھی ترنم سے یہ شعر پڑھتے ــــ۔ اکثر ایسا ہوتا کہ شعر پڑھتے پڑھتے وہ اپنے ماحول سے بے خبر اور مست ہو جاتے۔ انکی اس حالت پر مجھے اور اسلم (ڈاکٹر اسلم پرویز) کو ہنسی آتی۔ اُن کا ترنم کچھ ایسا ہی تھا۔ جب وہ ترنم سے یہ شعر پڑھتے تو مجھے اور اسلم کو اتنی ہنسی آتی کہ ہم لوگ کمرے سے باہر چلے جاتے۔ بہت عرصہ بعد جب میں خود گردشِ دوراں کا شکار ہو کر ایک بڑی مصیبت میں گرفتار ہوا۔ اور اچانک یہ شعر یاد آیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ جب خلیل یہ شعر دن بھر پڑھتے تھے تو کس ذہنی کرب کے شکار رہے ہوں گے۔

[۱۰] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی صـ۱۱
[۱۱] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی صـ۱۱
[۱۲] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی صـ۱۱

اس انداز سے شعر نے خلیل پر جادو کر دیا تھا۔ اُنہوں نے عہد نامے کے دیباچے میں اعتراف کیا ہے کہ میرے ذہنی رویے کی تبدیلی میں اس شعر کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔ بعد میں اُنہوں نے اس مفہوم کو خود اپنے الفاظ میں بھی بیان کیا ہے ؎

آج آئینہ جو دیکھا تو ہوا یہ محسوس !
جانے یہ کون ہے ؟ میں ایسا تھا ؟ یہ میں تو نہیں

خلیل کے شعر میں وہ بے ساختگی نہیں آسکی جو پہلے شعر میں ہے۔"[13]

قدیم شاعری کا مطالعہ اور تنقید نگاری کی ابتداء :

احمد الرؤف نشتری کے اس ایک شعر کا خلیل الرحمن اعظمی پر بڑا اثر یہ ہوا کہ اُن کے یہاں تنقید نگار نے جنم لیا اور وہ از سرِ نو قدیم شاعری کے مطالعہ کی طرف مائل ہوئے :

"...... یہ پہلا اتفاق تھا جب غزل کے ایک شعر نے مجھ پر ایسا جادو کیا۔ ان دنوں بعض تنقیدی مضامین اور نئے ادیبوں کی تحریریں پڑھ کر قدیم اُردو شاعری بالخصوص غزل کی طرف سے میں بدگمان ہوگیا تھا اور نئی شاعری اور نئی نظم کے لئے نو مسلموں کا سا جوش رکھتا تھا لیکن اس کے ایک شعر نے تو جیسے دنیا ہی بدل دی۔ میں نے پرانے شعرا کے دواوین اور کلیات پڑھنے شروع کئے اور کچھ دنوں کیلئے ان میں ڈوب سا گیا۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے میں نے اُن شعراء کو از سرِ نو دریافت کیا ہے کیونکہ میرے بعض تاثرات ایسے ہوتے جو عام اور مروّجہ تنقیدوں سے مطابقت نہیں رکھتے تھے اسی کیفیت نے میری تنقید نگاری کو جنم دیا۔"[14]

"میری تنقید نگاری میری داخلی ضرورتوں کی پیداوار تھی۔ یہ داخلی ضرورتیں میری اپنی شاعری سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں کچھ ایسی کیفیتوں سے گذر رہا تھا جو بہت سے مصرعے کہنے کے بعد بھی ان کہی سی رہ جاتی تھیں، انہیں سے ملتی جلتی کیفیات کو دوسرے شعرا کے یہاں تکمیل یافتہ صورت میں دیکھتا تو محسوس ہوتا کہ میں نے ان شعرا کو نہیں بلکہ اپنے آپکو پالیا۔"[15]

روایت اور جدیدیت کا شعور :

"...... روایت اور جدیدیت کے سلسلے میں ایک واضح شعور تو ذرا بعد میں پیدا ہوا جب مجھے انگریزی ادب کے مطالعہ کا موقع ملا لیکن قدیم اور جدید شاعری کے تصادم، ان کے اثرات کے امتزاج اور ان کی باہمی ترکیب سے اسی زمانہ میں مجھے اس لہجے کو پانے میں مدد ملی جو میرے اپنے تجربہ والی واردات کا ساتھ دے سکتا تھا، کم از کم اپنی حد تک مجھے یہ اطمینان ہونے لگا کہ مجھے جو کچھ کہنا تھا میں نے وہی کہا ہے، اور اب نظم یا شعر کو سنانے کے بعد اس کی مزید تشریح و توضیح کی زحمت خود مجھے نہیں اٹھانی پڑےگی۔"[16]

انجمن ترقی پسند مصنفین :

"میری شاعری ابھی ابتدائی منزلوں سے گذر رہی تھی۔ علی گڑھ میں نئے ادب اور نئے افکار سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کا ایک خاص حلقہ بن گیا تھا جس میں اشعر ملیح آبادی مرحوم، قاضی سلیم، فرید بخش قادری، سید منہاج الدین، باقر مہدی، اصغر عباس، تصور حسین زیدی، سید یوسف حسن اور ریاض القیوم قیصر وغیرہ شامل تھے ہم میں سے بعض فرسٹ ائیر اور سکنڈ ائیر کے طالب علم تھے۔ اور بعض بی اے اور ایم اے میں پڑھتے تھے لیکن ادب کے جنون نے ہم سب کو ایک دوسرے سے بہت قریب کر دیا تھا۔ ہم سے بعض نظم یا نثر کی کسی صنف میں طبع آزمائی کرتے تھے بعض ایسے تھے جو کچھ نہ لکھنے کے باوجود شعر و ادب کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے ہوئے تھے۔ اور اُسی کی فضا میں سانس لیتے تھے، انہیں دنوں ہم سب نے مل کر علیگڑھ میں دوبارہ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی، جس کے جلسے ہر ہفتہ الحمرا ریستوران میں ہونے لگے۔ اسوقت ہمارے سامنے ترقی پسندی کا وہ محدود اور مخصوص تصور نہیں تھا جو آگے چل کر کل ہند پیمانے پر سامنے آیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان جلسوں میں پروفیسر رشید احمد صدیقی، خواجہ منظور حسین، اختر انصاری، جذبی، ڈاکٹر ابواللیث صدیقی، ڈاکٹر مسعود حسین، خورشید الاسلام، سلامت اللہ خاں، اور اسلوب احمد انصاری جیسے مختلف الخیال حضرات شریک ہوتے ان جلسوں میں ہم سب اپنی لکھی ہوئی چیزیں سناتے جن پر ہمدردانہ

---

[13] "ہنگامۂ حیات سے جانبر نہ ہو سکا" از خلیل انجم "ہماری زبان" اعظمی نمبر ۸ر ۱۵ر اگست ۱۹۷۸ء صـ۲

[14] "نیا عہد نامہ" خلیل الرحمن اعظمی صـ۱۲

[15] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی صـ۱۳

[16] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی۔ صـ۱۲

تنقیدیں ہوتیں اور تشریح اور تجزیے ـــــــ اس کے کئی پہلو سامنے آتے۔ میں نے اپنی ادبی تربیت کے سلسلے میں اس حلقے کے دوستوں اور اس انجمن میں شریک ہونے والوں سے بہت فائدہ اٹھایا تھا۔"[16]

علیگڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد معین الدین جذبی کی نگرانی میں ڈالی گئی:ـــ

"..... ہم سب کی ایک ٹولی سی بن گئی اور کچھ دنوں میں جذبی صاحب کے اصرار سے اور ان کی رہنمائی میں ہم لوگوں نے یہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔۔۔ یوسف حسین صاحب اس کے پہلے سکریٹری منتخب ہوئے۔"[15]

تقسیم ہند ۱۹۴۷ء:ـ مسلم یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ کے امتحان میں کامیابی حاصل کی۔ تب وہ انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے بلڈنگ ڈپارٹمنٹ میں ایک عارضی ملازمت مل گئی تھی۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں وہ دہلی سے علیگڑھ آرہے تھے کہ فسادیوں نے ان کو اپنی دانست میں مار کر پھینک دیا۔ جہاں سے وہ جامع مسجد کے ریلیف کیمپ میں لائے گئے۔ پھر جامعہ ملیہ میں تین ماہ رہنا پڑا۔ پورے واقعہ کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں ـــ

"جس خوشگوار ذہنی فضا اور ادبی ماحول کا میں نے اوپر ذکر کیا ہے وہ بدقسمتی سے تقسیم ہند کے بعد درہم برہم ہوگیا۔ اس کے بعد میری ذاتی زندگی اور تخلیقی اور تجربے کو جس کرب و اضطراب کشمکش، تصادم اور جن واقعات و حادثات سے دوچار ہونا پڑا اس کی داستان بہت طویل ہے۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں دہلی سے علیگڑھ آتے ہوئے ٹرین میں میں نے اپنی موت کو خود اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس منظر کی تاب نہ لا سکا۔ ہوش آیا تو اپنے کو جامع مسجد کے ایک ریلیف کیمپ میں پایا اور پھر اس کے بعد جامعہ ملیہ میں تین مہینے تک حیات و مرگ کی کشمکش میں مبتلا رہا۔ اس حادثے سے جانبر ہونے کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء کے آخر میں پھر علیگڑھ واپسی ہوئی۔ یہاں آکر مجھ پر کچھ دنوں تک عجیب کیفیت طاری رہی۔ راتوں کو گہری نیند میں چیخ چیخ اٹھتا، مجھے ایسا معلوم ہوتا جیسے کوئی آسیبی قوت میرے سینے پر سوار ہو کر مجھے ہمیشہ کے لئے ختم کر دینا چاہتی ہے۔ آہستہ آہستہ کیفیت کم ہوتی گئی لیکن اس کا اثر اب تک کسی نہ کسی صورت میں باقی ہے۔ روزانہ تو نہیں لیکن چھٹے چھ ماہ ہے اب بھی یہ آسیب مجھے اپنی صورت دکھا جاتا ہے۔"[19]

اس واقعہ کا ذکر اپنی کتاب "آئینہ خانہ میں" کے پیش لفظ میں انہوں نے اس طرح کیا ہے:

"..... دوسرا اہم واقعہ دہلی کے فسادات کا ہے جب میرے جسم پر آٹھ زخم آئے تھے اور بڑی مشکلوں کے بعد میری جان بچی تھی۔ لیکن اس واقعے نے میرے شعور کو واضح کرنے میں بہت مدد کی۔ میں اپنے جسم کے زخموں کو یاد کرتا ہوں تو مجھے رومن رولاں کی یہ تحریر یاد آتی ہے:

"میری محبوب! میں تمہارے لئے اپنے زخموں کا تحفہ لایا ہوں۔ یہ میری بہترین متاع ہے جو زندگی نے مجھے دی ہے۔ میرا ہر زخم زندگی کی طرف ایک اگلا قدم ہے۔"[20]

تقسیم کے بعد علی گڑھ میں بڑی تبدیلی آچکی تھی۔ لوگ ادھر ادھر جا چکے تھے۔ اعظمی مرحوم اپنے زخموں کے ساتھ علی گڑھ لوٹے تو تب ہی کے احساس نے ان زخموں کو زیادہ دنوں تک ہرا رکھا:

"میری زندگی کا یہ دور میری ذہنی تباہی کا دور تھا۔ میرے بڑے دوست اور ساتھی ایک ایک کر کے علیگڑھ سے جا چکے تھے۔ اور میں ان کو یاد کر کے اداس ہو جاتا تھا۔ ریستورانوں میں، راستوں اور گذرگاہوں پر نگاہیں مانوس چہروں کو ڈھونڈھا کرتیں اور ٹکرا کر واپس آجاتیں۔ میری صبح و شام اب کاٹے نہیں کٹتی تھی اور ہر لمحہ یہ کیفیت کہ (؟)

اس آشیاں میں صدا دی ادھر پکار آئے

اس زمانے میں کئی مہینے ایسے گذرے جب میری زبان گنگ ہوگئی تھی یہ جو کچھ بیت چکی تھی اور بیت رہی تھی اس کے اظہار سے

---

[17] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۳-۱۴

[18] "علی گڑھ کی چند شخصیتیں" از خلیل الرحمن اعظمی بنقوش شخصیات نمبر حصہ ۲ ص ۱۲۳۲ شمارہ نمبر (؟)

[19] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۴

[20] "آئینہ خانے میں" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۰

مجھے خوف سا آنے لگا۔ اپنے جذبات اور احساسات کو چھوتے ہوئے مجھے ڈر سا لگتا تھا۔ اِدھر اُدھر کی کتابیں لا کر پڑھتا تھا، مگر اس سے بے چینی کا علاج ہونے کے بجائے دل کی ویرانی میں اضافہ ہو جاتا۔" ۲۱ ؎

مطالعہ کلام میر: یہی وہ زمانہ ہے جب تنہائیوں اور پریشانیوں نے انہیں میر کے کلام کا مطالعہ کرنے پر مجبور کیا۔ اور انھوں نے محسوس کیا:

"......... جیسے میری داخلی دُنیا میں کچھ دریچے کھل گئے ہیں، جن سے ہو کر ایسی ہوائیں آ رہی ہیں جو مجھے محبت، رفاقت، خلوص، ہمدردی اور دلدہی اور دلاسائی کا پیغام دے رہی ہیں۔ میں نے اس کلیات کو اپنے سینے سے لگایا اور اسی آئینہ میں اپنی ذات کا مشاہدہ کرنا میرا معمول بن گیا.........

میر سے میری شناسائی تو ایک اتفاقی حادثہ تھا۔ وہ ایک خاص کیفیت میں میرے غم گسار بن گئے۔ اور میں اُن کی صحبت میں بیٹھ کر تنہائی کے عذاب سے نجات حاصل کرنے لگا۔" ۲۲ ؎

کلامِ میر کے مطالعے سے وہ جس نتیجہ پر پہنچے وہ یہ ہے:

"میر کے بارے میں میں نے پڑھ رکھا تھا کہ وہ ہائے وائے کے شاعر ہیں۔ اُن کے یہاں غم پرستی اور قنوطیت ہے۔ وہ بے دماغ یا بدماغ تھے۔ اور کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ مگر میں نے میر صاحب کو اس کے برخلاف پایا۔ مجھے ان کے یہاں غم پرستی کے بجائے غم سے نبرد آزما ہونے اور اسکے زہر سے امرت نکالنے کا سلیقہ نظر آیا۔ مردم بیزاری اور کلبیت کے بجائے انسان دوستی، فراخ دلی، وسیع المشربی، زندہ رہنے اور زندگی سے نباہ کرنے کا ہنر دکھائی دیا۔ مجھے ایسا لگتا ہے جیسے اُن کو بھی اپنے زمانے میں اس نوع کی تنہائی سے واسطہ پڑا تھا۔ اُنہوں نے بھی اپنے سامنے ایک بساط کو اُلٹتے اور ایک بھری پری بزم کو درہم برہم ہوتے دیکھا تھا۔ اور اسکے باوجود بھی انسان اور انسانی زندگی پر ان کا اعتماد باقی تھا۔" ۲۳ ؎

اور آخر میر کی تلاش اور اس کی آواز کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو گئے:

"......... میر کی آواز کو اپنی آواز سمجھنا میرے لئے محض غزل گوئی یا شاعری کا راستہ نہیں تھا بلکہ یہ میری پوری زندگی کا مسئلہ تھا۔ اس آواز کا سراغ مجھے نہ ملتا تو میرا وجود کا غم جو اندر سے مجھے کھائے جا رہا تھا نہ جانے مجھے کن اندھی وادیوں میں لے جاتا۔"

انجمن ترقی پسند مصنفین سے تعلق:

ابھی یہ سلسلہ چل ہی رہا تھا اور میں اپنے کھوئے ہوئے حواس مجتمع کر ہی رہا تھا کہ علی گڑھ میں نوجوانوں کے قافلے آنے شروع ہو گئے اور ترقی پسند ادیبوں کی انجمن پھر ایک نئے ولولے کے ساتھ بیدار ہو گئی۔ جانے والے کارواں کی بچی کچی یادگار ایک میں ہی رہ گیا تھا۔ اس لئے انجمن کی سرگرمی کا بار سکریٹری کا میرے ہی کاندھوں پر ڈالا گیا۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد ایسا معلوم ہوا کہ اب فراغ دلی اور کشادگی باقی نہیں رہی ہے۔ بمبئی میں کل ہند انجمن کا دفتر قائم ہو چکا تھا اور نیا ادب کے سلسلۂ جدید کا اجراء ہو چکا تھا۔ اپنے ادب اور ترقی پسند ادب کی کشمکش بہت تیز ہو گئی تھی۔ مرکزی انجمن کی ہدایت کے مطابق انجمن کی رکنیت اب ادیبوں اور شاعروں تک محدود نہ رہی بلکہ اس میں عام طالب علم، سیاسی رضاکار اور مزدور اور کسان بھی شامل ہونے لگے۔ جو اپنے آپ کو ترقی پسند خیالات و عقائد کے حامل سمجھتے۔ میری اُفتادِ طبع اس وقت تک کچھ ایسے ڈھانچے میں ڈھل چکی تھی، کہ میں زندگی اور ادب کے سلسلے میں اس تصور سے مطابقت نہیں کر پاتا تھا جس میں ضرورت سے زیادہ غلو، یک رُخا پن اور منجمد نقطۂ خیال کی کارفرمائی ہوتی۔ پرانی مذہبی، اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے میں نے اپنا ناطہ اسی لئے توڑا تھا کہ میرے نزدیک اُن میں ادعائیت اور انجماد پیدا ہو گیا تھا۔ اور زندگی کے نامیاتی اور حرکی تصور کا ساتھ نہیں دے رہی تھی۔ ترقی پسندی میرے نزدیک زندگی کے انھیں حرکی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا نام تھا۔ مگر آہستہ آہستہ یہ محسوس کر رہا ہوں کہ ترقی پسندوں کے دعویدار ترقی پسندی

---

۲۱ ؎ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی صفحہ ۱۴

۲۲ ؎ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی صفحہ ۱۵

۲۳ ؎ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی صفحہ ۱۵

شاعر، بمبئی

۲۴ ؎ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی، صفحہ ۱۵

کا بھی جامد اور محدود تصور رکھتے ہیں اور اس سلسلے میں جس شدت سے کام لے رہے ہیں وہ اسی نوعیت کی ہے جو واعظوں اور محتسبوں کی خصوصیت رہی ہے جن سے بیزار ہو کر میں نے اس تحریک کے دامن میں پناہ لی تھی۔" ۲۵

اس زمانے میں ان کا شعر و ادب سے کیا تعلق تھا اور انکی پسند اور ناپسند کیا تھی ملاحظہ کیجئے:

"...... اپنے مطالعے اور تجربے کی بنا پر شعر و ادب سے متعلق بھی میرا ذوق بہت سے دوستوں سے مختلف تھا۔ میں ان لوگوں سے بھی اپنے آپ کو متفق نہ پاتا جو محض غزل گوئی کو شاعری سمجھتے یا اسلوب اور طرز بیان میں کسی انداز سے ہٹ کر کسی نوع کی تازگی کو تعجب کی نظر سے دیکھتے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ مجھے ان لوگوں کی بات بھی پسند نہیں آتی تھی جو غزل کو گردنی سمجھتے یا قدیم شاعری کے تمام سرمائے کو جاگیردارانہ اور انحطاطی سماج کی یادگار سمجھ کر اس سے منہ پھیر لینا چاہتے تھے۔ محض غزل، محض نظم یا محض آزاد نظم پر اصرار کرنے اور ذہن پر اڑنے والوں کی ہمنوائی میں نہیں کر پاتا تھا اس لئے کہ میری سمجھ کے مطابق ان اسالیب اور ہیئتوں میں کوئی تضاد اور افتراق نہیں اور نہ یہ ہیئتیں اپنی جگہ پر اٹل اور جامد و ساکت ہیں۔ اسی طرح ذاتی شاعری، غم جاناں، غم دوراں، داخلیت اور خارجیت وغیرہ کی تقسیم اور ان کی طول طویل بحثیں بھی مجھے بے معنی نظر آتیں اور نہ یہ بات دل میں بیٹھتی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق کیوں دیا جائے۔" ۲۶

نظموں سے متعلق ترقی پسندوں کے رویہ پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"...... مگر یہ دلچسپ واقعہ ہے کہ لوگ ایسی ہی نظموں کو سراہتے اور جو نظمیں ان کے نزدیک 'ذاتی'، 'داخلی' یا ان تجربوں کے متعلق ہوتیں جنھیں اس زمانے میں غم جاناں کہا جاتا تھا، انہیں سن کر اس بات کا اظہار خیال کرتے کہ ابھی آپ کا ذہن صاف نہیں ہے۔ ابھی آپکے یہاں بہت سے جالے ہیں۔ اب ان چکروں سے نکل ہی جائیے تو اچھا ہے۔" ۲۷

ترقی پسندوں کے اس رویے نے انہیں پریشان کیا وہ ان کے اس طرح کے خیالات سے مطمئن نہ تھے:

"میں بڑی کشمکش و پیچ میں مبتلا تھا، ان تحریروں کو اپنی اصل تحریریں سمجھوں جو خود مجھے پسند آتی ہیں یا ان تحریروں کو جو ترقی پسندی کے رائج معیاروں پر پوری اترتی ہیں۔ بہت دنوں سوچتا رہا کہ شاید میں ہی غلطی پر ہوں یا میرے ذاتی غموں نے شاید میری شخصیت کو بگاڑ دیا ہے یا ممکن ہے میر صاحب کی صحبت میں بیٹھ کر گمراہ ہو گیا ہوں۔" ۲۸

ابھی وہ اس طرح کی کشمکش میں مبتلا تھے کہ قید و بند کے مرحلے سے گذرنا پڑا:

"...... ۱۹۴۹ء میں کل ہند انجمن کی سیاسی پالیسی کے پیش نظر حکومت نے اسے غیر قانونی قرار دیا۔ علی گڑھ کی انجمن بھی اسکی آنچ سے محفوظ نہ رہ سکی کیونکہ اس کا الحاق بھی مرکزی انجمن سے ہو چکا تھا۔ میں چونکہ انجمن کا سکریٹری تھا اس لئے ڈیفنس آف انڈیا رولز کے ماتحت گرفتاری کا پروانہ سب سے پہلے میرے ہی نام جاری ہوا۔ میں نے اپنے آپکو سپرنٹنڈنٹ جیل کے سپرد کر دیا۔ جیل میں دوسرے سیاسی کارکنوں کے ساتھ مجھے بھی رکھا گیا۔" ۲۹

"آئینہ خانے میں" اپنے جیل جانے کے واقعہ کو اس طرح تحریر کرتے ہیں:

"...... تیسری چیز میری جیل کی زندگی ہے جب میں فروری ۱۹۴۹ء میں طالب علموں کے ایک جلسے میں تلنگانہ پر نظم پڑھنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا اور تین مہینوں تک میں نے ان ساتھیوں کے ساتھ زندگی گذاری جو اپنے خون سے نئے دور کی تاریخ لکھ رہے ہیں۔" ۳۰

جیل کے باہر سے اگرچہ اطلاعیں مل رہی تھیں کہ بعض لوگ جو آزمائش کے دور سے گزرنے کی ہمت نہیں رکھتے تھے انجمن ترقی پسند مصنفین سے الگ ہو گئے لیکن خلیل الرحمن اعظمی ان حالات سے گھبرائے نہیں:

"...... ہرچند مجھے بھی انجمن سے سیاسی و ادبی نقطۂ نظر سے خاصہ اختلاف تھا لیکن ان خبروں کا میرے اوپر ردعمل یہ ہوا کہ مجھے اسوقت اپنی ترقی پسندی پر اصرار کرنا چاہیے۔ اس وقت ترقی پسندی

---

۲۵ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۶

۲۶ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۶

۲۷ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۷

۲۸ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۷

۲۹ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۰

۳۰ "آئینہ خانے میں" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۱

میرے لئے محض ایک ادبی سرگرمی کا نشان نہیں تھا بلکہ یہ میرے لئے شخصی کردار کا امتحان تھا۔ میں نے اس موقع پر بعض ادبی طرز فکر کی آڑ لے کر اس میدان سے فرار اختیار کرنے کو اپنے نفس اور اپنی انا کی توہین سمجھا۔ وہ لوگ جو بزدلی یا مصلحت کی بنا پر اس وقت کنی کاٹ رہے تھے اور یہ کہتے تھے کہ ترقی پسندوں کے عقائد سے انھیں نہ مد اختلاف ہے۔ انہیں میں نے کچھ اچھی نظر سے نہیں دیکھا۔" [31]

۱۹۴۸ء میں آتش پر جب "نگار" میں اعظمی صاحب کا مقالہ شائع ہوا تو اسے اہل علم حضرات نے صرف پسند کیا بلکہ خلیل صاحب کی طرف انگلی اٹھائی جانے لگیں۔ اس وقت وہ بی اے کے طالب علم تھے۔ ملاحظہ کیجئے:

"۱۹۴۸ء میں جب میں بی اے کا طالب علم تھا آتش پر میرا یہ مقالہ بالاقساط "نگار" میں شائع ہوا تھا۔ ایک کم سواد اور نو آموز لکھنے والے کی اس تحریر کی ادبی حلقوں میں غیر معمولی طور پر پذیرائی ہوئی۔ نیاز صاحب نے اس مقالے پر خاص طور سے ایک نوٹ لکھا اور اسے سراہتے ہوئے یہ خیال ظاہر کیا کہ "جناب اعظمی جس وقت نگاہ اور امعان نظر سے کام لے رہے ہیں وہ آتش کے باب میں اس وقت تک کسی صاحب قلم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی"۔ اکبار اپنے اداریئے میں یہ رائے دی کہ "ان مضامین میں لکھی وہی آن بان ہے جو آتش کی شاعری کی خصوصیت کا خاصہ ہے"۔ حضرت فراق نے اسی زمانے میں مجھے ایک خط لکھا کہ "پچھلے دس سال سے جو کچھ میں آتش کے بارے میں سوچ رہا تھا ان خیالات کو آپ کے مضمون میں پاکر عجیب و غریب مسرت ہوئی"۔ یہ بات بھی کم قابل فخر نہ تھی کہ میری پہلی طالب علمانہ کوشش کو بابائے اردو مولوی عبدالحق صاحب، مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم، قاضی عبدالغفار صاحب، حضرت اثر لکھنوی، پروفیسر نجیب اشرف ندوی اور ڈاکٹر سید عبداللہ جیسے بزرگوں اور عالموں نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا اور نئے ادیبوں اور ناقدوں میں سید احتشام حسین، ڈاکٹر وحید قریشی، ریاض احمد، مظفر علی سید، رضیہ ادیب وغیرہ نے بھی کھول کر داد دی۔ آتش کے فن والا

حصہ "بہترین ادب" میں منتخب کیا گیا اور میرے انہیں مضامین کی بنا پر پروفیسر محمد شفیع صاحب نے "انسائیکلوپیڈیا آف اسلام" میں شامل کرنے کے لئے آتش پر مقالہ لکھنے کا کام میرے سپرد کیا۔ یہ انسائیکلوپیڈیا پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

سب سے زیادہ حوصلہ افزائی میری شفیق استاد پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کی جانب سے ہوئی۔ موصوف اس زمانے سے اپنے مخصوص انداز میں مجھے "آتش پرست" کہا کرتے تھے۔ [32]

رشید احمد صدیقی صاحب سے ملاقات کے سلسلے میں تحریر کرتے ہیں:

"رشید صاحب سے صحیح معنوں میں [illegible] جب میں بی اے کا طالب علم تھا۔ آتش پر میرے مقالات بالاقساط "نگار" میں شائع ہو رہے تھے۔ غالباً نیاز صاحب نے ان کو لکھا کہ علیگڑھ کے یہ کون صاحب ہیں جن کے مضامین آتش پر چھپ رہے ہیں تو رشید صاحب کو میری جستجو ہوئی اور یہ جان کر انھیں بڑا تعجب ہوا کہ میں وہی شخص ہوں جو ڈیوٹی سوسائٹی سے قرض لینے کے لئے انہیں اکثر گھیرتا ہے۔ پھر تو رشید صاحب بہت مہربان ہو گئے۔ کہا کہ جب مجھ سے ملنے گھر آیا کرو تو اپنا نام ضرور بتا دیا کرو کیونکہ میں نیکر اور بنیائن پہنے ہوئے اپنے باغیچے میں کام کرتا رہتا ہوں، غیر ضروری آدمیوں سے ملنے کے لئے کپڑے بدل کر باہر آنا اور پھر ان کے لئے کرسیاں اور مونڈھے نکلوانے میں زحمت ہوتی ہے اور علی گڑھ ایسی جگہ ہے کہ اگر جھوٹ نہ بولا جائے تو سارا دن اسی کی نذر ہو جائے۔" [33]

"میں نے ذوقی صاحب (مسعود علی ذوقی) کو پہلی بار ۱۹۴۸ء میں لکھنؤ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس کے موقع پر دیکھا تھا جب وہ فانی کی الم شاعری پر مقالہ پڑھنے آئے تھے۔" [34]

---

[31] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمن اعظمی، ص ۱۸

[32] مقدمہ کلام آتش، از خلیل الرحمن اعظمی، ص الف، ب

[33] علیگڑھ کی چند شخصیتیں، از خلیل الرحمن اعظمی۔ سوانیات نمبر حصہ دوم "نقوش" لاہور ص ۱۳۲۹

[34] علیگڑھ کی چند شخصیتیں: خلیل الرحمن اعظمی۔ شخصیات نمبر حصہ دوم "نقوش" لاہور ص ۱۳۳۷

غزل کا مطلع پڑھا ؎

ترے خیال سے لَو دے اٹھی ہے تنہائی
شبِ فراق ہے یا تیری جلوہ آرائی

سوائے اعظمی محفل میں ہر شخص واہ واہ کر رہا تھا۔ مطلع پر انہوں نے سر کھجایا اور اِدھر اُدھر دیکھا۔ مطلع ثانی یا دوسرے شعر پر انہوں نے پُراسرار انداز میں بڑی سُلگائی اور کہا کہ تیسرا شعر مجھ سے سُن لیجئے۔ اعظمی کے اس طرح مرے expose کرنے کے باوجود میں سارے اشعار کے بعد بگڑے گھبراہٹ میں سناتا چلا گیا۔ مقطع پھر اعظمی نے سُنایا ؎

اسی کی یاد میں ناصر ہوں بے قرار اب بھی
بچھڑ کے جس سے ہوئی شہر شہر رسوائی

غزل میں ایک شعر درمیان میں یہ بھی تھا ؎

میں سوتے سوتے کئی بار چونک چونک پڑا
تمام رات ترے پہلوؤں سے آنچ آئی

اُستادِ گرامی نے "پہلوؤں" کو "عارضوں" میں تبدیل کر دیا تھا۔ اگرچہ میں دل ہی دل میں احتجاج کر رہا تھا کہ محبوب کے عارض تندور تو نہیں ہوتے۔ اعظمی نے کہا امین اشرف صاحب پوری غزل میں یہی آپ کا ایک CONTRIBUTION ہے۔ یہی نہیں بلکہ شکستہ الماری میں ٹھسے ہوئے گرد آلود رسائل سے ایک ادبی رسالہ ڈھونڈ نکالا۔ کم بخت یہ ایک اور رسالہ تھا جس میں ناصر کاظمی کی یہی غزل چھپی ہوئی تھی۔ میں کھسیانا ہوا رسوائی کا تاج پہنے "کوٹھی" سے چلا اور ہفتوں چھپا رہا۔ مگر اس خفت نے بہت جلد مجھے شاعر بنا دیا۔" ۳۷

۱۹۵۰ء میں "امن کانفرنس" کے سلسلے میں کلکتہ کا سفر کیا تھا جس کے بارے میں تحریر کرتے ہیں:

"۱۹۵۰ء میں جب میں علی گڑھ یونیورسٹی کا طالب علم اور یہاں کی انجمن ترقی پسند مصنفین کا سکریٹری تھا۔ ایک امن کانفرنس میں شرکت کے لئے کلکتہ گیا۔ اس کانفرنس سے متعلق جہاں اور بہت سے تاثرات ابھی تک ذہن میں محفوظ رہ گئے ہیں وہاں ایک تاثر یہ بھی ہے کہ

پرویز شاہدی اس زمانہ میں جیل میں تھے لیکن انکی مقبولیت اور ہر دل عزیزی کا یہ عالم کہ وہاں ہر ادیب و شاعر اور سیاسی کارکن ان کا ہی ذکر کرتا تھا اور کانفرنس میں ہر اجلاس کے شروع میں پرویز کی کوئی نہ کوئی نظم یا غزل پڑھ کر سنائی جاتی اور پورے مجمع میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ جاتی"۔ ۳۸

اس زمانے میں جن لوگوں سے انہوں نے کچھ فیض حاصل کیا اور جن سے وہ متاثر ہوئے اُن کا ذکر وہ اس طرح کرتے ہیں:

"آخر میں اُن لوگوں کو نام لینا چاہتا ہوں جن سے مل کر میں نے کچھ حاصل کیا ہو اور اپنے شعور کو جلا دی ہے۔ اُنہیں سردار جعفری، کیفی اعظمی، احتشام حسین، ڈاکٹر عبد العلیم، ڈاکٹر رام بلاس شرما، انا بھاؤ ساٹھے، بھیم سنگھ ناگر اور شاد عارفی شامل ہیں۔ جن دوستوں اور ساتھیوں کا میری زندگی پر اثر کر اور جن کی تنقیدوں سے میں نے فائدہ اُٹھایا ہے ان میں باقر مہدی، انجم اعظمی، عزیز عالم، علی حماد عباسی، محمد مشتاق، میرزا امتیاز حسین، جاوید کمال اور رفیق گوالیاری کا خاص طور پر مشکور ہوں"۔ ۳۹

شاد عارفی کے وہ قدر داں تھے۔ اُن کی بعض خصوصیات نے اُنہیں اس قدر متاثر کیا کہ ایک بار اُنہوں نے اُن سے درخواست کی کہ وہ انکو اپنا شاگرد بنا لیں۔ وہ لکھتے ہیں:

"........ شاد صاحب کے اس طریق کار نے مجھے بہت متاثر کیا اور ایک مرتبہ میں نے اُن سے یہ خواہش ظاہر کی کہ مجھے بھی اپنا شاگرد بنا لیجئے۔ پہلے تو وہ انکار کرتے رہے۔ کہا تمہیں اصلاح کی ضرورت نہیں۔ تمہارا مطالعہ بہت اچھا ہے اس کی روشنی میں خود اپنے کلام پر بار بار نظرِ ثانی کیا کرو۔ لیکن جب میں بہت بضد ہوا تو کہنے لگے اچھا اپنی بیاض لاؤ۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب وہ علی گڑھ میں ہی جاوید کے یہاں مقیم تھے۔ بیاض لائی گئی۔ شاد صاحب نے غزلوں اور نظموں کو پڑھنا شروع کیا اور اُن پر اس طرح اصلاح دینی شروع کی

۳۷ بیادِ خلیل۔ زندگی، جون ۱۹۷۸ء ص۔۔
شاعر بمبئی

۳۸ "مضامینِ نو" از خلیل الرحمن اعظمی ص ۲۲۴
۳۹ "آئینہ خانے میں" خلیل الرحمن اعظمی ص ۱۱

کہ جس شعر میں اُن کو سقم نظر آتا وہ ہم سب کو سُناتے اور اس میں جس قسم کا جھول نظر آتا اس کو ظاہر کرتے پھر ہر شخص سے اپنی رائے پوچھتے۔ ایسا بھی ہوتا کہ شاد صاحب جس شعر کو عیب قرار دے رہے ہیں ہم میں سے کسی اور نے کہا کہ نہیں شاد صاحب یہ تو اس کا حُسن ہے' یہی تو وہ نکتہ ہے جس سے شعر میں جان پڑ گئی ہے۔ پہلے تو وہ خوب جھک جھک کرتے لیکن آخر کار مان جاتے "اچھا یہ ہے تو ٹھیک ہے۔" غرض ان کی کچھ اصلاحیں تو قبول کی جاتیں اور کچھ کو ہم لوگ ماننے سے انکار کر دیتے۔ میرے پاس وہ بیاضیں اب بھی کہیں رکھی ہوں گی جن پر شاد صاحب نے خود اپنے قلم سے بہت سی خامیاں اور غلطیاں درست کی ہیں۔ بعد میں کچھ غزلیں میں نے خطوط کے ذریعہ بھیجیں۔ اُن پر شاد صاحب نے اپنے خطوط میں بڑے دلچسپ انداز میں تبصرے کئے ہیں اور اصلاحیں بھی تجویز کی ہیں۔ میں نے خود بھی یہی طریقہ اختیار کیا کہ کچھ اصلاحوں کو تو قبول کریں اور کچھ اصلاحوں کے بارے میں پھر انہیں لکھتا تھا اور اپنا نقطۂ نظر ظاہر کرتا تھا۔" ۴۰

۱۹۵۱ء: علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر ہوئے۔

۱۹۵۱ء: ایم۔ اے کے امتحان میں امتیاز کے ساتھ کامیابی حاصل کی۔

۱۹۵۱ء: یونیورسٹی گزٹ کی ملازمت ملی جس کے بارے میں لکھتے ہیں:

"...... مجھے عارضی طور پر یونیورسٹی گزٹ کی ایڈیٹری مل گئی تھی۔ لیکن یہ ملازمت اپنے اندر کچھ ایسی نزاکتیں رکھتی تھی کہ جن سے عہدہ برآ ہونا میرے لئے آسان نہ تھا۔ اور یہ رشتہ دن بدن ٹوٹتا نظر آیا تھا۔" ۴۱

۱۹۵۱ء: انجمن ترقی پسند مصنفین کا غیر اطمینان بخش رویّہ:

"دوستوں کے حلقے میں کچھ لوگوں کو ہم خیال پاکر انجمن میں مباحثوں اور مذاکروں کا سلسلہ شروع کیا۔ انجمن ترقی پسند مصنفین کے محدود نقطۂ نظر' چند ادیبوں کی اجارہ داری اور آمریت' ادب کے سلسلے میں غیر ادبی معیاروں کا اطلاق اور اس طرح کے رجحانات کے خلاف سب سے پہلے علی گڑھ کی انجمن سے آوازیں اٹھیں' اور ان کو اُٹھانے والے میں اور میرے چند احباب تھے۔ مقامی انجمن کے وہ اراکین جو ادیب کم اور ترقی پسند زیادہ تھے۔ بلکہ بعض ادیب تو سرے سے ادیب ہی نہ تھے بلکہ محض ترقی پسندی کے دعویدار تھے۔ انھوں نے ہماری سخت مخالفت کی۔ مجھ کو اور میرے دوستوں کو گمراہ' انحطاط پرست' رجعت پسند اور اسی قبیل کے دوسرے خطابات سے نوازا گیا۔ یہ خطابات انجمن کے جلسوں کی تنگنائے سے نکل کر علیگڑھ کے گلی کوچوں' ڈرائنگ روموں اور ادب نواز خواتین کی محفل میں پہنچے۔ ہمارے بارے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں ہوئیں۔ بہت سی کہانیاں میرے اور میرے دوستوں کے نام سے منسوب ہوئیں اور اخلاقی و سماجی اعتبار سے کوئی عیب ایسا نہیں تھا جو ہمارے نامۂ اعمال میں درج نہ کیا گیا ہو بعض حضرات نے یہ انکشاف کیا کہ ہماری ترقی پسندی ایک طالب علمانہ ترنگ اور جوانی کا ابال تھی۔ اب چونکہ ہمیں ملازمت حاصل کرکے دُنیاوی ترقی کا راستہ ہموار کرنا ہے اسلئے ہم نے اس سے انحراف کا ایک منصوبہ تیار کیا ہے۔" ۴۲

ڈاکٹر مختارالدین آرزو سے اسی زمانہ میں تعلقات پیدا ہوئے:۔

"جس زمانہ میں مسلم یونیورسٹی گزٹ کا ایڈیٹر تھا۔ اور میرا قیام مرس حالی روڈ پر تھا۔ اسی زمانے میں آرزو صاحب سے تعلقات بڑھے۔ اور اتنی قربت ہوئی کہ آرزو صاحب مستقلاً میرے ساتھ قیام پذیر ہو گئے اور دو سال تک اسی طرح گزرے ہیں۔ کہ ہم دونوں کا ایک ایک لمحے کا "اعمال نامہ" ایک دوسرے کے سینہ میں محفوظ ہے ۵ حالی روڈ پر ہم مولوی مشتاق احمد صاحب (اورینٹل اسسٹنٹ لٹن لائبریری) کیساتھ وابستہ ہو گئے تھے۔ اور Paying Guest کی حیثیت سے رہتے تھے۔ مشتاق صاحب علیگڑھ کی عجیب و غریب ہستیوں میں سے ایک ہیں۔ انکی شخصیت بذاتِ خود علیگڑھ میں ایک ادارہ سے کم نہیں۔ اگرچہ اُنھوں نے کوئی علمی' ادبی کام نہیں کیا۔ لیکن اُن کے علم اور اُن کی ذہانت اور ان کے سوجھ بوجھ کے سب قائل ہیں لیکن سب سے زیادہ جو چیز لوگوں کو اُن کی طرف کھینچتی ہے وہ اُن کا خلوص' جاں نثاری اور دوست نوازی ہے۔ ۵ حالی روڈ پر شام کو محفل جمتی تھی۔ جسمیں مشتاق صاحب صدر بن کے بیٹھتے اور ادرگرد میں اور آرزو

۴۰؎ "مضامینِ نو" از خلیل الرحمٰن اعظمی' ص ۲۱۱

۴۱؎ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲

شاعر' ممبئی

۴۲؎ "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی۔ ص ۲۰

صاحب کے علاوہ قیوم قائم، حشمت اللہ انصاری، حنیف خاں ناشاد اور سید رضی الدین ایک گول دائرے میں ہوتے۔ چائے کا دور چلتا اور دنیا بھر کے مسائل پر بحث و مباحثہ ہوتا۔ ایسے موقعوں پر آرزو صاحب کے لطیفے اور فقرے اور برجستہ مکالمے اس قدر دلکش ہوتے کہ پہروں اُن کا نشہ باقی رہتا۔" [43]

۱۹۵۲ء جنوری فروری "نگار" لکھنؤ میں مضمون "حسرت کے شاعرانہ مرتبے کا تعین" شائع ہوا۔

۱۹۵۲ء مارچ "نگار" لکھنؤ میں مضمون "ہماری تحقیقی شاعری" شائع ہوا

۱۹۵۲ء جولائی "نگار" لکھنؤ میں مضمون "مومن عنفوانِ شباب سے سن کہولت تک" شائع ہوا

۱۹۵۲ء ستمبر "آجکل" دہلی میں مضمون "فن کے دائرے" شائع ہوا۔ (فکر و فن از خلیل الرحمٰن اعظمی)

۱۹۵۲ء "غالب اور عصر جدید" (فکر و فن از خلیل الرحمٰن اعظمی)

۱۹۵۲ء "بہادر شاہ ظفر" (فکر و فن از خلیل الرحمٰن)

۱۹۵۳ء مارچ "نگار" لکھنؤ میں مضمون "چند لمحے داغ کے ساتھ" شائع ہوا۔

۱۹۵۳ء مارچ "تلاش ملازمت کے لئے مدراس اور بمبئی کا سفر کیا۔

"... مارچ ۱۹۵۳ء میں جب دہلی کے اندر کل ہند انجمن ترقی پسند مصنفین کی آخری کانفرنس ہو رہی تھی اور ترقی پسند شعراء کرام اسٹالن کی موت پر فی البدیہہ نظمیں کہہ رہے تھے۔ میں ٹھیک اسی زمانے میں تلاشِ معاش کی خاطر مدراس اور بمبئی کی خاک چھان رہا تھا۔ مدراس اور بمبئی نے مجھے اپنے دامن میں پناہ نہیں دی اور کئی ماہ کی آوارہ گردی کے بعد میں وہاں سے خالی ہاتھ واپس آنے کے لئے مجبور ہو گیا مگر یہ کیوں کہوں کہ خالی ہاتھ آیا۔ میں اپنے ساتھ اس سفر میں اپنے ساتھ کیا لایا تھا اس کا صحیح اندازہ مجھے اُس وقت ہوا جب میں ضلع مظفر پور کے ایک گاؤں بڑی کوٹھی میں اپنے دوست ناشاد کے ساتھ بیکاری اور بیروزگاری کے دن گذار رہا تھا۔

اس جگہ پہنچ کر مجھے افسوس ہوا کہ میرے ذہن کے اندر پھر سے تخلیقی سوتے پھوٹ رہے ہیں اور پچھلے دنوں کے تلخ تجربات کے سبب جو گرد جم رہی تھی وہ دھل گئی ہے۔ مجھے ایسا لگتا جیسے میں کچھ لکھنا چاہتا ہوں، طرح طرح کی دیکھی اَن دیکھی تصویریں میرے ذہن کے پردے پر اُبھرنے لگیں۔ میں ابھی کچھ لکھ نہیں پایا تھا کہ میرے شفیق اُستاد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے "لاس گشتہ" کی تمہید باندھ کر مجھے ڈھونڈ نکالا۔ پھر اس مضمون کا خط موصول ہوا کہ تمہارے لئے علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اُردو میں عارضی طور پر ایک جگہ نکل آئی ہے۔ فوراً آ جاؤ۔ چنانچہ میں نے اسی علیگڑھ میں پھر سے قدم رکھا جہاں سے یہ سوچ کر رخصت ہوا تھا کہ شاید یہاں کی خاک اب مجھے قبول نہیں کرے گی۔" [44]

۱۹۵۳ء کے مارچ میں علی گڑھ کے احول پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

"علیگڑھ کی ادبی فضا میں ہنوز کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی۔ میرے دوستوں کی پیشانی پر ابھی تک وہی لیبل چسپاں تھے جنھیں میں چھوڑ کر گیا تھا۔ میں بہت دنوں تک اس ماحول میں اکھڑا اکھڑا سا رہا۔ ملازمت ملنے کی خوشی تھی لیکن اپنے اردگرد وہی گھٹن اور تنگی دیکھ کر دل کڑھتا تھا۔ کئی ماہ گذر جانے کے بعد ایک رات ایسا ہوا کہ سوتے میں میری آنکھ کھل گئی۔ مجھے میری ایک نظم نے جگا دیا جو ابھی لکھی نہیں گئی تھی۔ اس کا عنوان بھی معلوم نہیں تھا۔ میں نے قلم اور کاغذ سنبھالا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ مصرعے ڈھلے ڈھلائے چلے آ رہے ہیں۔ نظم مکمل ہوئی تو عنوان بھی خود بہ خود طے ہو گیا۔ یعنی "نیا جنم"۔ واقعہ یہ ہے کہ میرا نیا جنم تھا ورنہ میں تو یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ شاید اب ایک مصرعہ بھی نہ کہہ سکوں گا۔

اس نظم کے بعد پے بہ پے نظمیں ہونے لگیں۔ ان نظموں میں خود مجھے اپنی آواز نئی نئی اور اجنبی سی محسوس ہوئی۔ میرا لہجہ ایسا تھا جس سے میں خود پہلے آشنا نہیں تھا۔ یہ نظمیں داخلیت اور خارجیت کے ٹکراؤ سے پیدا ہوئی تھیں اس لئے ان میں ڈرامائی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ ان نظموں کا "میں" مختلف کرداروں کی صورت میں ڈھلتا ہوا معلوم ہوتا۔ اور ایک ہی نظم میں کئی آوازوں کی گونج سنائی دیتی۔" [45]

۱۹۵۳ء اگست "نگار" لکھنؤ "ظفر ایک نئے زاویہ سے" (فکر و فن از خلیل الرحمٰن)

۱۹۵۳ء داغ کا فن (فکر و فن از خلیل الرحمٰن اعظمی)

۱۹۵۳ء طرز مومن (فکر و فن از خلیل الرحمٰن اعظمی)

۱۹۵۴ء جوش ملیح آبادی

---

[43] "شخصیات نمبر" نقوش، لاہور ص ۱۳۳۶
شاعر بمبئی

[44] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۰

[45] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۲۱-۲۲

۱۹۵۵ء میں "کاغذی پیرہن" پہلا شعری مجموعہ آزاد کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا جس کے بارے میں خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں :

"میرا پہلا مجموعہ "کاغذی پیرہن" کتابت اور طباعت کی خامیوں اور بہت سی ہلکی پھلکی نظموں اور غزلوں کی شمولیت کے باوجود ادبی حلقوں میں جس پذیرائی کا مستحق سمجھا گیا اس پر مجھے مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی۔ عام تبصروں کے علاوہ کہ وہ بھی حوصلہ افزا تھے بعض معتبر اہل قلم مثلاً ڈاکٹر سید عبداللہ، ممتاز حسین اور خلیل احمد نقوی وغیرہ نے اس مجموعہ پر مستقل مضامین لکھے اور میری شعری کاوشوں کی دل کھول کر داد دی۔ اس مجموعہ کے ساتھ اسلوب احمد انصاری کا لکھا ہوا دیباچہ بھی شامل کیا گیا تھا۔ وہ خاص طور پر قابل توجہ تھا دیباچہ نگاری کی عام روش سے ہٹ کر موصوف نے میرے مزاج شعری کا تجزیہ کیا اور میری نظموں اور غزلوں کی منفرد خصوصیت واضح کرنے کے علاوہ میری کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کی طرف بھی اشارے کئے تھے۔ ان کوتاہیوں اور فروگذاشتوں کا تعلق اگر محض زبان و بیان کی چند ظاہری خصوصیات سے ہوتا تو شاید میں انھیں اسی وقت درست کر لیتا لیکن انکا تعلق تخلیقی عمل اور شعری طریق کار سے تھا جس سے واقف ہونے کے بعد بھی ان پر قابو پانے میں دیر لگتی ہے۔ میں نے اس تنقید کا جو بھی اثر قبول کیا ہے وہ میری بعد کی نظموں میں ملے گا۔ اگرچہ یہ کہنا مشکل ہے کہ میں اسمیں کہاں تک کامیاب ہو سکا ہوں۔"[46]

"چند لمحے ابن انشا کے ساتھ" میں ابن انشا سے ملاقاتوں کا سلسلہ اس طرح بیان کرتے ہیں :—

"۱۹۵۵ء میں چاند نگر کی اشاعت اس سال کا ایک اہم ادبی واقعہ تھی۔ ناصر کاظمی کی "برگ نے" اور راقم الحروف کا "کاغذی پیرہن" بھی اسی سال شائع ہوئے اور اس دور کے کئی نقادوں نے ان تینوں مجموعوں پر کچھ مشترک قدروں کی نشاندہی پر بطور خاص زور دیا۔ میں تو خیر کس شمار قطار میں تھا اور میرا مجموعہ دراصل میری ادبی تخلیقات کا ایک البم تھا لیکن نئے تنقیدی رویے کی بدولت مجھے بھی اچھی خاصی پذیرائی ملی، مگر سب سے دلچسپ بات یہ تھی کہ ابن انشا اور ناصر کاظمی دونوں سے میری ذہنی قربت، دوستی میں تبدیل ہو گئی۔ یہ دوستی محض خط و کتابت تک ہی محدود تھی۔ ایک کراچی میں تھا (ابن انشا) دوسرا لاہور میں (ناصر کاظمی) اور تیسرا علی گڑھ میں (راقم الحروف)۔ مگر لطف ملاقاتوں کے ذریعے خوب خوب پینگیں بڑھیں۔"[47]

۱۹۵۵-۵۶ء علیگڑھ میگزین میں "مجاز کی شاعری میں عورت کا تصور" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا۔

۱۹۵۶ء غزل نمبر نقوش لاہور میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی مندرجہ ذیل غزل شائع ہوئی ؎

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خوار و پریشاں ہیں
یاں اپنا ہی ہوش نہیں ہے کس کو چاہ کے ارماں ہیں[48]

۱۹۵۶ء "فکر و فن" تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ آزاد کتاب گھر دہلی سے شائع ہوا۔

۱۹۵۶ء جون نقد غالب مرتبہ مختار الدین آرزو میں "غالب اور عصر جدید" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا۔

۱۹۵۶ء جون اپنے مجموعہ مضامین "فکر و فن" کے معروضات میں تحریر کرتے ہیں :

"اپنے مضامین کا یہ مختصر مجموعہ پیش کرتے ہوئے مجھے یہ اعتراف کرنے میں کوئی جھجک نہیں کہ مضمون نگاری کو میری ادبی زندگی میں ثانوی حیثیت حاصل ہے۔ میں نے اپنی شخصیت کے سارے عناصر کی ترتیب و تہذیب ابتک اسی نقطۂ نظر سے کی ہے کہ شعر کے پردے پر اپنی روح کو بے نقاب کر سکوں۔ اس کے لئے مجھے کیا کیا زہر پینے پڑے ہیں اس کا تھوڑا بہت اندازہ میری شعری تخلیقات سے ہو سکتا ہے اگرچہ مجھے یہ بھی احساس ہے کہ میری اصل نظمیں ابھی تک لکھی نہیں گئی ہیں۔ ان ان لکھی نظموں کے لئے زندگی کے گوناگوں تجربات حاصل کرنے کی مجھ میں جو ہوس ہے اسکی تفصیل یہاں بے محل ہے لیکن انہیں نظموں کی خاطر مجھے "شاعر محض" کے دائرے سے نکل کر ادب کا طالب علم بھی بننا پڑا۔ ماضی و حال کے ادبی کارناموں کی چھان بین اور انکے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے کی مجھ میں عادت سی رہی ہے۔ ایسے لمحوں میں اپنے بعض نتائج کو پیش کرنے کی ضرورت بھی محسوس

---

[46] "نیا عہد نامہ" از خلیل الرحمٰن اعظمی صہ ۲۲-۲۳ شاعر، بمبئی

[47] "چند لمحے ابن انشا کے ساتھ" از خلیل الرحمٰن اعظمی "الفاظ" علی گڑھ (دو ماہی) مئی جون ۱۹۷۸ء صہ ۲۳-۲۴

[48] غزل نمبر نقوش صہ ۴۳۶

ہوتی ہے۔ میں نے یہ مضامین اس وقت لکھے ہیں جب میں نے محسوس کیا ہو کہ میرے پاس کہنے کے لئے کوئی بات ہے۔ خارجی دباؤ یا فرمائش پر لکھنے سے میں ہمیشہ جی چراتا ہوں اس کی وجہ سے بعض احباب اور بزرگوں کے طعنے بھی سہنے پڑتے ہیں لیکن یہ میری اُفتادِ طبع ہے جس پر بعض مصالح کی بنا پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہوں لیکن کامیابی نہیں ہوتی۔ ایسا نہیں ہے کہ مجھے نثر لکھنے میں دشواری پیش آتی ہو۔ جہاں تک لکھنے کا سوال ہے مجھے نثر لکھنے میں نسبتاً آسانی ہوتی ہے۔ شعر کہنے کے لئے جس کرب سے گزرنا پڑتا ہے، وہ میرا ہی دل جانتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کبھی کبھی خاموشی کے طویل دور سے پڑ گئے ہیں۔" [49]

آگے اس مجموعے کے مضامین کے بارے میں لکھتے ہیں :۔

"مجھے اس بات پر اصرار نہیں کہ ان مضامین کو تنقید کے زمرے میں شامل کیا جائے۔ میں نے مروجہ تنقیدی اصولوں اور نظریات کی پابندی کم کی ہے۔ اچھے ادب کا براہِ راست مطالعہ کر کے ادب کی خصوصیات کو سمجھنے اور انکا معیار اور سطح مقرر کرنے سے مجھے زیادہ دلچسپی رہی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ میں ان تنقیدی اصولوں سے ناواقف ہوں۔ لیکن ان نظریات اور اصولوں کے میکانکی استعمال سے جو نتائج نکلے ہیں اور شعر و ادب کی جس طرح مٹی پلید ہوئی ہے اس کی بنا پر انکو برتنے میں میں نے احتیاط و اعتدال سے کام لیا ہے۔" [50]

۱۹۵۶ء اکتوبر "نقوش" لاہور "شخصیات نمبر ۲" میں "علیگڑھ کی چند شخصیتیں" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا۔

۱۹۵۶ء "فکر و فن" اعظمی کے مجموعۂ مضامین میں "جذبی" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا۔

۱۹۵۶ء اعظمی کے مجموعہ مضامین میں "زاویۂ نگاہ" میں "دو نئے شعری مجموعے" کے عنوان سے "چاند نگر" اور "برگِ نے" پر تنقیدی مضمون شائع ہوا۔

۱۹۵۶ء دسمبر "اُردو ادب" کراچی میں "جمیل مظہری" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا۔

۱۹۵۶ء دسمبر "ہماری زبان" (ہفتہ وار) علیگڑھ میں "رفتار" کے مستقل عنوان سے کئی شماروں تک دلچسپ انداز سے لکھتے رہے۔

۱۹۵۷ء ۲۲ جنوری ابن انشا اپنے مکتوب میں خلیل الرحمٰن اعظمی کو لکھتے ہیں :

"..... اور وہ یہ کہ تم اپنے خلوص کی وجہ سے اُن گنجے فرشتوں پر جو تنقید کے میدان کے لندھور بن سعدان ہیں، ہر لحاظ سے فائق ہو۔ ہر زمانہ اپنے شاعر اور تنقید نگار خود پیدا کرتا ہے تم اس زمانے کے شاعر بھی ہو (اور میں تم پر فخر کر سکتا ہوں) اور تنقید نگار بھی (یہاں صرف رشک ہے)، تم بڑے آدمی بننے والے ہو۔ لکھتے رہو، پڑھتے رہو۔ سوچتے رہو اور لکھتے رہو۔ لیکن دیکھنا اپنا نام ریکھا بانا چاہو نہیں۔ تم میں ایک بڑی خوبی تمہاری سیر چشمی ہے۔ اپنے ہمعصروں کے متعلق (میں تو خیر اس سے زیادہ تمہارا دوست بھی ہوں) تمہارا محبت اور انسانیت کا رویہ مجھے پسند ہے۔ جانِ من تم بہت پیارے آدمی ہو۔" [51]

۱۹۵۷ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے "اردو میں ترقی پسند اُردو تحریک" پر پی ایچ ڈی کی ڈگری ملی جس کے بارے میں مجنوں گورکھپوری نے بحیثیت ممتحن تحریر کیا ہے کہ :

"خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے اس تحقیقی مقالے میں پہلی بار ترقی پسند ادب کی تحریک کو اس کے پورے سیاق و سباق میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ اُنہوں نے اس تحریک کے محرکات و عوامل اور اسکی سمت و رفتار کا مطالعہ بڑی دیدہ وری کے ساتھ کیا ہے اور اس کے ادبی اکتسابات کا بے لاگ اور منصفانہ جائزہ لیا ہے۔" [52]

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ممتحن کی حیثیت سے اس مقالے سے متعلق اپنے ان تاثرات کا اظہار کیا :

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس تحریک کے ادبی تقاضوں اور اُردو شعر و ادب پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا ہے۔ اُنہوں نے اس موضوع پر جتنا اہم مواد تاریخی تسلسل کے پیشِ نظر جس محنت اور دقتِ نظر سے جمع کیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس تحریک کی موافقت یا مخالفت میں جس نوعیت کی تحریریں بالعموم ملتی ہیں۔ اُن میں سے بیشتر میں جذبات کا مظاہرہ یا تبلیغ کا انداز

---

[49] "فکر و فن" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۵

[50] "فکر و فن" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۶ شاعر، بمبئی

[51] الفاظ علیگڑھ مئی جون ۱۹۷۸ء ص ۳۵

[52] گرد پوش۔ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک۔

زیادہ فکرمندی کم ملتی ہے۔ اس مقالے میں جن اشخاص کا ذکر ہے، ان کی تصانیف اور افکار پر بالعموم سنجیدگی سے اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر کثرت سے چھوٹے بڑے مقالے بھی ملیں گے ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے لیکن زیرِ نظر مقالہ اس اعتبار سے ان پر فوقیت رکھتا ہے کہ اس میں تلاش و تحقیق سے قابلِ قدر مواد فراہم کیا گیا ہے۔ تحریک کا تاریخی اور ارتقائی تسلسل ملحوظ رکھا گیا ہے۔ ان پر سنجیدگی سے غور کر کے نتائج پر پہنچنے کی کوشش کی گئی ہے۔ تصنیف کا ادبی اسلوب خاطر خواہ ہے اور مقالہ حسن ادبی و علمی پیرائے میں پیش کیا گیا ہے۔ وہ قابلِ اطمینان ہے۔" ۵۳

اس مقالے کے بارے میں ضیاء الدین اصلاحی کی یہ بات بالکل درست ہے کہ:

"........ ان کی زیادہ اہم کتاب "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" ہے جو ترقی پسند ادب کی تاریخ پر پہلی باقاعدہ کتاب ہے ......" ۵۴

۱۹۵۷ء نومبر — پہلی بھیت میں راشدہ بیگم سے شادی ہوئی۔

۱۹۵۷ء — علیگڑھ میگزین میں ایک مقالہ "آزاد نظم اور اس کے امکانات" شائع ہوا۔

۱۹۵۷ء — "زاویۂ نگاہ" میں "اردو شعر و ادب میں علیگڑھ کا حصّہ" شائع ہوا۔

۱۹۵۸ء — "نوائے ظفر" کے نام سے انتخاب کلام بہادر شاہ ظفر انجمن ترقی اردو علیگڑھ سے شائع ہوا۔

۱۹۵۹ء — پرویز شاہدی سے پہلی بار ملاقات ہوئی۔ جب وہ علیگڑھ کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے تشریف لائے تھے۔

۱۹۵۹ء ۲ فروری: کو بڑے بیٹے کامران کی ولادت ہوئی۔

۱۹۵۹ء — علی گڑھ میگزین شمارہ (۱) میں "آتش کی شاعری میں تصوف" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا۔

۱۹۵۹ء دسمبر — شعبۂ اردو مسلم یونیورسٹی سے ان کی تصنیف "مقدمہ کلام آتش" شائع ہوئی۔

۱۹۶۰ء — "شہرت کی خاطر از نظیر صدیقی" پر تبصرہ شائع ہوا۔ جو بعد میں "مضامینِ نو" میں شامل ہوا۔

۱۹۶۱ء فروری — "جشنِ شاعر" بمبئی میں شرکت کی۔ جس کے بارے میں رقم طراز ہیں:

"...... غالباً ڈیڑھ سال بعد بمبئی میں "جشنِ شاعر" منایا گیا۔ اس جشن میں شرکت کے لئے میں بھی گیا تھا۔ کلکتے سے پرویز آئے تھے۔ مجالسی پیلس میں میرے علاوہ جو اور شعرا ٹھہرائے گئے تھے۔ ان میں مخدوم محی الدین، شاہد صدیقی مرحوم، کنول پرشاد کنول، اور سلام مچھلی شہری تھے۔ میں اور پرویز جلسے سے ایک دن قبل ہی پہنچ گئے تھے۔ اس موقع پر مرحوم سے بہت کم ملاقاتیں رہیں۔ اور بہت سے ادبی مسائل پر تبادلۂ خیال کا موقع ملا۔ وہ اس زمانہ میں کمیونسٹ پارٹی کی اندرونی سیاست سے کچھ بیزار تھے۔ اس لئے عملی سیاست سے تقریباً کنارہ کشی اختیار کر لی تھی اور کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کے استاد کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔ مگر ادب کے ترقی پسند نظریے کے سلسلے میں ان کے خیالات میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی تھی۔ "جشنِ شاعر" کے مشاعرہ کے بعد ہم سب نے رت جگے کا پروگرام بنایا۔ مخدوم، شاہد صدیقی اور کنول پرشاد کے علاوہ عزیز قیسی اور بمبئی کے بعض اور نوجوان شعرا بھی اس صحبت میں شریک تھے۔ خوب ہنسی مذاق، لطیفہ گوئی، ادبی بحثیں اور شعر خوانی کے دور چلتے رہے۔ پرویز نے پے بہ پے کئی نظمیں سنائیں۔ اس دوران میں میں نے ان کی ایک پسندیدہ غزل کی فرمائش کر دی۔ اس غزل کا ذکر آتے ہی پرویز پر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو گئی۔ اور جس موڈ میں انہوں نے ترنم کے ساتھ وہ غزل سنائی، وہ سماں اب تک آنکھوں میں پھر رہا ہے۔ وہ غزل یہ ہے:

مرتعِ یاس کبھی تیری نظر نے نہ دیا
شرط جینے کی لگا دی مجھے مرنے نہ دیا

اس رفاقت پہ فدا میری پریشاں حالی
اپنی زلفوں کو کبھی تو نے سنورنے نہ دیا

تیری غم خوار نگاہوں کے تصدق کہ مجھے
علمِ ہستی کی بلندی سے اترنے نہ دیا

---

۵۳ "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" از خلیل الرحمن اعظمی ص۸

۵۴ معارف اعظم گڑھ، جولائی ۱۹۷۸ء ص۷۲

شاعر بمبئی

میں نے دیکھا ہے ترے حُسن خود آگاہ کا رعب
اجنبی چہروں کو چہرے پہ بکھرنے نہ دیا
حُسنِ ہموار ترا ہمسفر شوق رہا
تھک کر تنہا کسی منزل سے گذرنے نہ دیا
کتنی موش زدنی ہے تیری نگہ بادہ فروش
خالی رہنے نہ دیا جام کو بھرنے نہ دیا!

میں نے اس غزل پر رسے دیتے ہوئے کہا کہ پرویز صاحب میرے نزدیک آپکی شاعری کا اصل مزاج اس غزل میں ظاہر ہوا ہے۔ آپ اگر "ہانگ مینی کو سلام" جیسی خالص سیاسی اور وقتی نظموں کے بجائے اس انداز کی بیس پچیس غزلیں اور لکھ دیں تو اُردو غزل کے سرمایہ میں آپکے ہاتھوں ایک قیمتی سرمایہ کا اضافہ ہو سکتا ہے۔ فرطِ محبت سے لپٹ گئے اور کہا اپنی شاعری کے بارے میں اس طرح کی رائے پہلی بار سن رہا ہوں۔ کہنے لگے کلکتہ کی سیاسی زندگی نے میری حیثیت کچھ ایسی بنادی ہے کہ سب مجھے تعریف و تحسین سُننے کو ملتی ہے لیکن دوستانہ تنقید سے میں اب تک محروم رہا ہوں، میں تمہاری رائے کی بہت قدر کرتا ہوں"۔ [۵۵]

۱۹۶۱ء اپریل جامعہ دہلی میں "ادب اور حقیقت پسندی" شائع ہوا۔

۱۹۶۱ء سوغات بنگلور "جدید نظم نمبر" میں تبصرہ (موسم گل، فولاد کا کارخانہ، اگلے برس کی بات") شائع ہوا۔

۱۹۶۱ء "تذکرے اور تبصرے" شائع ہوا جو بعد میں "مضامین نو" میں شامل کر لیا گیا۔

۱۹۶۱ء "زنجیر رم آہو" پر تبصرہ شائع ہوا۔ جو بعد میں مضامین نو میں شامل کر لیا گیا۔

۱۹۶۲ء پرویز شاہدی سے تیسری ملاقات :

"پرویز شاہدی سے میری تیسری اور آخری ملاقات اس سے ایک سال بعد دہلی میں ہوئی جب ہم دونوں آل انڈیا ریڈیو کے ایک مشاعرے میں شریک ہونے کیلئے یہاں پہونچے تھے۔ مشاعرے کے دوسرے روز شمس الرحمٰن فاروقی نے اپنے یہاں ایک بے تکلف نشست کی تھی جس میں میرے اور پرویز کے علاوہ وحید اختر، شاذ تمکنت، حسن نعیم، زبیر رضوی اور بعض دوسرے احباب تھے۔ اس محفل میں بھی پرویز کی بہت سی نظمیں اور غزلیں سُنی گئیں۔ میں نے

شاعر بھی

پھر ایکبار اپنی اسی پسندیدہ غزل کی فرمائش کی تو مسکرائے اور بڑے موڈ میں آکر غزل سُنائی۔ اس پُرلطف صحبت کی یاد اب بھی آتی ہے۔ پرویز کے انتقال کی خبر سُنی تو دیر تک ان ملاقاتوں کے تاثرات دل کے پردے پر اُبھرتے اور مٹتے رہے۔ اور یہ محسوس رہا کہ کتنا اچھا شاعر اور کتنا اچھا انسان ہم سے جدا ہو گیا"۔
(مضامین نو" از خلیل الرحمٰن اعظمی صد۲۲۶)

۱۹۶۲ء اختر الایمان پر مضمون شائع ہوا۔ بعد میں "زاویۂ نگاہ" میں شامل کر لیا گیا۔

۱۹۶۲ء "خیال پارے" (تبصرہ) شائع ہوا۔ بعد میں مضامین نو میں شامل کر لیا گیا۔

۱۹۶۲ء مئی سلمان، منجھلے بیٹے کی پیدائش ہوئی۔

۱۹۶۳ء ۲ مئی عدنان، چھوٹے بیٹے کی پیدائش ہوئی۔

۱۹۶۴ء "شاد عارفی" کے عنوان سے مضمون شائع ہوا۔ بعد میں "مضامین نو" میں شامل کر لیا گیا۔

۱۹۶۴ء اکتوبر "تحریک" دہلی میں "جگر مراد آبادی" پر مضمون شائع ہوا۔

۱۹۶۵ء "اختر اورینوی نمبر" ساغر نو پٹنہ میں "اردو تنقید میں اعتدال اور توازن کی ایک مثال" کے عنوان سے ایک مضمون لکھا۔

۱۹۶۵ء "لہر لہر ندیا گہری" پر تبصرہ لکھا جو مضامین نو میں شائع ہوا۔

۱۹۶۵ء دسمبر "نیا عہد نامہ" دوسرا شعری مجموعہ انڈین بک ہاؤس، محمد علی روڈ، علیگڑھ سے شائع ہوا۔

۱۹۶۶ء ۲۵ جولائی رشید احمد صدیقی نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید نگاری سے متعلق لکھا :

"خلیل الرحمٰن اعظمی تنقید نگاروں کے قبیلے میں سب سے پہلے اپنے اُن مضامین کے ذریعے متعارف ہوئے جو انہوں نے آتش پر نگارین لکھے تھے۔ اور پہلی ہی بار اس طرح متعارف ہوئے کہ اُن کا نام اُردو کے سربرآوردہ تنقید نگاروں میں لیا جانے لگا"۔ [۵۶]

---

[۵۵] "مضامین نو" از خلیل الرحمٰن اعظمی صد ۲۲۶ - ۲۲۵
[۵۶] "پیش لفظ" رشید احمد صدیقی۔ زاویۂ نگاہ صد ۶

متوازن، پُرمغز اور فکر انگیز تنقید نگاری حالی کی وہ لائی ہوئی روایت ہے جس کے بروقت و برمحل ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اپنے عہد میں اس کی جتنی شدید مخالفت کی گئی بعد میں اس کو وہی منزلت نصیب ہوئی۔ یہ روایت حالی اور عبدالحق سے ہوتی ہوئی اعظمی تک پہونچی۔ اعظمی تھوڑے تعمیری تخریب کے بعد اسی قبیلے کے تنقید نگار ہیں۔ اُن کی اُٹھان کہتی ہے کہ نظر بد سے محفوظ رہے تو قبیلے کی قد و قامت تک پہنچ جائیں گے۔ احتیاطاً یہاں اور کہہ دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح کی نظر بد کا مجھے اندیشہ ہے۔ وہ دوسروں کی نہیں فن کار کی اپنی ہوتی ہے۔ وہ جس کو اپنی نظر بد لگ جائے اس کا خدا ہی حافظ۔"

(پیش لفظ از رشید احمد صدیقی، زاویۂ نگاہ ص ۶)

۱۹۶۶ء دوسرا تنقیدی مجموعہ "زاویۂ نگاہ" آورش پبلیشرز، بیراگی، گیا سے شائع ہوا۔ مندرجہ ذیل مضامین زاویۂ نگاہ میں ایسے شائع ہوئے ہیں جن پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے:

اردو تنقید کے مسائل
سرسید کے ادبی تصوّرات
اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ
فراق گورکھپوری
ابوالکلام آزاد کے مکاتیب
سوامی درشن (تبصرہ)

۱۹۶۸ء کی لکھی ہوئی مندرجہ ذیل تحریریں اعظمی کے مجموعہ "مضامین نو" میں شامل کرلی گئی ہیں

پرویز شاہدی
ادب اور تنقید (تبصرہ)
پیاس کا صحرا (تبصرہ)
پتھروں کا مغنی (تبصرہ)
قصہ مہر افروز و دلبر (تبصرہ)
فاروقی کے تبصرے (تبصرہ)
بیاض (تبصرہ)

۱۹۶۹ء "بیاض" پر تبصرہ لکھا، بعد میں "مضامین نو" میں شامل کرلیا گیا۔
۱۹۶۹ء "یک عمر از شوخی عنوان اُٹھایئے" غالب نمبر علی گڑھ میگزین شامل ہیں۔

میں شائع ہوا۔

۱۹۷۲ء مارچ پی ایچ ڈی کا مقالہ "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" انجمن ترقی اردو (ہند) علی گڑھ سے شائع ہوا۔

۱۹۷۲ء نومبر ۱۹۳۶ء کے بعد نظموں کا مجموعہ "نئی نظم کا سفر" مکتبہ جامعہ لیمیٹڈ، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ اس کتاب میں انتخاب کے طریقے سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

ہمارے پیش نظر صرف یہ بات رہی ہے کہ ہم ۱۹۳۶ء کے بعد کے شعرا کا مطالعہ اس زاویے سے کریں کہ اقبال اور جوش کے عہد تک کی نظم جس منزل پر پہنچ گئی تھی اس کے بعد انحراف و انقطاع کی جو صورتیں کسی نہ کسی نہج سے ابھری ہیں ہماری گرفت میں آسکیں یعنی اگر ایک شاعر نے اس دور میں بھی کچھ ایسی نظمیں لکھی ہیں جو مسائل اور موضوعات کے اعتبار سے نئی اور مختلف ہیں لیکن اسلوب، رویہ، مزاج، لہجہ اور آہنگ کے اعتبار سے گذشتہ دور کے شعرا کی یاد دلاتی ہیں تو ہم نے ایسی نظموں سے قطع نظر کیا ہے۔ اگر اس شاعر نے ایک یا ایک سے زیادہ ایسی نظمیں بھی لکھی ہیں جن میں گذشتہ شعرا سے الگ ایک آواز سنائی دیتی ہے اور اس کی یہ نظم کسی نہ کسی اعتبار سے نظم نگاری کی روایت میں تنوع یا اضافہ کا سبب بنتی ہے، تو وہ ہمارے لئے قابل ترجیح ہے۔ جن شعرا کے یہاں سو فیصدی گذشتہ شعرا کے اسالیب یا طریق کا اعادہ ہے انہیں ہم نے اس انتخاب میں شامل نہیں کیا ہے یعنی اس دور کے جو شعرا عصری موضوعات پر لکھنے کے باوجود انیس، حالی، چکبست، ظفر علی خاں، اقبال، جوش، اختر شیرانی وغیرہ کے طرز میں لکھتے رہے وہ ہمارے دائرے سے خارج ہیں۔"

("نئی نظم کا سفر" مرتبہ خلیل الرحمٰن اعظمی ص ۱۳)

۱۹۷۳ء ۸ اگست کو خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں ایک بچی "ہما فاطمہ" پیدا ہوئی۔

۱۹۷۳ء "کچھ خطوط غالب کے بارے میں" اعظمی کا مضمون "عرفان غالب" مرتبہ آل احمد سرور میں شائع ہوا۔

۱۹۷۳ء "اشعار" پر تبصرہ کیا جو بعد میں "مضامین نو" میں شائع ہوا۔

فروری ۱۹۷۶ء بلڈ کینسر میں مبتلا ہوئے اور جواہر لعل نہرو میڈیکل کالج میں داخل کیے گئے۔

۹ مارچ ۱۹۷۶ء ہسپتال سے واپسی ۔

۲۲ مارچ ۱۹۷۶ء کو اپنی کتاب "مضامینِ نو" میں "کچھ نجی باتیں" تحریر کرتے ہوئے اس طرح کی باتیں ان کے قلم سے ٹپک گئی ہیں :

"اس کتاب کی اشاعت کی ابھی کوئی جلدی نہ تھی مگر گذشتہ ایک سال سے موت وحیات کی کشمکش سے گزر رہا ہوں' اس نے زندگی کی بے ثباتی اور ناپائیداری کے نقش کو اور گہرا کر دیا ہے۔ یوں تو میں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے مایوس نہیں ہوں مگر اس کے جلوے اور اسکی پکار پر لبیک کہنے کو اپنے لئے باعث برکت سمجھتا ہوں' اس "جہانِ گندم و جو" میں ہمیشہ کیلئے رہنے' یہاں بستی بسانے اور چھاؤنی چھانے کی تمنا نہ پہلے تھی اور نہ اب ہے۔ "آدھی سے زیادہ شبِ غم کاٹ چکا ہوں" بقیہ عمر اس منزل سے گذر رہی ہے۔ جہاں اپنے آپ کو فریب دینے کی خواہش بھی نہیں رہی ؎

پانی وضو کو لاؤ رُخِ شمع زرد ہے
مینا اٹھاؤ وقت اب آیا نماز کا"

("مضامینِ نو" از خلیل الرحمٰن اعظمی ص۱۲)

... میں اعظمی کے مضامین کا تیسرا مجموعہ "مضامینِ نو" ... ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ سے شائع ہوا۔ جسمیں مندرجہ ذیل مضامین پر کوئی تاریخ درج نہیں ہے۔

نثر کا اسلوب
... اور صاحبِ کلام
اسٹر کا ذہنی ارتقار
جدید غزل
نئے شعری رجحانات
شبلی کا تنقیدی مسلک
مثنوی سحرالبیان
نئی شاعری کے نکتہ چیں
ادب میں فارمولا بازی
ادب' تاریخ اور اس کی تعلیم
شاعر' جلی

دسمبر ۱۹۷۷ء "آواز' دہلی کے اقبال نمبر میں ایک مضمون "اقبال کا نظریہ شعر" شائع ہوا۔

اپریل ۱۹۷۸ء اقبال سیمینار' علی گڑھ میں صدارت کی' صدارتی تقریر کی' اور مشاعرے میں شرکت کی ۔

مئی ۱۹۷۸ء ۲۴ مئی کو انھوں نے طلبا کا زبانی امتحان اور ۲۶ مئی کو ایک اکسٹرا کلاس لیا۔

آخری غزل ؎

ہم بانسری پر موت کی گاتے رہے نغمہ ترا
اے زندگی' اے زندگی رتبہ ہے اعلیٰ ترا
اپنا مقدر تھا یہی' اے منبعِ آسودگی
بس تشنگی' بس تشنگی گو پاس تھا دریا ترا
اس گام سے اس گام تک زنجیرِ غم کے فاصلے
منزل تو کیا ہم کو ملے چلتا ہے رستہ ترا
تو کون تھا؟ کیا نام تھا؟ کچھ ہمیں کیا کام تھا
ہے پردہ دل پر ابھی دھندلا سا ایک چہرہ ترا
سب دھیرے دھیرے بجھ گئی سینے میں جتنی آگ تھی
اب اے چراغِ آگہی! زندہ رہے شعلہ ترا
سورج کہ گوتا مہرباں ہو سر پہ نیلا سائباں
اے آسماں' اے آسماں دائم رہے سایہ ترا

("الفاظ" علیگڑھ جولائی' اگست ۱۹۷۸ء)

آخری نظم : نیند پیاری نیند

ابوالکلام قاسمی صاحب تحریر کرتے ہیں : ۔

"یہ نظم خلیل صاحب نے مارچ ۱۹۷۷ء میں کشمیر جانے سے قبل مجھے الفاظ کے لئے عنایت کی تھی ۔ اور میں نے اس وقت کے زیرِ ترتیب شمارے میں اسے شامل بھی کر لیا تھا کہ مجھے کشمیر سے خلیل صاحب کا ایک خط موصول ہوا ۔ انہوں نے لکھا تھا ۔

'میں نے جو نظم آپ کو دی تھی اسے شائع نہ کریں ۔ میں وہاں آکر اگلے شمارے کیلئے کوئی اور چیز دوں گا ۔ جو نظم آپ کو پہلے دی تھی' اس کی اشاعت ابھی ٹھیک نہیں ۔ میں چاہتا ہوں کہ میرے کلام کا کچھ حصہ غیر مطبوعہ پڑا رہے اور اسے میرے بعد ہی شائع کیا جائے ۔ وہ نظم بھی اسی قبیل کی ہے

اور میں نے اس نظم کی اشاعت روک لی تھی۔ اب جبکہ خلیل صاحب ہمارے لئے متاعِ گمشدہ بن چکے ہیں۔ یہ نظم اُن کی وصیت کی تعمیل کے طور پر آپ کی نذر کر رہا ہوں۔" (ا۔ ق)

جب کھلی آنکھوں سے اپنے آس پاس
دیکھتا ہوں اپنی دُنیا ——— کس قدر محدود و تنگ

اور پھر
اک جاگتے لمحے میں پھر
بند کر لیتا ہوں اپنی آنکھ میں
دیکھتا ہوں سامنے پھیلا ہوا
اک جہانِ بے کنار
دیکھتا ہوں اپنی ہی آنکھ سے وہ سارے مناظر
شہر اور آبادیاں
سینکڑوں صدیوں سے جو محفوظ ہیں
کس کو دیکھوں کس کو چھوڑوں
ایسی اک دُنیا جس کا اُور چھور
نہ تو سمتیں نہ حدیں
اور اُفق ناپید، غائب آسماں

سوچتا ہوں
آہ میرا یہ سفر کتنا طویل
فاصلے ... اتنے کہ ان کی اب کوئی منزل نہیں
ایسی اک منزل تو ساری عمر میں
طے کروں گا اور تھک جاؤں گا میں
اور میری نیند روٹھی ہی رہے گی ——— کیسے میں آرام لوں

کھول دیتا ہوں یہ آنکھیں
اور اب خوش ہوں چلو فرصت ملی
اس مشقت کی بے گار سے

کیا بتاؤں میرے اندر سے ابھی دم
دو نئی آنکھیں نکل کر
شاعر بھی

میری آنکھوں کی جگہ لیتی ہیں
اور پھر پہنچ جاتا ہوں اس کی دُنیا میں
جس سے بھاگ کر آیا تھا میں

پھر وہی سارے مناظر، شہر اور آبادیاں
جیسے اک آسیب بن کر میرے سر پہ چھا گئیں
آہ مجھ کو کیا ہو گیا

کاش کوئی
وہ کھلی آنکھیں مجھے واپس دلا دے
میں ہمیشہ کے لئے بن جاؤں گا اس شخص کا

آج تک وہ شخص میری آنکھوں سے اوجھل ہے، میں
موت تک کیا سو سکوں گا
موت ہی وہ اپنی پیاری نیند ہے
جو ہمیشہ کے لئے اپنے مسافر کو سُلا دیتی ہے
اک تحفہ عطا کرتی ہے
جس کو ہم کبھی آرام کہتے ہیں، کبھی امن و سکوں

میں اُسی کی کالی زلفوں کا —
میں اُسی اپنی دلہن کا منتظر ہوں ...
("الفاظ" علی گڑھ، جولائی، اگست ۱۹۷۸ء)

---

۲۹ مئی ۱۹۷۸ء بیماری کا شدید حملہ
یکم جون ۱۹۷۸ء پونے دو بجے اُردو باغ علیگڑھ میں انتقال کیا۔

آخری سفر — محمود ہاشمی لکھتے ہیں :-

"گذرتی شام تھی جب ہم خلیل کے مکان پر پہونچے۔ تاریکی بڑھ رہی تھی۔ سورج کے ساتھ دل بھی ڈوب رہا تھا — صحن کے کنارے کی طرف برآمدے میں دو تین لالٹینیں روشن تھیں۔ دالان میں کچھ کرسیوں پر بہت سے لوگ بیٹھے تھے۔ یہ لالٹینیں ... خاموش لوگ اس عہد کی "آبِ حیات" کا کم

دور ختم ہو رہا تھا ـــ ان خاموش لوگوں میں علیگڑھ کے علمی وقار کی آبرو قائم رکھنے والے پروفیسر اسلوب احمد انصاری جیسے لوگ بھی تھے۔ اور اوپر سے تلے تک شیروانی کے بٹن لگائے ہوئے اُجڑے اُجڑے بالوں اور موٹی کمانیوں دار چشموں سے آراستہ ادھیڑ عمر زندگی کے احساس، رنج و راحت، موت کے چہرے سے بے نیاز ہستی کی علامت، پتھرائی ہوئی آنکھوں اور غم و الم سے تمتمائے ہوئے نوجوان ابوالکلام قاسمی، جاوید حبیب، آشفتہ چنگیزی، عتیق الرحمٰن قاسمی، نقوی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے ہم عصر، رفیق ہمدم و ہم مشرب وحید اختر، شہریار ـــ شعبۂ اُردو کے اساتذہ ـــ اور بہت سے لوگ تھے۔

خلیل الرحمٰن کا جنازہ نہ معلوم کن کچی پکی سڑکوں سے اندھیرے راستوں کے رتیلے بنجر علاقہ سے گذرا۔ ہمیں کچھ پتہ نہ چلا ـــ یہ علاقہ علی گڑھ کا وہ علاقہ تھا جو خلیل اعظمی نے زندگی میں ہمیں کبھی نہیں دکھایا تھا ـــ علیگڑھ کی سڑکوں پر خلیل ہمیشہ ہمارے ساتھ ساتھ چلتے تھے ـــ آج وہ سب سے آگے تھے اور دوسروں کے کاندھے پر تھے ـــ میں اور شمس الرحمٰن فاروقی ـــ ایک ساتھ خاموش چلتے رہے۔ ـــ لرزتے ہوئے قدموں اور بکھرتے جسموں کو سنبھالتے رہے ـــ لالٹین کی روشنی میں قبر تیار ہوئی، خلیل الرحمٰن اور ہمارے بیچ اب منوں مٹی کا فاصلہ تھا ـــ اس فاصلے کے احساس نے فاروقی کو اس طرح جھنجھوڑا جیسے سیلاب سے کوئی بند ٹوٹ جائے ـــ وہ بے اختیار ہو اُٹھے ـــ یہ پہلا رونا تھا ـــ پہلی آہ و بکا تھی ـــ پہلے آنسو تھے۔ جو اپنے کسی بے حد عزیز ہم عصر دوست کے لئے بہائے گئے تھے۔
مٹی کی امانت ہم نے مٹی کو سونپی ـــ"

("مانند صبح مہر" محمود ہاشمی۔ دو ماہی "الفاظ" علی گڑھ، جولائی، اگست ۱۹۷۸ء)

یکم جون ۱۰ بجے شب یونیورسٹی قبرستان منٹو ہی۔ علیگڑھ میں دفن ہوئے۔ جس کی پیشن گوئی تقریباً ۲۲ سال پہلے انہوں نے اس طرح کی تھی :-

(اس تحریر کا لکھنے والا آج سے گیارہ سال قبل ۱۹۴۵ء میں شاعر بھی)

ایک کم سواد طالب علم کی حیثیت سے علیگڑھ داخل ہوا۔ اور یہاں کی ہوا کچھ اس طرح لگی کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد بھی اس بستی کا ہو رہا ـــ اس کی نس نس میں علیگڑھ کی مٹی کچھ اس طرح سے رچ گئی ہے کہ اب شاید اس کی خاک یہیں ٹھکانے لگے۔ وما توفیقی الا باللہ"

("علیگڑھ کی چند شخصیتیں" از خلیل الرحمٰن اعظمی
"نقوش" لاہور شخصیات نمبر ۲ اکتوبر ۱۹۵۶ء صفحہ ۱۳۱۶)

OO

بقیہ : صفحہ ۲۵ خلیل الرحمٰن میرا بھائی

ربّنا وانّا بفراقك لمحزونون ہ (آنکھیں اشکبار ہیں، دل غمزدہ ہے، زبان مرضیٔ الٰہی کے خلاف کچھ کہنے سے قاصر ور ہم تیری جدائی میں اندوہگیں ہیں۔) جانے والے اللہ بال بال مغفرت فرمائے اور کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے!!

OO

بقیہ : صفحہ ۶۴ دوستانہ احمد خلیل

مراسم عزا کو یہاں تک مستعد دیکھا، قریب تھا کہ پنجۂ حسد سے گریبانِ طاقت کو چاک کرے اور ناخنِ غیرت سے سینۂ تحمل کو مجروح، آخر بجز لب گشتہ ہوا اور حرفِ شکوہ اس پیرایہ میں زبان حسرت بیان سے آشنا کہ اگر مجھکو یقین ہو کہ میری موت ایسی حسرت افزا ہوگی تو اس عزاداری کی ہوس میں اپنا گلا گھونٹ کر مرجاؤں۔ سچ ہے۔ ؎

مرگے کہ زندگاں بہ دعا آرزو کنند
یہی مرگ ہے۔"

جس وقت خلیل صاحب کا جنازہ اُردو باغ سے چلا معلوم نہیں کیوں صابر کا یہ بیان بار بار یاد آیا۔ خلیل صاحب خوش قسمت تھے کہ انہوں نے موت بھی اچھی پائی۔ تاریخ اس طرح ہوئی ؎

اول شہر ششم فوت شد آہ
۶+۳۰۴+۴۸۶+۶۴۰+۵۰۵+۳۷
۱۹ ۶ ۷۸

OO

پرواز اصلاحی

احمد سیلر ہائی اسکول - ڈونگری روڈ - بمبئی ۹

خلیل الرحمٰن میرا بھائی

زندگی میں غیر متوقع حادثے ہوتے ہی رہتے ہیں لیکن وقت کا مرہم ان زخموں کو مندمل کرتا جاتا ہے۔ لیکن بعض حادثے اپنی کیفیت کے اعتبار سے دائمی درد و الم چھوڑ جاتے ہیں جو بھلائے نہیں بھولتے۔ جن کی یاد ہر لحہ تازہ ہوتی رہتی ہے۔ میرے حقیقی چھوٹے بھائی خلیل الرحمٰن کا سانحۂ رحلت بھی دل کا وہ زخم ہے جسے بھرنے میں وقت کا مرہم شاید ناکام رہے۔ ہمارے خاندان کا ہر فرد اس صدمۂ جانکاہ سے عجیب کرب و اضطراب کے عالم میں مبتلا ہو گیا۔ میرا چھوٹا بھائی خلیل الرحمٰن خاندان کا لعل، شبِ چراغ اور ہم لوگوں کے لئے باعث فخر و ناز تھا۔ اس نے اپنی غیر معمولی ذہانت، اعلیٰ صلاحیت، فطری نیکی اور اردو ادب میں اپنی گراں بہا خدمات سے ہم لوگوں کا سر اونچا رکھا۔ وہ میرے تمام بھائیوں میں سب سے زیادہ ذہین و فطین اور بے پناہ صلاحیتوں کا مالک تھا، وہ بلند پایہ شاعر، ادیب اور نقاد ہی نہ تھا بلکہ خوش اوصاف اور خوش اطوار بھی تھا۔ اس کی جدائی کا غم ناقابلِ فراموش ہے، یادوں کی پُروائی دل کے اس زخم کو ہرا کرتی رہے گی۔

مولانا شبلی نعمانی نے اپنے برادرِ خورد مولوی محمد اسحاق مرحوم کا بڑا پُر درد مرثیہ لکھا ہے۔ میرے والد مولانا محمد شفیعؒ جن کا مولانا شبلی سے خاص تعلق تھا۔ مولانا کے اس مرثیے کے بعض بند مولانا شبلی کے لہجے میں ہم لوگوں کو سنایا کرتے تھے۔ اور اس حادثے سے مولانا پر جو کیفیت گذری تھی اس کا تذکرہ کرتے تھے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ آج نصف صدی کے بعد خود مجھے اپنے چھوٹے بھائی کی وفات پر بے اختیار اس مرثیے کے بعض بند یاد آ رہے ہیں ؎

وہ برادر کہ مرا یوسف کنعانی تھا — وہ کہ مجموعۂ ہر خوبیٔ انسانی تھا
وہ کہ گھر بھر کیلئے رحمتِ یزدانی تھا — قوتِ دست دلِ شبلی نعمانی تھا
شاعر بھی

جوش اک تھا جو مرے سر پُر شور میں تھا
بل اسی کا یہ مرے خامۂ پُر زور میں تھا

آج افسوس کہ وہ نیر تاباں بھی گیا — میری جمعیت خاطر کا وہ ساماں بھی گیا
اب وہ شیرازۂ اوراق پریشاں بھی گیا — عتبۂ والد مرحوم کا درباں بھی گیا

گلۂ خوبیٔ تقدیر رہا جاتا ہے
نوجواں جاتے ہیں اور پیر رہا جاتا ہے

والد مرحوم جہاں ہم لوگوں کو بہت سی نصیحتیں کرتے تھے وہاں یہ بھی کہا کرتے تھے کہ دنیا میں بڑے لوگ وہی ہوتے ہیں جو اپنے سہارے آپ کھڑے ہوتے ہیں۔ جو دوسروں کا سہارا تکتے ہیں وہ خود کبھی نہیں آگے بڑھ سکتے اور اگر بڑھتے ہیں تو جتنا حاصل کرتے ہیں اس سے زیادہ کھو دیتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن کی پوری زندگی اسی نصیحت کی عملی تفسیر تھی۔ وہ ان لوگوں میں تھے جو اپنے بل بوتے پر کھڑے ہوئے اور اپنی ذاتی لیاقت، محنت، خلوص و لگن کے ساتھ کام کر کے عزت و ناموری پائی۔

خدا نے انھیں ایک ایسے خاندان میں پیدا کیا جس کی کچھ دیرینہ روایات تھیں۔ انسان کتنا ہی ذہین و فطین ہو۔ اسے ماحول نہ ملے تو اس کی صلاحیتیں بجھ کر رہ جاتی ہیں۔ خلیل الرحمٰن نے علمی و ادبی میدان میں جو شہرت و ناموری حاصل کی، اس کے پس پشت کچھ عوامل بھی کار فرما رہے ہیں، اور وہی ان کو آگے بڑھانے میں مددگار بن گئے۔ ان میں خصوصیت سے ہمارے خاندان کی مذہبی، علمی اور پھر ادبی روایات تھیں۔

ہمارا خاندان نہ تو مالدار تھا اور نہ بہت غریب، بلکہ متوسط درجے کا کھاتا پیتا خاندان تھا۔ پیشۂ زراعت کے ساتھ اس خاندان میں علمی روایت بھی قائم ہو چکی تھی۔ اور پشتہا پشت سے اس خاندان کے ساتھ کچھ ایسی خصوصیات جمع ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے یہ ضلع اعظم گڑھ

کے مسلمانوں میں امتیاز رکھتا تھا۔ ایک تو شرافتِ نفسی، ہمارے مورثِ اعلیٰ پٹھانوں کے یوسف زئی قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ سلطان بہلول لودھی کے زمانے میں افغانستان سے ہندوستان آئے۔ جون پور کی مشرقی سلطنت پر جب بہلول لودھی نے حملہ کیا تو ان میں جن سپاہیوں نے دادِ شجاعت دی۔ اسمیں ہمارے دادا سالار خاں پیش پیش تھے۔ اور انھیں اسکے صلے میں تیس گاؤں پیش کئے گئے۔ اسی بناء پر ہمارے گاؤں کا نام "سی دہ" ہوا۔ بعد میں اسی کو "سیدھا سلطان پور" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ ہم لوگوں کا شجرۂ نسب محفوظ ہے۔ اس گاؤں کی بڑی آبادی انہیں سالار خاں کی نسل سے تعلق رکھتی ہے۔

دوسرے ہمارا خاندان علمی اور دینی لحاظ سے بھی ممتاز تھا۔ ہمارے والد کے چچا حافظ قادر بخشؒ نامی گرامی بزرگ تھے۔ انہوں نے خدا ترسی تقویٰ کے ساتھ فیاضی اور غرباء پروری کی ایک مثال قائم کی۔ انھوں نے رفاہِ عام کے بہت سے نمایاں کام کئے۔ اور ان کی ولایت و درویشی کا چرچہ مدّتوں رہا۔ پھر ہمارے والد مولانا محمد شفیع صاحبؒ کی ذات ایک ایسی ذات ہے جن کے ساتھ مسلمانانِ اعظم گڑھ کی علمی تاریخ وابستہ ہے۔ وہ نہ صرف ایک جیّد عالمِ دین تھے بلکہ ایک مخلص داعی اور رہبرِ قوم بھی تھے۔ انہوں نے اپنے علاقے میں شرک و بدعت کے انسداد کے لئے بھرپور جدوجہد کی۔ شادی بیاہ کے مسرفانہ رسموں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا۔ مسلمانوں کی معاشرتی اور اخلاقی اصلاح کیلئے ہمیشہ سرگرم عمل رہے۔ انکی مخلصانہ کوششوں کے نتیجے میں اس علاقے میں دینی بیداری کی فضا پیدا ہوگئی۔ اور مدرستہ الاصلاح سرائے میر جیسی عظیم الشان درس گاہ کا وجود عمل میں آیا۔ والد صاحب نے نہ صرف اپنی پوری زندگی اس کے لئے وقف کردی بلکہ وقت کی اہم اور ممتاز ہستیوں کا تعاون بھی حاصل کیا۔ علامہ شبلی نعمانی نے اس کی سرپرستی فرمائی تو مولانا حمید الدین فراہیؒ مصنف تفسیر نظام القرآن نے دارالعلوم حیدرآباد سے علاحدگی کے بعد اس کی نظامت اپنے ہاتھوں میں لی۔ اور پھر عروج و ارتقاء کی منزلیں طے کرکے یہ مدرسہ قرآنی علوم کا مرکز بن گیا۔

والد صاحب نے جس انداز کی ذہنی و علمی تربیت پائی تھی اس کی بنا پر انکی نظر میں وسعت اور طبیعت میں اعتدال تھا۔ نہ انہیں متقشف علماء کا سا جمود اور گروہی عصبیت تھی نہ تنگ نظری اور خورده گیری۔ وہ اپنے علمی خیالات سے لیکر فقہی مسلک تک وسیع النظر، وسیع القلب اور معتدل مزاج تھے۔ ایک طرف ان کے تعلقات قدیم وضع کے مشائخ سے تھے تو دوسری طرف جدید تعلیم یافتہ طبقے سے بھی۔ ان کے احباب میں علماء کے علاوہ ادباء و شعراء بھی تھے۔ اپنی طالب علمی کے زمانے میں جہاں انہوں نے وقت کے جیّد اساتذہ مولانا فیض اللہ مئوی، علامہ صادق پوری اور میاں نذیر حسین محدّث دہلویؒ سے کسبِ فن کیا وہاں وہ عظیم آباد (پٹنہ) کے شعراء کی صحبتوں میں بھی بیٹھے۔ اس لئے اچھے اشعار کی پرکھ بھی رکھتے تھے۔ تھوڑے دنوں شعر و شاعری بھی کی۔ شاہ محمد اکبر ابوالعلائی داناپوری سے مشورۂ سخن بھی کیا۔ ان میں شاعرانہ صلاحیتوں کے ساتھ تصنیفی مادہ بھی تھا۔ مگر اصلاحی تحریک اور مدرسے کی سرگرمیوں نے انہیں اس کی فرصت ہی نہ دی۔ اور وہ پھر اسی کے ہو کر رہ گئے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ مجھے تو کتابیں لکھنے کا موقع نہ ملا لیکن میں نے ایک ایسا ادارہ قائم کردیا ہے کہ اس سے بڑے بڑے مصنّف اور صاحبِ کمال پیدا ہونگے۔ پھر وہ اپنی اولاد سے بھی مایوس نہ تھے۔ وہ ہم لوگوں کو ہمیشہ ادبی کتابوں کے مطالعہ کی ترغیب دلاتے۔ اردو شاعری اور نثر کے اسلوب میں ان کے زمانہ میں جو انقلاب آچکا تھا وہ اس سے اچھی طرح واقف تھے۔ غالب کے خطوط، محمد حسین آزاد، نذیر احمد، سرسید، حالی، شبلی کی تصانیف سے پہلے پہل ہم لوگوں نے والد صاحب کے شوق دلانے پر پڑھیں۔ مسدسِ حالی کے وہ بڑے دلدادہ تھے۔ نہ صرف اپنے مواعظ کے درمیان اس کے اشعار پڑھتے بلکہ اسے مدرستہ الاصلاح کے اردو نصاب میں شامل کیا۔ اور ہم تمام بھائیوں کو انہوں نے بذاتِ خود سبقاً سبقاً پڑھائی۔ ہم نے اور خلیل الرحمٰن نے مسدسِ حالی ساتھ ہی پڑھی۔ اور اس کا تقریباً نصف حصہّ ہم لوگوں کو زبانی یاد تھا۔

والد صاحب مثنوی مولانا رومؒ کے عاشقوں میں سے تھے۔ اکثر اس کی حکایات اور تمثیلات سنایا کرتے۔ فارسی شعراء میں حافظ، نظامی، سعدی، عطار، جامی اور خسرو سے بڑی دلچسپی تھی۔ انہیں بےشمار شعر یاد تھے۔ اور اکثر تنہائی میں گنگنایا کرتے تھے۔

جب ہم لوگوں نے کچھ فارسی پڑھ لی اور شعر سمجھنے کی کچھ کچھ صلاحیت پیدا ہوگئی تو انہوں نے خاص طور سے "شعر العجم" پڑھنے کی طرف توجہ دلائی۔ شبلی کی اس کتاب کے بڑے مدّاح تھے اور کہا کرتے تھے کہ مولانا نے اس میں فارسی شاعری کا عطر نکال کر رکھدیا ہے۔ اردو شعراء میں زیادہ تر صوفی اور نعت گو شعراء کے کلام سے دلچسپی تھی۔ خواجہ میر درد،

شاہ نیاز بریلوی، محسن کاکوروی، غلام امام شہید کے اچھے اشعار پڑھا کرتے۔ خصوصاً شہید نے بحرطویل میں جو نعتیہ قصائد لکھے ہیں انہیں پورے کے پورے یاد تھے۔ انھیں مزہ لے لے کر سناتے۔ اس کے علاوہ جب کبھی ان کی ملاقات کے لئے کوئی شاعر آجاتا تو اس سے فرمائش کرکے کلام سنتے۔ والد صاحب کے اس ادبی ذوق کی چھاپ کچھ نہ کچھ ہمارے تمام بھائیوں پر پڑی۔ بعد میں پھر مزید مواقع ملے تو یہ ذوق اور بھی نکھرتا چلا گیا اور اس میں متنوع تبدیلیاں بھی پیدا ہوتی گئیں۔

ہماری والدہ رابعہ بیگم کی تعلیم معمولی تھی لیکن علمی گھرانے کی بیٹی تھیں۔ ان کے والد مرزا سلیم اللہ بیگ مختار تھے۔ ان کے بڑے بھائی مرزا عبد الحئی پروفیسر اور چھوٹے بھائی مولوی نبی احمد اصلاحی بہت سی زبانوں کے ماہر تھے۔ وہ گھر کے کام کاج سے فرصت پاتیں تو اردو نظم و نثر کی کتابیں پڑھ لیتیں خصوصاً ڈپٹی نذیر احمد کے ناولوں سے بڑی دلچسپی تھی۔ ان کا حافظہ بھی بلا کا تھا۔ بچپن میں سونے سے پہلے ہم لوگوں کو نہایت دلچسپ قصے سنایا کرتی تھیں۔

ہمارے چچا حافظ عبد الغفار نہایت باغ و بہار اور بذلہ سنج تھے۔ فارسی کی تعلیم اچھی تھی۔ فارسی شعراء کے سینکڑوں اشعار نوک زبان تھے۔ یہ مشہور شاعر اور ہمارے پڑوسی علامہ اقبال سہیل کے ہم سبق رہ چکے ہیں۔ گرچہ وہ کھیتی باڑی کی دیکھ بھال پر متعین تھے۔ لیکن محفل طرازی ان کی خاص صفت تھی۔ ان کے پاس دوست احباب کا مجمع لگا رہتا اور وہ ان میں بیٹھ کر قصے اور لطیفے سنایا کرتے۔ اور محفل قہقہہ زار بنی رہتی۔

ہمارے بڑے بھائی عزیز الرحمن اصلاحی اردو کے اچھے انشاپرداز تھے۔ حکیم برہم مرحوم گورکھپوری کے مشہور اخبار "مشرق" میں ایڈیٹر رہے۔ پھر اپنا رسالہ "کونین" نامی نکالا۔ جو نیم مذہبی اور نیم ادبی رسالہ تھا۔ بھائی صاحب مولانا عبد الرحمن نگرامی ندوی اور مولانا امین احسن اصلاحی کی ادبی تربیت میں رہ چکے تھے۔ اور گورکھپور کے دوران قیام ریاض خیرآبادی کی صحبتوں میں بھی انہیں رہنے کا اتفاق ہوا تھا۔ اسلئے ان کا ادبی ذوق بہت نکھرا ہوا تھا۔ گورکھپور سے آنے کے بعد "الاصلاح" سرائمیر میں مدیر معاون کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ انکی بدولت ہمارے گھر پر اردو کے علمی و ادبی رسالوں کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا۔

پڑھا جاتا تھا اور یہ تھا ہمارے خاندان کا ماحول جس میں خلیل الرحمن نے آنکھیں کھولیں۔ جب کچھ سیانے ہوئے تو گاؤں کے مکتب میں قرآن پڑھنے کیلئے بٹھا دیئے گئے۔ اس زمانے میں ہمارے مکان کے باہری حصے میں دالان میں یہ مکتب تھا۔ اور پڑھانے والے حافظ عظیم الدین مرحوم تھے۔ ہمارے پانچوں بھائیوں کی بسم اللہ خوانی انھوں نے کرائی۔ خلیل الرحمن نے بہت کم مدت میں قرآن ختم کر لیا۔ حافظ صاحب والد صاحب سے بیان کرتے تھے کہ آپ کے پانچوں صاحبزادوں میں سب سے کم مدت میں خلیل نے قرآن ختم کیا۔ آپ کا یہ بچہ تو غضب کا ذہین معلوم ہوتا ہے پھر کچھ دنوں اردو کی کتابیں پڑھیں اور اسکے بعد فکر ہوئی کہ انھیں پرائمری اسکول میں داخل کر دیا جائے۔ گاؤں کے اسکول کی پڑھائی اچھی نہ تھی۔ عزیز الرحمن بھائی کے کہنے پر قریب کے گاؤں "بینا پارہ" کے اسکول میں انہیں داخل کر دیا گیا۔ درجہ چہارم تک انہوں نے "بینا پارہ" میں پڑھا۔ اور ہمیشہ اول درجہ میں امتحانات میں کامیابی حاصل کی۔ پرائمری اسکول کے اساتذہ میں مولوی صفی اللہ صاحب اور مولوی محمد مصطفیٰ صاحب تھے۔ یہ دونوں اصحاب جب ہمارے دروازے سے گزرتے تو تھوڑی دیر کے لئے والد صاحب کے پاس بیٹھ جاتے۔ اور خلیل الرحمان کی شائستگی اور ذہانت کا تذکرہ کرتے۔

پرائمری اسکول کی تعلیم کے دوران ان کو شعر و شاعری کی کتابوں سے دلچسپی شروع ہو گئی تھی۔ کسی محفل یا جلسے میں جاتے اور اچھے شعر سن لیتے تو انہیں یاد ہو جاتا۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں اکثر علماء آتے۔ ان میں بعض تو سیدھی سادی تقریر کرتے اور بعض اپنے وعظوں میں ترنم سے اشعار پڑھتے۔ خلیل الرحمن اس میں ضرور شرکت کرتے اور اپنی پسند کے شعر یاد کر لیتے۔

ایک مرتبہ والد صاحب کے ہاتھ میں کلیات شبلی" آگئی۔ والد صاحب شبلی کی نظمیں شبلی کے لحن میں سنانے لگے۔ انکی مشہور نظم "عدل جہانگیری" کے اشعار خلیل الرحمن نے سنے تو اب کیا تھا سلے اڑے۔ اس وقت وہ سمجھتے نہ تھے لیکن کھیل کود میں ہوں یا بچوں کے جھگڑے میں، ہر وقت وہی گنگناتے رہتے۔ یہ بھی عجیب اتفاق ہے کہ جب میں علی گڑھ گیا۔ تو ان کی چھوٹی بچی ہما فاطمہ کی زبان سے سنا کہ وہی اشعار اسی انداز سے پڑھ رہی ہے۔ تو بے اختیار خلیل الرحمان کا بچپن یاد آگیا۔ وہی آواز، وہی صاف و شستہ لب و لہجہ، وہی معصومیت، وہی چلبلاپن اس میں بھی تھا۔

ہمارے گاؤں میں ایک صاحب تھے بشیر خلیفہ، غریب اور کسان آدمی تھے۔ پڑھے لکھے بالکل نہ تھے۔ لیکن فطری شاعر تھے۔ دیہاتی صنف سخن "برہا" اور "بچرا" کہتے تھے۔ خلیل الرحمن گھر والوں کی نگاہ سے بچ بچاکر ان کے پاس پہنچ جاتے۔ ایک بیاض بنائی اور اس میں اُن کے برہا اور بچرا نوٹ کر لیتے۔ بشیر خلیفہ بہت خوش ہوتے اور جب ان کو شاعری کا موڈ ہوتا تو خلیل الرحمان کو تلاش کر کے اپنے اشعار لکھواتے۔

بچپن میں ہم لوگوں نے کھیل کود میں کم حصہ لیا۔ ویسے گھر کے لوگ بھی روکتے تھے کہ گاؤں کا ماحول خراب ہے۔ گنوار، اُجڈ اور بدقماش لڑکوں کی صحبت میں پڑ کر بگڑ جائیں گے۔ چنانچہ خلیل الرحمان نے پھلواری لگانے کی اسکیم بنائی۔ ہمارے پاس زمین کافی تھی۔ بڑا لمبا چوڑا باغ تھا۔ باغ میں چھاؤنی بھی تھی۔ کھیتی باڑی کے سارے لوازمات باغ میں ہی رہتے تھے۔ پھر باغ بھی ایسا تھا جس میں طرح طرح کے درخت لگائے گئے تھے۔ تخمی آم، قلمی آم، امرود، شریفہ، فالسہ، شہتوت، کیلا سب موجود تھے۔ اور اس دیار کے ممتاز باغوں میں شمار ہوتا تھا۔ چچا صاحب مستقل طور پر باغ ہی میں رہتے تھے۔ ہم لوگوں نے سوچا کہ ہمارے باغ میں پھلواری کی کمی ہے۔ چنانچہ بلا مزدوروں کی مدد کے ہم نے زمین کھودی، کیاریاں بنائیں اور خوشبودار اور بغیر خوشبو کے خوشنما پھولوں کے پودے لگائے۔ اور قسم قسم کے پھولوں کے بیج بھی مہیا کر کے بوئے۔ خود ہی گوڑتے اور خود ہی کنوئیں سے پانی نکال کر سینچتے۔ کچھ دنوں میں اچھی خاصی پھلواری تیار ہو گئی۔ باغ ہی کے ایک حصہ میں بیلوں، گایوں اور بھینسوں کا مکان بھی تھا۔ کبھی کبھی نوکروں کی لاپرواہی سے ہماری پھلواری کو نقصان بھی پہنچ جاتا۔ تو ہم لوگ چچا صاحب سے اس کے خلاف احتجاج کرتے۔ لیکن چچا صاحب اس انداز سے معذرت کرتے کہ ہم لوگوں کو ہنسی آجاتی۔

ہم لوگوں کے اس شوق سے والد صاحب اور چچا بہت خوش تھے۔ اور بہت سراہتے۔ اور کہتے کہ ان دونوں نے ہمارے باغ کی خوش نمائی میں اضافہ کر دیا ہے۔ اپنے باغ کو چچا صاحب جنت سے تعبیر کرتے۔ ایسے چچا صاحب بڑے صفائی پسند اور پاکیزہ مزاج تھے۔ گندگی اور غلاظت کی جگہوں کے پاس بھی کبھی نہ پھٹکتے۔ اس بارے میں ان کا مزاج ابوالحسن تانا شاہ سے ملتا جلتا تھا۔ گاؤں کے اندر کسی ضرورت سے ان کو آنا ہوتا تو اس کی گندی گلیوں سے بمجبوری اگر ناک پہ رومال رکھ کر گذرتے۔ شاعر بھی

وہ اکثر گاؤں کو جہنم بھی کہا کرتے تھے۔ خلیل الرحمن انکی باتوں سے بہت لطف لیتے۔ اور انھیں چھیڑ کر ان کی دلچسپ اور ظرافت آمیز باتیں سُنا کرتے۔

یاد پڑتا ہے کہ خلیل الرحمان نے سب سے پہلے اپنی اسی پھلواری پر ایک نظم لکھی تھی۔ اسے والد صاحب کو بھی سنایا اور چچا کو بھی۔ پہلی بار ہمارے گھر والوں کو ان کی شاعری کا علم ہوا۔ اسی زمانے میں اقبال سہیل ہمارے گاؤں سے گزرے۔ تو والد صاحب سے ملنے کے لئے سواری سے اُتر گئے۔ والد صاحب ان کے اوّلین اُستاد تھے۔ وہ والد صاحب کا بیحد احترام کرتے تھے۔ والد صاحب اس وقت بیمار اور صاحب فراش تھے۔ اس لئے گھر کے اندر ملاقات کے لئے گئے۔ ان کی آمد کے موقع پر خلیل الرحمان سامنے آگئے۔ تو والد صاحب نے اقبال سہیل سے مخاطب ہو کر کہا کہ ہمارے گھر میں بھی ایک سہیل پیدا ہو گیا ہے۔ سہیل صاحب نے پوچھا وہ کون ہے؟ تو والد صاحب نے خلیل الرحمن کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا "یہ ہمارے سب سے چھوٹے صاحبزادے!" پھر والد صاحب کہنے لگے۔ بچپن میں جیسا تمہارا حال تھا بالکل وہی انداز اس کا بھی دیکھتا ہوں۔ نہ کھانے پینے کی سدھ بدھ نہ کھیل تماشوں کا شوق، بس ہمیشہ کسی نہ کسی خیال میں کھویا رہتا ہے اور گنگناتا رہتا ہے۔

درجہ چہارم پاس کرنے کے بعد خلیل الرحمن کو سرائے میر کے مڈل اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ سرائے میر میں انہوں نے ساتویں جماعت تک تعلیم حاصل کی۔ اور ہمیشہ امتیازی نمبروں سے پاس ہوتے رہے۔ مڈل اسکول کے اساتذہ بھی خلیل کے بڑے مداح رہے۔ ایک مرتبہ اس کے ہیڈ ماسٹر غالباً سید محمد نام تھا۔ والد صاحب کے پاس آئے اور بطور خاص درخواست کی کہ اس لڑکے کو انگریزی اسکول میں بھیج دیتے تو مستقبل میں بڑا نام پیدا کرتا۔

سرائے میر چونکہ اس اطراف میں ایک مرکزی مقام ہے اس لئے مڈل اسکول میں انھیں ادبی رسالے پڑھنے کے لئے مل جاتے تھے۔ پھر مدرسۃ الاصلاح بھی قریب تھا اس مدرسہ میں دار المعلومات کے نام سے طلبہ کی لائبریری تھی۔ کتابوں کا نہایت منتخب اور عمدہ ذخیرہ فراہم کیا گیا تھا۔ خلیل الرحمن برابر مدرسہ سے اپنی پسند کی کتابیں لیتے اور پڑھ ڈالتے۔ اقبال، چکبست، اکبر، جوش، سیماب، اسرار، ظفر علی خاں، اصغر، جگر، حفیظ وغیرہ کے مجموعے اسی دور میں انہیں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ افسانہ نگاروں

میں پریم چند سے بڑی دلچسپی ہوگئی تھی۔ شاید ہی ان کے افسانے اور ناول میں کوئی ان سے چھوٹے ہوں۔ جدید افسانوں کے مجموعے تقریباً اس دور تک کے سب پڑھ ڈالے تھے۔

پھر مدرستہ الاصلاح بڑا علمی مرکز تھا۔ آئے دن جلسے اور ادبی نشستیں ہوتیں۔ بڑی بڑی شخصیتیں وہاں آتیں۔ ان تقریبات میں بالالتزام شریک ہوتے۔ اس زمانے میں ہمارے گاؤں میں بھی علمی بیداری کی ایک لہر پیدا ہوئی تھی۔ نئی پود کے لوگوں میں کچھ تو مدرستہ الاصلاح کے طالب علم تھے۔ اور کچھ ہائی اسکول کے۔ فاروق احمد اس میں سب سے زیادہ فعال اور سرگرم تھے۔ وہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں زیر تعلیم تھے۔ اور جب چھٹیوں میں گھر آتے تو گاؤں میں بہت چہل پہل ہو جاتی۔ نوجوانوں اور طلبہ کے شوق کو دیکھ کر ایک لائبریری قائم کرنے کی تحریک کی۔ گاؤں کے تمام تعلیم یافتہ لوگوں کو اکٹھا کیا گیا۔ اور ایک دارالمطالعہ کا افتتاح ۱۹۳۸ء میں والد صاحب کے ہاتھوں سے کرایا گیا۔ تھوڑے دنوں کے اندر اچھا خاصا کتب خانہ بن گیا بہت سے اخبارات اور رسائل آنے لگے۔

اس اطراف میں بہت سے مالدار اور پڑھے لکھے گاؤں تھے۔ لیکن یہ اولیت صرف ہمارے گاؤں کو حاصل ہوئی۔ لوگ اس کا خاص طور سے چرچا کرتے اور جب کبھی کوئی اہم شخصیت وہاں سے گذرتی تو وہاں کتب خانہ کا معائنہ ضرور کر لیتی تھی۔ فاروق مرحوم نے علمی و ادبی سرگرمیوں کا اسے مرکز بنا دیا تھا۔ طلبہ کے تقریری جلسے ہوا کرتے۔ چھوٹے بچوں میں تقریر کرنے کا جذبہ پروان چڑھا۔ پھر تحریری مقابلے رکھے۔ اور بیت بازی کے مقابلے تو آئے دن ہوتے رہتے۔ گاؤں کی فضا میں انکی بدولت بڑی تبدیلی پیدا ہوگئی۔ اس کتب خانہ کے پہلے صدر فاروق مرحوم اور سکریٹری مجھے منتخب کیا گیا۔ اس کے بعد پھر عزیز الرحمان بھائی، مولوی صدر الدین اصلاحی، اصغر احسن اصلاحی جامعی، عبد الرحمان ناصر جامعی اسکے صدر ہوئے۔ اور سکریٹری خلیل الرحمان اور مولوی غالب احسن اصلاحی بنائے گئے۔ لیکن خلیل الرحمان نے کتب خانہ کے بنانے اور ترقی میں بڑی جد و جہد کی۔ اسی زمانے میں اس کا ایک بڑا جلسہ کیا گیا تو اس موقع پر بابائے اردو مولوی عبد الحق، رشید احمد صدیقی، مولانا اسلم جے راج پوری، مولانا امین احسن اصلاحی، اقبال سہیل، عبد الغنی الغفاری انکم ٹیکس کمشنر نے نہایت حوصلہ افزا پیغامات بھیجے۔

اس زمانے میں خلیل الرحمان کے اندر لکھنے کی اچھی صلاحیت پیدا ہو چکی تھی۔ "بیداری" کے نام سے ایک قلمی رسالہ نکالا۔ خود مضمون لکھتے۔ اور اسکولوں کے طلبہ سے مضامین لکھواتے۔ سب سے پہلے چھپنے کیلئے انہوں نے "غنچہ" بجنور میں مضمون بھیجا۔ ان کے ایک مضمون "الو کہا کہیں" پر "غنچہ" کے ایڈیٹر شاغل فخری مرحوم نے انعام بھی دیا۔ پھر ہمارے گاؤں کے "نواب خان" پر انھوں نے ایک مزاحیہ خاکہ لکھا تو اس کی بڑی شہرت ہوئی۔ نواب خاں کے واقف کاروں نے پڑھا تو بہت لطف اندوز ہوئے۔ اور بڑی داد دی۔ خاص طور سے بھائی عزیز الرحمان صاحب، فاروق مرحوم، اور عبد الرحمن ناصر جامعی اس مضمون کو پڑھ کر بہت متاثر ہوئے اور کہتے کہ خلیل کا مشاہدہ کتنا تیز ہے، ذہن کتنا زرخیز ہے، تخیل کتنا نادرہ کار، اور بات کہنے کے انداز میں کتنی شوخی، شیرینی اور تازگی ہے۔

مڈل اسکول کی تعلیم کے بعد سوال ہوا کہ انھیں مزید تعلیم کے لئے کہاں بھیجا جائے۔ والد صاحب انگریزی تعلیم کے مخالف نہ تھے لیکن چونکہ خود ایک عربی درسگاہ کے بانی اور ذمہ دار تھے اس لئے بڑی پس و پیش میں مبتلا ہوئے۔ عبد الغفار چچا کی بھی رائے تھی کہ کم سے کم ایک لڑکے کو انگریزی اسکول میں بھیجا جائے۔ ان کے کوئی اولاد نہ تھی، وہ ہمارے تمام بھائیوں میں خلیل الرحمن سے بڑی محبت کرتے تھے۔ اس لئے کہتے تھے کہ عربی مدرسوں میں ڈال کر اس پر دنیاوی ترقی کا دروازہ بند نہ کیا جائے۔ ان کے علاوہ بھائی عزیز الرحمان بھی یہی چاہتے تھے کہ وہ انگریزی اسکول میں جائیں۔ والد صاحب انہیں شبلی اسکول اعظم گڑھ بھیجنے کے لئے تیار ہو گئے لیکن شرط یہ رکھی کہ کچھ دن مدرستہ الاصلاح میں رہ کر وہ تھوڑی سی عربی اور فارسی پڑھ لیں۔ مدرسہ میں درجہ بندی تھی۔ اس لئے وہ کسی جماعت میں باقاعدہ داخل تو نہیں کئے گئے۔ البتہ پرائیوٹ طور پر انھوں نے مولانا صدر الدین اصلاحی (جماعت اسلامی کے مشہور مصنف) سے عربی کی چند کتابیں۔ اور مولانا نور الہدیٰ نور اصلاحی سے فارسی پڑھا۔ فاروق مرحوم گریجوٹ ہو کر گاؤں میں آ گئے تو ان سے انگریزی کی چند ابتدائی ریڈریں پڑھ ڈالیں۔ اور چند مہینوں کے بعد انہیں شبلی اسکول میں داخل کر دیا گیا۔ والد صاحب نے خلیل کو اعظم گڑھ بھیجتے وقت اس بات کی تاکید کی کہ دار المصنفین کبھی کبھی جایا کرنا۔ وہاں بڑی بڑی شخصیتیں ہیں، شاندار کتب خانہ ہے۔ درسیات کے بعد وہاں اچھی کتابیں

شاعر، بمبئی

پڑھتا۔ وہاں ملک کے متعدد رسائل و اخبارات بھی آتے ہیں انھیں دیکھنے کا موقع ملنے لگا۔ چنانچہ خلیل الرحمٰن نے اعظم گڑھ پہنچنے کے بعد سب سے پہلے مولوی عبدالباری صاحب سے رابطہ پیدا کیا۔ مولوی عبدالباری صاحب مدرسۃ الاصلاح کے تعلیم یافتہ اور علامہ سید سلیمان ندوی کی تربیت میں رہ چکے تھے۔ اُردو کے نہایت شگفتہ نثر پرداز اور عمدہ ادبی ذوق کے مالک تھے۔ وہ زیادہ تر رسالوں میں "ابوعلی اعظمی" کے نام سے مضامین لکھا کرتے تھے۔ دارالمصنفین میں وہ کتب خانہ کے انچارج تھے۔ ہمارے خاندان سے ان کے گوناگوں تعلقات تھے۔ ان کے چچا ماسٹر محمد احمد مرحوم مدرسۃ الاصلاح میں انگریزی کے اُستاد تھے اور والد صاحب سے دوستانہ مراسم تھے۔ مولوی عبدالباری صاحب مرحوم نے خلیل الرحمٰن پر خاص شفقت کی نظر رکھی۔ انہیں اچھے رسالے پڑھنے کے لئے دیتے۔ ادبی و تنقیدی کتابیں مہیا کرتے۔ پھر مضمون نگاری کے سلسلے میں مفید مشورے بھی دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے اپنے آخری مجموعۂ مضامین کو ان کے نام انتساب بھی کیا ہے۔

شبلی اسکول میں جب تک رہے اس کے ممتاز طالب علموں میں ان کا شمار ہوتا رہا۔ تمام اساتذہ انکی ذہانت، حافظہ، شوق اور لگن کا تذکرہ کرتے۔ انھوں نے تمام مضامین میں امتیازی حیثیت حاصل کرلی۔ عربی کے استاد مولانا سعید صاحب نے تو یہاں تک کہدیا کہ بھئی تمہارے لئے عربی کے پیریڈ میں حاضری ضروری نہیں ہے۔ عام طور سے ادب و زبان سے دلچسپی رکھنے والے طلبہ حساب کے مضمون میں کمزور ہوتے ہیں۔ لیکن خلیل صاحب کے بھی تیز تھے۔ ایک مرتبہ حساب کے استاد نے الجبرا کے کچھ سوالات حل کرنے کے لئے دیئے۔ اس کے لئے جواب کا جو بندھا ٹکا طریقہ ہے اس سے ہٹ کر حل کیا۔ اور استاد کے سامنے پیش کیا۔ پہلے تو استاد چکرائے کہ ائیں یہ کیا ؟ پھر خلیل الرحمٰن کو بلاکر پوچھا کہ تم نے یہ کیسے کیا ہے ؟ خلیل الرحمٰن نے اپنا نیا طریقہ انہیں سمجھایا اور بتایا کہ اسے یوں بھی حل کیا جاسکتا ہے۔ پھر تو وہ خلیل الرحمان کی جدت طرازی پر عش عش کرنے لگے۔ اور اسکول کے دوسرے اساتذہ سے بھی اس کا ذکر کیا اور نہایت فخریہ طور سے کہا کہ ہمارے شاگرد نے الجبرا کے حل کا نیا طریقہ دریافت کیا ہے جو آج تک کسی کو نہیں سوجھا ہوگا۔

شبلی اسکول کی تعلیم کے دوران انکو احباب بڑے مخلص ملے۔ شاعر بمبئی نیاز احمد ساکن نیحر پٹی (اب حاجی نیاز بمبئی کے کاروباری)، اخلاق احمد ساکن نیحر پٹی (اب لکچرار شعبۂ اسلامیات علی گڑھ یونیورسٹی) مختار احمد ساکن کھنڈواری (اب سرائے میر کے سب سے بڑے کلاتھ مرچنٹ)، علی حماد عباسی (پروفیسر شبلی کالج)، سہیل سلطان (پاکستان میں جہاز کے کپتان)، غلام صابر وکیل سے بڑا یارانہ تھا۔ نیاز و اخلاق کا ساتھ تو پرائمری اسکول ہی سے تھا۔ اور ان سے مرتے دم تک تعلقات استوار رہے۔

شبلی اسکول میں جب وہ زیر تعلیم تھے تو ہمارے خاندان کو کئی مشکل مسائل سے دوچار ہونا پڑا۔ ایک تو والد صاحب پر فالج کا حملہ ہوا۔ اور وہ بالکل صاحب فراش ہو گئے۔ دوسرے جائداد اور زمین کے تعلق سے کئی جھگڑے کھڑے ہوئے۔ گاؤں کے ایک صاحب سے مقدمہ بازی کی نوبت آگئی۔ پھر اس مقدمہ کی جڑ سے کئی اور مقدمے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ میں نیا نیا مدرسہ سے فارغ ہوا تھا۔ اس دُنیا کی کوئی واقفیت نہیں رکھتا تھا۔ اور نہ ان گُوں کا تھا۔ مجھ سے اُوپر کے بھائی حافظ حبیب الرحمٰن کے اندر بھی ان کاموں کی اہلیت نہ تھی۔ معاملات میں ہوشیار ان سے بڑے عزیز الرحمان بھائی تھے۔ وہ مدافعت کے لئے تیار ہو گئے۔ اس کی وجہ سے انہیں کئی کیسوں میں پھنسایا گیا۔ بہرحال تسم پشتم کسی طرح میدان میں ڈٹے رہے۔ لیکن اس کی وجہ سے پورے خاندان کو کافی زیر بار ہونا پڑا۔ پھر اسی درمیان ہمارے اپنے بھائیوں میں بھی اختلافات بڑھ گئے۔ سوتیلے بھائی مولوی فیض الرحمٰن صاحب نے جائداد کی تقسیم کا مطالبہ کیا۔ لیکن والد صاحب اور چچا صاحب کی وجہ سے بات دب کر رہ گئی۔

۱۹۴۵ء میں خلیل الرحمان نے میٹرک پاس کیا۔ اسی سال والد صاحب کی رحمت کا سایہ ہم لوگوں کے سروں سے اُٹھ گیا۔ اسی پریشان کن دور میں خلیل الرحمان نے علیگڑھ مسلم یونیورسٹی جانے کا منصوبہ بنایا۔ اس وقت علیگڑھ بھیجنا ایک متوسط درجے کے آدمی کے لئے بڑی اہمیت رکھتا تھا۔ پھر ہمارا کنبہ بہت بڑا تھا۔ اور ذرائع آمدنی بہت محدود۔ رائے یہ ہوئی کہ اعظم گڑھ میں شبلی کالج میں ہی داخلہ لے لیں۔ کم خرچ میں کام چل جائے گا۔ مگر خلیل الرحمان کا کہنا یہی تھا کہ میں جاؤں گا تو علی گڑھ ورنہ پڑھائی چھوڑ دوں گا۔ دراصل مرحوم علیگ کے ذریعہ انہیں علیگڑھ کے متعلق بہت سی باتیں معلوم ہو چکی تھیں۔ ان کے مسلسل تذکروں سے علیگڑھ کی عظمت کا نقش ان کے دل پر کچھ ایسا بیٹھ گیا تھا کہ دوسرے کالج نظر میں جچتے نہ تھے۔ بہرحال ان کے لئے کچھ رقم فراہم کی گئی اور انہیں علیگڑھ بھیجا گیا۔

علیگڑھ جانے سے قبل وہ اپنے ساتھیوں اور دوستوں سے ملنے کیلئے اعظم گڑھ گئے۔ مولوی عبدالسلام صاحب کو معلوم ہوا تو انہیں علامہ سید سلیمان ندوی کی خدمت میں لے گئے۔ سید صاحب یونیورسٹی کورٹ کے ممبر تھے۔ علی گڑھ جانے کا ذکر سن کر بہت خوش ہوئے۔ اور بتایا اس سلسلے میں تمہارے لئے جو کچھ کر سکتا ہوں کروں گا۔ سید صاحب نے ایک طویل خط صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے نام لکھا۔ اور اس خط کو خلیل الرحمان کے ہاتھ میں تھماکر فرمایا کہ صدر یار جنگ کے پاس تم اسے خود لے کر جانا۔ اس خط میں سید صاحب نے مدرسۃ الاصلاح کے تعلق سے والد صاحب کی خدمات کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے خلیل الرحمان کی ذہانت، صلاحیت اور ادبی ذوق کی بڑی تعریف کی تھی۔ اور لکھا کہ یہ ایسا طالب علم آپکی خدمت میں بھیج رہا ہوں جو آگے چل کر نہ صرف علم و ادب میں ممتاز مقام حاصل کریگا بلکہ اس کے ذریعہ یونیورسٹی کی نیک نامی میں اضافہ ہوگا اور ایک وقت آئیگا کہ وہ آپکی کرسی پر بیٹھے گا۔

سید صاحب کے اس خط پر انہیں جاتے ہی فوراً یونیورسٹی میں داخلہ مل گیا اور وظیفہ بھی منظور ہو گیا۔ پھر دو سال تک انہیں گھر سے برابر اخراجات بھی جاتے رہے۔ اور وہ ہر چھٹی میں گھر بھی آتے رہے۔

پھر ہمارے گھریلو اختلافات نے شدت اختیار کر لی۔ اور سب لوگ الگ الگ ہو گئے۔ اس بات سے خلیل الرحمان کو بڑا غم ہوا۔ ہمارے اور بھائیوں میں ایک دوسرے سے شکایتیں تھیں لیکن خلیل الرحمٰن سے کسی کو کوئی عداوت نہ تھی۔ البتہ اپنے بھائیوں میں عزیز الرحمان بھائی اور مجھ سے وہ زیادہ قریب رہے۔ اور اپنی باتیں صرف ہمیں لوگوں سے کہتے۔ اور ہم لوگوں نے اپنی تنگی کے باوجود یہ سوچ لیا تھا کہ ان کی مدد کرتے رہیں گے۔

اسی دور میں برادری کے بعض اچھے گھرانوں سے ان کے لئے شادی کے پیغامات بھی آئے۔ لیکن حالات کی ناسازگاری کے باعث کہیں بات طے نہ ہو سکی۔ پھر ایکبار ایک بڑے دولت مند شخص ہمارے گھر آئے۔ ہماری خاندانی وجاہت سے متاثر تھے۔ خلیل الرحمٰن کی تعریفیں سن سن کر وہ اس کیلئے تیار ہو گئے کہ وہ میری لڑکی سے شادی کر لیں تو اعلیٰ تعلیم کے سلسلے میں جملہ اخراجات کی ذمہ داری لے لوں گا۔ ہم لوگوں نے کہا کہ اس بارے میں خلیل الرحمان کا عندیہ لینا ضروری ہے۔ چنانچہ وہ خلیل الرحمٰن کے پاس آئے اور ایک بڑی رقم بطور سلامی پیش کی۔

ایسے موقع پر جب کہ عام طور سے نوجوان خواہشمند ہوتے ہیں۔ اور خود اپنی جانب سے بڑی بڑی فرمائشیں کرتے ہیں خلیل الرحمان نے انکی یہ رقم یہ کہکر واپس کر دی کہ میں کوئی بکاؤ مال نہیں ہوں۔ میری غیرت اسے گوارا نہیں کرتی۔" خلاف توقع یہ جواب سن کر وہ حیرت زدہ رہ گئے۔ پھر اسکے بعد شادی سے بھی انکار کر دیا۔ اور ہم لوگوں سے کہا کہ آپ لوگ میری شادی کی فکر نہ کریں۔ میں خود اپنی شادی اپنی پسند سے کروں گا۔ البتہ آپ لوگوں کو چھوٹی بہن صغریٰ بانو کی شادی کا بندوبست کرنا چاہیئے۔ اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد صغریٰ کی شادی ایک اچھے کھاتے پیتے خاندان میں کر دی گئی۔

اس کے بعد میں مشہور شاعر احسان دانش کے بلانے پر ۱۹۴۶ء میں لاہور چلا گیا۔ وہاں میرے ساتھ قاضی اطہر مبارکپوری صاحب بھی تھے۔ مجھ سے جو کچھ ہو سکا میں لاہور سے بھی کچھ نہ کچھ بھیجتا رہا۔ میرا تقریباً ایک سال تک لاہور میں قیام رہا۔ اس زمانے کا ایک خط محفوظ رہ گیا ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

وقار ملک لین کورٹ۔ مسلم یونیورسٹی
علیگڑھ

۱۹ مارچ ۱۹۴۷ء

بھائی جان!

عرصہ ہوا آپ کو ایک مفصل خط لکھ چکا ہوں۔ امید کہ ملا ہوگا۔ اس وقت ایک بہت ضروری کام سے خط لکھ رہا ہوں۔ اس وقت مجھے دو سو روپیوں کی سخت ضرورت ہے۔ اور کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ میں نے جو قرض لئے تھے وہ صاحب اس وقت سخت تقاضا کر رہے ہیں کیونکہ انہیں فیس داخل کرنی ہے۔ اس لئے آپ جتنی جلد ممکن ہو سکے روپے بھیجدیں تو میں از حد ممنون ہوں گا تاکہ میں قرض بھی ادا کر دوں۔ اور اپنی ضرورت بھی پوری کر لوں۔ امید ہے کہ آپ ضرور خیال کریں گے۔ میرا امتحان ۲۸ اپریل سے ہوگا اسلئے مصروفیت بہت زیادہ ہے۔ امید ہے کہ آپ میری اسوقت مدد کر کے میری ذہنی الجھنوں کو دور کریں گے۔

قاضی اطہر صاحب کو میرا سلام کہیئے گا۔ صابر صاحب نے ان کو ابھی کل ہی خط لکھدیا ہے۔

منتظر جواب: خلیل الرحمٰن

چند مہینے گذرے نہ تھے کہ تقسیم ہند کا غلغلہ بلند ہوا۔ تو میں نے

شاعر بھی

یہی بہتر سمجھا کہ اپنے وطن واپس آجاؤں۔ گھر پر آنے کے بعد تھوڑے دن ٹھہرا تھا کہ دار العلوم احمدیہ سلفیہ "دربھنگہ (بہار)" مجھے تدریسی سلسلہ میں بلالیا گیا۔ اس وقت میں خود عجیب ابتلا کے دور میں تھا۔ لیکن ان سے برابر خط و کتابت جاری رہی۔ اور میں برابر ان کے احوال دریافت کرتا رہا۔ قلیل مشاہرہ کی بنا پر میں انھیں خاطر خواہ مدد نہ کرسکا۔ اس وقت وہ انٹرمیڈیٹ پاس کرچکے تھے۔ انھوں نے یہی بہتر سمجھا کہ کچھ دن عارضی ملازمت کرکے اتنے روپئے اکٹھا کرلیں کہ آگے تعلیم میں دشواری نہ ہو۔

چنانچہ انہوں نے جامعہ ملیہ دہلی میں ملازمت کرلی۔ دہلی پہنچ کر وہ مجھے لکھتے ہیں :—

حالی منزل جامعہ نگر۔ دہلی

۸ر جولائی ۱۹۴۷ء

بھائی صاحب!

میں گھر سے سیدھے دہلی چلا آیا۔ اور یہیں مجھے شیخ الجامعہ صاحب کے دفتر میں ایک ملازمت مل گئی۔ اب چھٹیوں میں یہیں رہوں گا۔ عید بعد میری یونیورسٹی کھل رہی ہے۔ میں نے رفیق فاروقی صاحب کی خدمت میں بچوں کی کتاب بھیجی ہے۔ ابھی اس کا جواب نہیں آیا ہے۔ شاید دو ایک دن میں آجائے۔ حسین حسان صاحب نے نظموں کے مجموعے پر دیباچہ لکھ لیا ہے۔ وہ خود مجموعے کے متعلق مکتبہ جامعہ سے بات چیت کر رہے ہیں۔

چھٹیوں کے ختم ہونے کے بعد میں بی۔ اے میں داخلہ لینے کی کوشش کروں گا۔ لیکن سب سے زیادہ اہم سوال داخلہ کے اخراجات کا ہے۔ امتحان کے زمانہ میں سیکڑوں روپے بہت سا قرض بھی ہوگیا تھا جس کو میں رفتہ رفتہ ادا کر رہا ہوں۔ اس کے بعد اگر کچھ روپے ادھر ادھر سے مل گئے اور آپ نے بھی اس سلسلے میں میری مدد کی تو میں اپنی کوششوں میں کامیاب ہوجاؤں گا۔ داخلہ ہوجانے کے بعد پھر کسی نہ کسی صورت سے میں بی۔ اے کر ہی لوں گا۔ تکلیفیں اٹھانی ہی پڑتی ہیں، لیکن میں ہر تکلیف کا مقابلہ کرنے کا عادی ہوچکا ہوں۔

جامعہ کی زندگی بہت ہی پرسکون ہے۔ یہاں ہر طرح کا آرام ہے۔ مجھے کام بھی بہت کم کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے مطالعہ اور سیر و تفریح کے مواقع بھی ملتے رہتے ہیں۔ معین الدین جے راجپوری صاحب ساتھ ہی رہتے ہیں اور اکثر آپکا تذکرہ ہوتا رہتا ہے۔ آجکل لکھنے پڑھنے سے ان کو شوق ہوتا جارہا ہے۔ افسانے اور نظمیں ایک عرصے سے لکھتے ہیں۔ میں نے ان سے لیکر دو ایک چیزیں شائع بھی "جدید اُردو" اور "عالمگیر" میں بھیجی ہیں۔

ہمارے گھر کی حالت اب دن بدن جس درجہ پہنچتی جارہی ہے۔ اس کا تصور کرکے سخت تکلیف ہوتی ہے۔ شاید میں اپنی تعلیم کے دوران میں جلد گھر نہ آسکوں ——— آپکے خط کا انتظار رہے گا۔

خلیل الرحمان

اتنے میں ہندوستان کی آزادی کی صبح طلوع ہوئی۔ ہندوستان دو حصوں میں بٹ گیا۔ اور ساتھ ہی فرقہ وارانہ فسادات بھی پھوٹ پڑے۔ خون کی ہولیاں کھیلی جانے لگیں۔ مشرقی پنجاب اور دلّی کی سرزمین جہنم زار بن گئی۔ خلیل الرحمان نے عافیت اسی میں سمجھی کہ وہاں سے نکل جائیں۔ راستے میں ہمسفر بلوائیوں نے تاکا اور ٹرین ہی میں ان پر قاتلانہ حملہ کردیا۔ اور اپنے نزدیک مردہ سمجھ کر ان کو گاڑی سے نیچے پھینکدیا۔ ریلوے کے ایک ملازم جو ریلوے پٹریوں کی دیکھ بھال کے لئے ٹھیلہ گاڑی سے معائنہ کر رہے تھے۔ دیکھا کہ ابھی وہ زندہ ہیں از راہ انسانیت انہیں ٹھیلہ گاڑی پر اٹھوا کر جامع مسجد دہلی تک پہونچا دیا۔ وہاں سے کسی طرح جامعہ ملیہ اطلاع دی گئی۔ ہمارے پھوپھی زاد بھائی اصغر احسن اصلاحی جامعہ میں استاد تھے۔ وہ ڈاکٹر ذاکر حسین مرحوم کی مدد سے پولیس گاڑی سے جامعہ میں لائے گئے۔ مرہم پٹی کرائی، اور انکا علاج کرایا گیا اور تین ہفتے کے بعد رفیع احمد قدوائی کے ہمراہ انہیں علیگڑھ روانہ کردیا گیا۔

جس دن ان پر قاتلانہ حملہ ہوا اسی رات والدہ نے خواب دیکھا۔ اور صبح اٹھنے کے بعد انکی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور بار بار خلیل الرحمان کو یاد کرتی رہیں۔ بہت پوچھنے کے بعد بتایا کہ خلیل کے متعلق بہت ہی برا خواب دیکھا ہے۔ اس کی جلد خبر لو۔ فسادات کی دہشت ناک خبروں سے ہم لوگوں کو بھی بڑی تشویش تھی۔ دو تین دن کے بعد ماسٹر صاحب کا ایک خط میرے نام آیا۔ اور اس میں پوری کیفیت درج تھی۔ اور بھی گھبراہٹ ہوئی۔ ڈاکٹر ذاکر صاحب کو تار دیا تو جواب ملا کہ اطمینان رکھو، خطرے سے باہر ہیں۔ پھر علی گڑھ سے وہ خود ہی گھر آگئے۔ ان کے جسم پر زخموں کے نشانات بہت گہرے اور نمایاں تھے۔ مارنے والے نے اپنا کام پورا کردیا تھا لیکن حیات باقی تھی۔ اسی لئے ہم لوگوں کو پھر مل گئے۔ ملاقات ہونے پر ایک بات انہوں نے ایسی بتائی جس پر بڑی مسرت ہوئی۔ انہوں نے کہا کہ بلوائیوں نے پہلے سوال کیا کہ تم مسلمان ہو؟ اگرچہ ظاہری علامت تو کوئی نہ تھی لیکن میری غیرت ایمانی نے یہ گوارا نہ کیا کہ ان سے جھوٹ

بول کر جان بچاؤں۔ میں نے فوراً کہہ دیا کہ ہاں میں مسلمان ہوں اور پھر اس نے چھرا چلا دیا۔

ان کے صحیح سلامت گھر آنے پر خاندان اور رشتہ داروں میں بڑی خوشی منائی گئی۔ والدہ صاحبہ نے فقیروں کو کھانا کھلایا۔ کچھ دن رہ کر وہ پھر علیگڑھ چلے گئے۔ اور بی۔ اے میں داخلہ لے لیا۔ اس زمانے میں غالباً کچھ ٹیوشن وغیرہ کرلئے تھے۔ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں:

۶۔ امیر نشاں، میرس روڈ۔ علیگڑھ

۱۷ رمئی ۱۹۴۸ء

بھائی صاحب!

عرصہ ہوا آپکا ایک خط موصول ہوا تھا۔ جس کا میں نے بہت طویل جواب دیدیا تھا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے میرا وہ خط آپکو ملا نہیں۔ کیونکہ اس کے بعد آپکا پھر کوئی خط نہیں آیا۔ — میری زندگی آجکل بہت اچھی گذر رہی ہے خدا کا شکر ہے کہ اب میں اس قابل ہوگیا کہ بغیر کسی کے سہارے اور بغیر کسی کی مدد کے اپنی تعلیم جاری رکھ سکوں۔ میں نے اپنی بعض سہولتوں کی خاطر ہوسٹل بھی چھوڑ دیا ہے۔ اور آجکل معین احسن جذبی کے ساتھ ان کے مکان میں رہتا ہوں۔ یہاں مجھے ہر طرح کا سکون اور اطمینان حاصل ہے۔ میں نے ارادہ کرلیا ہے کہ اب اپنی تعلیم کسی نہ کسی طرح مکمل کرلوں گا۔ اور اُمید ہے کہ میں اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوجاؤں گا۔ ۱۵ رمئی سے یونیورسٹی بند ہورہی ہے۔ اور اب اس کے بعد میں بی۔ اے (فائنل) کا طالب علم ہوں گا۔ یعنی اگلے سال انشاءاللہ بی۔ اے پاس کرلوں گا۔ اُمید ہے آپ بخیریت ہوں گے۔ اپنی خیریت سے کبھی کبھی مطلع کرتے رہیئے۔ مجھے اس وقت کسی قسم کی امداد کی ضرورت نہیں ہے ورنہ میں ضرور لکھتا۔ آپکی ہمدردیوں کا شکرگزار ہوں۔ خلیل الرحمٰن

بی۔ اے سے ایم۔ اے تک مدت تعلیم میں وہ بہلوگوں سے کسی مدد کے خواستگار نہیں ہوئے۔ لیکن خط وکتابت جاری رکھی۔ پھر یکایک معلوم ہوا کہ ان کے خیالات میں بڑا انقلاب آچکا ہے۔ فکروو جدان میں تبدیلیوں کے ساتھ مذہب بیزاری بھی پیدا ہوگئی ہے پھر علیگڑھ کے ماحول میں دوست احباب کا حلقہ بھی ایسا ملا گیا جس میں ایک ذہین انسان کے لیے انحراف کے بہت سے راستے نکل آئے۔ پھر وہ ترقی پسند ادبی

تحریک سے وابستہ ہوگئے۔ اور اس سلسلے میں انکی دلچسپی اتنی بڑھی کہ وہ علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری چنے گئے۔ ۱۹۴۹ء میں حکومت ہند ڈیفنس آف انڈیا قواعد کے تحت اس تحریک کو خلافِ قانون قرار دیا تو وہ بھی گرفتار کرلئے گئے۔ چار مہینے جیل میں رہے۔ جیل ہی سے خاص اجازت لیکر (پیرول پر) وہ بی۔ اے کے امتحان میں بیٹھے۔ اور جیل سے رہائی کے بعد چند دنوں کے لئے گھر پر بھی آئے۔ پھر انکی دلچسپیاں اور مصروفیات علی گڑھ میں اتنی بڑھیں کہ گھر کا رخ تک نہ کیا۔ ۱۹۵۱ء میں ایم۔ اے پاس کیا۔ ایم۔ اے کے بعد کچھ دنوں کے لئے "یونیورسٹی گزٹ" کے ایڈیٹر رہے۔ یہ پرچہ برابر میرے نام بھیجتے رہے۔ "یونیورسٹی گزٹ" سے وہ دل برداشتہ رہے۔ اور کچھ ہی دنوں کے بعد اس سے علاحدہ ہوگئے۔ اس کے بعد پھر ان پر ایک عجیب بحرانی دور آیا۔ انہوں نے کلکتہ، مدراس اور بمبئی کا سفر کیا۔ اس زمانے میں اپنے بعض معاصرین کی دیکھا دیکھی فلمی دُنیا کی طرف میلان پیدا ہوا۔ مگر وہ اس سلسلے میں کامیاب نہ ہوسکے۔ لیکن اس کے متعلق جب اعظم گڑھ میں بات پہنچی تو بڑا رنج ہوا۔ میں نے انہیں سخت ملامت کا خط لکھا اور بتایا کہ ہم لوگ تمہیں زیادہ بلند علمی و ادبی مقام پر دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور یہ تمہارے لئے کسی لحاظ سے بھی شایانِ شان نہیں ہے۔ اللہ نے تمہارے اندر جو صلاحیتیں رکھی ہیں ایک نہ ایک دن تمہارے لئے مناسب جگہ دلاکے رہیں گی۔ پہلے تو اُن کو بُرا لگا۔ لیکن بعد میں اپنی غلطی کا اعتراف کیا۔ چنانچہ کچھ عرصے کے بعد اُن کے شفیق اُستاد پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ۱۹۵۳ء میں علی گڑھ بُلالیا۔ اور بحیثیت لکچرار اُن کا تقرر ہوگیا۔ اس کے بعد انکی زندگی میں سکون اور ٹھہراؤ آیا۔ پھر ۱۹۵۷ء میں انہوں نے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی علاوہ ریڈر بھی ہوگئے۔ اسی دوران انکی شادی کی بات چیت شروع ہوئی۔ پہلے کسی اور لڑکی سے طے ہوئی تھی لیکن کسی وجہ سے نہ ہوسکی۔ تو ان کے دوستوں کے مشورے اور کوششوں سے جہان آباد (ضلع پیلی بھیت) میں حکیم محفوظ الدین کی صاحبزادی راشدہ بیگم سے شادی ہوگئی۔ شادی کے موقع پر وہ گھر کے کسی شخص کو پوچھ نہ سکے۔ اس موقع پر گھر کی عورتوں نے والدہ صاحبہ کو خاص طور سے طعنے دیے کہ آپ تو انکی محبت میں مری جاتی ہیں لیکن بہو کے دیکھنے کا موقع بھی نہ دیا۔ شاید یہ شادی بڑی عجلت میں ہوئی اس لئے وہ کسی کو اطلاع نہ دے سکے۔

شادی کے چند ہی مہینوں کے بعد مجھے علیگڑھ جانے کا اتفاق ہوا۔ دیکھا تو انکی زندگی میں بڑی باقاعدگی آگئی تھی۔ بیوی بھی سلیقہ مند اور مزاج کے مطابق تھی۔ اس سے طبیعت خوش ہوئی۔ اس سفر میں اپنی تمام ادبی سرگرمیوں اور فتوحات کی مفصل روداد سنائی۔ اپنے مسودے دکھلائے تو میری مسرت میں اور بھی اضافہ ہوا۔ پھر اُن سے رخصت ہو کر آیا تو بہت زمانے تک ہم ایک دوسرے سے بے خبر رہے۔ شعرا میں ہمارے بھی آگیا۔ غالباً ۱۹۶۲ء میں رسالہ "شاعر" کا جشن ...... بڑے تزک و احتشام سے منایا گیا۔ ہمارے مخلص و محترم بزرگ جناب اعجاز صدیقی صاحب مرحوم نے مجھے یہ خوش خبری سنائی کہ اس جشن میں آپکے بھائی بھی آرہے ہیں۔ اتنے میں دوسرے بزرگ اور سراپا شفقت مولانا مہر محمد خاں شہاب مالیر کوٹلوی مرحوم بھی آگئے۔ خلیل الرحمٰن کا ذکر چھڑ گیا تو پہلے پوچھا کہ گھر جاتے ہیں یا نہیں؟ میں نے کہا اب تو اُنہوں نے بن باس لے لیا ہے۔ پھر پوچھنے لگے کہ آپ لوگوں کی والدہ باحیات ہیں؟ میں نے کہا کہ ہاں۔ تو اظہار افسوس کرنے لگے کہ والدہ سے ملنے بھی کبھی نہیں جاتے؟ میں نے کہا کہ ہم لوگوں کو بھی اسی بات کا رنج ہے۔ ہر بھائی اپنی معاش فکر میں لگا ہوا ہے اور سب کے ساتھ اس کی خانگی پریشانیاں لگی ہوئی ہیں۔ کم سے کم سال میں چند ہی روز کے لئے گھر آجایا کرتے تو بڑی خوشی ہوتی۔ اس کے چند ہی روز کے بعد "جشن شاعر" میں شرکت کی غرض سے آگئے۔ مقالہ بھی پڑھا اور مشاعرے میں بھی شریک ہوئے۔ اسی تقریب میں مولانا شہاب نے ہم دونوں بھائیوں کو پکڑا۔ ایک ہاتھ ان کے کندھے پر اور ایک میرے کندھے پر رکھ کر نہایت ہی مخلصانہ نصیحتیں کیں۔ گھر کی یاد دلائی۔ ماں کے حقوق بتلائے۔ انکی باتوں کو نہایت نیازمندانہ انداز میں سنا۔ اور اپنے رویّہ پر نظرثانی کا وعدہ کیا۔ پھر تنہائی میں ملے تو کہا کہ میں گھر کی کچھ زیادہ خدمت تو نہیں کر سکتا ہاں اپنے تمام بھائیوں کی اولاد کی تعلیم کی ذمہ داری لیتا ہوں۔ آپ لوگوں میں سے جس کسی کے لڑکے ہائی اسکول کی تعلیم ختم کر لیں تو میرے پاس بھیج دئیے جائیں۔

میں گرمیوں کی چھٹی میں بمبئی سے گھر گیا تو اس کا ذکر اپنے بڑے بھائی عزیزالرحمان سے کیا۔ اس بنیاد پر وہ اپنے بڑے صاحبزادے طارق سلمہٗ کو لیکر علیگڑھ گئے تو وہاں داخلہ کرا دیا۔ طارق کئی برس تک خلیل الرحمان کے ساتھ رہے۔ اب وہ سائنس میں پی ایچ ڈی ہو چکے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ اس کے بعد بھی انہیں گھر جانے کا موقع نہ ملا۔ وطن اور علیگڑھ کے حالات کے درمیان طارق سلمہٗ ہی واسطہ رہے۔ والدہ صاحبہ ضعیف ہو چکی تھیں اور گھر کے لوگوں کی خواہش اور اصرار بھی تھا۔ اس لئے ۱۹۷۶ء میں وہ گھر آئے اور بڑے اہتمام سے آئے۔ اپنے بڑے بیٹے کامران سلمہٗ کو بھی ساتھ لائے۔ گاؤں والوں کو معلوم ہوا تو ٹوٹ پڑے۔ رشتہ داروں اور ملنے والوں کی بھیڑ لگ گئی۔ اس موقع پر اُنہوں نے خاندان کے تمام عزیزوں بچوں بچیوں کو تحفے اور جوڑے دیئے۔ والدہ صاحبہ باغ باغ ہو گئیں۔ اُنہوں نے ضعیفی کے باوجود اپنے منّت کے روزے پورے کئے۔ پھر اسکے چند ہی مہینوں کے بعد دسمبر ۱۹۷۶ء میں والدہ صاحبہ کا انتقال ہو گیا۔ مارچ ۱۹۷۷ء میں بڑے بھائی عزیزالرحمٰن صاحب بھی چل بسے۔ ان دونوں حادثوں کے بعد وہ ایکبار پھر گھر آئے۔ اور چند روز رہ کر علی گڑھ چلے گئے۔ اس کے بعد بدقسمتی سے انہیں پھر اپنے آبائی وطن آنا نصیب نہ ہوا۔ اس اثنا میں اُن سے خط و کتابت بھی بہت کم ہوئی۔ چونکہ طارق سلمہٗ بسلسلۂ تعلیم علیگڑھ میں مقیم تھے۔ اس لئے اُن کے ذریعہ ان کے حالات معلوم ہوتے رہے۔ اور انہیں کے ذریعہ بعض انکی مطبوعہ کتابیں ملتی رہیں۔ طارق سے معلوم ہوا کہ چچا مکان بنوا رہے ہیں۔ تعمیر مکان کے سلسلے میں زیادہ دوڑ دھوپ کرنے سے انکی صحت بگڑ گئی ہے۔ پھر معلوم ہوا کہ اُن کو یرقان ہو گیا۔ چونکہ بیماریاں آئے دن لگی رہتی ہیں۔ اسلئے خیال ہوا کہ اچھے ہو جائیں گے۔ پھر اسکے ایک سال کے بعد بمبئی میں نوجوان شاعر اور ادیب عبداللہ کمال نے بڑی تشویشناک انداز میں انکی بیماری کا تذکرہ کیا۔ تو میں نے ارادہ کیا کہ جب بمبئی میں گرمیوں کی تعطیل ہوگی تو اُن کو دیکھنے علی گڑھ چلا جاؤں گا۔ میں نے اپنا ارادہ ظاہر کیا تو مجھے بتایا گیا وہ گرمیوں میں کشمیر جانے کا پروگرام بنا چکے ہیں۔ مجبوراً ارادہ ملتوی کر دیا۔ کشمیر میں تقریباً چار ماہ اپنے ہم زلف کمال احمد صدیقی صاحب ڈپٹی چیف پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو کے یہاں رہے۔ علاج بھی ہوتا رہا۔ اور وہاں کی آب و ہوا بھی ان کے لئے مفید ثابت ہوئی۔ صحت کچھ کچھ بحال ہو گئی۔ خوش خوش علیگڑھ آئے۔ واپسی میں جہاں اپنے بال بچوں کے لئے بہت سی چیزیں لائے وہاں مجھے بھی یاد رکھا اور میرے لئے نہایت قیمتی شال خریدی۔ اب ان کی بیماری کے متعلق اطمینان بخش خبریں ملنے لگیں۔ دوسرے سال

یعنی ۲۱ر نومبر ۷۰ء کو بذریعہ خط کے ذریعہ اطلاع دی کہ میں ۲۹ر نومبر کو جامعہ اردو کے جلسۂ تقسیم اسناد میں شرکت کی غرض سے بمبئی آرہا ہوں۔ ۲۸ر اور ۲۹ر کو ڈاکٹر رفیق زکریا کا مہمان رہوں گا۔ میرے دوست حاجی نیاز کا بہت اصرار ہے کہ میں مولانا کے یہاں قیام کروں۔ میں نے بھی یہی بہتر سمجھا کہ حاجی کے پاس مکان کشادہ ہے ان کے پاس قیام میں انکو زیادہ آرام اور سہولت ملے گی۔ چنانچہ حسب اطلاع بمبئی آئے۔ دیکھا تو انکی صورت بالکل بدلی ہوئی تھی۔ توانائی اور رعنائی ختم ہوچکی تھی۔ ان کی کمزوری اور لاغری دیکھ کر بڑا قلق ہوا۔ اپنے کرم فرما حکیم محمد یحییٰ اصلاحی کے پاس لے گیا تو انھوں نے بھی یہی تشخیص کیا کہ جگر کام نہیں کر رہا ہے اس لئے خون نہیں بن رہا ہے۔ اتنا لمبا سفر اپنی قوت ارادی اور ہمت کی بدولت کیا۔ بہرحال: جامعہ اُردو کے پروگرام میں شرکت کی۔ اس موقع پر ہمارے ہم وطن، عزیز و رشتہ دار جو بمبئی میں مقیم ہیں۔ اُن سے ملنے آئے۔ بہتوں نے دعوتیں دیں۔ لیکن اپنی بیماری اور پرہیز کی وجہ سے عذر کرتے رہے۔ میرے مخلص دوست مولوی مستقیم احسن اعظمی کی دعوت محض ان کے بے پناہ خلوص اور حد درجہ اصرار پر قبول کی۔ بمبئی کے اس قیام کے دوران حاجی نیاز نے ان کے آرام و آسائش کیلئے خاص اہتمام رکھا۔ بڑے خوش رہے۔ پھر مولوی مستقیم اور حاجی نیاز کے ساتھ انڈیا گیٹ، چوپاٹی، وا کیفور کی سیر و تفریح بھی کی۔ کچھ دیر کیلئے مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر میں بھی آئے۔ ان کی آمد سے فائدہ اٹھاتے ہوئے احمد سیلر ہائی اسکول، محمدیہ ہائی اسکول، انجمن اسلام ہائی اسکول بوری بندر کے اسٹاف نے انکو اپنے یہاں مدعو کیا۔ طلبہ و اساتذہ کے سامنے اُن سے تقریریں کرائیں۔ اس سلسلے میں نعیم عثمانی، شمیم عثمانی اور فیروز عثمانی پیش پیش رہے۔ ایک ہفتہ بمبئی میں ٹھہرے رہے اور نہایت خوش خوش علیگڑھ واپس گئے۔

میں اس وقت شاہ وجیہ الدین گجراتی پر کتاب لکھ رہا ہوں۔ اس سلسلے میں بعض ان کی قلمی کتابوں کے بارے میں اپنے پھوپھی زاد بھائی مولانا اختر احسن اصلاحی مرحوم کے نواسے مولوی اجمل اصلاحی ندوی کو خط لکھا تھا کہ مولانا آزاد لائبریری میں ہوں تو مطلع کریں۔ اُنہوں نے چند مخطوطات کی موجودگی کی اطلاع دی تو میں نے گرمیوں کی چھٹی میں علیگڑھ اور رامپور جانے کا پروگرام بنایا۔ اور اس سلسلے میں خلیل شاعر بھی الرحمن کو بھی لکھا۔ اُنہوں نے اسکے جواب میں جو خط لکھا وہی اُن کا میرے نام آخری خط ثابت ہوا۔

اُردو باغ، سرسید نگر۔ علی گڑھ۔

۴ر اپریل ۷۸ء

برادر مکرم و محترم: السلام علیکم

آپکا کیم اپریل کا خط کل ملا۔ حالات معلوم ہوئے۔ بمبئی سے واپسی کے بعد میری کچھ ایسی مصروفیات رہیں کہ آپکو خط نہ لکھ سکا صرف حاجی نیاز احمد کو اپنے بخیریت پہنچنے کی رسید لکھدی تھی۔ واقعہ یہ ہے کہ بمبئی کا سفر بہت خوشگوار رہا۔ اس مرتبہ علمی اور ادبی حلقوں سے نکل آیا تھا۔ اس لئے زیادہ لطف اور اپنائیت محسوس ہوئی۔ اپنے دیار کے لوگوں کی محبت اور مہمان نوازی کو میں کبھی نہیں بھول سکتا۔ خاص طور سے مولوی مستقیم صاحب سے ملکر تو بیحد مسرت ہوئی۔ اس زمانے میں ایسے مخلص اور زندہ دل لوگ بہت کم ملتے ہیں۔ فیروز عثمانی اور دوسرے اپنے دیار کے لوگ بھی بڑی محبت سے پیش آئے۔ سب لوگوں سے میرا سلام کہدیں۔ احمد سیلر اسکول۔ محمدیہ اسکول اور انجمن اسلام کے تمام ملاقاتیوں کو میری یاد دلا دیں۔

شیخ برہان پوری صاحب کا خط ملا تھا۔ ان کو میرا بہت بہت سلام کہدیں اور میری طرف سے اطمینان دلا دیں۔ آپ مئی کے اواخر میں علیگڑھ ضرور تشریف لائیے۔ اگرچہ اُس وقت یہاں قیامت کی گرمی پڑ رہی ہوگی۔ لُو کے جھکڑ اور طوفانی ہوائیں چل رہی ہوں گی۔ مگر امسال ہماری یونیورسٹی میں پڑھائی دیر سے شروع ہوئی تھی اسلئے گرمی کی تعطیلات یکم جون سے ہونگی۔ طلبہ کے امتحانات جون میں بھی چلتے رہیں گے۔ طارق اور اجمل یقیناً یہاں موجود ہوں گے۔

میری صحت فی الجملہ ٹھیک ہے۔ البتہ بدن میں خون کے ذرات کی اب بھی کمی ہے۔ ہومیو پیتھی کا علاج کر رہا ہوں۔ اور اس سے کافی فائدہ بھی ہے۔ کوئی تشویش

کی بات نہیں۔ میری کتاب "مضامین نو" پر یو پی اکیڈمی نے ڈیڑھ ہزار روپے کا انعام دیا ہے۔ کتاب کی تعداد کاپیاں اکیڈمی کو داخل کرنی پڑیں۔ کچھ مقامی احباب میں تقسیم ہو گئیں۔ ناشر نے کچھ اور کاپیاں دینے کا وعدہ کیا ہے ایک آپ کے لئے منگوا لوں گا۔ تم جب تشریف لائیں گے تو پیش کر دوں گا۔ عبدالستار دلوی صاحب کو سلام محبت۔ حکیم بنت راصلاحی کو بھی سلام و نیاز۔ بیگم سلام کہتی ہیں اور بچے آداب بجا لاتے ہیں۔

آپکا خلیل الرحمان

میں ۲۲ مئی شام کو علیگڑھ پہونچا' اسوقت طبیعت اچھی تھی۔ اور بشاش بشاش تھے۔ اپنے بچوں کو بلایا۔ کامران' سلمان' عزیز اور عرفان کو بتایا کہ یہ تمہارے بڑے ابا ہیں۔ گھر میں بڑی مسرت کی فضا اور چہل پہل تھی۔ دوسرے دن مجھے اپنے ساتھ یونیورسٹی لے گئے۔ اپنے شعبے کے لوگوں سے تعارف کرایا۔ پھر ہم لوگ مولانا آزاد لائبریری گئے۔ اسکے سے ملاقات کرائی۔ مخطوطات سے استفادہ اور نقل کی اجازت لی۔ اور پھر مجھے چھوڑ کر چلے گئے۔ اسکے بعد سے میرا معمول ہو گیا کہ میں روزانہ ناشتہ کر کے لائبریری چلا جاتا اور تقریباً دو بجے واپس آتا۔ جب تک میں گھر آنا جاتا اس وقت تک کھانے پر انتظار کرتے۔ چار پانچ روز نہایت اچھے گذرے۔ اس درمیان ان کے احباب میں سے جتنے لوگ آتے سب سے میرا تعارف کراتے۔ اور میری تصنیفات کا ذکر کرتے۔ پھر جب اطمینان سے بیٹھتے تو مختلف موضوعات پر گفتگو کرتے۔ انکی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ انھوں نے ادھر مذہبی کتابیں بھی کافی پڑھ لی ہیں۔ ان کے خیالات میں کافی تبدیلی بھی آگئی ہے۔ نادر الدین خاں جو ان کے شعبے سے تعلق رکھتے ہیں۔ اُن کے توسط سے بہت سے علما و مشائخ سے بھی ربط پیدا ہو گیا ہے۔ پھر خود ہی ایک دفعہ بتایا کہ وقت کی اہم دینی شخصیت شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب سہارنپوری کی خدمت میں حاضری دی ہے اور وہاں تقریباً ایک ہفتہ رہا ہوں۔ اس مدت قیام میں اپنے بزرگوں کا تذکرہ بھی اکثر کرتے۔ اور یہ بھی بتایا کہ کئی مرتبہ خواب میں والد صاحب کی زیارت ہوئی ہے۔ پھر یکایک ان کی طبیعت خراب ہوئی۔ گردن اور ہاتھ پیروں میں رعشہ شروع ہو گیا۔ طارق اور کامران انکو راتوں رات اسپتال لے گئے اور دوسرے دن وہ گھر واپس آ گئے۔ لیکن کئی دن تک درد سے کراہتے رہے۔ اور کہتے پیٹ میں بھی کبھی جلن ہوتی ہے۔ پھر جب انکے درد میں کمی آئی۔ اور میں نے دیکھا کہ اب وہ دوسیحت ہیں۔ تو ان سے کہا کہ چھٹیاں قریب الختم ہیں۔ اور یہ گھر میں رامپور بھی جانا ہے کیا کروں؟ کہنے لگے کہ میں تو مستقل مریض ہوں بیٹھے بیٹھے یہ حال ہو جایا کرتا ہے آپ جائیے۔ چنانچہ جب میں ان سے رخصت ہونے لگا تو بے اختیار ہاتھ پکڑ کر رونے لگے۔ اور بڑی دیر تک روتے رہے۔ میں نے بادیدۂ نم اُن کو الوداع کہا۔ طارق اور اجمل کے ہمراہ علیگڑھ شہر بس اسٹینڈ کے لئے روانہ ہوا۔ لیکن طبیعت بے چین رہی۔ دونوں سے کہا بھی کہ کیا میں لوٹ چلوں؟ لیکن انہوں نے اطمینان دلایا۔ طارق کو علاج و معالجہ کے فن سے آگاہی بھی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ایسا کئی بار ہو چکا ہے۔ آپ گھبرانے کی ضرورت نہیں ابے اچھے ہو جائیں گے۔ ان کے کہنے پر گیارہ بجے دن کی بس سے رامپور روانہ ہو گیا۔ پانچ بجے شام کو پہونچا۔ رضا لائبریری کا وقت ختم نہیں ہوا تھا۔ اس لئے مولانا امتیاز علی عرشی اور انکے صاحبزادے اکبر علی خاں (عرشی زادہ) سے ملاقات ہو گئی۔ عرشی زادہ صاحب نے مہمان خانے میں قیام کا انتظام کیا۔ اور کہا کہ شام میں مغرب بعد کھانا ساتھ کھائیے۔ مغرب بعد عرشی صاحب کے مکان پر گیا۔ کھانا کھا کر دروازے سے باہر نکلا تو تار والے نے تار ہاتھ میں دیدیا۔ تو دل دھک سے ہو گیا۔ طارق نے اطلاع دی تھی کہ چچا دو بجے ہم لوگوں سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔ اِنّا لِلّٰہ واِنّا اِلَیہ رَاجعون ط ـــــ دل تھام کر رہ گیا۔ اب فکر ہوئی کہ راتوں رات کیسے پہونچوں۔ بہت دوڑ دھوپ کی' لیکن بروقت سواری کا انتظام نہ ہو سکا۔ اور علیگڑھ پہونچا بھی تو اس وقت جب کہ لوگ میرے بھائی کو کئی من مٹی کے نیچے چھپا آئے تھے اپنی بدقسمتی پہ ہاتھ مل کر رہ گیا۔ گھر والے اس لئے بھی زیادہ دیر تک میرا انتظار نہیں کیا کہ گرمی بڑی شدت کی تھی۔ تاخیر مناسب نہ تھی۔ علیگڑھ پہنچتے ہی منوطلے قبرستان گیا اور وہاں ان کی لحد دیکھ کر طبیعت بے قابو ہو گئی۔ موت کی بانسری پر زندگی کا نغمہ گانے والا آج کتنا خاموش تھا۔ اپنے عزیز بھائی کی جدائی پر میری زبان پر بھی وہی الفاظ بار بار آ رہے تھے جو دنیا کے سب سے بڑے انسان (روحی فداہ) نے اپنے صاحبزادے کی وفات پر کہے تھے: تدمع العین ویحزن القلب ولا نقول اِلّا ما یرضیٰ

(باقی صفحہ ۲۰۴ پر دیکھئے)

حامد مسعود

خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے گھر میں

بیگم راشدہ خلیل سے ایک انٹرویو

مشہور شاعر اور نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی نے سال بھر ہوا اس دنیا سے منہ موڑ لیا۔ اس عرصہ میں ان کے غم میں ہندوستان اور پاکستان کے ادب نوازوں نے لاتعداد تعزیتی جلسے کئے اور مکاتیب نذر عقیدت قائم کئے۔ ادیبوں اور شاعروں نے مرحوم فن کار کی شعری اور تنقیدی معنویت کی اہمیت پر روشنی ڈالی۔ اور کچھ نے خراج تحسین پیش کیا۔ ایسے وقت کس میں ہمت تھی جو راشدہ خلیل سے اس گھر آنگن کے حالات پوچھتا جس کی رازدار خلیل صاحب اور انکی ذات رہی ہے۔ وہی راشدہ مریم جنھیں خلیل صاحب نے "نیا عہد نامہ" نذر کرتے ہوئے یوں مخاطب کیا تھا ؎

در عشق غنچہ ایم کہ لرزد ز باد صبح   در کار زندگی صفت سنگ خارا ایم

یکم جون کے سانحے نے راشدہ کو سُن کر دیا تھا۔ مدیر "شاعر" ان کے گھر آنگن کی تصویر مرتب کرانے کے خواہشمند تھے۔ کافی عرصہ تک یہ کام صبر آزما بنا رہا پھر وہ سنبھلیں تو میں نے ہمت کی۔ مئی کے آخری ہفتہ میں ان کے مکان اردو باغ میں ہماری باتیں ہوئیں۔ جنھیں انٹرویو کی شکل میں "شاعر" کے لئے ترتیب دیا گیا ہے

س: آپ پیلی بھیت کی رہنے والی ہیں اور خلیل صاحب کا تعلق اعظم گڑھ اور علی گڑھ سے رہا ہے۔ یہ بتائیے کہ آپکا ان سے کیسے رشتہ ہوا؟

ج: میری شادی سہیل عظیم آبادی کے ذریعے طے ہوئی تھی۔ میری بڑی بہن کی شادی دو سال قبل کمال احمد صدیقی (چیف ڈپٹی پروڈیوسر آل انڈیا ریڈیو) کے ساتھ ہو چکی تھی۔ اس وقت وہ کشمیر میں تھے۔ سہیل بھیا بھی وہاں براڈکاسٹنگ ہاؤس میں ملازم تھے۔ اور کمال بھائی کے پڑوس میں رہتے تھے۔ اتفاق سے میرے والد صاحب کا کشمیر جانا ہوا۔ وہیں سہیل بھیا سے ابا کی ملاقات ہوئی انھوں نے خلیل صاحب کا پیغام میرے لئے دیا اور بتایا کہ میں اپنی ذمہ داری پر یہ پیغام دے رہا ہوں کیونکہ خلیل مجھے چھوٹے بھائی کی طرح عزیز ہے۔ اور واقعی سہیل بھیا خلیل صاحب سے بیحد محبت کرتے تھے۔

س: خلیل صاحب کو اس طرح پیغام دینے پر کوئی اعتراض نہیں ہوا؟

ج: خلیل صاحب کو جب اس پیغام کا علم ہوا تو انھیں کوئی اعتراض نہیں ہوا۔ انھوں نے سہیل بھیا سے کہا کہ آپ جہاں بھی میری شادی طے کر دیں گے میں بخوشی قبول کر لوں گا۔ آپ کو تعجب ہوگا کہ انھوں نے میرے گھر والوں سے ملنے اور مجھے دیکھنے کی بھی خواہش نہیں کی۔ اس طرح یہ شادی طے ہو گئی۔ میرا نکاح تو جولائی ۵۷ء میں ہوا لیکن رخصتی ۱۲ نومبر ۵۷ء کو ہوئی۔

س: رخصتی کس جگہ سے ہوئی اور بارات میں کون کون لوگ شامل تھے؟

ج: میری رخصتی جہان آباد ضلع پیلی بھیت سے ہوئی تھی۔ باراتیوں میں سہیل بھیا کے علاوہ ریاض الدین قیصر، شہاب الدین جعفری وقار جعفری، شاہد مہدی، حسن مثنیٰ انور، امین اشرف اور کنور صاحب شامل تھے۔

س: کیا شادی سے قبل آپ کو خلیل صاحب کی کوئی نظم یا غزل پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا؟

ج: میں نے شادی سے قبل خلیل صاحب کی کوئی نظم، غزل یا مضمون نہیں دیکھا تھا۔ سسرے میکے میں شعر و ادب کا چلن نہیں تھا۔ میں ادبی دنیا سے قطعی ناواقف تھی۔ اور نہ میرے گھر والے ہی جانتے تھے کہ یہ نامور مشہور شاعر و ادیب ہے۔

س: یہ شاید اس لئے کہ شادی کے لئے عام طور سے لڑکے کے برسرِ روزگار ہونے ہی کو ترجیح دی جاتی ہے۔

ج: جی ہاں! اور یہ مجھے سرسری طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ خلیل صاحب علی گڑھ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں لکچرر ہیں۔ میری عمر پندرہ سولہ سال کے لگ بھگ تھی۔ اور پھر میرے گھرانے میں جب لڑکیوں کی بات طے کی جاتی تھی تو ان سے کوئی مطلب نہیں ہوتا تھا۔ اور نہ ہی ان سے کوئی مشورہ لیا جاتا تھا۔ مجھے اس وقت کچھ خبر نہیں تھی کہ خلیل صاحب کی کیا اہمیت ہے۔ یہ سب تو مجھے خلیل صاحب کے گھر آکر پتہ چلا۔

س: مثلاً آپ کو پتہ چلا کہ خلیل صاحب شاعر ہیں۔ تو خلیل صاحب کے شاعر ہونے کی وجہ سے آپ نے اپنی اور دوسری شادی شدہ لڑکیوں کی زندگی میں کوئی فرق محسوس کیا؟

ج: میں نے کبھی کسی قسم کا کوئی فرق محسوس نہیں کیا۔ بلکہ جب مجھے اور شاعروں کی گھریلو زندگیوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا تو میں نے ہمیشہ خود کو خوش نصیب پایا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ خلیل صاحب میں احساسِ ذمہ داری بہت زیادہ تھا۔ اور وہ میرے سامنے اپنی ادبی شخصیت جتانے کے بجائے شوہر کے روپ میں رہنا پسند کرتے تھے۔ اور شوہر بھی ایسا جو مخلص ہو۔

س: خلیل صاحب کا جیون ساتھی کے لئے تصور بھی صحت مند تھا۔ زندگی کے ساتھی سے وہ ہم آہنگی کے قائل تھے۔ ۱۹۵۷ء اور ۵۸ء میں انھوں نے جو چند نظمیں کہی ہیں مثلاً بھیرویں، آنچل کی چھاؤں میں اور سایۂ دیوار وغیرہ میں گھریلو فضا کی خوشبو رچی ہوئی ہے۔ ان نظموں میں "رانی" اور "بلکشی" کا ذکر ہوا ہے وہ محض [illegible] نہیں بلکہ رفیقِ حیات ہے۔ جس کے ساتھ دکھ سکھ بانٹنے [illegible] مچلتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ کیا خلیل صاحب نے

شاعر، بھی

کبھی آپ کو بتایا کہ یہ نظمیں انھوں نے آپ کے لئے کہی ہیں؟

ج: مجھے تو انھوں نے نہیں بتایا۔

س: کیا خلیل صاحب آپ سے اپنی شاعری کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے تھے؟

ج: خلیل صاحب عام طور سے گفتگو نہیں کرتے تھے۔ ہماری باتیں دوسری مشترک دلچسپیوں کے بارے میں ہوتی تھیں۔ انھوں نے کبھی مجھ پر اپنی علمیت کا رعب نہیں ڈالا۔ اور میں اُن کے اس برتاؤ کو اُن کی بڑائی سمجھتی ہوں۔ اور اسی لئے کہیں ادب سے دُور رہ کر بھی اُن سے بہت قریب رہی ہوں۔ جب شادی کے بعد علی گڑھ آنے پر یہاں کے ماحول کو دیکھ کر میرے اندر احساس پیدا ہوتا کہ یہاں بیشتر خواتین اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔ گھر میں اُن سے کہتی کہ میں بھی تعلیم شروع کر دوں۔ تو وہ کہتے کبھی اگر مجھے بہت پڑھی لکھی بیوی کی ضرورت ہوتی تو میں وہاں اتنی دُور تم سے کیوں شادی کرتا۔ کیا یہاں پڑھی لکھی لڑکیوں کی کمی تھی۔ ان کا نظریہ تھا کہ میں اپنا مطالعہ جاری رکھوں مگر اس کی ضرورت نہیں ہے کہ ڈگری حاصل کرنے کی لالچ میں پڑوں۔ انھوں نے مجھے کبھی اس کمتری کا احساس نہیں ہونے دیا کہ میں ڈگری یافتہ نہیں ہوں۔ وہ تو برابر یہ کہتے تھے کہ مجھے اتنی تعلیم پسند ہے کہ عورت گھر کو سلیقہ سے چلا سکے، مجھے نوکری نہیں کروانی ہے۔ جو اللہ نے دیا ہے وہ بہت ہے۔

س: تو اس سے اچھی طرح واضح ہو جاتا ہے کہ "آنچل کے سایہ میں" اور "سایۂ دیوار" کی مخاطب آپ ہی ہیں ـــ خلیل صاحب کے تعلقات آپ کے عزیزوں کے ساتھ کیسے رہے؟

ج: بڑا محبت بھرا برتاؤ رہا خلیل صاحب کا۔ وہ میری والدہ، والد، بہنوں اور بھائیوں کا بہت خیال رکھتے تھے۔ اور ہمیشہ ان کے لئے فکرمند رہتے تھے۔ میری چھوٹی بہن کی شادی صغیر احمد صوفی سے انھوں نے ہی کرائی تھی۔ میری والدہ کو اصرار کے ساتھ اپنے یہاں ٹھہراتے۔ دراصل وہ کنبے اور گھریلو تعلقات کے بڑے طلب گار رہتے تھے۔

س: خلیل صاحب نے ترک وطن کب کیا۔ اپنی جلاوطنی کا تذکرہ آپ سے کیا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ خاندانی حالات اس کے

ذمّہ دار ہوں گے۔

ج: خلیل صاحب کے والد مولوی محمد شفیع خاں اصلاحی تھے۔ یہ سدھا سلطان پور اعظم گڑھ میں ایک گاؤں ہے وہاں کے رہنے والے تھے۔ میرے سسر صاحب نے سرائے میر ضلع اعظم گڑھ میں مدرسۃ الاصلاح قائم کیا۔ ان کے چار بیٹے تھے۔ سب سے بڑے عزیز الرحمٰن اصلاحی اور دوسرے حبیب الرحمٰن اصلاحی، تیسرے عبدالرحمٰن پرواز اصلاحی اور چوتھے خلیل الرحمٰن اعظمی تھے۔ ایک چھوٹی بہن صغریٰ خانم ہیں۔ خلیل صاحب نے مجھے بتایا کہ ۱۹۴۵ء میں انھوں نے شبلی اسکول اعظم گڑھ سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ دوران امتحان انکے والد صاحب کا انتقال ہوگیا۔ نتیجہ نکلنے کے بعد جب انھوں نے آئندہ تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ ظاہر کیا تو گھر کے سبھی لوگ خفا ہوگئے۔ چونکہ ان کے گھرانے میں انگریزی تعلیم بیکار خیال کی جاتی تھی، اس لئے لوگ خلاف تھے۔ اور کسی طرح ان کو آگے پڑھانے پر آمادہ نہ تھے۔ مگر خلیل صاحب دھن کے پکے تھے۔ انہوں نے سوچ لیا کہ علی گڑھ جاکے پڑھنا ہے۔ خاندان کے لوگوں نے طعنہ دیا کہ دیکھنا ہے کچھ دنوں کے بعد جب ٹھوکریں کھائے گا تو خود واپس آجائے گا۔ وہ بتاتے تھے کہ میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر میں اپنی تعلیم جاری نہ رکھ سکا اور اپنا کیریئر نہ بنا سکا۔ تو گھر نہیں جاؤں گا۔ اور انہوں نے یہ کرکے دکھا دیا۔ گھر والوں سے ایک پیسہ نہیں لیا۔ اور اپنی جدوجہد سے تعلیم حاصل کی یہاں تک کہ اپنی شادی بھی خود ہی کی۔ میری شادی کے کچھ ہی دن بعد خلیل صاحب کے بڑے بھائی عزیز الرحمٰن صاحب اپنے بیٹے طارق عزیز کو لیکر ہمارے یہاں آئے اور کہا کہ میں اپنے لڑکے کو علی گڑھ میں پڑھوانا چاہتا ہوں۔ یہ تمہارا کام ہے کہ اس کی ذمّہ داری لے لو۔ خلیل صاحب بخوشی تیار ہوگئے۔ اس کے بعد طارق عزیز خلیل صاحب کی سرپرستی میں میرے گھر نو سال رہا۔ اس نے ایم ایس سی کے بعد حال ہی میں پی ایچ ڈی مکمل کی ہے۔ خلیل صاحب نے نو سال تک اسے تعلیم دلوائی مگر ان کا ظرف دیکھئے کہ گھر والوں کے رویّے کا اس بچّے کے سامنے ذکر نہیں کیا۔ عزیز الرحمٰن صاحب بس پہلی اور آخری بار میرے گھر آئے تھے۔ منجھلے بھائی حبیب الرحمٰن صاحب کلکتہ کے عربی مدرسہ میں پڑھاتے ہیں۔ ان کی ملاقات خلیل صاحب سے گھر سے نکلنے کے بعد پھر کبھی نہیں ہوئی۔ انھوں نے کبھی خط نہیں بھیجا حد تو یہ ہے کہ خلیل صاحب کے انتقال پر تعزیتی خط بھی نہیں لکھا۔ وہ خلیل صاحب کی اعلیٰ تعلیم سے سخت ناراض تھے۔

اس وقت مجھے خلیل صاحب کا وہ سفر یاد آرہا ہے جب تقریباً اٹھارہ سال کے بعد وہ بڑے بیٹے کامران کو لیکر اپنی والدہ سے ملنے سدھا سلطان پور پہونچے۔ کامران اسوقت غالباً تیسری یا چوتھی جماعت میں پڑھ رہا تھا۔ گرمی کی تعطیلات کا زمانہ تھا۔ خلیل صاحب نے جب وطن جانے کا ارادہ کرلیا تو ہمہ تن اس کی تیاری میں مصروف ہوگئے۔ اپنی والدہ، بھائی، بھاوج اور بچوں کے لئے کپڑے بنوائے۔ تولئے، چادریں، چائے کے ڈبے، چائے کا سٹ، غرض کہ جتنا ممکن ہو سکتا تھا، سامان لے گئے۔ اپنی مسجد کے امام صاحب کے لئے خوب بڑا سا کرتا بنوایا۔ وہ انکے لئے تحفہ تھا۔ مدرسۃ الاصلاح کے لئے بہت سی کتابیں اور رسالے لے گئے جو لائبریری کو دیں۔ یہ ساز و سامان لے کر جب وہ سرائے میر پہنچے تو ان کے بڑے بھائی عزیز الرحمٰن صاحب گاؤں کے کچھ دوسرے لوگوں کے ساتھ سرائے میر اسٹیشن تک آئے۔ خلیل صاحب اپنے گاؤں پہونچے تو نہایت تپاک سے استقبال ہوا۔ جلسے اور مشاعرے ہوئے۔ دعوتوں کا سلسلہ ختم ہونے میں نہ آتا تھا۔ اس طرح خلیل صاحب نے جو خواب دیکھا تھا وہ خاندان والوں کو پورا کر دکھایا۔

وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ آج اللہ نے مجھے آسودہ حال کیا ہے عزت دی ہے۔ اس لئے خاندان کے لوگ مجھے اپنا رشتہ دار بتاتے ہیں۔ اور ہر شخص دلچسپی لیتا ہے۔ اگر خدا اس کے برعکس کرتا تو کوئی مجھے اپنا رشتہ دار تسلیم نہ کرتا۔ کیونکہ طالب علمی کے دوران ان کے ایک رشتہ دار علی گڑھ آئے تھے تو انہوں نے ان سے ملنا بھی گوارہ نہ کیا۔ کیونکہ اسوقت انکی کوئی پوزیشن نہ تھی۔

س: اٹھارہ سال بعد خلیل صاحب کے وطن جانے کی روداد بہت پُراثر ہے۔ گاؤں والوں اور کنبے کے افراد نے حیرت اور مسرت سے دیکھا ہوگا۔ خاص طور سے خلیل صاحب کی والدہ کی خوشی ناقابلِ بیان ہوگی۔

ج: بس نہ پوچھئے! خلیل صاحب جب کامران کو لیکر اپنے گھر پہونچے

تو انکی والدہ اپنے گمشدہ بیٹے کو دیکھکر نہال ہوگئیں۔ کمو کو کسی وقت اپنی نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دیتی تھیں۔ اپنے ہاتھ سے کمو کے سر میں تیل اور آنکھوں میں کاجل لگاتیں، پنکھا جھلتیں۔

س: غالباً خلیل صاحب پھر اپنے گاؤں کئی بار گئے۔

ج: اس سفر کے کچھ ہی عرصہ بعد خلیل صاحب اپنی والدہ کے انتقال پر سلطان پور گئے۔ انکی والدہ کی وفات کے چار ہی ماہ بعد اچانک عزیز الرحمٰن صاحب بھی فوت ہوگئے۔ تب خلیل صاحب تعزیت کے لئے گئے، تو پھر اس کے بعد جانا نہیں ہوا۔

س: خلیل صاحب کا گھر سے نکلنا اور پھر عرصہ دراز بعد اسی گھر میں ایک دوسری شان سے پہونچنا، یہ پورا واقعہ خاص ڈرامائی کیفیت کا حامل ہے۔ یقیناً زندگی کی اس کشاکش نے خلیل صاحب کو جہاں حساس، محبت کا متلاشی بنایا وہاں ان کے اندر خود اعتمادی زبردست قوت ارادی اور اصول پسندی کو بھی جنم دیا تھا۔ کیا ایسی کچھ مثالیں انکی زندگی سے آپ دیں گی؟

ج: ایسی ان گنت مثالیں ہیں جنھیں بارہا لوگوں نے سراہا ہے۔ آپ نے اس وقت پوچھا تو مجھے خلیل صاحب کی اصول پرستی کی ایک دلچسپ مثال یاد آگئی۔ مجھ سے پہلے انکی شادی مسولی کے قدوائی خاندان میں ہونے والی تھی۔ سارے معاملات طے ہوگئے تھے۔ حتیٰ کہ بارات جانے میں صرف ایک دن رہ گیا تھا۔ اچانک وہاں سے تاریخ بڑھانے کا پیغام آگیا اور بہانہ یہ کیا گیا کہ والدین حج کو جارہے ہیں۔ ہفتہ بھر بعد شادی ہوسکے گی۔ دراصل ان لوگوں کو یہ اطلاع ملی تھی کہ لڑکا کمیونسٹ ہے۔ چنانچہ اُنہوں نے تحقیق کرکے اپنا اطمینان کرلینا چاہا تھا۔ جب خلیل صاحب کو معلوم ہوا تو بہت برہم ہوئے۔ بعد میں ہر طرح سے ان لوگوں نے راضی کرنا چاہا مگر وہ کسی قیمت پر تیار نہیں ہوئے۔ اس خاندان کے ڈھیروں خطوط آج بھی خطوں کے ذخیرے میں موجود ہیں۔ جن میں لڑکی والوں نے بہت معذرت کی، معافی چاہی مگر وہ اپنی بات پر اٹل رہے۔

س: خلیل صاحب کے گھر کی کشتی آپ ہی کو بننا تھی آخر — جب آپ میکے جاتی تھیں تو خلیل صاحب آپ کو خطوط بھی لکھتے رہے ہونگے؟ یہ خطوط کس نوعیت کے ہوتے تھے؟

ج: جب میں میکے جاتی تھی تو خلیل صاحب تقریباً روزانہ ایک خط مجھے لکھا کرتے تھے۔ میں تو خط لکھنے میں بہت کاہل تھی۔ مگر وہ پابندی سے خط بھیجتے تھے۔ جس پر گھر کا کل احوال ہوتا تھا۔ بڑے دلچسپ خطوط ہوتے تھے۔ ان خطوں میں اپنے دوستوں کے تذکرے سے لیکر اپنی بلی کا حال تک بڑی تفصیل سے لکھتے تھے۔ میرے نہ ہونے کا جو احساس اُن کو ہوتا تھا اور جیسی تنہائی وہ محسوس کرتے تھے اس کا پورا نقشہ کھینچا کرتے تھے۔ اور جلد گھر آنے کی تاکید ہوتی تھی۔ اور یہ بھی لکھتے کہ تم تو اپنی ماں بہنوں اور بھائیوں میں خوش ہوگی مگر میرا عجیب حال ہے، اس لئے جلد آنے کی کوشش کرو۔ وہ سارے خطوط میرے پاس موجود ہیں۔ آخری بار سرینگر سے واپسی پر انھوں نے ان خطوط پر نمبر ڈالکر ان کا فائل بنا دیا تھا۔ یہ کل ایک سو اسّی خطوط ہیں۔

س: لوگ کہتے ہیں کہ شادی سے قبل انکی زندگی میں بے راہ روی تھی۔ کیا ان کی زندگی میں نظم و ضبط پیدا کرنے میں آپکی کوششوں کا دخل ہے؟

ج: خلیل صاحب کی زندگی میں کیا بے راہ روی تھی، اسکے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتی کیونکہ اس وقت علی گڑھ میں بہت سے لوگ موجود ہیں جو میری شادی سے قبل اور پھر بعد تک اُن کے ہم نشیں رہ چکے ہیں چنانچہ بے راہ روی کے بارے میں وہی بیان کرسکتے ہیں مگر میں تو ایک سیدھی بات جانتی ہوں کہ جس وقت ہماری شادی ہوئی، اس وقت ان کی تنخواہ کل ڈھائی سو روپے تھی، پچاس روپے آنند بھون والے مکان کا کرایہ تھا۔ پھر ڈیوٹی سوسائٹی کے قرضہ کی قسط بھی ادا کرنی ہوتی تھی۔ اس کے باوجود اس آمدنی میں ہماری گذر بسر بخوبی ہوجایا کرتی تھی۔ خلیل صاحب میں اگر کوئی بے راہ روی ہوگی بھی تو کم از کم ان کی زندگی میں داخل ہوکر میں نے کوئی دکھ نہیں اُٹھایا۔ اور نہ کسی بات کے لئے میں نے انھیں سختی سے منع کیا۔ میں نے ابھی آپ کو ان کے ذمہ داری کے احساس کے بارے میں بتایا تھا۔ بے راہ روی تو اس کی ضد ہے۔

س: خلیل صاحب کے دوستوں کا حلقہ بڑا وسیع ہے۔ اس کے بارے میں بتائیے۔

ج: جب میری شادی ہوئی تو اس وقت ان کے گھر میں شہریار اکثر رہتے

تھے۔ جنھیں خلیل صاحب اور میں کنور صاحب کہتے ہیں اور وہ دوستوں میں شہاب جعفری، حسن مثنوی، انور، وقار جعفری، انور معظم اور شاہد مہدی کا برابر آنا جانا رہتا تھا۔ اور بھی احباب تھے۔ تقریباً روزانہ ہی دعوتیں ہوتیں، سینما جانے کا پروگرام بنتا۔ اور طرح طرح کی تفریحات رہتیں۔ یہ سمجھ لیجیے کہ سب کا دن رات کا ساتھ تھا۔ خلیل صاحب رشید کی صحبت میں ہنستے ہنستے رہتے تھے۔ خاص طور سے کنور صاحب سے تو بالکل چھوٹے بھائی کی طرح محبت کرتے تھے۔ انکی کوئی بات نہیں ٹال سکتے تھے۔ اُن کی یہ محبت آخری دم تک قائم رہی۔ محمود ہاشمی اکثر دلی سے آتے رہتے تھے۔ ہم لوگ بھی اُن کے یہاں جاتے تھے۔ خلیل صاحب اپنی طالب علمی کے دوستوں کے واقعات اور لطیفے ہنس ہنس کر سناتے تھے۔ اگر کوئی پُرانا ساتھی آجاتا تو مجھے ضرور ملواتے تھے۔

س: ادیبوں اور شاعروں سے تعلقات کا دائرہ تو اس سے بھی وسیع تر ہوگا؟

ج: اس میں شک نہیں کہ ان کے تعلقات کا دائرہ جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان کا شاید ہی کوئی ادیب ایسا ہوگا جو علیگڑھ آکر ہمارے یہاں نہ پہونچا ہو۔ بزرگوں میں آنند نرائن مُلّا، مالک رام، فراق گورکھپوری، مجنوں صاحب، اختر اورینوی، شکیل اختر، امتیاز علی عرشی، گیان چند جین، شکیل بدایونی وغیرہ کو میں نے اپنے گھر آتے دیکھا ہے۔ اس کے علاوہ نریش کمار شاد، جگن ناتھ آزاد، سردار جعفری، اختر الایمان، کیفی اعظمی، گوپال مِتّل، عمیق حنفی، کرشن موہن، بلراج کومل، عصمت چغتائی، سلمیٰ صدیقی، شاذ تمکنت، زبیر رضوی، کلام حیدری، جیلانی بانو، گوپی چند نارنگ، رام لعل، شمس الرحمٰن فاروقی وغیرہ چند ایسے نام ہیں جو ہمارے گھر گاہے گاہے آتے رہے۔ پورے نام تو یاد آنا مشکل ہیں۔ علیگڑھ میں آرزو صاحب اور ذوقی صاحب بھی ان کے دوستوں میں ہیں۔ وحید اختر پرانے دوست ہیں اور بعد کو شمیم حنفی بھی علیگڑھ آکر حلقۂ احباب کی بھیڑ میں شامل ہو گئے۔

س: [illegible] شاعر بھی

ج: رشید احمد صدیقی صاحب سے انھیں گہری عقیدت تھی۔ وہ ہمیشہ ان کی علمی بصیرت کے مداح رہے۔ رشید صاحب کا معمول تھا کہ جب بھی انھیں کسی علمی یا ادبی مسئلہ پر خلیل صاحب کی رائے معلوم کرنی ہوتی تو وہ اپنے ملازم کے ہاتھ ایک پرچہ بھیجا کرتے اور میں خلیل صاحب کو دیکھتی کہ وہ بڑی تیزی کے ساتھ اس پرچے کا جواب لکھ کر ملازم کے حوالے کر دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوا کہ انہوں نے کوئی کتاب منگوائی۔ میں نے کہا میں نکالے دیتی ہوں۔ لیکن وہ خود ہی کتاب نکال کر باہر دینے جاتے تھے۔ اتفاق ایسا ہوا کہ جب رشید صاحب کا انتقال ہوا تو خلیل صاحب بہت بیمار تھے۔ ریڈیو پر انتقال کی خبر سُنی تو سر پکڑ کر بیٹھ گئے اور کہنے لگے کہ میری بد قسمتی دیکھئے کہ جب میرے والد کا انتقال ہوا تو میں دسویں کا امتحان دے رہا تھا اعظم گڑھ کے شبلی کالج سے۔ اس لئے انکی تجہیز و تکفین میں شریک نہ ہو سکا۔ اس کے بعد میں رشید صاحب سے اتنی محبت کرتا تھا لیکن اُن کے آخری رسوم میں شریک نہیں ہو سکتا۔ پھر لحاف اُوڑھ کر لیٹ گئے۔ میں نے کھانے کے لئے پوچھا تو منع کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد اُٹھے اور کہنے لگے۔ رات ہی میں نے انکو رشید صاحب کو خواب میں دیکھا ہے۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ اچھا اعظمی صاحب اس شعر کا مطلب بتایئے ؎

مٹھیوں میں خاک لیکر دوست آئے وقتِ دفن
زندگی بھر کی محبت کا صلہ دینے لگے

کئی روز تک برابر رشید صاحب کا تذکرہ کرتے رہے۔ رشید صاحب کے بہت سے خطوط ان کے پاس محفوظ ہیں۔

س: اس لحاظ سے خلیل صاحب بھی خوش نصیب تھے کہ اُن کے اُستاد محترم کے جذبات بھی ان کے لئے تقریباً ایسے ہی تھے۔ میں نے بیگم رشید صدیقی کی زبانی سُنا کہ یونیورسٹی کی جانب سے رشید صاحب کو ڈاکٹریٹ آف لار کی آنریری ڈگری دی جانے والی تھی۔ جب اُن سے ذرا سی دیر کے لئے کانوکیشن ہال میں چلنے کے لئے کہا گیا تو انھوں نے کہا کہ اگر میں جا سکتا تو خلیل جو اتنے عرصے سے بیمار ہے اسے دیکھنے نہ جاتا ــــ یہ بتایئے کہ خلیل صاحب کی عام طور پر صحت کیسی رہتی تھی۔؟

ج: [illegible] پر بیماری کا حملہ اپنے تعمیر کردہ نئے مکان میں آ کر ہوا جس کو انھوں نے ۷۳ء میں بنوانا شروع کیا تھا۔ خلیل صاحب جس بات کی ٹھان لیتے تھے۔ اسے پورا کر کے چھوڑتے تھے۔ مکان کی تعمیر کی نگرانی اور فراہمیٔ سامان کی کل ذمہ داری انھوں نے تن تنہا جھیلی۔ اس میں وہ شب و روز لگے رہے۔ اپنی صحت کی بالکل پرواہ نہ کی۔ اس قدر سخت جسمانی محنت سے شل ہو کر وہ بیمار پڑ گئے۔ اتنا بڑا مکان تین ماہ کے اندر تقریباً مکمل کرا لیا۔ اور یہی بیماری کا سبب بن گیا۔

س: گُڈو کی آمد پر خلیل صاحب نے مسرّت سے سرشار ہو کر کہا تھا "اے میرے حسن و سال کے حاصل، میرے آنگن کے نودمیدہ گلاب" — تو اولاد کی تربیت میں خلیل صاحب نے کیا حصّہ لیا۔ ان کے مستقبل کے بارے میں انکی کیا خواہشات تھیں ؟

ج: خلیل صاحب بچّوں کی تربیت میں خاص دلچسپی لیتے تھے۔ اُنہیں ہمیشہ یہ فکر رہی کہ اُن کے بچّے ان سے زیادہ اچھے نکلیں اور بہتر سے بہتر تعلیم پائیں۔ انھوں نے بچّوں کو قرآن مجید اور اُردو پڑھانے کی طرف خاص توجّہ دی۔ گُڈو کے لئے جو نظم کہی ہے اسمیں انھوں نے اپنی تمنّاؤں کا اظہار کیا ہے۔ ببّجو (سلمان) اور اجّو (عدنان) سے بھی انہیں اتنا ہی لگاؤ تھا۔ بچّوں کی تعلیمی پروگریس سے وہ کبھی غافل نہیں رہے۔ پڑھنے کے ساتھ کھیل اور دوسرے غیر درسی مشاغل کی بھی ہمّت افزائی کرتے تھے۔ خیال اور محبّت میں وہ مجھ سے آگے آگے رہتے تھے۔ بعض اوقات اسی بات پر ہماری بحث ہو جاتی تھی۔ ۷۶ء میں ہما پیدا ہوئی تو خوش ہو کر کہنے لگے کہ اللہ کا شکر ہے اب کسی کی کمی نہیں ہے۔ تین بیٹوں کے بعد ہما جو پیدا ہوئی تو اب اسے بہت چاہتے تھے اور ہمیشہ بی بی کہہ کر پکارتے تھے۔

س: کیا آپ خلیل صاحب کی شخصیت سے مرعوب تھیں ؟

ج: اس کا جواب دینا مشکل ہے — بس یوں سمجھئے تھی بھی اور نہیں بھی۔ کیونکہ ان کی محبّت، بے تکلفی اور سادگی نے مجھے ہمیشہ ان سے بے تکلّف اور بے خوف رکھا۔ ایسا تعلق سمجھئے کہ جس میں دونوں طرف سے ایک دوسرے کا خیال مدِّنظر ہو۔ ایک طرف شاعر، بھی لحاظ کی صورت نہ ہو یہ تو ایک بات ہوتی، ہاں گھر میں ان کے علم اور فہم و فراست کی باتوں سے مرعوب ہوتی تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ خلیل صاحب کے آگے میرا وجود بالکل ایسا تھا جیسے سمندر میں تنکا۔ زندگی کے عام مسائل کا بھی وہ جس طرح حل نکالتے اور کہاتے اس سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے۔

س: خلیل صاحب شعر کس طرح کہتے تھے ؟ کیا آپ کو اندازہ ہو جاتا تھا کہ وہ اس وقت تخلیقی موڈ میں ہیں ؟

ج: میں دیکھتی کہ انھیں کچھ بےچینی سی ہو رہی ہے۔ کبھی لیٹے، کبھی اٹھتے، کبھی قلم ہاتھ میں ہے کبھی تکیہ کے نیچے رکھ لیا۔ چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار سے دیکھ کر میں سمجھ جاتی تھی کہ کچھ کہنے والے ہیں۔ اگر اس دوران میں کوئی ملنے والا آتا تو فوراً اس کیفیت سے سنبھل جاتے اور کہتے اندر بلا لو۔ پھر مہمان سے باتیں کرتے ہوئے کچھ کھوئے کھوئے سے رہتے تھے۔ جب وہ اُٹھ کر چلا جاتا تھا تو فوراً کاغذ قلم سنبھال لیتے تھے۔ انکی عادت تھی کہ کوئی پروگرام ہو، مشاعرے کا یا براڈ کاسٹ کرنے کے لئے کوئی مضمون ہو تو ہمیشہ صرف ایک دن پہلے لکھا کرتے تھے۔ مثلاً کل جانا ہے تو رات کو جب سب سو جائیں گے تو قلم لے کر بیٹھ جاتے اور مکمل کر کے سوتے تھے۔

س: خلیل صاحب کی تخلیق کی سب سے پہلی سامع آپ ہوتی تھیں ؟

ج: انھوں نے خاص طور سے مجھے اپنی کوئی تخلیق نہیں سنائی۔ وہ ہمیشہ اپنا کلام سب سے پہلے شہریار کو سنایا کرتے تھے۔ اس کے بعد کسی اور کو۔ انکی کوئی بھی تخلیق کسی رسالے میں چھپتی تو وہ رسالہ خود پڑھ کر رکھ لیتے تھے۔ جب میں کہتی کہ خلیل صاحب آپ نے مجھے نہیں دکھایا۔ تو کہتے ارے کیا خاص بات تھی جو بتاتے۔ انھوں نے کبھی مجھ پر اپنے شاعر یا ادیب ہونے کا رعب نہیں ڈالا۔ کبھی اپنی تخلیقات کی توصیف نہیں کی۔ حتیٰ کہ اپنی کوئی نئی چھپی ہوئی کتاب بھی خاص طور سے نہیں دکھائی۔ بس نظر پڑ گئی تو دیکھ لی۔ اکثر دہلی ریڈیو سے ریکارڈنگ کرا کے آتے تو یہ نہیں بتاتے کہ یہ پروگرام کب براڈکاسٹ ہو رہا ہے۔ بہت پوچھنے پر کہتے کیا میری آواز گھر پر نہیں سنتی ہو۔ اتفاق سے ریڈیو پر جب میں اور بچے ان کی آواز سنتے تو بہت خوش ہوتے۔ بچے کہتے یہ ابا بول رہے ہیں۔

س: خلیل صاحب مطالعہ کس طرح کرتے تھے؟

ج: پورا وقت جو خالی ہے مطالعہ کے لئے وقف تھا: کوئی رسالہ یا کتاب پڑھے بغیر رکھنا مشکل تھا۔ جب ڈاک آتی فوراً اس میں آئے ہوئے رسائل کھول کر پڑھنا شروع کر دیتے۔ اس وقت کوئی ملاقاتی آئے گا تو بار بار اسکو اٹھائیں گے، ورق پلٹیں گے، برابر پڑھنے کی بےچینی رہے گی۔ اگر کوئی سامنے ادبی دوست ہے تو بس فوراً کسی نہ کسی مضمون پر تبصرہ شروع ہو جائے گا۔ اور اس طرح اچھا مشغلہ ہاتھ آجاتا تھا۔

س: خلیل صاحب کی لائبریری میں کتابوں اور اس سے بھی زیادہ ہر قسم کے رسالوں کا ترتیب وار اسٹاک موجود ہے۔ بڑا تعجب ہے کہ اتنے رسالے محفوظ کیسے رہے؟

ج: کتابیں انکا سرمایۂ حیات تھیں۔ وہ ہمیشہ یہی کہا کرتے تھے کہ میرے بعد یہی میری جائداد ہوگی۔ اور تو کچھ میرے پاس نہیں ہے۔ ہندوستان اور پاکستان سے برابر نثری اور شعری کتب و رسائل خلیل صاحب کے پاس آتے رہتے تھے۔ اور جو کتاب ان کے پاس نہ ہوتی وہ خود خرید کر لاتے تھے۔ اس طرح ان کے پاس یہ ذخیرہ جمع ہوا۔ وہ اپنی کتابیں ہر شخص کو دینے کو تیار رہتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ سب اس سے فیض حاصل کریں لیکن جو لوگ کتابیں ضائع کر دیتے تھے۔ انھیں دینے سے گریز کرتے تھے۔ ایک عجیب عادت تھی ان کی کہ اگر ان کی کوئی کتاب ایک شیلف سے نکال کر دوسری الماری میں رکھ دیتا تو فوراً پوچھتے کہ میری الماری کس نے کھولی تھی۔ اور وہ کتاب یہاں سے اٹھا کر یہاں کیوں رکھی گئی۔ اپنی برسوں کی رکھی کتابیں اور رسالے نہیں بھولتے۔ ضرورت پڑنے پر ایک منٹ میں نکال کر لے آتے تھے۔ اُن کے پاس جتنے رسالے آتے ان کی جلدیں بندھواتے رہتے۔ اس وقت ان کی لائبریری میں درجنوں رسالوں کی جلدیں موجود ہیں جس پر انھوں نے کافی روپیہ لگایا۔ یہاں تک کہ بچوں کو کہانیوں کی کتابوں اور شفیع الدین نیّر کی لکھی ہوئی نظموں کی جلدیں بندھوا کر بچوں کو دیتے تاکہ کتابیں ضائع نہ ہوں۔

س: اس میں شک نہیں بہت سے لوگوں نے خلیل صاحب کی لائبریری سے پورا پورا فیض اٹھایا ہے۔ اب آپ اس کو کس طرح رکھیں گی؟

ج: جس چیز کو وہ اپنا سرمایۂ حیات کہتے تھے اس معاملہ میں میرا ذہن صاف ہے۔ خلیل صاحب نے مکان میں لائبریری کے لئے ایک کشادہ کمرہ بنوایا ہے۔ وہ رخصت ہونے سے قبل برابر ہمت کر رہے تھے کہ کتابوں کو قاعدے سے ترتیب دے دیا جائے۔ مگر ان کی کمزوری اور بچوں کے امتحانات کی وجہ سے میں اس کام کو ٹال رہی تھی۔ اب میں اس لائبریری کو قائم رکھنا چاہتی ہوں۔ میرے گھر میں یہ اسی طرح محفوظ رہے گی۔ لوگ جس طرح اس سے فائدہ اٹھاتے تھے آئیں اور پڑھیں، تحقیقی کاموں میں مدد لیں۔ اور دوسرے لوگوں کو بھی فائدہ اٹھانے کا موقع دیں۔ میں اسے خلیل صاحب کی یادگار سمجھتی ہوں، اسلئے اس کی ہر طرح حفاظت بھی میرا فرض ہے۔

س: دوستوں کے خطوط بھی محفوظ ہوں گے؟

ج: بالکل! وہ دوستوں کے خطوط محفوظ رکھتے تھے۔ ان کے پاس سینکڑوں خطوط اس وقت موجود ہیں۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ایک پرزہ تک ضائع نہیں کرتے تھے۔ بجلی اور پانی کی رسیدوں کے علاوہ بھی ہزاروں کاغذات بھی موجود ہیں۔ انکی کتابوں کے مسودے اور مدیروں کے خطوط وغیرہ۔

س: اس انکشاف سے خوشی ہو رہی ہے۔ اگر قابلِ اشاعت چیزیں جلد منظرِ عام پر آسکیں تو ادب میں اضافہ ہوگا۔ برسبیل تذکرہ یہ بتائیے کہ جب خلیل صاحب کی کوئی نئی کتاب شائع ہوتی تھی تو ان کے چہرے بشرے سے آپ کو کیا اندازہ ہوتا تھا؟

ج: میں نے تو کوئی خاص بات محسوس نہیں کی۔ وہ مجھ سے تو تذکرہ نہیں کرتے تھے۔ ہاں شہریار کہتے کہ بھابی خلیل صاحب کی کتاب چھپ کر آگئی ہے۔ اور جب میں خلیل صاحب سے کہتی کہ آپ نے مجھے نہیں بتایا تو بس پھر وہی ہنسی اور یہ کہنا کہ بتانے کی کیا بات ہے۔ وہ تو معلوم ہو ہی جاتا ہے لیکن کسی اور کی کتاب چھپتی تو بہت خوش ہوتے اور فوراً بتاتے۔ دوسروں کی ہر خوشی سے خوش ہوتے۔ خاص کر اپنے دوستوں کی خوشیوں سے

س: آخری عمر میں خلیل صاحب کا رجحان مذہب کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ کیا وہ کسی روحانی شخصیت سے متاثر ہو گئے تھے؟

ج: خلیل صاحب کی مذہبیت آخری عمر میں یکدم نہ بڑھی بلکہ یہ ایک طرح سے انھیں خاندانی وراثت میں ملی تھی۔ ان کے والد عربی کے جید عالم تھے۔ مسلمانوں کے بچے بھی خواہ تھے جن کے لئے انھوں نے سیدھا سے میر میں مدرسۃ الاصلاح کی بنیاد ڈالی۔ جو اب بھی قائم ہے۔ خلیل صاحب علی گڑھ آنے سے قبل مذہبی تعلیم حاصل کر چکے تھے۔ مگر وہ لکیر کے فقیر تو کسی معاملہ میں نہیں تھے۔ چنانچہ مذہب سے دوری کے بھی کچھ ایسے ہی اسباب رہے ہوں گے۔ بعض وقت ضد بھی تو پیدا ہو جاتی ہے۔ لیکن انھوں نے بچوں کو قرآن مجید پڑھوایا۔ خود دینی کتابوں کو اپنے مطالعہ میں رکھتے تھے۔ قرآن مجید کی آپ کوئی آیت پڑھیں وہ اس کا مطلب بتا دیتے تھے۔ جمعہ کی نماز پڑھنے پابندی سے مسجد جاتے تھے۔ بیماری کے آخری حملے سے قبل جب وہ تندرست ہوئے تو رمضان کے پورے روزے رکھے۔ میں ہمیشہ سے روزہ کی پابند ہوں۔ مگر وہ روزے نہیں رکھتے تھے۔ لیکن ہمیشہ سحری کے لئے انھوں نے ہی مجھے جگایا۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ نماز روزے کا پابند نہ ہونے کے باوجود بھی ان پر مذہب کی گرفت برابر رہی ہے۔

س: مقامی سیاست کا ذکر علیگڑھ کے اساتذہ کا محبوب مشغلہ ہے۔ کیا خلیل صاحب علی گڑھ کی اس تہذیبی سرگرمی میں حصہ لیتے تھے؟

ج: میں نے انہیں یونیورسیٹی کی مقامی سیاست کے متعلق بحث و مباحثہ میں کبھی مصروف نہیں پایا۔ انکی دلچسپیوں کی دنیا ہی کچھ اور تھی۔

س: کیا خلیل صاحب اپنے شعبہ کے حالات کے بارے میں آپ سے گفتگو کرتے تھے؟

ج: شعبہ کے حالات انھوں نے مجھے خاص طور سے تو نہیں بتائے۔ یہ موضوع کبھی ہمارے یہاں اس وقت چھڑتا جب کوئی ملاقاتی آتا اور اس بارے میں اظہار خیال کرتا۔ لیکن اکثر و بیشتر موضوع جلد بدل جاتا۔ شعبہ کے لوگوں سے وہ کبھی بدگمان نہیں ہوئے۔ اس بات پر وہ کبھی یقین نہیں کرتے تھے کہ کوئی انکا دشمن ہے۔ اگر کوئی اس کی طرف اشارہ کرتا تو ہنس کر کہتے کہ تم کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس پر میں غصہ سے کہتی کہ آپ اپنی طرح کیوں سب کو سمجھتے ہیں۔ ان کی شاعری بھی

پروفیسر شپ کا معاملہ جب سے طے نہیں ہو سکا تب بھی انہوں نے ہمیشہ اس بات پر صبر کیا اور مجھ سے برابر یہی کہا کہ سب منجانب اللہ ہے۔ کوئی قصوروار نہیں ہے۔ وہ ہمیشہ راضی برضا رہے۔

س: خلیل صاحب نے مستقبل میں کوئی اور علمی کارنامہ انجام دینے کی خواہش آپ کے سامنے ظاہر کی تھی؟

ج: خلیل صاحب لگ کر محنت کرنے والوں میں سے تھے۔ کبھی بیماری کی وجہ سے لکھنے پڑھنے سے جلد تھک جاتے تھے تو پریشان ہو کر کہتے "اللہ مجھے کچھ دن کے لئے اچھی صحت عطا کر دے تاکہ میں کچھ کتابیں اور لکھ لوں۔ ابھی تو مجھے ادب میں بہت کام کرنے ہیں لیکن صحت اجازت نہیں دے رہی تھی کہ وہ اپنا تخلیقی سفر جاری رکھ سکیں۔

س: کھانے پینے کے معاملے میں انکی کیا عادتیں تھیں؟

ج: بڑی بے ضرر، کیونکہ کھانے پینے کے خاص شوقین نہ تھے۔ سادہ اور صاف ستھرا کھانا پسند کرتے تھے۔ ہمارا گھر خانہ بے تکلف رہا۔ باہر سے لوگ آتے اور ہمارے یہاں قیام کرتے۔ خلیل صاحب مہمان داری دل سے کرتے۔ لیکن مجھے چوبیس گھنٹے چولہا جھونکنے کا اتفاق نہیں ہوا۔ وہی سادہ کھانا مہمانوں کی خدمت میں پیش ہوتا۔

س: لیکن چائے کے پیالے تو برابر گردش میں رہتے ہوں گے؟

ج: اس کا تو پر تکلف خاطر مدارات میں شمار نہیں ہوتا۔ ہاں! خلیل صاحب کی ایک مرغوب ڈش تھی۔ جب پوچھتی خلیل صاحب! آج کیا پکاؤں فوراً کہتے انڈے کا سالن۔

س: اور لباس کس طرح کا پسند کرتے تھے؟

ج: اپنے لباس کے بارے میں وہ ہمیشہ سے لاپرواہ تھے۔ کبھی اچھے کپڑے نہیں پہنتے تھے۔ طالب علمی کے زمانے میں وہ شیروانی پہنتے رہے۔ بعد کو پینٹ وغیرہ پہننے لگے۔ البتہ ہم لوگوں کے کپڑوں کا خاص خیال رکھتے تھے۔ بچوں کے لئے جہاں تک ممکن ہوتا اچھے سے اچھا کپڑا بنواتے۔ میرے لئے اچھی ساڑیاں خریدتے۔ ہم لوگوں کے کپڑے بنوانے میں بڑے فراخ دل تھے۔ ویسے بھی انہوں نے کبھی کنجوسی نہیں کی۔ اس مرض سے بیزار تھے مگر اپنے لئے نہیں۔

س : خلیل صاحب کی ہر وقت کتب بینی بعض اوقات آپ کو کھل جاتی ہوگی؟

ج : ان کے مطالعہ کا شوق حد سے بڑھا ہوا تھا۔ دُنیا و مافیہا سے بے خبر وہ کتاب میں ڈوب جاتے تھے۔ اور اگر انہیں کچھ لکھنا ہے تو پھر انہیں یاد نہیں رہتا تھا کہ انھوں نے کھانا کھایا بھی یا نہیں۔ بار بار کہنے پر مجھ سے لڑائی ہو جاتی تھی۔ میں اس بات پر ناراض ہو جاتی تھی کہ کھانے کا ہوش نہیں ہے۔ لکھنے کے وقت ان کا عجیب عالم ہوتا تھا، لگتا تھا کہ اب قلم رکھنے کا نام نہیں لے گا۔؟

س : اپنے شعری و تنقیدی مضامین کے مجموعوں کا نام تجویز کرنے میں انہوں نے آپ سے بھی مشورہ کیا ؟

ج : انہوں نے اپنی ہر کتاب کا نام خود تجویز کیا ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود اپنی رائے کو اہمیت دیتے تھے۔ کتاب کا نام صرف ایک رکھا اور وہی برقرار رہا۔ بالکل یہی اصول اپنے بچوں کے سلسلہ میں بھی اپنایا۔ تینوں بیٹوں کے نام کامران، سلمان اور اعظم رکھے۔ ہمارے یہاں راز چاند پوری مرحوم آتے تھے۔ انھوں نے کہا کہ تیسرے بیٹے کا نام اپنے بڑے بھائیوں کے ناموں کے وزن پر نہیں ہے۔ اسے "عدنان خلیل" کر دیجئے۔ یہ تبدیلی خلیل صاحب نے تسلیم کرلی۔ جب ہمارے یہاں بیٹی ہوئی تو خلیل صاحب نے فوراً اس کا نام ہما رکھا۔ اور جب ہمارا مکان مکمل ہوا تو اس کا نام اُردو باغ رکھا۔ جب میں نے اپنے مکان پر پتھر لگا ہوا دیکھا تو مجھے پتہ چلا۔ میں نے کہا کہ کسی بیٹے کا نام رکھتے مثلاً "کامران منزل"۔ تو کہنے لگے میرا تمام کام اُردو میں ہے۔ میں اُردو ہی کی روٹی کھا رہا ہوں اس لئے یہ مکان بھی اُردو ہی کے نام ہے۔

س : خلیل صاحب نے اپنے ماضی کی باتیں بھی آپ کو بتائی ہونگی ؟

ج : انہوں نے اپنا ماضی مجھ سے چھپانے کی کوشش نہیں کی۔ سب ہی کچھ سُنایا۔ اپنے گھر کا وہ برابر ذکر کرتے تھے سب سے زیادہ انہیں اپنے والد صاحب سے محبت تھی۔ ان کا رعب، مہمان نوازی اور وضعداری کا دللہانہ انداز سے گھنٹوں ذکر کرتے تھے۔ وہ بتاتے تھے کہ میرے ابّا مجھے بہت چاہتے تھے۔ میں نے اپنے گھر میں ایک چھوٹا سا باغیچہ لگایا تھا۔ ابّا جب سیر سے آتے تو کہتے چلو تمہارے باغیچے میں بیٹھ کر چائے پئیں گے۔ کبھی وہ اپنے کھیتوں اور آم کے باغیچوں کا ذکر کرتے کہ ہم ان باغوں میں کیسے کھیل کھیلا کرتے تھے۔ وہ اپنے چچا کا بھی ذکر کرتے تھے جو انھیں بہت چاہتے تھے۔ خلیل صاحب کی زبانی سُن کر میں اُن کے والد کی بزرگی، والدہ کی عبادت گذاری اور بھولے پن سے واقف ہوئی۔ ان کے اپنے ہاتھوں سے لگے ہوئے باغیچے کی تازگی اور باغوں اور کھیتوں کی ہریالی سے لطف اندوز ہوئی۔ اور گاؤں کی ریت رسموں کے ساتھ وہاں کے قاعدے قوانین کی سنگینی کا بھی احساس ہوا جسکی بنا پر باوجود اشتیاق میں وہاں تک نہیں جاسکی۔ کتنے قصّے سناتے تھے۔ خلیل صاحب اپنے گاؤں کی زندگی کے، لیکن آخر میں افسوس کرتے تھے کہ والد صاحب کے ختم ہوتے ہی گھر کا شیرازہ منتشر ہو گیا۔ وہ پہلی سی بات ہی نہیں رہی۔ خلیل صاحب اپنے بھائیوں میں چھوٹے تھے۔ والد کے لاڈلے تھے، انہیں جس محبت و شفقت کی عادت ہو گئی تھی، وہ اس سے محروم ہو گئے۔

وہ اپنی تعلیمی دور کی پریشانیوں کا تذکرہ کرتے تھے کہ کس مصیبت سے انھوں نے تعلیم جاری رکھی۔ گھر والوں نے ان کی کوئی مدد نہیں کی۔ انھوں نے یونیورسٹی سوسائٹی سے قرض لیکر اپنی تعلیم جاری رکھی۔ گھر والوں نے کوئی مدد نہیں۔ اور اس قرض کی ادائگی اُن کی تنخواہ سے میری شادی کے بعد تک ہوتی رہی۔

۱۹۴۷ء کے فساد میں خلیل صاحب ٹرین میں سخت زخمی ہو گئے تھے۔ وہ دلی کے ریلیف کیمپ میں تین ماہ تک رہے۔ وہ بھی سخت آزمائش کا زمانہ تھا۔ اُن کے پاس ایک پیسہ نہیں تھا۔ پورا سامان ٹرین میں لٹ چکا تھا۔ اسوقت ان کے بچپن کے دوست اور ہم وطن اخلاق صاحب نے انہیں پچیس روپے کا ایک منی آرڈر بھیجا۔ اس بے سر و سامانی کے عالم میں یہ روپیہ ان کے لئے پچیس ہزار سے کم نہ تھا وہ اس احسانِ عظیم کا ذکر ہر ہر موقع پر کرتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی اگر کسی نے اُن کے ساتھ ذرا سا بھی احسان کیا تو انھوں نے اسے کبھی فراموش نہیں کیا۔ سنانے اور بتانے کو باتیں ہزار ہیں۔ لیکن ان کے لکھنے کیلئے کتاب درکار ہے۔ میں تو انہیں ایک اچھے انسان کے روپ میں دیکھتی ہوں شاعر اور نقاد تو وہ بعد کو ہیں۔ آج ایک ایک بات کو یاد کر کے روتی ہوں اور نہ جانے کب تک روتی رہوں گی۔

س : خلیل صاحب کے ساتھ گذاری ہوئی زندگی آپ بھلا بھی کیسے سکتی ہیں۔ یہ تو بڑی تکلیف دہ بات ہے۔ لیکن اس موذی بیماری کے بارے میں آپ کچھ بتا سکیں گی ؟

ج : مکان مکمل کراتے ہی خلیل صاحب بیمار پڑ گئے۔ تلی بڑھ گئی، ہاضمہ گڑبڑ رہنے لگا۔ کبھی طبیعت ٹھیک ہو جاتی پھر خراب ہو جاتی۔ یہاں تک کہ فروری ۷۸ء کو اچانک ان کی پیٹھ میں درد ہوا۔ اور وہ یونیورسٹی میڈیکل کالج میں داخل ہوئے۔ اس بار وہ تقریباً ۲۲ روز اسپتال میں رہے۔ بہترین طبی امداد بہم پہونچائی گئی۔ دوست و احباب کی فکر کا یہ عالم تھا کہ کمرہ کسی وقت خالی نہیں رہتا۔ آدھی رات تک لوگ بیٹھے رہتے۔ کسی وقت طبیعت ٹھیک ہوتی تو شعر و شاعری کا پروگرام بھی ہو جاتا۔ اسپیشل وارڈ کا دربان کہتا تھا کہ آج تک کسی مریض کو دیکھنے اتنے لوگ نہیں آئے جتنا ان صاحب کو دیکھنے آتے ہیں۔ اس وقت پتہ چلا کہ علیگڑھ کے اندر اور باہر دوست احباب خلیل صاحب سے کس قدر قربت محسوس کرتے ہیں۔

س : بیماری کے دوران خلیل صاحب کے مزاج میں آپ نے کوئی تبدیلی پائی ؟

ج : ان کے مزاج میں کوئی خاص فرق محسوس نہیں کیا میں نے۔ وہ اپنی بیماری سے کبھی پریشان نہیں ہوئے۔ مجھ سے کہتے تم اللہ پر بھروسہ رکھو۔ انشاءاللہ ہم اچھے ہو جائیں گے۔ فکر نہ کرو۔ آنے جانے والوں سے کبھی مرض کی تکلیف کا تذکرہ نہ کرتے۔ نہ کوئی مایوسی کا حرف زبان پر لاتے۔ ہمیشہ ہنس کر مسکرا کر اپنا حال بتاتے۔ اچھے ہو کر گھر آ گئے۔ دوائیں برابر جاری رہیں۔ پھر دوسری بار اسپتال میں داخل ہوئے۔ اب کے زیادہ عرصہ رہے۔ رمضان و عید بھی اسپتال ہی میں کی۔ دونوں بار اسپتال میں رہ کر انہوں نے بہت سی نظمیں کہیں۔ طبیعت کی روانی کا عجیب عالم تھا۔ پلنگ کے برابر کی میز پر کاغذ ہے اور قلم اور ان کا تخلیقی موڈ۔ اکثر رات میں سوتے میں گھبرا کر میری آنکھ کھلتی تو دیکھتی کہ بہت مدھم روشنی میں ہمہ تن ڈوبے ہوئے کچھ لکھ رہے ہیں۔ صبح اسے صاف کیا کرتے۔ جب شہریار آتے تو انہیں سناتے۔ مگر اس ہنستے ہوئے اور بظاہر فارغ انسان کے قلم سے کیسی نظمیں اور اشعار نکلتے تھے۔ میں جب سنتی تو دل دہل جاتا کہ یہ کس قسم کی شاعری شاعر کہہ رہے ہیں۔ جب کبھی سناتے تو شہریار کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ کہنے لگے خلیل صاحب آپ ایسی شاعری مت کہا کیجئے۔ کیا بکتے رہتے ہیں۔ تو مسکرانے لگتے۔ ان کے حسرت بھرے اشعار پہ میرا دل خون کے آنسو روتا تھا۔

باجی اور کمال بھائی کے یہاں سرینگر میں رہ کر صحت بہتر ہو گئی۔ واپس آ کر شعبے کے فرائض انجام دینے لگے۔ کئی بار علی گڑھ سے باہر بھی جانا ہوا۔ اواخر اپریل ۷۸ء میں شعبے کے زیر اہتمام اقبال سیمینار ہوا۔ اس میں خوشی سے شرکت کی۔ مئی میں بھی برابر ڈپارٹمنٹ جاتے رہے۔ کورس ختم کرایا۔ مئی کے آخر میں طبیعت خراب ہوئی۔ جیسا اکثر وقفہ وقفہ سے ہو جایا کرتی تھی۔ ہم لوگوں کو یہ احساس بھی نہیں ہوا کہ وہ اتنی جلدی ساتھ چھوڑ دیں گے۔ انتیس ۲۹ مئی کو اسپتال گئے جہاں انہیں خون دیا گیا۔ اسی روز وہاں سے واپس آ گئے۔ ان کے تیسرے بھائی عبدالرحمن پرواز اصلاحی بیس سال کے طویل عرصے کے بعد مکہ مکرمہ سے علی گڑھ ہمارے یہاں آئے ہوئے تھے۔ یکم جون کو بھائی صاحب نو بجے صبح رامپور روانہ ہونے لگے۔ رخصت کے وقت خلیل صاحب نے ان سے ہاتھ ملایا اور زار و قطار رونے لگے۔ بھائی صاحب بھی آبدیدہ ہو گئے اور اسی افسردگی کے عالم میں روانہ ہو گئے۔ خلیل صاحب دیر تک روتے رہے اور بھائی صاحب کو یاد کرتے رہے۔ میں نے سمجھایا آپ گھبرا کیوں رہے ہیں۔ انشاءاللہ جلد ملاقات ہو گی۔ کہنے لگے کہ افسوس اس بات کا ہے کہ بیس ۲۰ سال بعد بھائی آئے تو میں ان کے ساتھ ایک وقت کھانا بھی نہیں کھا سکا۔ رخصت ہوئے تو دروازے تک چھوڑنے بھی نہیں جا سکا۔

خیر! پھر سنبھلے۔ لیکن کوئی خاص بات نہیں کی۔ بس یہ پوچھتے رہے کہ بچے کب آئیں گے۔ بچے آ گئے۔ ساڑھے بارہ ۱۲ بجے کے قریب سردی محسوس ہوئی۔ اپنی دوا مانگ کر پی۔ پھر انار کا عرق مانگا۔ وہ نکال کر دیا۔ مجھ سے کہا آج جمعرات ہے کچھ غریبوں کو کھانا کھلا دینا۔ اور سورہ یٰسین پڑھنے کو کہا۔ اس وقت پڑوس سے مسز وصی الرحمٰن آ گئی تھیں۔ بس تھوڑی دیر بعد آنکھوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ میں نے کہا خلیل صاحب ہاتھ ہٹائیے۔ ہاتھ ہٹایا۔ آنکھیں عجیب سی ہو گئیں، بس ختم! ــــ سب یہ سمجھے کہ بیہوش ہو گئے ہیں۔ بعد میں وصی الرحمٰن صاحب ڈاکٹر کو لائے بھی۔ لیکن وہاں اب کیا تھا۔

(باقی صفحہ ۷۰ پر دیکھئے)

محمد انصار اللہ
۸۸۵ - سر سید روڈ - سر سید نگر - علی گڑھ

دوستدارِ احمد، خلیل

۶۷۵ + ۵۳ + ۶۷۰

۱۳۹۸ھ

اعظم گڑھ میرا مولد ہے اور میں نے اسی تعلق سے خلیل الرحمٰن اعظمی کو جانا تھا۔ میں نے ۱۹۴۳ء میں ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا تھا۔ اس اعتبار سے وہ مجھ سے صرف تین برس سینیئر تھے لیکن خواجہ حیدر علی آتش سے متعلق مقالہ شائع کر کے انہوں نے جو شہرت حاصل کر لی تھی اس کا حال سن سن کر مجھے بہت رشک آتا تھا۔ دو برس بعد جب میں علیگڑھ آیا تو بڑے اشتیاق سے ان سے ملا۔ وہ زمانہ تھا جب خلیل صاحب میرؔ کے طرز میں شعر کہہ رہے تھے۔ مجھے ان کی زبان سے چند غزلیں سننے کا موقع ملا۔ جامع مسجد دلی کی سیڑھیوں پر بولی جانے والی میرؔ کی گفتگو سدھا سلطانپور (سرائے میر) کے رہنے والے خلیل الرحمٰن کی زبان سے بہت عجیب معلوم ہوتی تھی۔ خوشی کی بات ہے کہ تقلید کی اس روش کو خلیل صاحب نے ترک کیا اور اس طرح کہ غالباً پھر کسی کی تقلید پسند نہ کی۔

اس میں شک نہیں کہ خلیل صاحب کو میرؔ سے عقیدت رہی تھی اور اس کا ایک سبب یہ ہے کہ زمانے کے فرق کے باوجود دونوں کے حالات میں یک گونہ مطابقت پائی جاتی ہے۔ میرؔ اور خلیلؔ دونوں باپ کے مرنے کے بعد گھر چھوڑ کر نکلے تھے۔ فرق یہ تھا کہ میرؔ نے "پورب کے ساکنوں" کے درمیان عمر کے آخری تیس سے زائد سال گذارے تھے۔ خلیل "پورب" کو چھوڑ کر نکلے اور تقریباً اتنی ہی مدت تک علیگڑھ میں رہ کر اللہ کو پیارے ہو گئے۔

میرؔ نے اپنی زندگی میں بعض جنگی معرکوں میں شرکت کی تھی۔ خلیل بھی ۱۹۴۷ء ہنگاموں میں اس طرح مبتلا ہوئے تھے کہ کسی مفسد نے زخمی کر کے انہیں چلتی ریل سے پھینک دیا تھا۔

میرؔ اپنے زمانے کے علمی و ادبی حلقوں میں ہمیشہ قدر کی نظر سے دیکھے گئے۔ لیکن ارباب اقتدار کے ہاتھوں آخری عمر میں انہیں مجبوراً خانہ نشین ہو جانا پڑا تھا۔ خلیل کے زمانے کے حالات مختلف ہیں پھر بھی خاص و عام میں نہایت مقبول اور ہر دلعزیز ہونے کے باوجود زندگی کے کم از کم دو برس انہوں نے بھی خاموشی اور خانہ نشینی میں گذارے۔

خلیل الرحمٰن نہایت ہی ذکی اور ذہین شخص تھے۔ اور نتیجہ کے طور پر مزاج میں صفائی اور سختی بھی تھی۔ سنا ہے کہ میرے علیگڑھ آنے سے پہلے کوئی نظم پڑھنے کے جرم میں انہیں گرفتار بھی کیا گیا تھا۔ آتش کے بارے میں انہوں نے جو مقالہ لکھا تھا اس کی وجہ سے پروفیسر رشید احمد صدیقی نے ان کو آتش پرست کہا۔ اور اسی طور پر ابتدا شہرت بھی ملی۔ پھر جوش ملیح آبادی کی شاعری کے بارے میں ایک مقالہ علیگڑھ میگزین میں شائع کیا جس میں پوری شدت کے ساتھ انکی شاعری کے نقائص ظاہر کئے تھے۔ شعبۂ اردو کی ریسرچ ایسوسی ایشن کے ایک جلسے میں ایک نئے استاد کے مضمون کو سن کر انہوں نے فرمایا تھا کہ: "اس سے بہتر مضمون ہمارے یہاں کے ایم۔ اے کے طالبعلم لکھ سکتے ہیں"۔

اسقدر صفائی کے ساتھ اپنے نقطۂ نظر کو پیش کر دینا عام نہیں ہے۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ آخر عمر میں مزاج کی یہ شدت بہت کم ہو گئی تھی اور ایسے موقع پر وہ عموماً خاموشی کو ترجیح دینے لگے تھے۔

خلیل صاحب نے ایک جگہ لکھا ہے کہ:

"اچھے ادب کا براہ راست مطالعہ کر کے ادب کی خصوصیات کو سمجھنے اور اُن کا معیار اور سطح مقرر کرنے سے مجھے زیادہ دلچسپی رہی ہے"۔

وہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ تنقید کے مردِ میدان تھے۔ مطالعہ اور کتب بینی سے ان کو جو شغف تھا۔ اب وہ بھی کمیاب ہے۔ خوبی یہ تھی

کو جو کچھ پڑھتے تھے وہ ذہن میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو جاتا تھا۔ میں نے ایسا حافظ بہت کم لوگوں کا دیکھا ہے۔ جب کبھی انکی خدمت میں حاضر ہوا ذاتیات سے متعلق گفتگو کم سے کم ہوئی، ہمیشہ علمی اور ادبی مسائل زیر بحث آتے تھے۔ اور انھیں سے ان کو زیادہ دلچسپی بھی تھی۔ پروفیسر آل احمد سرور صاحب کی عنایت سے میری مرتب کردہ کتاب "غالب بلوگرافی" چھپ کر آئی تو میں نے انکی خدمت میں بھی اس کی ایک جلد پیش کی۔ چند روز بعد جب ملاقات ہوئی تو معلوم ہوا کہ انہوں نے پوری کتاب کو سطر سطر دیکھ لیا ہے۔ اور جگہ جگہ اس میں اضافے بھی فرما دیئے ہیں۔ یہ سب اضافے انہوں نے اپنی یادداشت سے کئے تھے۔ لیکن انکی قدر و قیمت کا اندازہ میں ہی کر سکتا ہوں۔ میں نے وہ کتاب ان سے واپس لے لی اور ایک دوسری جلد انکی خدمت میں پیش کر دی۔ علمی معاملوں میں اس طور پر مدد کرتے رہنا خلیل صاحب کے معمولات میں داخل تھا۔

پروفیسر آل احمد سرور صاحب کے زمانہ میں ریسرچ اسکالرز کیلئے پہلی مرتبہ "ریسرچ میتھڈالوجی" کا نصاب مرتب ہوا جسکی تدریس کیلئے چار اُستاد مامور ہوئے، چودھری محمد نعیم، خلیل الرحمٰن اعظمی، منظر عباس نقوی اور راقم السطور ــــ ان لکچروں میں طلبا کے ساتھ ساتھ کوئی بھی شخص شریک ہو سکتا تھا۔ ہم چاروں تو پابندی کے ساتھ موجود رہتے ہی تھے۔ چودھری صاحب کو بطور خاص شکاگو سے ریڈر کی حیثیت سے مدعو کیا گیا تھا۔ انہوں نے تحقیق و تنقید کے جدید ترین طریقوں کے بارے میں لکچر دیئے تھے جو مغرب میں رائج ہیں۔ خلیل صاحب کے ذمہ تنقید کے ضابطوں سے متعلق مباحث تھے۔ منظر صاحب نے زبان و بیان اور اسالیب کے مسائل سے بحث کی تھی۔ اور راقم نے متون کی تحقیق و تدوین کے سلسلے میں گفتگو کی تھی۔ ان لکچروں کے دوران مجھے خلیل صاحب سے قریب تر آنے اور انکی وسعتِ نظر اور وسعتِ مطالعہ کے ساتھ ساتھ انکی تدریس کی دلنشینی کا اندازہ کرنے کا موقع ملا تھا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ نہایت کامیاب اُستاد تھے۔

سرور صاحب کے ریٹائر ہونے کے بعد کچھ عرصہ کے بعد سے خلیل صاحب نے عموماً گوشہ نشینی کی زندگی گذاری۔ ان کا زیادہ وقت اپنے مکان "اُردو باغ" کی تعمیر پر صرف ہوتا تھا لیکن اس سے یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالا جائے کہ انہوں نے اپنے فرائضِ منصبی سے غفلت شعار نہ تھے

برتنی شروع کر دی تھی، یہ تو اُن کا مزاج ہی نہ تھا ــــ کہا جاتا ہے کہ تعمیر مکان کے سلسلے میں انہوں نے جو غیر معمولی مشقت اُٹھائی اس کی وجہ سے انکی صحت بگڑ گئی تھی لیکن میرا خیال ہے کہ بات اتنی سادہ نہ تھی۔ خلیل صاحب نے اگرچہ خاموشی کو اپنا مزاج بنا لیا تھا انہوں نے اپنی آنکھوں کو بند نہیں کر لیا تھا۔ وہ گرد و پیش کے معاملات سے بے نیاز تو ہو سکتے تھے، بے خبر کبھی نہیں رہے۔ وہ جانتے تھے کہ مناصب کی تقسیم کا انحصار لازمی طور پر اہلیت اور لیاقت پر نہیں ہوتا، اکثر دوسرے عوامل زیادہ اہمیت حاصل کر جاتے ہیں۔ لیکن ان دوسرے عوامل کی کارفرمائی کو دیکھ کر بھی ذہن کا متاثر نہ ہونا بے حسی کی دلیل ہے اور خلیل الرحمٰن اعظمی بے حس ہرگز نہ تھے۔ انتقال سے چند روز پیشتر ایک صاحب کے ساتھ میرا اُن کے یہاں جانا ہوا تو انہوں نے میرے معاملات سے متعلق جو فرمایا اس سے اس کرب کا بخوبی اندازہ ہوتا تھا جس سے وہ دوچار تھے۔ خلیل صاحب مسلمان تھے۔ وہ رہبانیت کے قائل نہ تھے۔ "لاتقنطوا من الرحمۃ اللہ" پر ان کا ایمان تھا۔ انھوں نے نا امید ہو کر جدوجہد کے سلسلے کو ترک نہیں کر دیا تھا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی خوش قسمت تھے۔ کہ اُن کی زندگی میں ان کی کئی کتابیں نہ صرف چھپ کر شائع ہو گئی تھیں بلکہ ان میں سے بعض انعاموں کی مستحق بھی قرار دی گئی تھیں۔ ان کی علمی حیثیت کو خاص و عام نے تسلیم کیا تھا۔ انہوں نے عمر زیادہ نہیں پائی، اس کے باوجود شاگردوں کی ایک ایسی جماعت چھوڑ گئے۔ جو علم و ادب کی خدمت میں برابر مصروف ہے۔ ان میں صاحبِ علم ڈاکٹر کوکب قدر سجاد علی مرزا، ڈاکٹر محمد کاظمی، ڈاکٹر محمد اشفاق خاں، ڈاکٹر ذکار الدین شایاں، قاضی عبدالرحمٰن ہاشمی، اور ڈاکٹر سمیع اللہ اشرفی کے نام خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

مرزا قادر بخش صابر نے ذوق کے ذکر میں لکھا ہے کہ :

"بازار حسد قدیم سے گرم ہے اور ناتواں بینی ہمیشہ سے آزرم، کہتے ہیں کہ اس خاکِ ارم رشک میں کس مدعی تفنن و ہنر نے جب ذوق مرحوم کے ماتم میں صدائے نوحہ کو اس قدر بلند اور دستِ دلکش کو حسرت و اندوہ میں اتنا سرگرم اور عامی و جاہل کو تلاش مواد تاریخ ... حد تک سامی اور دور و نزدیک کو

باقی صفحہ ۸۳ پر دیکھئے

عبدالمغنی
مارلی گنج۔ عالم گنج۔ پٹنہ ۷

خلیل الرحمٰن اعظمی کی ادبی حیثیت

۱۹۵۵ء میں "جدید اُردو تنقید" کے عنوان سے اپنے ایک مقالے میں میں نے اپنے معصروں میں خاص کر خلیل الرحمٰن اعظمی کی ادبی قوت کی طرف اشارہ کیا تھا اور اب بیس سال بعد وہ قوت بروئے عمل آکر اُردو ادب کی تاریخ کا جزو بن چکی ہے۔ جن کارناموں نے تنقید و تحقیق کے دائرے میں اعظمی کی جگہ محفوظ کر دی ہے۔ وہ مجموعی طور پر یہ ہیں:

مقدمہ کلامِ آتش (جو مقالے کی صورت میں ۴۸ء میں اور کتابی شکل میں ۵۹ء میں شائع ہوا)۔
اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک (۵۷ء)
فکر و فن زاویۂ نگاہ (۶۶ء)
مضامینِ نو (۷۷ء)

آخری تین تنقیدی مضامین اور تبصروں کے مجموعے ہیں۔
ان کے علاوہ "نوائے ظفر" (۵۸ء) اور "نئی نظم کا سفر" (۷۲ء) بھی انہوں نے ترتیب دیئے تھے۔

اعظمی نے آتش کی شاعری کو ایک نئے زاویۂ نگاہ سے پیش کیا۔ اور اردو ادب میں اس شاعر کے فکر و فن کی خاص جگہ متعین کی۔ اسی طرح انہوں نے اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کا ایک علمی و تحقیقی جائزہ بڑی حد تک معروضی انداز سے لیا۔ حالانکہ وہ خود اس تحریک سے وابستہ رہے تھے۔ اور ان کے احساسات میں اس تحریک کے عناصر و مضمرات شامل ہو چکے تھے، یعنی انہوں نے ترقی پسند ادب پر تبصرہ ایک ترقی پسند ہی کی حیثیت سے کیا۔ اس کے باوجود یہ ان کی دیدہ وری، باریک بینی اور انصاف پسندی ہے کہ انہوں نے اپنی پسندیدہ تحریک کے اوصاف کے ساتھ ساتھ اس کے نقائص کی بھی نشان دہی کی۔ آتش کے کلاسیکی سرمایے کا ایک طرف اور ترقی پسندی کے رومانی، سرمائے شاعری بھی

کا دوسری طرف، دونوں ہی قسم کے مختلف النوع مطالعات اعظمی نے جس علمی توازن اور تنقیدی اعتدال کے ساتھ کئے۔ اس سے ان کے ادبی ذوق اور فنی شعور کا وہ معیار معلوم ہوا جس کے عناصر ترکیبی میں فکر کی ندرت و استقامت، نگاہ کی وقت و وسعت، اور ذہن و ظرف کی بلندی۔

یہی وہ اوصاف ہیں جو اعظمی کی ادبی تنقیدوں کا اثاثہ بنے۔ اسی اثاثے کی بدولت انہوں نے ادب کے مختلف مسائل و موضوعات پر اپنے وہ مطالعات پیش کئے جو دلچسپی کے ساتھ پڑھے گئے۔ اور قدر کی نگاہ سے دیکھے گئے۔ اور تین مجموعوں — فکر و فن، زاویۂ نگاہ اور مضامینِ نو کی شکل میں جدید تر اُردو تنقید کی دستاویزات بن چکے ہیں۔ ان مجموعوں کے مضامین میں ایک ایسے ذہن کا اظہار ہوتا ہے جو روایت اور انفرادیت، تاریخ اور تجربے، قدیم اور جدید کے درمیان تطبیق اور توازن پیدا کرنا چاہتا ہے، جو اپنی اور دوسروں کی خصوصیت کو ایک عام اور وسیع پس منظر میں دیکھنا اور دکھانا چاہتا ہے۔ جو ادب اور زندگی کے باہمی رشتے کو زیادہ سے زیادہ واضح اور مستحکم کرنا چاہتا ہے۔ جو فن کو تہذیب کے ایک وسیلے کے طور پر پیش کرنا چاہتا ہے۔ اور جس کے نزدیک جمالیات اور اخلاقیات کے درمیان کوئی تضاد نہیں، اس لئے کہ کسی بھی تعمیری فن کاری کے لئے اس کے خیال میں جبلتوں اور قدروں کی ہم آہنگی ضروری ہے۔

جس طرح خلیل الرحمٰن اعظمی کا ذہن واضح تھا۔ اسی طرح اُن کا اسلوب بھی سلیس اور سجل تھا۔ وہ اپنی بات کہنے کا سلیقہ اسی طرح رکھتے تھے جس طرح اپنی بات سوچنے کا حوصلہ، جو کچھ وہ صاف

صاف سمجھتے تھے اسے صاف صاف کہہ سکتے تھے۔ ان کے بیان میں ایک شستگی اور شائستگی ہے۔ فصاحت اور نفاست ہے۔ جس کے سبب گہرے علمی خیالات اور تنقیدی نکات دلچسپ اور پُر اثر انداز میں ہو کر اظہار آتے ہیں۔ اس سلسلے میں اس بحث کی چنداں ضرورت نہیں کہ اعظمی صاحبِ اسلوب ہیں یا نہیں، اتنا کافی ہے کہ وہ اپنے مافی الضمیر کو موثر اور متین طریقے سے ظاہر کرنے پر قادر ہیں ـــ ٹی۔ ایس۔ الیٹ کے لفظوں میں ان کے لئے ایک نقاد کی حیثیت سے یہ امتیاز کافی ہے کہ انکی نثر ایک اچھی طرح لکھی ہوئی نثر ہے۔ اعظمی کے اسلوب کی خصوصیت اور خوبی یہ بھی ہے کہ وہ ایک تنظیم کے ساتھ اپنے دلائل مرتب کرتے ہیں۔ اور قطعیت کے ساتھ منطقی بحث کرتے ہیں۔ گو جب دکیلوں کی طرح بال کی کھال نکالتے ہیں اور نہ زرقی بن کر حکم لگاتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ وہ فیصلے ضرور کرتے ہیں اور اپنے نتائج فکر کے اسباب و وجوہ بھی تفصیل سے بتاتے ہیں، تاکہ مخاطب کو اپنے موقف کا قائل کر سکیں۔ اسی لئے اعظمی کی رایوں سے اختلاف کی گنجائش تو بہت ہے، مگر مخالفت کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی۔

خلیل الرحمٰن اعظمی ناقدوں کی اس صف میں ہیں جو تخلیقی شغل سے بھی وابستگی رکھتی ہے۔ انکی شاعری کے دو مجموعے "کاغذی پیرہن" اور "نیا عہد نامہ" (۱۹۶۵ء) ہمارے سامنے ہیں۔ ان میں نظمیں بھی ہیں اور غزلیں بھی۔ اور نظموں میں پابند بھی ہیں اور آزاد بھی۔ اس سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اعظمی ان جدید شاعروں میں نہیں جو جدید زیادہ ہیں اور شاعر کم، بلکہ وہ ایسے پختہ کار فن کار ہیں جو اپنے ادبی قدروں سے نہ صرف آگاہ ہیں بلکہ ان پر دست رس بھی رکھتے ہیں۔ وہیں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعظمی اظہار و بیان کے تسلیم شدہ سانچوں پر قناعت نہ کر کے ایجاد و اختراع کی طرف مائل ہیں۔ شاید وہ اس قسم کے ترقی پسند ہیں جو کسی بھی دور اور کیفیت میں ایک نقطے پر قائم رہنے کی بجائے آگے ہی آگے بڑھنا ضروری خیال کرتے ہیں۔ یا ان کی طبیعت کا تقاضہ انہیں کسی ایک جہت میں قرار نہیں لینے دیتا اور وہ مختلف وقتوں میں مختلف جہتوں کا رخ کرتے ہیں۔ بہر حال! اعظمی کی شاعری ان کی تنقید نگاری کی طرح ہموار نہیں ہے۔ اس میں ایک طرف شاعر، بھی

تغزل کی متانت و نفاست ہے اور دوسری طرف نظم آزادگی و اور پراگندگی۔

بہر کیف! اعظمی کی تخلیقات ایک ٹھہرے ہوئے جذبات اور سکڑے ہوئے احساس کی غماز ہیں۔ اور جدید کا انسانی المیہ ان کے حواس پر طاری ہے۔ ان کا ذہن مجروح ہے۔ آج کی زندگی کی تلخیوں کا عکس وہ اپنی ذاتی محرومیوں میں بھی پاتے ہیں۔ عصری تہذیب کا کرب ان کا اپنا درد ہے۔ ایک حزنیہ تفکر اعظمی کے تغزل کا مزاج ہے۔ میرؔ سے ان کا تعلق بلاوجہ ہے نہ بلا نتیجہ۔ انہوں نے اپنے دوسرے مجموعے "نیا عہد نامہ" میں اپنی نفسی کیفیات کا ذکر کرتے ہوئے واضح کیا ہے کہ کس طرح کلامِ میرؔ ان کے لئے سامانِ تسکین ہوا۔ اعظمی کے لہجہ کا دھیا پن اور ان کے آہنگ کا فقیرانہ صدا میرؔ ہی کی چھاپ ہے۔ شاید بیسویں صدی کا تہذیبی انتشار اٹھارہویں صدی کے سیاسی انتشار سے ملتا جلتا ہے۔ موجودہ صدی میں میرؔ کی ایک خاص طبقے میں مقبولیت کا راز ممکن ہے کہ یہی ہو، اور اس راز کے امانت دار جدید اردو شاعری میں خاص کر ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی ہیں، جب کہ ان سے پہلے فراقؔ کی شاعری کا ایک حصہ اور فراقؔ سے قبل فانیؔ کا پورا سرمایۂ شاعری اسی راز کا غماز ہے۔ لیکن میرؔ کا وفورِ طبیعت اور توانائیٔ احساس ان سے متاثر ہونے والوں کے یہاں تقریباً مفقود ہے۔ فراقؔ صرف فراوانیٔ تخیل رکھتے ہیں، جب کہ فانیؔ محض جوشِ غم سے سرشار رہے۔ کاظمی اور اعظمی فراوانی اور جوش سے بھی خالی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے بیسویں صدی کا وسط انکی تاب و تواں پر بجلی بن کے گرا ہے۔ اور ان کے اشعار کی ساری تابش ایک جلے ہوئے نشیمن کی چنگاری ہے۔ ہم اس قسم کی شاعری کو "نوائے ظفر" بھی کہہ سکتے ہیں، جس میں کہیں کہیں آتش کی مخصوص صوفیت بلکہ قلندری کے اشارات بھی چمک اٹھتے ہیں ـــ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری، برخلاف تنقید کے، انکی وہ کاوش ہے جو انہیں ترقی پسندی سے ذرا ہٹا کر جدیدیت کی طرف مائل کرتی نظر آتی ہے۔ بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شاعری میں جدیدیت کا زور بڑھنے سے پہلے ہی اعظمی نے اپنے کلام میں خود شکستگی کے اس احساس کا اظہار کیا جو بعد میں جدیدیت

پسند شاعری کا ایک معیاری نشان بن کر اُبھرا۔ اس طرح اعظمی کو اردو شاعری میں جدیدیت کا ایک قریبی پیش رو بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اپنے احساس و اظہار کی کلاسکی پختگی کے سبب اعظمی جذبہ و بیان کے اس انتشار کے پوری طرح شکار ہوئے نہیں۔ جس میں جدیدیت پسند شعراء عام طور پر مبتلا نظر آتے ہیں۔ بات یہ ہے کہ اعظمی کو زیادہ سے زیادہ جدیدیت کا پیش رو ہی کہا جاسکتا ہے، جدیدیت کا علمبردار نہیں کہا جاسکتا۔ وہ بہرحال جدیدیت سے قبل اور مختلف دور اور ماحول کی پیداوار ہیں۔ پھر ترقی پسندی کسی نہ کسی شکل اور درجے میں برابر ان کی دامن گیر رہی۔ یوں یہ صحیح ہے کہ اعظمی نے اپنے بعض تنقیدی تبصروں میں نئے تجربے جدّت و اختراع، آزادیِ فکر اور انفرادیت کی وکالت کی ہے۔ مگر یہ وکالت ترقی پسند تحریک کے جبر، قہر اور ضابطہ بندی کے خلاف ایک ردعمل اور احتجاج کے باوجود ترقی پسندی کے بالکل منافی نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت اعظمی کے خیال میں یہ انکی پُرخلوص ترقی پسندی ہی کا اگلا قدم ہے۔ جو اصل ترقی پسندی کے اصولوں اور تقاضوں کے بالکل مطابق ہے۔ اور جدّت و آزادی کے عناصر تو وہ ہیں جن کا مطالبہ و مظاہرہ خود ترقی پسند تحریک نے اپنے ابتدائی دور میں کلاسکیت اور قدامت کے خلاف کیا تھا۔

اس اعتبار سے دیکھا جائے تو اعظمی کو ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان ایک کڑی، ایک پُل اور ایک رابطہ بھی کہا جاسکتا ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس رابطے کو ترقی پسندوں کی سرکاری سرپرستی حاصل نہیں تھی، بلکہ اسکے پیچھے کوئی اجتماعی محرک اور باضابطہ مقصد تھا ہی نہیں۔ یہ تو بس اعظمی کے اپنے جذبۂ بے اختیارِ شوق کا ایک اظہار تھا۔ اس لئے ایک ناقد اور شاعر، ادیب اور فن کار اور دانشور کی حیثیت سے، بعض وقت ترقی پسند تنظیم کے بعض عہدے قبول کرنے کے باوجود، اعظمی اپنے ذہن و مزاج کے لحاظ سے ترقی پسندوں کی اشتراکی سیاست سے وابستہ نہیں رہے، اور بالآخر اس سیاست سے بیزار ہوگئے۔ درحقیقت وہ شروع ہی سے ذہنی طور پر ادیب پہلے تھے اور ترقی پسند بعد میں۔ لہٰذا انکی فنی وفاداری برابر ترقی پسندی کے بجائے ادب کے ساتھ رہی۔ ظاہر ہے کہ یہ وفاداری ترقی پسندی سے کہیں بلند ہے اور سرکاری ترقی پسندی کے سانچے میں بند نہیں ہوسکتی تھی۔ اعظمی کے خیالات اور جذبات کو اس سانچے کے باہر آنا ہی تھا۔ یہ ان کی ذاتی ضرورت تھی، اندرونی مطالبہ اور نفسی تقاضا تھا۔

سوال پیدا ہوتا ہے: کیا خلیل الرحمٰن اعظمی کو ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان ایک عبور اور کا مظہر کہا جاسکتا ہے؟ میرا خیال ہے، اتنا قطعی سوال ابھی قبل از وقت ہے۔ یہ سوال اس وقت یقیناً پیدا ہوگا۔ جب ترقی پسندی کی طرح جدیدیت بھی وقت گذرنے کے ساتھ ایک متعین مکتبِ فکر کی حیثیت سے تاریخ ادب کا ایک جزو بن جائیگی۔ ابھی تو خود جدیدیت کے علمبردار اپنے خوابوں کی تعبیر میں اس کثرت کے ساتھ کر رہے ہیں کہ ایک پریشانی و پراگندگی کا عالم پیدا ہوگیا ہے اور یہ بھی طے نہ ہوسکا ہے کہ جدیدیت ایک تحریک ہے یا محض ایک رجحان، بلکہ یہ تک مشتبہ ہے کہ جدیدیت کی کوئی خاص فکر ہے بھی یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ محض دورِ جدید میں سانس لینا اور کچھ انفرادی قسم کی جدتیں کرنا "جدیدیت" کے نام سے کوئی مکتبۂ فکر قائم کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ دورِ جدید میں تو ترقی پسند اور کلاسکیت پسند اور جمالیت پسند اور اخلاقیت پسند بھی سانس لے رہے ہیں اور ان میں کچھ لوگ اپنے طور پر کچھ نہ کچھ جدتیں بھی کرتے رہتے ہیں، جبکہ اس رَو اور رویّے سے اُن کا کوئی تعلق نہیں جسے جدیدیت کہا جاتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ اعظمی ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے مثبت عناصر کا ایک مرکب تھے۔ جتنے اور جیسے کچھ بھی مثبت عوامل ان دونوں رجحانات میں رہے ہوں۔ اس اعتبار سے اعظمی کو ان کے مخصوص احول کا ایک صالح عنصر کہا جاسکتا ہے۔ یہ صالحیت اپنی حدود میں ایک فکری توازن اور فنی اعتدال پر قائم ہے۔ اسی توازن و اعتدال کا منفی اظہار اعظمی کی ان "ہجویات" میں ملتا ہے۔ جو انہوں نے ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے متعلق اپنے دوسرے مجموعۂ کلام "نیا عہد نامہ" کے آخر میں درج کی ہیں:

انکو اپنا بتائیں سب مزدور — سب ہی کہلائیں شاعرِ جمہور
چین پر، کوریا پر، لنکا پر — مصر پر، جرمنی پر، جاوا پر
نظمیں لکھ لکھ کے خوب لاتے ہیں — گھر پہ سب خیریت بتلاتے ہیں
کون آئینہ انکو دکھلائے — سب ہی جدت پسند کہلائے
آرٹ اور فن کا ان کے نام نہ لو — عقل سے اپنی کوئی کام نہ لو

(تذکرہ شعرائے اردو) ۶۷

پڑھے لکھوں میں نئی شاعری کا چرچا ہے
ہر ایک مجتہدِ عصرِ فن کے بیٹھا ہے
مگر رسالوں میں ایسا کلام چھپتا ہے
کہ جس کا کوئی نہ اُلٹا ہے اور نہ سیدھا ہے
ہے نافدوں کی سزا یہ بتائیں انکی جو ل
ہمارے مورث و اجداد پیٹتے تھے لکیر
اسی لئے تو بنے رہ گئے حقیر و فقیر
مگر یہ ہم کہ جو روشن خیال و باتدبیر
رہیں گے توڑ کے رسم و رواج کی زنجیر
رہے گا اب نہ کوئی فرقِ فاعل و مفعول

(شہر آشوب)

ظاہر ہے کہ یہ ترقی پسندی اور جدیدیت دونوں کے منفی میلانات کی تنقید ہے۔ اور یہ وہی کر سکتا ہے جسکے پاس اپنا کوئی مثبت معیار یا کم از کم اس کا ایک تصوّر اور احساس ہو۔ اس تنقید سے واضح ہوتا ہے کہ اعظمی کی نظر ترقی پسندی اور جدیدیت کی انتہا پسندیوں اور بے اعتدالیوں پر بہت گہری تھی اور زاویۂ نگاہ کی یہ گہرائی ایک معیارِ توازن کے بغیر ممکن نہیں۔

سوال ہے، وہ معیارِ توازن کیا ہے اور اعظمی کے ہاتھ کب لگا؟ اتنا تو یقینی ہے کہ اعظمی ایک ذوقِ سلیم ابتدا ہی سے رکھتے تھے۔ اور اُن کا شعور بھی بیدار تھا، جو ترقی پسندی سے جدیدیت تک کے ادوار میں برابر ان کے لئے پاسبانِ عقل کا کام کرتا رہا۔ انہیں خود تنقیدی اور احتساب کے لئے اکساتا رہا، اور اُنہیں خوب سے خوب تر کی جستجو پر اُبھارتا رہا۔ نہ تو انہیں ترقی پسندی میں چین لینے دیا اور نہ جدیدیت میں، بلکہ ان کے ضمیر پر دونوں کے نقائص روشن کرتا رہا، یہاں تک کہ زندگی اور فن کی بلند تر قدروں کے متعلق ان کا احساس روز بروز شدید سے شدید تر ہوتا گیا۔ مگر کیا اعظمی اپنی عمر کے آخری لمحے تک تعین، قطعیت اور وضاحت کے ساتھ سمجھ سکے کہ ان کا حقیقی جینیس (Genius) کیا ہے؟ ان کے فن کی پکار کیا ہے؟ میرے علم میں ایسا کوئی دستاویز نہیں جس کی بنا پر اس سوال کا جواب دینے کی کوئی موثر کوشش شاید ہی کی

کروں۔ انکی زندگی کے آخری دور کے بارے میں جو کچھ سُنا گیا ہے اور انکے بعض شخصی و ادبی بیانات سے جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ مبہم اور غیر قطعی ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ اعظمی کا آخری دور ابھی نامکمل تھا کہ ان کی داستانِ حیات مکمل ہو گئی اور وہ اپنے تازہ ترین ادبی تفکر کے کسی نتیجے پر پہنچنے سے پہلے ہی اپنی زندگی کے خاتمے تک پہنچ گئے۔ یقیناً یہ ان ہی کا نہیں، جدید اُردو ادب کا بھی المیہ ہے۔ اس لئے کہ وہ بلاشبہ نئے ادب کی ایک قوت تھے۔ جو اگر پورے طور سے اور اپنے صحیح رُخ پر بروئے عمل آجاتی تو عصری ادب کی کئی اُلجھنوں کو دور کرنے میں مدد ملتی۔

بہر حال، خلیل الرحمٰن اعظمی کی ادبی حیثیت کا اندازہ ہم ان کے اس تنقیدی و تخلیقی سرمایے کی بنیاد پر بھی لگا سکتے ہیں جو انہوں نے اپنے پیچھے چھوڑا ہے ــــ عصری ادب میں اعظمی کا سب سے بڑا امتیاز تو یہی ہے کہ وہ ان معدودے چند دانشوروں میں ایک تھے۔ جو ادب کا ایک سلیم و مستقیم ذوق اور شعور رکھتے ہیں۔ اور ان کی بدولت کسی بھی ایسے رجحان کے پابند رہنے کے لئے تیار نہیں جو زندگی اور ادب دونوں کا ادھورا تصوّر رکھتا ہے۔ خواہ اعظمی کا مطمح نظر متعین ہوا ہو یا نہیں، ان کی نظر بہر حال بلند تھی، وہ زندگی اور ادب کی تمام وسعتوں اور گہرائیوں کو ناپنے کا حوصلہ رکھتے تھے۔ ایک کھلے دماغ اور دردمند دل کے ساتھ بات کی تہہ تک پہنچنا، اور اسکے ہر پہلو کو سمجھنا چاہتے تھے۔ ان کی انفرادی استعداد، اپنی روایت سے بخوبی آگاہ اور اس کی قدر شناس تھی۔ انکا تجربہ ایک تاریخ کا پس منظر رکھتا تھا۔ انکی جدت ایک قدامت پر مبنی تھی۔ انکی رومانیت کلاسکیت سے پیوستہ تھی۔ انکی "جدیدیت" ترقی پسندی سے وابستہ تھی۔

خواہ اعظمی کی ادبی کاوشوں کو مفاہمتی کہا جائے یا مصالحتی لیکن اُن کا سرچشمہ ایک مرکب اور متوازن زاویۂ نگاہ تھا، اور اُردو ادب کی تاریخ کے جس دورِ انتشار میں یہ زاویۂ نگاہ اُبھرا تھا، وہ اس کی اہمیت اور آفادیت ثابت کرنے کے لئے کافی ہے۔ انتہا پسندیوں کے درمیان ایک جادۂ اعتدال کی تلاش یقیناً ایک اُمید افزا کوشش ہے۔ اگر اعظمی ترقی پسندی اور جدیدیت کے درمیان ایک ادبی بُنیاد پر کوئی مثبت سمجھوتہ کرانا چاہتے تھے۔ اور اس کیلئے

باقی صفحہ ۸۵ پر دیکھئے۔

گوپی چند نارنگ
صدر شعبۂ اردو، جامعہ ملیہ اسلامیہ، جامعہ نگر، نئی دہلی - ۲۵

"کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور"

یکم جون ۱۹۷۸ء کو آخری ہوا جس کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ جب شمس الرحمان فاروقی اور محمود ہاشمی نے فون پر خلیل الرحمان اعظمی کے انتقال کی اطلاع دی تو یقین نہیں آیا۔ اس لئے بھی کہ چند ماہ کشمیر میں رہنے سے انکی صحت پر اچھا اثر پڑا تھا۔ اور طبیعت سنبھل چلی تھی۔ خیال تھا کہ شاید ڈاکٹروں کا لکھا غلط ثابت ہو اور خون کے دریا کو ہر سال وہ اسی طرح پار کرتے رہیں۔ دہلی اکثر اُن کا آنا ہو جاتا تھا۔ ریڈیو کے لئے، جامعہ کے کام سے یا یونہی' ملاقات مقرر تھی۔ دوست احباب جمع ہوتے' علمی ادبی باتیں ہوتیں اور کبھی کبھی تو یہ لطفِ صحبت رات گئے تک جاری رہتا۔ میرا بھی جب علی گڑھ جانا ہوتا' اُن سے ملے بغیر واپسی نہیں ہوتی تھی۔ اِدھر آخری ملاقات جامعہ ہی میں ہوئی۔ جب اُنہوں نے "مضامینِ نو" کی جلد دی۔ اس سے پہلے اُنھوں نے علیگڑھ میں "مثنوی سحر البیان" کا مرتبہ نسخہ دیا تھا جس کا مقدمہ اُنہوں نے جی لگا کر لکھا تھا۔ غزلیں' نظمیں تو برابر ہو ہی رہی تھیں لیکن ان میں موت کی پرچھائیاں واضح طور پر لرزاں تھیں۔ اگرچہ "مضامینِ نو" میں "نئی باتیں" کے عنوان سے انہوں نے جو کچھ لکھا تھا اُن میں بھی موت کی دستک سُنی جا سکتی تھی۔ تاہم ان سطروں میں خود اعتمادی اور قوتِ ارادی کی جھلک بھی تھی جس سے اطمینان ہوا کہ اب وہ دوبارہ اپنے علمی کاموں کی طرف راجع ہو رہے ہیں' اور اچانک موڑ کا خطرہ اس طرح ٹلتا رہے گا۔ لیکن شاید یہ شمع بجھنے سے پہلے بھڑک اُٹھنے کی منتظر تھی۔ خلیل صاحب ہر کام کو ایک شانِ استغنیٰ اور بے نیازی سے کرتے تھے۔ وہ اُن چند لوگوں میں تھے جن کا وجود اپنے دوستوں کے لئے کبھی سوالیہ نشان نہیں بنا' وقت کی ریت میں کتنے نشان دھندلا جاتے ہیں۔ لیکن کچھ واقعے اور سانحے ایسے بھی شاعر' بھی

ہوتے ہیں کہ یادوں کی نیلگوں وسعتوں میں تیرتے ہوئے سامنے آجاتے ہیں۔ اب سوچتا ہوں کہ کچھ یاد نہیں آتا کہ خلیل صاحب سے تعلقات قائم کیسے ہوئے۔ بس ایسے ہی جیسے شراب تہہ خانوں میں رکھی رکھی VINTAGE WINE کے رتبے کو پہنچ جاتی ہے اور جس کی لذت کا مزہ کچھ ذائقہ چشیدہ ہی جانتے ہیں۔ شاید یہ ایسے تعلقات تھے جو آغاز و عروج کی اضافتوں سے ملوث ہی نہیں ہوئے۔ ان دلوں کا معاملہ جو ایک ہی تال پر دھڑک سکتے ہوں' شاید ہمیشہ ایسا ہی ہوتا ہوگا۔ بیس پچیس برس پہلے بھی اُن سے ملاقات ایسے ہوتی تھی گویا میں اُنہیں برسوں سے جانتا تھا۔ نگار میں خلیل صاحب کے مضامین آتش پر نکل چکے تھے۔ اُن کا مجھ پر خاصا اثر تھا۔ آزاد کتاب گھر کے قاضی معز الدین احمد ان دلوں بڑی کاوش سے ایک سے ایک عمدہ کتاب شائع کرتے تھے۔ "کاغذی پیرہن" ان ہی کے توسط سے منظرِ عام پر آئی۔ میر کے لہجے کی بازیافت کی گونج تھی۔ ناصر کاظمی کی "برگِ نے" اور ابن انشا کی "چاند نگر" بھی اسی زمانے میں شائع ہوئی تھیں۔ خلیل صاحب کا تذکرہ بھی نئی غزل کے بنیاد گذاروں میں محبت سے کیا جانے لگا۔ اُن کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ بھی چند برس کے اندر اندر شائع ہو گیا۔ پھر "نوائے ظفر" پھر "مقدمۂ کلامِ آتش" اور پھر "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" اور یوں خلیل صاحب کا علمی قد روز بروز بڑھنے لگا۔ لیکن رندانِ باصفا اور دوستانِ بے ریا کو اتنا مطلب ان کے "قد" سے نہیں تھا۔ جتنا اس "انداز" سے جو طہارت تھا غزل میں ایک یاس انگیز ہلکی چاندنی میں دھیمی نرم رو بہنے والی کیفیت سے یا نظم میں افسردہ سلگتے ہوئے فکری

آنے بانے سے اور تنقید میں کلاسیکی نظر کے فیضان، ادب کی ادبیت پر اصرار، معتدل و متوازن اظہار رائے اور شبنم کی طرح شفاف اسلوب بیان سے۔ شاید یہی وہ کشش تھی جو ہم لوگوں میں اپنائیت اور یگانگت کے بے نام رشتے کی ضامن تھی۔ بے تکلف گفتگو ہو، مباحثہ ہو، مذاکرہ ہو، سیمینار ہو، سمپوزیم یا جلسے جلوس کا منظر ہو، میں نے کبھی خلیل صاحب کو معلومات کے ہاتھوں بند نہیں دیکھا۔ کلاسیکی سرمائے کے علاوہ پچھلے چالیس برسوں کے ادبی رسائل کی بحثوں، معرکوں، مجادلوں اور مضامین و مقالوں سے متعلق معلومات کا وہ چلتا پھرتا انسائیکلوپیڈیا تھے۔ حافظہ اس بلا کا کہ قدماء سے لیکر عصر حاضر کے شعراء تک کے ہزاروں اشعار اور نظموں کے حوالے نوک زبان تھے۔ لیکن وہ اس کی نمائش نہیں کرتے تھے۔ در اصل وہ ان لوگوں میں نہیں تھے جو موقع بے موقع اپنے احساس کمتری کو سہلاتے رہتے ہیں۔ میں نے انہیں اس عالم میں بھی دیکھا ہے جب چاندنی رات میں کھلی چھت پر ساری رات گفتگو رہتی تھی محمود ہاشمی اور شہریار کی معیت میں۔ ان دنوں شہریار نے شعر کہنا شروع کیا تھا۔ نظمیں ادھر ادھر چھپ رہی تھیں اور داد و تحسین کے ڈونگرے برس رہے تھے۔ سرور صاحب کے شعبۂ اردو میں آنے کے بعد سیمیناروں کا سلسلہ شروع ہوا۔ میں وسکانسن یونیورسٹی کے سفر اول سے لوٹ آیا تھا۔ کل ہند اورینٹل کانفرنس کا اجلاس رہیں علی گڑھ میں آرٹس فیکلٹی کی نئی عمارت میں منعقد ہوا تھا۔ خلیل صاحب، شہریار اور دوسرے دوستوں سے خوب ملاقاتیں رہیں۔ اس موقع پر میں نے اپنا مضمون "ہمزہ کیوں" پڑھا تھا۔ خلیل صاحب کا کہنا تھا کہ اگر لسانیات یہ ہے تو اسے ہم بھی سمجھ سکتے ہیں۔ اگلے سال سرور صاحب نے زبان کے مسائل پر سیمینار کرایا۔ مجھ حقیر کو بھی یاد فرمایا۔ میں نے "زبان کے مطالعے میں لسانیات کی اہمیت" پر مضمون پڑھا۔ سبھی نے پسند کیا، خاصی بحث ہوئی۔ سرور صاحب کی طرح خلیل صاحب کا انداز بھی ایسے موقعوں پر ہمیشہ محبت آمیز حوصلہ افزائی کا ہوتا تھا جس سے کام کا ولولہ بڑھتا تھا۔ اس زمانے میں میرے چند مضامین نقوش میں نکل رہے تھے۔ خلیل صاحب رسائل "چاٹ" جانے کے لئے تو شہرہ رکھتے ہی، ملاقات ہوئی تو "عظمت اللہ خاں: طرز مثنوی کے پرستار" کی دل کھول کر داد دی۔ اور اصرار کیا کہ تحقیق و شامل بھی

لسانیات تو ہے ہی تنقید پر زیادہ توجہ کرنی چاہیئے۔ سو تنقید جو میں لکھتا رہتا ہوں اس میں خلیل صاحب کے "بگاڑنے" کو بہت زیادہ دخل ہے۔ علی گڑھ کے اگلے سیمینار میں، میں نے فراق اور فیض پر انگریزی میں مضمون پڑھا تو خلیل صاحب نے بالصراحت کہا کہ جو تجزیاتی انداز اختیار کیا گیا ہے اور اسلوبیات سے جو نظر پیدا ہوتی ہے، دوسروں کے یہاں اس کی کمی ہے۔ ادبی تنقید میں لسانیات سے جو بیش بہا مدد ملتی ہے اس کا فائدہ ضرور اٹھانا چاہیئے۔ غرض کس کس بات کا ذکر کیا جائے۔ اس زمانے میں شاید ہی کوئی کام کی چیز قلم سے نکلی ہو اور خلیل صاحب نے اس کا تذکرہ نہ فرمایا ہو۔

خلیل صاحب کی علالت اور جگر کے متاثر ہونے کے آثار سب سے پہلے اس زمانے میں پیدا ہونا شروع ہوئے جب وہ سرسید نگر میں اپنا مکان بنوا رہے تھے۔ گویا "باغ اردو" کی تعمیر میں خرابی کی صورت مضمر تھی۔ میں ملنے گیا تو وہ اپنی اصل شکل و صورت کا ظلِ موہوم رہ گئے تھے۔ دھکا سا لگا۔ — میں نے عمداً ذکر نہیں چھیڑا۔ اس کے شاید ایک ڈیڑھ برس بعد جب پہلا حملہ ہوا اور اسپتال میں داخل ہوئے تو دلی کے دوستوں کے ساتھ میرا بھی جانا ہوا۔ تب تک آفت ٹل چکی تھی۔ تکیے کے سہارے بستر پر بیٹھ گئے۔ وحید اختر، شہریار سبھی تھے۔ اور چاہنے والوں کا ہجوم غفیر تھا۔ خلیل صاحب باوجود نقاہت کے بشاش دکھائی دے رہے تھے۔ جیسے کبھی بیمار نہیں تھے۔ ہنس ہنس کر باتیں کرتے رہے، تازہ کلام سناتے رہے۔ گویا مرض کا دور دور تک نام و نشان نہ تھا۔ کچھ مدت کے بعد شہریار کے ساتھ دلی آئے۔ شمیم احمد شمیم سابق رکن ممبر پارلیمنٹ کے توسط سے آل انڈیا انسٹی ٹیوٹ آف میڈیکل سائنسز میں معائنہ اور جانچ ہوئی اور رازدارانہ طور پر ہمیں معلوم ہوا کہ جگر سوخت ہو چکا ہے اور خون بنانے والے خلیوں کے تمام ریشے اپنا کام بند کر چکے ہیں۔ اب یہ جئیں گے بھی تو تازہ خون کی منتقلی کے سہارے۔ وائے قسمت کہ یوں بھی جیئے تو کتنے دن سے

بہت آرزو تھی گلی کی تیری — سو یاں سے لہو میں نہا کر چلے

اگلی گرمیوں میں خلیل صاحب اپنے ہم زلف کمال احمد صدیقی کے پاس سرینگر چلے گئے۔ خطوں سے معلوم ہوتا رہا کہ رو بصحت ہیں۔

اور خون دینے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔

جون کے آخر میں نیشنل بک ٹرسٹ کے سیمینار میں میرا سری نگر جانا ہوا تو دیکھ کر خوشی ہوئی کہ چہرے پر رنگ آچلا تھا۔ غذا کا پرہیز بھی ڈاکٹروں نے اٹھا دیا تھا۔ پروفیسر شکیل الرحمٰن کے یہاں کمال احمد صدیقی اور مظہر امام کے گھر پر اور لالہ رُخ میں کئی نشستیں رہیں، پروفیسر مسعود حسین خاں، وارث علوی، ڈاکٹر خلیق انجم، انور کمال حسینی سبھی وہاں تھے۔ خوب خوب لطف صحبت رہا۔ خلیل صاحب دیر سویر سوتے جاگتے بھی رہے لیکن چہرے پر تکان کے آثار پیدا نہیں ہوئے۔ وہی بے تکلفی، رہی روانی اور مزے مزے کی باتیں۔ اطمینان سا ہونے لگا کہ اب یہ مرض کو پیچھے چھوڑ رہے ہیں۔ شاید ستمبر اکتوبر میں جب وہاں سے علی گڑھ آئے تو دلی میں ملتے ہوئے گئے سردیوں میں جامعہ کے حالات سننے تو بطور خاص دلی آئے۔ سب کچھ انہیں معلوم تھا۔ یونیورسٹیاں جس طرح بغض، عناد اور سیاسی سازشوں کا اکھاڑہ بن گئی ہیں اس پر افسوس کرتے رہے۔ کہا ــــ "کون نہیں جانتا کہ یہ آگ حاسدوں کی لگائی ہوئی ہے۔ جو خود تنگ نظری اور تعصب کا شکار ہوں، وہ دوسروں پر اس طرح کا الزام لگایا کرتے ہیں۔ چند ماہ بعد بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ ڈاکٹر رفیق زکریا نے خلیل صاحب کو بھی جامعہ اُردو کی کورٹ کا رکن مقرر کیا تھا۔ انہیں بھی بلایا گیا۔ خلیل صاحب بھی تشریف لائے۔ اور ہم سب لوگوں کا قیام ایم ایل اے ہوسٹل میں تھا، یہاں باقر مہدی، خضر راہ اور یارانِ طریقت کے سرخیل تھے۔ ڈاکٹر ظ۔ انصاری نے اپنے عائدین بمبئی میں سے ہونے کا حق ادا کیا۔ باقر مہدی خلیل صاحب کو "استاد خلیل" کہہ کر ان کی بزرگی کا اعتراف کراتے رہے۔ ڈاکٹر عبدالستار دلوی، فضیل جعفری، عزیز قیسی، حسن کمال، عبداللہ کمال سب سے خلیل صاحب کی ملاقاتیں رہیں اور لطف اندوز ہوتے رہے۔ بمبئی میں جہاں کہیں بھی جامعہ کے حالات کا ذکر آیا، خلیل صاحب نے حقیقت بیان کر دی۔ سب کچھ بتانے کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ آزمائش کی اس گھڑی میں میرے جن کرم فرماؤں، دوستوں، چاہنے اور چاہے جانے والوں نے (جن کے منطقے دلی اور علیگڑھ سے، بمبئی، حیدر آباد اور، احمد آباد اور لکھنؤ، الٰہ آباد سے پٹنہ اور کلکتہ تک پھیلے ہوئے ہیں) جس جس طرح حق شناسی کا ثبوت

دیا اور اپنے مہر و وفا اور صدق و صفا سے کذب و افترا کا مقابلہ کیا اور جن کے الطاف و اکرام کو میں کبھی بھلا نہیں سکتا، انہیں خاص الخاص کرم فرماؤں میں خلیل صاحب بھی تھے۔

علیگڑھ کے ایک خاص واقعے کا ذکر ضروری ہے۔ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کی جانچ کے بعد ایک دوبار خلیل صاحب سخت بیمار ہوئے۔ خون دیا گیا اور رفتہ رفتہ طبیعت بحال ہو گئی۔ ایسے ہی ایک موقع پر میں علی گڑھ گیا ہوا تھا۔ قیام پروفیسر خورشید الاسلام صاحب کے یہاں تھا۔ ان دنوں کچھ ایسے احباب کی بدولت جو محبت کی فراوانی سے مجبور ہو کر لگانے بجھانے کے کاموں میں فیاضی کا ثبوت دیتے رہتے ہیں، خورشید صاحب اور خلیل صاحب میں خاصا فاصلہ پیدا ہو گیا تھا۔ لیکن جب خورشید صاحب کو مجھ سے میڈیکل انسٹی ٹیوٹ کی جانچ کے بارے میں معلوم ہوا تو دیر تک دُکھ اور تشویش کا اظہار کرتے رہے۔ یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ جب میں جانے لگا تو خورشید صاحب بھی تیار ہوئے اور میرے ساتھ خلیل صاحب کے یہاں تشریف لے گئے۔ وہ جون اور پھر اگلا جون، گرمی بھی ایسی بلا پناہ کہ آسمان سے شعلے برستے تھے۔ خیال تھا کہ جون میں کشمیر چلے جائیں گے۔ رختِ سفر باندھ ہی رہے تھے کہ اچانک اس سفر کا بلاوا آ گیا جس میں کوئی چیز ساتھ نہیں جاتی۔ اور ہم جون کی رات کے سائے گہرے ہونے سے پہلے پہلے اردو کا یہ بے مثل ادیب منوں مٹی کے نیچے دب چکا تھا۔ اُن برس کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے۔ ابھی انکو کتنا اور لکھنا اور کتنا اور کام کرنا تھا ؎

ہاں اے فلکِ پیر جواں تھا ابھی "عارف"

کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور

خلیل صاحب کا سانحۂ ارتحال میرے لئے ایک ایسا لمحۂ تاریک ہے جو میرے ذہن سے کبھی محو نہیں ہو سکتا۔ انکی موت صرف ایک منفرد شاعر اور نقاد، ادیب اور معلم ہی کی موت نہیں، میرے لئے ایک ایسے ہی دوست کی موت بھی ہے جو نیکی، شرافت، انسانیت اور علمیت کا استعارہ تھا۔ اور ایک ایسا استعارہ جو حسن خبر میں واقع ہوا تھا۔ افسوس کہ گردشِ دوراں سے اس کے مبتدا کا سانچہ بھی ٹوٹ چکا، اور اب لوگ ڈھلتے بھی ہیں تو ایسے کہ پہلی ہی بارش میں یاروں کی پوری صرف و نحو دھل جاتی ہے۔

ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے ∞∞ [illegible]

سہیل عظیم آبادی (مرحوم)

یادِ خلیل

زندگی انسان کو ایسے سانحوں سے دو چار کر دیتی ہے جسکا تصور بھی اندوہناک ہوتا ہے۔ ان سانحوں میں سب سے زیادہ روح فرسا پیاروں کی موت ہے۔ لیکن ایسے سانحوں کا بھی سامنا کرنا اور انہیں برداشت کرنا ہی پڑتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی موت میرے لئے اندوہناک سانحہ تھی جب ان کی موت کی خبر ملی تو دل کو سخت چوٹ لگی۔ اور کچھ دیر عجیب عالم میں رہا۔ چند ہی دنوں پہلے ان کا خط آیا تھا کہ اب وہ اچھے ہیں۔ اور صحت بحال ہو رہی جاری ہے۔ اور اُمید ہے کہ جلد ہی اچھے ہو جائیں گے۔ پھر یہ المناک خبر ملی۔ اللہ کی مرضی کے آگے سر جھکا دینے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اللہ انہیں اپنے دامنِ رحمت میں جگہ دے۔

خلیل مجھے بے حد عزیز تھے۔ چھوٹے بھائی کی طرح۔ یہ رشتہ قائم ہونے کے بعد انھوں نے بھی مرتے دم تک اسے قائم رکھا۔

خلیل سے میری ملاقات عجیب طرح سے ہوئی تھی۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ مہینہ کون سا تھا اور تاریخ کون سی تھی لیکن یہ ۱۹۴۷ء کے اوائل کی بات ہے۔ ان دنوں میرا قیام رانچی میں تھا۔ انجمن ترقی اُردو ہند نے وہاں اپنا ایک ذیلی ادارہ قائم کیا تھا۔ چھوٹا ناگپور اُردو مرکز۔ مقصد تھا وہاں کے آدی باسیوں اور غیر آدی باسیوں میں اُردو کی ترویج و اشاعت۔ بابائے اُردو اس کے نگراں تھے۔ اور میں اس کا مہتمم تھا۔ میں بابائے اُردو سے مشورے کرنے اور ہدایتیں لینے کے لئے دہلی جا رہا تھا۔ ٹرین آٹھ، نو بجے علی گڑھ اسٹیشن پر پہونچی۔ دو نوجوان اس ڈبے میں آ گئے جس میں میں بیٹھا تھا۔ دونوں آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ جب ٹرین چل پڑی تو ایک نوجوان قریب آ کر بیٹھ گیا۔ اور مجھ سے باتیں کرنے لگا۔

شاعر، بمبئی

"معاف فرمایئے گا۔ آپ سہیل عظیم آبادی ہیں؟"

میں نے نوجوان کو دیکھا، گورا چٹا رنگ، دُبلا پتلا اور میانہ قد چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ نوجوان نے مسکراتے ہوئے ہاتھ بڑھایا اور ہاتھ ملایا اور بولا۔

رسالے میں آپکی تصویر دیکھی تھی۔ آپ کو پہچان لیا۔ میرا نام خلیل الرحمٰن اعظمی ہے مسلم یونیورسٹی کا طالب علم ہوں۔ ایک ضرورت سے دہلی جا رہا ہوں۔"

اس کے بعد باتیں ہونے لگیں۔ خلیل کچھ اس طرح ملے کہ مجھے بھی مخاطب ہونا پڑا۔ ان کا نام سُن چکا تھا۔ وہ علی گڑھ میں ترقی پسند ادبی تحریک کے سرگرم کارکن تھے۔ شاید اس وقت تک ان کی کوئی تحریر میری نظر سے نہیں گذری تھی مگر یہی کیا کم تھا کہ وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے کارکن تھے۔ یہ رشتہ ہم دونوں کو ایک دوسرے سے قریب لانے کیلئے کیا کم تھا۔ ہم لوگ باتیں کرتے رہے اور ٹرین دہلی کا راستہ طے کرتی رہی۔ اس وقت یہ یاد نہیں کہ اُن کے ساتھ دوسرے صاحب کون تھے۔ بہت سی باتیں ہوئیں۔ خاص کر علی گڑھ میں ترقی پسند تحریک سے متعلق۔ ہم سب دہلی پہنچ گئے۔ خلیل کہیں اور چلے گئے۔ اور میں انجمن کے دفتر پہونچا ان دنوں انجمن کا دفتر دریا گنج میں تھا۔ ڈاکٹر انصاری کی شاندار کوٹھی دارالسلام میں۔

اسے اتفاق سمجھئے کہ پندرہ سترہ دنوں کے بعد میں دہلی سے رانچی واپس جانے لگا تو پھر خلیل سے دہلی اسٹیشن پر ملاقات ہو گئی۔ وہ صبح کے وقت دہلی آئے تھے اور شام کی ٹرین سے واپس جا رہے تھے۔ علی گڑھ تک ساتھ رہے اور بہت سی باتیں ہوئیں۔ انکے بارے میں بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ کچھ تو انھوں نے بتایا اور کچھ ان کی باتوں سے اندا

ہوا۔ ان دنوں وہ پریشان تھے۔ ان کا کوئی سرپرست نہیں تھا اور وہ خود اپنی ہمت اور کوششوں کے سہارے اپنی زندگی کو سنوارنے کی کوششوں میں لگے ہوئے تھے۔ مجھے واقعی ان سے دلی ہمدردی ہوگئی۔ اور ان سے قربت محسوس کرنے لگا۔ علی گڑھ کا اسٹیشن آیا تو وہ ٹرین سے اتر گئے۔ اور میں رانچی چلا گیا۔

چند دنوں کے بعد خلیل کا ایک خط ملا۔ بس خیریت کا رسمی خط تھا۔ میں نے عادت کے مطابق جواب دیا۔ کچھ دنوں کے بعد پھر ان کا دوسرا خط آیا۔ اس خط میں انھوں نے اپنے بارے میں بہت سی باتیں لکھی تھیں۔ خط کے ہر لفظ سے اندازہ ہوتا تھا کہ لکھنے والا محبت کا پیاسا ہے۔ اور بات بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ بعد میں جو حالات معلوم ہوئے تو میرے خیال کی تصدیق ہوگئی۔ والدین کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور بڑے بھائیوں سے کوئی تعلق نہیں رہ گیا تھا۔ وہ زندگی کا طویل اور دشوار گذار راستہ تنہا اپنی ہمت سے طے کر رہے تھے۔

میں اس لحاظ سے بہت خوش نصیب ہوں کہ جن بزرگوں سے ملا۔ اُن سے شفقت ملی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ شفقت کے ساتھ پیش آنا میری عادت بن گئی ہے۔ اب بھی میرا رویہ یہی ہے۔ اگرچہ اس سلسلے میں بعض نہایت برے تجربے بھی ہوئے ہیں۔ واقعی خلیل کے ساتھ اپنا پن محسوس کرتا تھا۔ وہ مجھے خط لکھتے اور میں اُنھیں خط لکھتا۔ ان خطوں میں ذاتی باتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ اور علم و ادب کی باتیں کم۔ ان کے خطوں سے ایک بات معلوم ہوئی کہ خلیل حوصلہ مند، خود دار اور ذہین انسان ہیں اور پختہ ارادوں کے مالک۔ کوئی فیصلہ کرنے کے بعد بدلتے نہیں تھے۔ اُنھوں نے اس زمانے میں سخت دقتوں کا بھی سامنا کیا۔ لیکن کسی قریبی رشتہ داروں سے بھی مدد نہیں چاہی۔ حالانکہ اُن کے رشتہ داروں میں ایسے لوگ تھے، جو اُن کی مدد کر سکتے تھے۔

خلیل کا گھرانہ دیندار مسلمانوں کا تھا۔ اُن کے والد بزرگوار مولانا محمد شفیع مدرسہ اصلاح سرائے میر کے بانی تھے۔ مولانا حمید فراہی اُن کے پھوپھا تھے۔ ابتدا میں خلیل کو بھی دینی تعلیم دی گئی۔ انگریزی اُنھوں نے بعد میں پڑھی۔ انکا دینیات کا مطالعہ اچھا خاصہ تھا۔ لیکن دینی تعلیم کا اُن پر کوئی اثر نہ تھا۔ آزاد خیال تھے۔ اور مزاج میں بڑی شگفتگی تھی۔ خواہ کیسی ہی بات ہو، مسکراتے ضرور تھے۔ اور کبھی کبھی زور سے بھی ہنستے تھے۔ لیکن کم۔ یہ اندازہ مجھے دو ایک مرتبہ کی ملاقات میں ہو گیا تھا۔ جو بعد میں زیادہ واضح ہوتا گیا۔

دو تین مہینوں کے بعد خلیل کا خط آنا بند ہو گیا۔ میں نے دو تین خط لکھے۔ کسی کا جواب نہیں آیا۔ تو مجبوراً میں بھی خاموش ہو گیا۔

یہ زمانہ ہندوستان کے ہر سنجیدہ انسان کے لئے بیحد سخت تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی۔ مرکز میں ملی جلی حکومت بن چکی تھی۔ زیادہ صوبوں میں کانگریس کی حکومت تھی۔ کانگریس ہندوستان کی آزادی پر مصر تھی اور مسلم لیگ پاکستان کے قیام پر۔ انگریز اپنی سیاسی بازی گری میں مصروف تھے سارے ملک میں تناؤ تھا۔ فرقہ وارانہ فضا بے حد خراب تھی۔ اور ہر سنجیدہ وطن پرست ذہنی طور پر پریشان تھا۔ آخر ہندوستان آزاد ہو گیا۔ اور پاکستان بھی قائم ہو گیا۔ سارے ملک میں طوفان سا آگیا۔ خاص کر شمالی حصے میں انسان کی زندگی سب سے حقیر چیز بن کر رہ گئی تھی۔ ہر روز ہولناک خبریں ملنے لگیں۔ ایک دن کسی نے خبر دی کہ خلیل دہلی سے علیگڑھ جا رہے تھے۔ فسادیوں نے ان کو مسلمان ہونے کے جرم میں اپنے خیال میں مار کر ٹرین سے باہر پھینک دیا تھا۔ اس سے زیادہ کچھ بھی نہیں معلوم ہو سکا۔ سخت پریشانی ہوئی۔ علی گڑھ میں کچھ دوستوں کو خطوط لکھے۔ لیکن وہ عجیب سا زمانہ تھا۔ کسی کو کسی کی خبر نہ تھی۔ کون زندہ ہے اور کون مارا گیا؟ اور کون جان بچا کر پاکستان چلا گیا۔ دہلی اور علی گڑھ کے سفر کی بات سوچی بھی نہیں جا سکتی تھی۔ اب دہلی جانے کا کوئی کام بھی نہیں رہ گیا تھا۔ دہلی میں جو فسادات ہوئے ان میں انجمن ترقی اُردو کا دفتر برباد کر دیا گیا تھا۔ بابائے اُردو مولوی عبدالحق کچھ دنوں بھوپال میں پناہ گزیں رہے۔ پھر پاکستان چلے گئے۔ چھوٹا ناگ پور اُردو مرکز کی سرگرمیاں ختم کر دینی پڑیں۔ میں رانچی میں تھا اور بے کار وقت کاٹ رہا تھا۔ ایک سال پہلے یعنی ۱۹۴۶ء میں بہار میں جو فرقہ وارانہ فسادات پھوٹے تھے وہ ان میں خود برباد ہو چکا تھا۔ اب کیا کرنا ہے، اس کا کوئی نقشہ ذہن میں نہیں تھا۔ کتابیں پڑھنا، کچھ لکھنا اور دوستوں میں بیٹھ کر گپیں کرنا کام رہ گیا تھا۔ احباب کی یادیں آتی رہیں۔ بعض کے خطوط بھی آئے۔ لیکن خلیل کا کوئی خط نہیں آیا۔ خبر درست تھی۔ بلوائیوں نے اُن کو مردہ سمجھ کر پھینک دیا تھا۔ لیکن ایک نیک دل ہندو نے انہیں دیکھ لیا۔ اٹھا کر لے گیا۔ علاج کرایا۔ وہ اچھے ہو گئے۔ علی گڑھ میں تھے۔ اور تعلیم کا سلسلہ پھر جاری ہو گیا تھا۔

خلیل کی شہرت دراصل ۱۹۴۹ء سے شروع ہوگئی۔ جب ایک نظم پڑھنے کے جرم میں وہ گرفتار کر لئے گئے۔ اور اُنہیں سزا ہوگئی۔ اور شاعر کیفی

بی اے کا امتحان دینے کے لئے بہرول پر رہا کر دیا گیا۔ خلیل نے بہت جلد ہی اپنے قلم کی طاقت منوالی۔ انھوں نے چند مضامین لکھے۔ جن کو پڑھنے کے بعد یہ سمجھنا مشکل نہیں ہوتا تھا کہ یہ مضامین کافی مطالعہ اور غور و خوض کے بعد لکھے گئے ہیں۔ اپنے موضوع پر ان کی نظر گہری تھی۔ جو کچھ لکھتے تھے سمجھ بوجھ کر لکھتے تھے۔ صرف اس لئے نہیں لکھتے تھے کہ مضمون شائع ہو جائے بلکہ اس لئے لکھتے تھے کہ اس موضوع پر کچھ نئی روشنی ڈالنا چاہتے تھے۔ خلیل نے مولانا نیاز فتحپوری جیسے مشکل پسند اہلِ نظر سے بھی داد وصول کر لی۔

خط و کتابت کا سلسلہ جاری رہا۔ لیکن ملاقات کا موقع بہت دنوں تک نہیں ملا۔ ۱۹۴۹ء میں میں رانچی چھوڑ کر پٹنہ چلا آیا۔ اور عزیز ترین دوست عبدالقیوم مرحوم کی صلاح سے ایک روزانہ اخبار جاری کیا۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان بننے کے بعد عام مسلمان پراگندہ خیال ہو گئے تھے۔ اور ان کے حوصلے پست ہو گئے تھے۔ اخبار جاری کرنے کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کی ذہنی آبادکاری کی جائے۔ ان کو حوصلہ دلایا جائے۔ انصاری صاحب مرحوم اس وقت بہار کی کانگریسی حکومت میں وزیر تھے۔ میں نے اخبار کے اجرا کی خبر خلیل کو دی۔ ان کا ردِّ عمل اچھا نہیں تھا۔ انہوں نے لکھا تھا یہ کیا سوجھی۔ بہت سے اخبار نویس ادب کی طرف جا رہے ہیں اور آپ ادب سے خبر نویسی کی طرف۔ اس سے ادبی زندگی ختم ہو جائے گی۔ انھوں نے کئی خطوں میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا۔ اسی سال اخبار کی ایک ضرورت سے دہلی جانا پڑا۔ اب حالات بہت کچھ سدھر چلے تھے۔ اور سفر کرنا اب خطرناک نہیں رہا تھا۔ راستے میں علی گڑھ آیا تو میں اتر گیا۔ حالانکہ پہلے ارادہ نہیں تھا۔ ان سے ملاقات ہو گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر خوش ہوئے۔ اس مرتبہ اندازہ ہوا کہ وہ اپنے دوستوں کے حلقے میں بے حد مقبول تھے۔ ان کے کمرے میں دوستوں کا جمگھٹ رہتا تھا۔ شعر و شاعری اور علم و ادب کی باتیں ہوتی رہتی تھیں۔ خلیل اپنی ذات سے انجمن تھے۔ جب انھوں نے بی اے کر لیا تو بعض اساتذہ نے جو ان کے مضامین پڑھ کر متاثر ہو چکے تھے خاص طور پر توجہ دی اور انھیں اردو میں ایم اے کرنے کا مشورہ دیا۔ پروفیسر رشید احمد صدیقی نے خاص طور پر ان کی ہمت افزائی کی۔ پھر وہ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بنا دئے گئے۔ ساتھ ہی ساتھ مسلم یونیورسٹی گزٹ کی ایڈیٹری بھی ان کو دی گئی۔ یہی ان کی آمدنی کا ذریعہ تھا۔ اس زمانے میں انھوں نے بہت سے چھوٹے چھوٹے مضامین لکھے۔ جو بہت پسند کئے گئے۔ اسی حال میں انھوں نے ایم اے کر لیا۔ لیکن اطمینان بخش نوکری کی صورت اب بھی نہیں تھی۔ وہ تلاشِ معاش میں باہر جانے کی سوچ ہی رہے تھے کہ یونیورسٹی کے شعبۂ اردو میں ایک لکچرر کی جگہ خالی ہوئی اور وہ حسبِ دلخواہ انھیں مل گئی۔

لکچرر بننے کے بعد خلیل زیادہ مخلص اور ذمّہ دار ہو گئے۔ ان کا میدان تنقید تھا۔ اور تحقیق بھی۔ میری دلچسپی تنقید سے ایک حد تک ہے۔ لیکن تحقیق سے نہیں۔ یہ بڑا صبر آزما کام ہے۔ میں ان کے مضامین بڑے شوق سے پڑھتا تھا۔ لیکن رائے کم ہی دیتا تھا۔ اس لئے کہ تحقیق اور تنقید سے میری دلچسپی کم تھی۔ اور خلیل جب بھی کچھ لکھتے تو رائے پوچھتے۔ آخر میں نے ان کو لکھا کہ کسی سخن ناشناس کی رائے جاننا ضروری نہیں۔ لیکن وہ اپنی عادت نہیں چھوڑتے۔

خلیل کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ خاص کر معاصر اردو ادب پر۔ ان کے پاس بہت سے رسالے آتے تھے۔ اور وہ ہر رسالے کو شروع سے آخر تک ضرور پڑھتے تھے۔ اسکے ساتھ حافظہ بلا کا تھا۔ کسی شاعر کی کوئی غزل رسالے میں پڑھنے کے بعد یاد ہو جاتی تھی۔ اور اچھے اشعار تو وہ بھولتے ہی نہیں تھے۔

وقت گذرتا گیا۔ بار بار ملاقات ہوتی رہی۔ اور تعلقات بڑھتے رہے۔ پھر حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ روزانہ اخبار کو خیرباد کہنا پڑا۔ بے کار بیٹھنے کی عادت نہیں۔ میں نے ایک ماہانہ رسالہ "تہذیب" جاری کیا۔ اور انہیں اطلاع دی تو بہت خوش ہو گئے۔ مضامین کی فراہمی کی ذمّہ داری لی۔ اور مضامین فراہم بھی کرتے رہے۔ انھوں نے باضابطہ شاعری بھی شروع کر دی تھی۔ انکی یہ خوبی تھی کہ جس قدر سنجیدہ اور بصیرت افروز مضامین لکھتے تھے۔ اتنی ہی اچھی غزلیں اور نظمیں بھی کہتے تھے۔ اپنے حلقہ میں ان کا کافی اثر تھا۔ لیکن وہ گروہ بندی کے سخت خلاف تھے۔ نہ خود اپنی ٹولی بنائی اور نہ کسی ٹولی میں شریک ہوئے۔ جب ترقی پسند تحریک کے سرگرم رکن تھے تو بھی ترقی پسندوں کی کوئی اچھی تحریر سامنے آجاتی تو اس کی تعریف کرتے تھے۔ اور جب ترقی پسندی سے علیحدہ ہو کر جدیدیت کے قائل ہو گئے تھے۔ تو بھی ترقی پسندوں کی اچھی چیزوں کی دل کھول کر تعریف کرتے تھے۔ انکے اپنے خیالات تھے۔ اور یہ خیالات فیشن کے بہاؤ کے نہ تھے بلکہ ان کے اپنے مطالعہ اور غور و خوض کا نتیجہ تھے۔

خلیل نے بیحد اچھی طبیعت پائی تھی۔ ہمیشہ اور ہر حال میں خوش رہا کرتے تھے۔ طبیعت میں مذاق بھی تھا۔ اور موقع ملنے پر مذاق سے نہ چوکتے تھے۔ اسوقت ایک دلچسپ واقعہ یاد آ رہا ہے جو ان کی خوش طبعی کا ثبوت

۴۔ جاڑے کو میں دہلی جاتے ہوئے علی گڑھ میں اُن سے ملنے کو رک گیا۔ ان کے ایک بہت ہی قریبی دوست حنیف ناشاد تھے۔ طے پایا کہ ایک گروپ فوٹو لیا جائے۔ اور اس ارادے سے ہم لوگ شمشاد مارکیٹ کے ایک فوٹو گرافر کی دکان پر گئے۔ راستے میں ایک صاحب مل گئے جو میرے بھی ملاقاتی تھے اور اُن کے بھی۔ وہ بھی ساتھ ہو گئے۔ حنیف ناشاد اور خلیل ان کو گروپ فوٹو میں شامل کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن وہ شرکت پر مصر تھے۔ آخر خلیل اور حنیف ناشاد میں کچھ باتیں ہوئیں۔ پھر خلیل نے فوٹو گرافر سے جا کر کہا۔ پہلا اکسپوزر لیا گیا۔ گروپ میں چار آدمی تھے۔ اور دوسری بار میں تین۔ یعنی وہ صاحب اس گروپ میں شریک نہیں تھے۔ میں نے سمجھا کہ دو گروپ فوٹو لیا گیا۔ لیکن واپسی پر خلیل نے ہنستے ہوئے کہا کہ پہلا گروپ فوٹو نزیب تھا۔ اکسپوزر لیتے وقت کیمرے میں پلیٹ تھی ہی نہیں۔ خلیل نے فوٹو گرافر کو یہ ترکیب بتائی تھی۔ اس مذاق پر سب لوگ دیر تک ہنستے رہے۔

"تہذیب" بھی حالات کی نذر ہو گیا۔ خلیل کو تہذیب کے بند ہو جانے کا بیحد افسوس تھا۔ لیکن میں بھی مجبور تھا اور وہ بھی۔ "تہذیب" پھر جاری نہ ہو سکا۔ لیکن خلیل مرحوم سے جب بھی ملاقات ہوتی تو وہ اس کا ذکر ضرور کرتے اور اصرار کرتے کہ پھر اسے جاری کیا جائے۔ لیکن تیر کمان سے نکلنے کے بعد واپس نہیں آتا۔ میں چاہنے کے باوجود کچھ بھی نہیں کر سکا۔

۱۹۵۵ء میں مجھے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت مل گئی۔ اور سری نگر بھیج دیا گیا۔ سری نگر جانے سے پہلے دو دن دہلی میں رہنا تھا۔ ایک دن علیگڑھ میں بھی گذرا۔ خلیل بہت خوش ہوئے۔ اور سری نگر پہنچنے کا انہوں نے وعدہ بھی کیا، لیکن نہیں پہونچے۔ جب بھی بلاتا تو وہ وعدہ بھی کر دیتے۔ لیکن جیسے انھیں علیگڑھ چھوڑنے کے تصور سے تکلیف ہوتی تھی۔ علی گڑھ سے باہر وہ کم ہی جاتے تھے۔ اور یہ تو برابر کہتے تھے کہ اب ساری زندگی علیگڑھ میں رہنا ہے۔ وہ علی گڑھ آنے کے بعد شاید ہی کبھی اپنے وطن گئے ہوں۔ کم سے کم مجھے اس کا علم نہیں۔ وہ علی گڑھ آئے تو علی گڑھ کے ہو گئے۔

میں خلیل کے علمی و ادبی کارناموں پر روشنی ڈالنا نہیں چاہتا۔ یہ زیادہ لائق اصحاب کے کرنے کا کام ہے۔ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ خلیل کی ذات کے بارے میں، جیسا میں نے انھیں دیکھا اور پایا۔

۱۹۵۷ء میں دہلی سے تبدیل ہو کر میں دہلی آ گیا۔ اُن کو معلوم تھا۔ وہ ایک ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں دہلی آئے۔ ملاقات ہوئی اور انہوں

نے مجھ

نے وعدہ لیا کہ اگلے سنیچر کو میں علیگڑھ پہونچوں گا۔ اور میں حسب وعدہ علی گڑھ پہونچا۔ ان دنوں وہ دودھ پور کے ایک مکان آنند بھون میں رہتے تھے۔ وہاں پہونچا تو رات ہو چکی تھی۔ لیکن خلیل غائب تھے۔ ان کا ملازم موجود تھا۔ اور میرا کھانا بھی تیار تھا۔ وہ کہہ کر گئے تھے کہ جلدی واپس آ جائیں گے۔ لیکن وہ غائب تھے۔ اُن کے ملازم نے کھا لینے کو کہا۔ اور یہ بھی کہا کہ ان کا یہی حال ہے۔ بارہ بجے رات سے پہلے شاید ہی آ سکیں۔ واقعی مجھے غصہ آیا۔ یہ کیا حرکت ہے۔ میں نے کھانا کھا لیا اور سونے کی کوشش کرنے لگا۔ لیکن نیند نہیں آئی۔ خلیل بارہ کے بعد واپس آئے۔ میں نے اس وقت کچھ کہنا مناسب نہیں سمجھا۔ خلیل اپنی غفلت پر شرمندہ تھے۔ لیکن دوسرے دن جانے کے وقت ذرا صاف صاف باتیں ہوئیں۔ میں نے کہا کہ تمہاری یہ حالت اس لئے ہے کہ تمہاری زندگی کا مرکز نہیں ہے۔ اور اگر تم جلد ہی شادی نہ کر لوگے تو تمہاری حالت نہیں سدھرے گی۔ خلیل نے میری باتوں کا کوئی جواب نہیں دیا۔ میری باتیں سنتے رہے۔ دوسرے دن میں دہلی روانہ ہو گیا۔ دو دن بعد خلیل کا خط ملا بے حد سعادت مند چھوٹے بھائی کی طرح۔ انھوں نے لکھا تھا کہ میری باتوں پر انہوں نے غور کیا۔ اور میں نے انہیں جو رائے دی تھی۔ وہ انھیں مناسب نظر آئی۔ اور یہ کہ وہ شادی کرنے کے لئے بالکل تیار تھے۔ اور چونکہ مناسب رشتہ تلاش کرنے کی ذمہ داری انھوں نے مجھ پر چھوڑ دی تھی۔ ـــ اتفاق کی بات کہ ایک شریف گھرانے کی ایک نیک سیرت لڑکی میری نظر میں تھی میں نے انھیں خط لکھا اور یہ ذمہ داری قبول کر لی۔ اور چند ہی دنوں کی خط و کتابت کے بعد یہ رشتہ طے ہو گیا۔ اور خلیل کی شادی ہو گئی۔ اُن کی شادی میں ان کے خاندان کا کوئی فرد بھی شریک نہیں تھا۔ میں تھا اور اُن کے چند خاص احباب۔ بارات بیلی بھیت ضلع جہان آباد گئی۔ جہاں اُن کے خسر حکیم عبدالمجید صاحب مرحوم طبیب تھے۔

مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ شادی نہایت مبارک و مسعود ثابت ہوئی۔ خلیل کی زندگی سدھر گئی۔ لاابالی پن بالکل ختم ہو گیا۔ اور زیادہ سے زیادہ وقت گھر پر رہنے لگے۔ خود خلیل بھی اپنی شادی سے بہت خوش تھے۔ انہوں نے اپنے ایک خط میں اقرار کیا کہ شادی نہایت مبارک ثابت ہوئی۔ اور انکی زندگی بن گئی۔

جب میں کسی ضرورت سے دہلی جاتا تو علی گڑھ ضرور رکتا اور خلیل سے ملتا۔ سچ یہ ہے کہ خلیل سے مل کر دلی خوشی ہوتی تھی۔ ان کے ساتھ وقت اچھا

ایکبار میں علیگڑھ پہونچا تو وہ مجھے اپنے شعبے میں لے گئے۔ مجھے بٹھا کر خود صدر شعبہ پروفیسر آل احمد سرور کے پاس گئے۔ اور تھوڑی دیر میں آکر بولے کہ آپ کو سمینار میں اپنی کہانی پڑھنی ہے۔ میں نے اُن سے کہا کہ ایک تو میں سفر میں ہوں میرے پاس کوئی کہانی نہیں۔ دوسرے میں شاعر نہیں ہوں کہ تھوڑی دیر میں دو چار غزلیں سُنا دوں۔ خلیل نے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا کہ اب بات طے پائی ہے۔ سارے طالب علم سیمینار میں جا رہے ہیں۔ سرور صاحب آ رہے ہیں۔ اگر آپ کہانی نہیں پڑھیں گے تو مجھے خفت ہوگی۔ مجھے یہ بھی منظور نہ تھا۔ میں نے کہا کہ میرے پاس کہانی نہیں ہے، کیا پڑھوں گا۔ تو خلیل مرحوم نے کہا کہ میں ایک کہانی لیتا آیا ہوں۔ اچھی کہانی ہے۔ میں نے کہانی سُنا دی۔ کہانی طویل تھی۔ سچ تو یہ ہے کہ میں لمبی کہانی سُنا تے سُناتے تھک گیا تھا۔

جب ہم لوگ واپس آئے تو خلیل مرحوم نے ہنس کر کہا کہ آپ نے بہت ڈانٹا ہے، آج میں نے انتقام لے لیا۔ میں بھی اُن کے ساتھ ہنسنے لگا۔

باتیں اتنی ہیں کہ لکھتا جاؤں اور ختم نہ ہوں۔ جب ۶۶ء میں اپنے شعبے میں ریڈر مقرر ہوئے تو ذاکر باغ کے کوارٹر میں آ گئے۔ اسی وقت سے ان کو مکان بنانے کی دھن سوار ہوئی۔ پھر کچھ دنوں کے بعد انہوں نے ملاقات ہونے پر بتایا کہ زمین خرید لی ہے۔ پھر اطلاع دی کہ مکان بنا شروع ہو گیا ہے۔ ایکبار علی گڑھ پہونچا تو مکان دکھانے لے گئے جو زیر تعمیر تھا۔ وہ مکان کی تعمیر کے سلسلے میں بڑی محنت کر رہے تھے۔ یونیورسٹی جانے سے پہلے مکان پر اور واپس آنے کے بعد مکان پر ــــ وہ کام کی نگرانی کرتے کرتے تھک جاتے تھے۔ آخر مکان تیار ہو گیا اور وہ اس میں منتقل ہو گئے۔

اپنے مکان میں آکر وہ بہت خوش تھے۔ میں بھی ان کی زندگی میں اس مکان میں ٹھہرا۔ وہ بڑے شوق سے ایک ایک بات بتاتے تھے اور مطمئن تھے۔ اسی زمانے میں انکی صحت خراب رہنے لگی۔ اور کمزوری بڑھتی گئی۔ علاج شروع ہوا اور کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا۔ پھر اطلاع ملی کہ کچھ افاقہ ہے۔ اور وہ تبدیلی آب و ہوا اور آرام کے لئے سرینگر گئے ہوئے ہیں۔ سرینگر سے انہوں نے خط لکھا کہ وہ اچھے ہیں اور ہومیوپیتھی کے علاج سے فائدہ ہوا۔ اور وہ خوش خوش واپس آئے۔ علیگڑھ آکر اُنہوں نے خط لکھا اور اپنی مکمل صحت یابی کی خوش خبری سُنائی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ آنے

شاعر بھی

والا لمحہ کیسا ہوگا۔ یکم جولائی ۱۹۷۸ء کو مرض کا شدید حملہ ہوا۔ اور وہ اس دُنیا سے رخصت ہو گئے۔

خلیل اچھے محقق، اچھے نقاد، اچھے شاعر تو تھے ہی نہایت شریف، نہایت مخلص اور نہایت اچھے دوست بھی تھے۔ ان کو جاننے والے ان کو بھول نہیں سکتے۔

بقیہ بیگم راشدہ سے انٹرویو ۹۲

اُنہوں نے ہی تھکی ہاری صحت کے عالم میں اسپتال میں کہا تھا ؎

بس ایک سکوت صدا ہے جو مجھ سے رہ رہ کر
یہ کہہ رہا ہے کہ لو آگئی ہے منزلِ شب

قدم اس منزل کی طرف مڑ چکے تھے۔ سرزمین علی گڑھ سے خلیل صاحب کو بڑا پیار تھا۔ اس سرزمین نے بھی محبت کا حق ادا کر دیا آناً فاناً دوست احباب اور شعبہ کے سب رفیق آ گئے۔ اور تمام کام اُنہیں لوگوں کے ہاتھوں انجام پائے۔ بھائی صاحب اور میرے رشتہ دار بعد کو پہونچے۔ البتہ دلی سے شمس الرحمن فاروقی، گوپی چند نارنگ، محمد ہاشمی اور شمیم حنفی اسی شام آ گئے تھے۔ شعبہ کے رفیق نادر علی خاں صاحب نے خلیل صاحب کو آخری غسل دیکر کفن پہنایا اور پھر دس بجے رات کو یونیورسٹی کے قبرستان میں خلیل صاحب کو سپردِ خاک کر دیا گیا۔

میرے حواس بجا نہ تھے۔ ایسا لگتا تھا جیسے میں اپنے گھر میں نہیں کسی غیر کے گھر میں ہوں اور میں یہاں خلیل صاحب کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ بھائی صاحب کا خلیل صاحب کی موجودگی میں آجانا ایک غیبی امداد تھی۔ انہوں نے بچوں کے سروں پر ہاتھ رکھا اور ہم لوگوں کی بڑی سرپرستی فرمائی۔ یونیورسٹی کے رفیقوں اور علیگڑھ سے باہر خلیل صاحب کے دوستوں نے بھی میرے مسائل کو سلجھانے میں کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ اب بچوں کو روشن مستقبل کی طرف لے جانا میری زندگی کا واحد مقصد ہے۔ خلیل صاحب کے دوست اکثر و بیشتر آتے رہتے ہیں۔ یقین نہیں آتا کہ خلیل صاحب نہیں ہیں۔ ایسا لگتا ہے وہ کہیں سے واپس آجائیں گے۔

پروفیسر اسلوب احمد انصاری نے میرے معاملات میں خاص طور سے جتنی اور جیسی دلچسپی لی اسکو میں تا زیست فراموش نہیں کر سکتی۔ O

مظہر امام

اسسٹنٹ ڈائرکٹر ٹیلی ویژن سنٹر سری نگر

خلیل صاحب لکھیں

یہ اُن دنوں کا ذکر ہے جب ترقی پسند ادب سے آشنائی روشن خیالی اور ذوقِ لطیف کی علامت تھی۔ میں اپنے چھوٹے سے شہر کے بارے میں جو دراصل ایک قصبے سے زیادہ نہ تھا، آج سوچتا ہوں تو حیرت ہوتی ہے کہ وہاں کے روایت زدہ ماحول میں اس وقت کی تازہ ترین ادبی فضا نے کس طرح میری روح سے سرگوشیاں کیں۔ میری عمر یہی کوئی تیرہ چودہ سال رہی ہوگی جب میرے ایک دوست منسوب حسن نے، جو اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے ایک جاں باز کارکن تھے میرے کان میں مارکسزم، ترقی پسند ادب اور سجاد ظہیر کا صُور پھونکا۔ میرے ایک ماموں محکمۂ ڈاک سے وابستہ تھے، اس لئے بعض اہم رسائل مثلاً ادبِ لطیف، ساقی، ادبی دُنیا وغیرہ مجھے پڑھنے کو مُفت مل جاتے تھے، لیکن اس میں باقاعدگی نہ تھی۔ لہٰذا منسوب حسن اور میں نے اس وقت کے سرکردہ جرائد کی سالانہ خریداری قبول کی؛ مکتبۂ اُردو لاہور، ساقی بکڈپو دہلی اور دوسرے اداروں سے تازہ ترین مطبوعات منگوائیں، اور اپنے طور پر گردن اکڑا اکر چلتے رہے کہ اس نئے ادب کا شناسا ہم دو کے علاوہ پورے شہر میں کوئی اور نہیں ہے۔

روس سے چھپی ہوئی مارکس اور لینن کی کتابیں میں نے بھی خرید رکھی تھیں، جو سستی تھیں، خوب صورت تھیں اور شیشے کی الماریوں کو سجانے کے کام آتی تھیں۔ نہ ان کتابوں کو پڑھنے کی فرصت تھی اور نہ اُنہیں سمجھنے کی صلاحیت۔ لیکن "دانش وری" کی تصدیق کے لئے ان کتابوں پر گفتگو ضروری سمجھی جاتی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ ایکبار شولوخوف کے ناول" اور ڈان بہتا رہا" کی بابت ایک محفل میں راجندر سنگھ بیدی نے زور دار گفتگو کی، لیکن تنازعہ یہی

جب کسی نے اس ناول کی جزئیات سے بحث شروع کی تو بیدی کو اعتراف کرنا پڑا کہ اُنہوں نے کتاب کی شکل تک نہیں دیکھی ہے۔ یہ بات ۴۹-۱۹۴۸ء کی ہوگی۔ ویسے ۴۶-۱۹۴۵ء تک نئے ادب اور ترقی پسند ادب میں کوئی حدِّ فاصل قائم نہیں ہوئی تھی۔ فیض، راشد، میراجی، کرشن چندر، بیدی، منٹو، عصمت، محمد حسن عسکری، اختر الایمان، سلام مچھلی شہری — سب ایک ہی خانے میں رکھے جاتے تھے۔ ۱۹۴۵ء تک سردار جعفری اور اُن کے قبیل کے کسی شاعر کا کلام پنجاب کے رسائل مثلاً "ادبِ لطیف" وغیرہ میں شائع نہیں ہوتا تھا۔ لاہور میں حلقۂ اربابِ ذوق سرگرم تھا۔ لکھنؤ اور بمبئی میں انجمن ترقی پسند مصنفین پُرجوش تھی۔ مجھ جیسا عام قاری نظریاتی مباحث میں اُلجھنے کی بجائے فن پارے کی قدر و قیمت پرکھتا تھا فقادبھی بڑی حدتک جمہوریت پسند تھا اور اس میں فرقہ وارانہ شدّد پسندی پیدا نہیں ہوئی تھی۔

آزادی اور تقسیمِ ملک کے بعد نقشہ ہی بدل گیا۔ وضاحت طلب کی گئی کہ تم بہاکشی پُل کے اس طرف ہو یا اس طرف۔ حالات کچھ ایسے تھے کہ بہاکشی پُل کے اِس طرف مجھے آنا ہی مناسب معلوم ہوا۔ ویسے یہ بھی سوچتا رہا کہ کبھی کبھی اُس طرف جانے میں کیا حرج ہے؟ محمد حسن عسکری سے ذہنی قربت کے باعث ترقی پسند دوستوں کی طنز و تشنیع کا نشانہ بھی بنا۔ سولہ سترہ سال کی عمر میں اشتراکیت اور ترقی پسندی کے گلیمر نے اپنا گرویدہ بنا لیا تھا، مگر اپنے ذہنی اور جذباتی اضطراب سے چھٹکارا پانے کیلئے کامیاب نہ ہوسکا۔ میں نے اپنے دوست نشاط الایمان کو آندرے ژید کے حوالے سے

تھا کہ میں بھی اسی کی طرح عملی جدوجہد میں اس لئے شریک ہوا ہوں کہ مجھے زندگی میں کوئی معنویت نظر نہیں آتی۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ جواب میں میرے ترقی پسند دوست نے مجھے ڈانٹ پلائی۔

تمہید کچھ طویل ہوگئی ہے۔ لیکن شاید اس ماحول کا ذکر بھی ضروری تھا، جس میں خلیل الرحمٰن اعظمی سے قریب آنے کی سبیل پیدا ہوئی۔ ایک نوجوان محمد یٰسین تھے، جو رہنے والے تھے شاہو بیگہ، ضلع گیا کے، لیکن اپنے والد کی ملازمت کے باعث دربھنگہ کے ہی ہو کر رہ گئے تھے۔ کانگریس کی تحریک سے متاثر تھے۔ تقسیم کے آس پاس ان کی مجھ سے اور منصوب حسین سے دوستی ہوئی اور وہ اشتراکیت سے قریب آئے۔ انہیں دنوں میری بہن سے انکی شادی بھی ہوئی۔ انہوں نے تجویز رکھی کہ ایک ترقی پسند ادبی رسالے کا اجرا کیا جائے۔

منصوب حسن اور میرے مشورے سے انہوں نے اپنا ادبی نام منظر شہاب رکھا۔ پہلا شمارہ ہم تینوں کی مشترکہ کوششوں کا ثمرہ تھا۔ میرے بڑے بھائی حسن امام درد بھی اس گاڑی کو آگے کی سمت بڑھانے میں مدد دے رہے تھے۔ "نئی کرن" کا پہلا شمارہ جنوری ۴۹ء میں شائع ہوا۔ فروری میں مجھے اور منظر شہاب کو ریلوے کی ہڑتال کے خطرے کے پیش نظر گرفتار کرلیا گیا، حالانکہ ہم میں کوئی عملی سیاست میں شریک نہ تھا۔ پولس "نئی کرن" کی بے ضرر کاپیاں اٹھا کر لے گئی۔ منصوب حسن زیرزمین چلے گئے۔ ٹھیک انہیں دنوں اسی خطرے کے تحت علیگڑھ میں خلیل الرحمٰن اعظمی کو گرفتار کیا گیا۔ وہ اس وقت انجمن ترقی پسند مصنفین علیگڑھ کے سکریٹری تھے۔ ادبی رسائل میں ان گرفتاریوں کا خوب چرچا ہوا۔ انجمن کے جلسوں میں احتجاجی تجویزیں منظور کی گئیں۔ بمبئی میں ایک بڑا احتجاجی جلسہ ہوا، جس میں کرشن چندر نے ایک خطبہ پڑھا۔ بعض رسائل نے اداریئے لکھے۔ خلیل صاحب کی رہائی تین ماہ بعد ہوئی۔ ہم دونوں ایک ماہ بعد ہی چھوڑ دیئے گئے۔ شاید خلیل صاحب کو زیادہ خطرناک سمجھا گیا۔ حالانکہ جس طرح اپنے بازو میرے آزمائے ہوئے ہیں۔ اسی طرح خلیل صاحب کے بارے میں پتہ چلا کہ نہ ان سے خنجر اٹھ سکتا ہے اور نہ تلوار۔ کہیں وہ بھی عملی جدوجہد میں اسی لئے تو شریک نہیں ہوئے تھے کہ انہیں زندگی میں کوئی معنویت نظر نہ آتی تھی؟

شاعر، بمبئی

خلیل الرحمٰن اعظمی کا بیان ہے کہ انکی پہلی نظم "نقشِ ناتمام" ۱۹۴۶ء میں ممتاز شیریں کے "نیا دور" میں شائع ہوئی۔ لیکن میرے ذہن میں وہ نظم نہیں ہے۔ ممکن ہے "نیا دور" کا وہ شمارہ میری نظر سے نہ گذرا ہو۔ دراصل انکا رعب اس وقت پڑا۔ جب ان کا کلام "نیا ادب" میں دکھائی دیا۔ "نیا ادب" ترقی پسند مصنفین کا سرکاری ترجمان تھا۔ اور سردار جعفری کی ادارت میں بمبئی سے شائع ہوتا تھا۔ اس میں صرف برگزیدہ، مستند ادیب ہی لکھا کرتے تھے۔ اور کچھ ایسا لگتا تھا کہ جو اس میں نہیں چھپتا وہ سرے سے ادیب ہی نہیں ہے۔ اس لئے اس میں کسی نئے شاعر کا کلام دیکھ کر چہرہ فق ہونا لازمی تھا۔ غالباً یہ ۴۸ء کی بات ہے۔

انہیں دنوں "نگار" میں آتش پر خلیل صاحب کے مضامین چھپ رہے تھے۔ "نگار" وہ رسالہ تھا، جس کا نام آتے ہی مجھ پر لرزہ طاری ہوجاتا ہے۔ اور جب نیاز فتحپوری نے خلیل صاحب کے بارے میں یہ تعریفی نوٹ لکھا:

> "جناب اعظمی جس دقتِ نگاہ اور امعانِ نظر سے کام لے رہے ہیں، وہ آتش کے بارے میں اس وقت تک کسی صاحب علم کی طرف سے ظاہر نہیں ہوئی"۔

تو میرے پسینے چھوٹ گئے۔ سب سے پہلے تو لغت میں "امعان" کے معنی دیکھے۔ اور پھر اپنے دل کو بہلایا کہ نیاز صاحب سٹھیا گئے ہیں، وہ جو چاہیں لکھیں۔ لیکن خلیل صاحب کے طلسم نے اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ میں نے ترقی پسندی کا واسطہ دیکر انہیں خط لکھا کہ "نئی کرن" کیلئے اپنا کلام مرحمت فرمایئے۔ ان دنوں ہم لوگ لفظ "کامریڈ" کھل جا سم سم کی جگہ استعمال کیا کرتے تھے۔ مجھے اب ہنسی آتی ہے کہ میں نے کرشن چندر کو بھی خط میں جب بہایت ساتھی کہہ کر مخاطب کیا تھا تو میری انا کو کتنی تسکین ہوئی تھی۔ خلیل صاحب ان دنوں علیگڑھ یونیورسٹی میں شاید بی۔ اے کے طالب علم تھے۔ ان کا جواب فوراً آگیا —— مختصر، لیکن بڑا پیارا، محبت اور خلوص سے بھرا۔ اس معذرت کے ساتھ کہ فی الحال ان کے پاس کوئی غیر مطبوعہ کلام نہیں ہے، [illegible] تین چار تازہ شعر محض میری دلچسپی کے لئے خط [illegible]۔

[illegible] مزید تعلیم کے لئے پٹنہ چلے

گئے۔ منصور حسن نے پاکستان کے مشرقی حصے کی جانب رُخ کیا۔ حسن امام وارد تلاش معاش میں کہیں اور جا نکلے۔ میں تنہا رہ گیا اور رسالے کی ترتیب کی ذمہ داری میرے ہی سر آ پڑی۔ خلیل صاحب کے پہلے ہی خط میں اپنائیت کی ایسی خوشبو تھی کہ میں نے اُن کی معذرت قبول نہ کی۔ اور انہیں دوبارہ لکھا۔ وہ جیل سے واپس آ چکے تھے۔ انہوں نے اپنی ایک تازہ نظم "شہید زنداں" بھجوائی۔ جو کمیونسٹ کارکن بھارودواج کی یاد میں لکھی گئی تھی۔ "نئی کرن" کا دوسرا شمارہ نومبر ۴۹ء میں منظر عام پر آیا۔ اس میں حصہ منظومات کی ترتیب اس طرح تھی ـــــ خلیل الرحمٰن اعظمی، رشید اختر عادل، فارغ بخاری، نرتیش کمار شاد، افضل پردیزی، جمیل ملک، جگن ناتھ آزاد، خلیل صاحب کی تحریک پر ان کے دوستوں شہاب جعفری، انجم اعظمی اور جاوید کمال نے بھی اپنا کلام بھجوایا تھا لیکن اس وقت ان سب کے کلام سے "نو آموزی" نمایاں تھی۔ اور اسی لئے "نئی کرن" میں انکی اشاعت نہ ہو سکی۔ خلیل صاحب اپنے دوستوں، ہم عصروں اور نئے لکھنے والوں کو آگے بڑھانے میں پیش پیش رہتے تھے۔

خلیل صاحب سے جذباتی لگاؤ کی ایک اور وجہ تھی۔ انکے بڑے بھائی مولانا عبد الرحمٰن پرواز اصلاحی دربھنگے میں ہی قیام پذیر تھے۔ اور ایک مذہبی پندرہ روزہ "الہدیٰ" کی ادارت کرتے تھے۔ اُن کے اداریوں میں ادبی چاشنی ہوا کرتی تھی، اور اسی لئے اُن کی نثر مجھے پسند آتی تھی۔ اچھی نثر ہمیشہ سے میری کمزوری رہی ہے۔ ایک ملحد اور ایک مولوی کا یہ ربط خاصا دلچسپ تھا۔ پرواز اصلاحی کے ساتھ خلیل صاحب کے تعلق سے اکثر گفتگو ہوتی تھی۔ گذشتہ دنوں ۲۷ - ۲۸ سال کے لمبے وقفے کے بعد بمبئی میں پرواز اصلاحی سے اُس جلسے میں ملاقات ہو گئی جو اعجاز صدیقی کی پہلی برسی کے موقع پر منعقد ہوا تھا۔ ہم دونوں جس والہانہ پن سے ملے، اس جذبے میں قدرے مشترک خلیل الرحمٰن اعظمی تھے۔ جتنا وقت بھی اُن کے ساتھ گذرا، وہ طاق دل کو خلیل صاحب کی یادوں سے سجانے میں گذرا۔ پرواز صاحب ایک عرصے کے بعد علیگڑھ گئے تھے اور کئی دن تک خلیل صاحب کے ساتھ رہنے کے بعد، جس صبح علیگڑھ سے رخصت ہوئے اسی دوپہر شام، کبھی

خلیل صاحب کا انتقال ہو گیا۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے پرواز صاحب کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

میری ابتدائی ادبی زندگی کے نقوش میں یہ نقش نمایاں ہے کہ مارچ ۵۰ء کے "جادہ" "پھول" (مدیر کوثر چاندپوری) میں خلیل الرحمٰن اور میری غزلیں اور دسمبر ۵۱ء کے "جائزہ" کراچی میں ہم دونوں کی نظمیں یکساتھ آگے پیچھے شائع ہوئیں تو مجھ میں بڑی خود اعتمادی پیدا ہوئی۔ یہ غزلیں اور نظمیں ہم دونوں کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہیں۔

۵۰ء کے اواخر تک کبھی کبھی خلیل صاحب سے میری خط و کتابت رہی۔ فروری ۵۱ء میں "نئی کرن" کا تیسرا اور آخری شمارہ شائع ہوا۔ پھر میں امتحان کی تیاریوں میں لگ گیا۔ اور بی اے کی تکمیل کر کے ستمبر میں کلکتہ چلا گیا۔ اُردو صحافت سے رشتہ جوڑنے کے لئے۔ میں کلکتہ میں اُردو اور ہندی کے ترقی پسند مصنفین کی مشترکہ انجمن کا سکریٹری رہا۔ جو ۵۵ء تک فعال تھی۔ اور ۵۶-۵۵ء تک گھسٹتی رہی۔ علیگڑھ میں انجمن کے جلسے شاید کچھ اور بعد تک ہوتے رہے۔ ان میں شرکت خلیل صاحب کی بھی ہوتی رہی، لیکن اس تحریک کے مدعیوں اور رہنماؤں کی کٹر پسندی، ادعائیت، حلقہ بندی اور تنگ نظری نے سب کو کافی پہلے سے بددل کرنا شروع کر دیا تھا۔ خلیل صاحب ترقی پسندی کے سحر سے آزاد ہونے والے پہلے گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ گرچہ اسکا باقاعدہ تحریری اظہار انہوں نے بعد میں کیا۔ میں نے ۵۲ء کے اواخر میں کلکتہ کی انجمن میں ایک بحث کے دوران ایک مضمون پڑھا تھا۔ جس میں سخت الفاظ میں نام بہ نام اہم ترقی پسند ادیبوں اور شاعروں کے قول و فعل کے تضاد اور انکی ادبی سیاست کو ظاہر کیا گیا تھا۔ باقر مہدی نے اپنے مضمون "ترقی پسند شاعری کا بحرانی دور" میں تقریباً اسی طرح کی باتیں زیادہ تفصیل سے پیش کیں یہ مضمون جون ۵۳ء کے "تہذیب" پٹنہ میں شائع ہوا۔ ـــــ خلیل الرحمٰن اعظمی شاعر اور نقاد کی حیثیت سے دو چار سال کے اندر ہی معتبر تسلیم کر لئے گئے اور ان کی نثری اور شعری تخلیقات ارباب نقد و نظر کی توجہ کا مرکز بننے لگیں۔ انہیں جائز طور پر ہندوستان میں نئی غزل کا بانی کہا

جاتا ہے۔ اُن کے مضامین میں جو بصیرت اور تفکر ملتی ہے۔ خیالات کی جو صفائی اور وضاحت اور اندازِ نظر کی جو معروضیت ہے، وہ ہماری نئی تنقید کا بیش قیمت سرمایہ ہے۔

میں ۵۳ء میں معمول کے مطابق موسم سرما کی تعطیلات میں کلکتے سے اپنے وطن آیا تو کہیں سے خبر ملی کہ آج کل خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے کسی دوست کے یہاں در بھنگہ ضلع کے ایک گاؤں میں ٹھہرے ہوئے ہیں (یہ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ در بھنگہ ضلع نہیں بلکہ مظفر پور ضلع کا ایک گاؤں ہے، جو در بھنگہ ضلع کی سرحد پر واقع ہے) ہم لوگوں نے در بھنگہ شہر کے ایک ٹاؤن ہال میں ایک مشاعرے کا اہتمام کیا تھا۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح خلیل صاحب کو اس مشاعرے میں لایا جائے۔ لیکن ان تک پیغام نہ پہنچ سکا۔ اگر پیغام پہنچ جاتا تب بھی شاید وہ مشاعرے میں شرکت نہ کرتے۔ خسلیل صاحب نے اس گاؤں میں قیام کا تاثر اپنی نظم "سفلا ولیش" میں پیش کیا ہے، جو اُن کے پہلے مجموعۂ کلام "کاغذی پیرہن" میں شامل ہے۔

خسلیل صاحب شروع سے یار باش رہے ہیں اُن کے خلوص اور محبت سے فائدہ اُٹھانے والوں کی کمی نہیں رہی۔ انکے بارے میں اطلاع ملی کہ ان کے اسی دوست نے جس کا ذکر اوپر آچکا ہے، اور جو ایک خوش حال گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اُنہیں غلط راستے پر ڈال دیا۔ ایک بازاری عورت کے سلسلے میں وہ بدنام ہوئے اور کئی ماہ تک علیگڑھ سے دور شمالی بہار کے ایک دُور اُفتادہ گاؤں میں اپنے اُسی دوست کے یہاں روپوش رہے۔ اس دوست کے نام سے خسلیل صاحب نے بعض خوبصورت غزلیں چھپوائیں، ایک غزل کراچی سے شائع ہونے والے ایک جریدے نے "سال کے انتخاب" میں بھی شامل کی۔ میں دوست کے نام سے واقف تھا۔ کیونکہ وہ میرے ہی ایک علاقے کے رہنے والے تھے۔ اور اُن کے نام سے چھپی ہوئی غزلیں دیکھ کر ہی مجھے اندازہ ہو گیا تھا کہ اس پردۂ ژنگاری میں کون معشوق ہے۔ اس کی تصدیق اس وقت ہوئی جب دو تین سال بعد وہ مجھ سے کلکتہ میں ملے اور اُنہوں نے اچھی بھلی غزلوں کے اشعار ناموزوں کر کے سُنائے۔ —— رشید احمد صدیقی جو خسلیل صاحب کے شاعر بھی

نہ صرف اُستاد تھے، بلکہ اُن کے مربّی بھی، ہر چند اُن کی ان لغزشوں سے خوش نہیں تھے، لیکن وہ جوہرِ قابل کی پرکھ بھی رکھتے تھے۔ جیسے ہی علیگڑھ میں لکچرارشپ کی جگہ نکلی، اُنہوں نے خسلیل صاحب کو بلوا لیا۔ اور اس طرح خلیل صاحب ایک نئی زندگی سے ہم کنار ہوئے —— ادبی اعتبار سے بھی۔

۵۴ء میں علی گڑھ سے ایک نیا رسالہ "فکر و نظر" نکلا جس میں خسلیل صاحب کا ایک مضمون جوش کی شاعری کے خلاف شائع ہوا تھا۔ اتفاق سے اس کے کچھ ہی دنوں بعد جوش ایک مشاعرہ کے سلسلے میں کلکتہ تشریف لائے۔ ان کے ساتھ سے کسی کی ایک شام پرویز شاہدی کے گھر پر گذری۔ اس مختصر محفل میں اُدیوں کے علاوہ جمیل مظہری اور رضا مظہری بھی تھے۔ مگر اُنہوں نے صرف پانی پر ہی اکتفا کی۔ میں نے دورانِ گفتگو جوش صاحب سے خلیل صاحب کے مضمون کا ذکر آیا۔ کہنے لگے میرے خلاف مضمون لکھنے کے لئے امریکہ سے پیسے ملے ہیں۔ اسی سال جوش ہمیشہ کے لئے پاکستان چلے گئے۔ اگر خسلیل صاحب کو پیسے کا ایسا ہی لالچ ہوتا تو اُنہوں نے جوش کی تقلید نہ کی ہوتی؟

کم و بیش دس سال تک خلیل صاحب سے میری خط و کتابت نہیں ہوئی، لیکن ان کی تحریروں کے ذریعے اُن سے ملاقات ہوتی رہی۔ اُن کے بارے میں علیگڑھ سے خبریں بھی ملتی رہیں۔ مارچ ۶۰ء میں، جب میں کٹک میں تھا، مجھے آل انڈیا ریڈیو کے ایک تربیتی کورس کے سلسلے میں ایک ماہ کے لئے دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ علیگڑھ یونیورسٹی دیکھنے اور اس سے زیادہ خسلیل صاحب سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ میں نے دہلی سے انہیں خط میں غالب کا یہ پٹا پٹایا شعر لکھ بھیجا ؎

تو مجھے بھول گیا ہو تو پتہ بتلادوں
کبھی فتراک میں تیرے کوئی نخچیر بھی تھا

خسلیل صاحب نے فوراً جواب میں عندلیب شادانی کا شعر لکھا ؎

میں تجھے بھول گیا ہائے تری سادہ دلی
کوئی طائر کہیں بھولا ہے نشیمن اپنا

اور بڑی گرم جوشی سے اپنے یہاں آنے کی دعوت دی۔

خسلیل صاحب ان دنوں آنندن بھون، دودھ پور میں رہتے

تھے (بعد میں اسی مکان میں وحید اختر رہنے لگے تھے) ان کے ہمسایہ
قاضی عبدالستار تھے، جو تا حال اسی مکان میں رہ رہے ہیں۔ میں جب
[illegible] پہونچا تو شہریار کو اپنا منتظر پایا۔ خلیل صاحب یونیورسٹی
گئے ہوئے تھے۔ اُن دنوں شہریار، خلیل صاحب کے ساتھ ہی رہتے
تھے۔ جس وقت میں وہاں پہونچا تھا، قاضی عبدالستار اپنے
وطن روانہ ہونے کے لئے اپنا مکان مقفل کر رہے تھے۔ شہریار
نے اُن سے میرا تعارف کرایا۔ انہوں نے میرے سلام کا جواب
تو دیا، لیکن بڑی بے دلی سے ـــ اس طرح جیسے میرے نام
سے واقف نہ ہوں۔ کئی سال بعد جب میں پٹنہ گیا تھا۔ اُنہوں
نے خود میرے گھر آنے کی زحمت کی۔ لیکن اس کا تعلق علی گڑھ
کی یادوں سے نہیں ہے۔

خلیل صاحب کے ساتھ میرا قیام مختصر تھا ـــ تین چار
دن۔ لیکن اس دوران میں جیسے میں نے برسوں کی جُدائی کی
تلافی کرلی۔ خلیل صاحب سے میری پہلی ملاقات تھا یونیورسٹی
میں موسم گرما کی تعطیلات ہو چکی تھیں اس لئے اکثر اساتذہ
باہر جا چکے تھے۔ پھر بھی ان کے ساتھ علیگڑھ کی کئی شخصیتوں
سے ملنا ہوا ـــ مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر مختارالدین
احمد آرزو، امین اشرف، لائبریرین جناب محمد بشیر، جو دراصل
اڑلیسہ کے رہنے والے تھے۔ مگر انہوں نے علیگڑھ کو ہی اپنا
مستقر بنالیا تھا۔ یہ امجد نجمی کے بچپن کے ساتھیوں میں تھے، یہیں
اسسٹنٹ لائبریرین مشتاق صاحب مرحوم سے بھی ملاقات
ہوئی، جو میرے وطن سے قریب بستی پپرے کے رہنے والے تھے۔
وہ اس وقت شبلی کے مکاتیب مرتب کر رہے تھے۔ بعد میں یہ مکاتیب
کتابی صورت میں شائع ہوئے۔ اس وقت مولانا آزاد لائبریری
کی عمارت نئی نئی بنی تھی۔ اور پُرانی لائبریری سے اس میں کتابیں
منتقل ہو رہی تھیں۔ خلیل صاحب کے گھر پر ان کا ذاتی کتب خانہ
دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ رسالوں کی فائلیں بطور خاص اہتمام سے
رکھی ہوئی تھیں۔ چونکہ خود مجھے رسالوں کی فائلیں محفوظ رکھنے
کا شوق رہا ہے۔ اس لئے میری توجہ لازمی طور پر اس جانب
گئی۔ خلیل صاحب کے مکان سے سادگی، لیکن نظم اور سلیقہ کا
احساس ہوتا تھا۔ اس وقت ان کا پہلا بیٹا کامران ایک سال
کا تھا۔ اسی لڑکے کی ولادت پر خلیل صاحب نے اپنی خوبصورت
نظم "میلاد" لکھی تھی۔ اس ملاقات میں خلیل صاحب کی شخصیت
کی سادگی اور دلفریبی اور ان کے علم کی ہمہ جہتی سے براہ راست
واقف ہونے کا موقع ملا۔

خلیل صاحب کی خوبی یہ تھی کہ وہ مجہول سے مجہول، معمولی
سے معمولی لکھنے والوں کی تحریریں بھی توجہ سے پڑھتے تھے۔ ان
کے بارے میں ایک رائے قائم کرسکتے تھے۔ اور ان کا نام حافظ
میں محفوظ رکھتے تھے۔ ان کے حافظے کی قسم کھائی جاسکتی ہے۔
ایک زمانے میں مجھے بھی چسکا تھا کہ میں رسالوں میں شائع ہونے
والی زیادہ سے زیادہ تحریریں پڑھوں اور اپنے وقت کے تمام
ادبی رسائل میں شائع ہونے والی نگارشات سے باخبر رہوں۔
ایک بار کسی رسالے میں اُڑیہ افسانہ نگار سربندہ بھنتی کے ایک
افسانے کا ترجمہ شائع ہوا۔ یہ ترجمہ بدیع مشہدی (موجودہ بدیع الزماں)
نے کیا تھا۔ اُن سے دہلی میں ملاقات ہوئی تو میں نے اس ترجمے کا
ذکر کیا۔ انہیں بڑی حیرت ہوئی کہ یہ غیر معروف رسالہ [illegible] نظر سے
گذرا تھا۔ حسن نعیم بھی وہاں موجود تھے۔ کہنے لگے "خلیل الرحمٰن
اعظمی کے بعد اگر کوئی انہی نئی تحریروں سے واقف رہتا ہے
تو وہ مظہر امام ہیں۔" شاید حسن نعیم نے یہ بات محض میری دلداری
کے لئے کہی تھی، لیکن مجھے اس Compliment سے واقعی مسرت
ہوئی۔ خلیل صاحب کے ساتھ کسی بھی حیثیت سے میرا نام وابستہ
ہونا میرے لئے واقعی فخر کی بات تھی۔

سنہ ۶۱ء میں جب میں اپنے پہلے مجموعہ کلام "زخم تمنا" کی
ترتیب میں مصروف تھا۔ میں نے خلیل صاحب کو ایک خط لکھا کہ
وہ میری شاعری کے بارے میں ایک مختصر رائے لکھ کر بھیج دیں۔
انہوں نے جو کچھ لکھا، اس سے اس تعلق خاطر کا پتہ چلتا ہے، جو
انہیں مجھ سے تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

"مظہر امام ان معدودے چند شعرا میں ہیں جنہیں
اپنا ہم عصر اور ہمسفر سمجھنے میں مجھے ہمیشہ مسرت محسوس
ہوئی ہے۔ ان کے شعری مزاج کے بارے میں جب
بھی میں نے سوچا ہے مجھے اس دریا کا خیال آیا ہے
جو میدانوں میں بہتا ہے اور اس کی چال میں سکون اور

گمبھیرتا ہوتی ہے۔ اُن کے یہاں تیز روشنی اور تیز رنگوں کی چونکا دینے والی شاعری نہیں، ان کے یہاں سلونا پن ملتا ہے جو زمین سے قربت اور اپنائیت کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ میرے دیکھتے دیکھتے کتنے نوجوان شاعر طوفان کی طرح آئے لیکن انکی آوازیں بہت جلد فضا میں کھو گئیں۔ مظہر امام نے آہستہ آہستہ اپنی آواز کا جادو جگایا، لیکن مجھے یقین ہے کہ انکا فن دیرپا ثابت ہوگا۔

جو شاعر ایسے اشعار کہہ سکتا ہو ؎

شاخِ گل سے لپٹ کے روتی ہے
اُس چمن کی ہوا کو کیا کہیے

اس سے دوستی کا کون آرزومند نہ ہوگا۔"

خلیل صاحب بہار سے باہر کے پہلے ناقد تھے، جنہوں نے جمیل مظہری کی شاعری پر ایک طویل مضمون لکھا، اور انہیں جوش پر فوقیت دینے کی کوشش کی۔ یہ مضمون خلیل صاحب کے تنقیدی مضامین کے پہلے مجموعے "فکر و فن" میں شامل ہے۔ خلیل صاحب کو بہار کے لکھنے والوں سے ایک اُنسیت شروع سے رہی ہے۔ شاید اسی قربت کا اثر تھا کہ وہ بہار کے کسی ادیب یا شاعر کے غلط اندازِ نظر کو قبول نہ کر سکتے تھے۔ انہیں محبوب خزاں کے ایک مضمون (بہ عنوان "مگر یہ کون بولے گا") سے اختلاف تھا، جو "سوغات" کے جدید نظم نمبر میں شائع ہوا تھا۔ انہوں نے "سوغات" کے اگلے شمارے میں اس مضمون کا جواب "اس پہ مچلے ہیں کہ ہم زخم جگر دیکھیں گے" چھپوایا۔ خلیل صاحب سے غلطی یہ ہوئی کہ انہوں نے محبوب خزاں کو بہار کا باشندہ سمجھ لیا۔ شاید اس لئے کہ موخر الذکر نے اپنے مضمون میں جمیل مظہری اور اجتبیٰ رضوی کی وکالت کی تھی۔ دوسری غلطی یہ ہوئی کہ محبوب خزاں کے غلط بیانات کے باعث بہار کے تمام نئے لکھنے والوں کو موردِ الزام ٹھہرانے لگے۔ انہوں نے اپنے جوابی مضمون میں لکھا:

"بہار میں بسنے والے بعض نوجوان ادیب جنہیں پچھلے تین چار سال سے کچھ لکھنے لکھانے کا شوق ہوا ہے، شاعر، بھئی وہ بجائے اس کے کہ جم کر ادب کا باضابطہ مطالعہ کریں اور محنت و ریاضت سے جی نہ چرائیں، بس اسی پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں کہ نئی اور چونکا دینے والی باتیں کریں اور اپنی دانست میں انہیں 'سچ' کہہ کر پیش کریں۔"

مجھے یہ بات پسند نہیں آئی۔ بعض دوستوں سے ذکر آیا تو انہوں نے کچھ زیادہ ہی ناگواری کا اظہار کیا۔ میں نے اپنے مضمون "آتی جاتی لہریں" (شب خون، ستمبر ۱۹۶۶ء) میں اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا:

"خیر، اس سے قطع نظر کہ ہر اچھا اور بڑا ادب نئی اور چونکا دینے والی باتیں پیش کرتا ہے، یہ کون سی منطق ہے کہ اگر اعتراض یا تنقید کسی ایسے لکھنے والے کی طرف سے ہو، جو اتفاق سے بہار میں پیدا ہوا ہو، تو پورے صوبے اور اس صوبے کے لکھنے والوں کو ہدفِ ملامت بنایا جائے۔"

اپنے اسی مضمون میں خلیل صاحب کے ایک مطبوعہ خط کا حوالہ دیتے ہوئے میں نے کچھ لوگوں کی ایسی رائیں پیش کی، جو اچھی خاصی سخت تھی۔ خلیل صاحب غیر معمولی طور پر حساس تھے۔ شاید انہیں مجھ سے اس کی توقع نہ تھی۔ انہوں نے جائز طور پر اس کا برا مانا۔ دوستوں کی محفل میں ذکر آیا۔ پھر جب اختر اور نیوی سے رشید احمد صدیقی کے مکان پر ملاقات ہوئی تو انہوں نے برسبیل تذکرہ اس سلسلے میں بھی شکایت کی۔ مجھے اختر صاحب نے علی گڑھ سے لوٹنے کے بعد اطلاع دی تو میں نے فوراً خلیل صاحب کو خط لکھا، کیونکہ میرا مقصد دل آزاری یا قطع محبت نہیں تھا۔ خسلیل صاحب نے جواب میں اپنی شکایت کا اعادہ تو کیا، لیکن کسی تلخی کے ساتھ نہیں، ایک فراخ دل دوست کی طرح!

اس کے کچھ ہی دنوں بعد خلیل صاحب پٹنہ آئے اور حسب معمول اختر اور نیوی کے یہاں ٹھہرے۔ بہار کی ایک یونیورسٹی کیلئے بہار پبلک سروس کمیشن کی جانب سے اُردو کے دو لیکچراروں کا انتخاب ہونا تھا۔ خلیل صاحب بھی ایک ایکسپرٹ تھے۔ میرے ایک عزیز دوست، جو ہر چند اپنی صلاحیتوں کے پیشِ نظر، واقعی اس

جگہ کے مستحق تھے، میری سفارش چاہتے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے مجھ سے پہلے ہی کہہ رکھا تھا۔ جس دن خلیل صاحب پٹنہ پہنچے، میں بخار میں مبتلا تھا۔ میرے عزیز دوست مجھے یاد دلانے آ گئے۔ میں اسی حالت میں خلیل صاحب کے پاس گیا۔ تھوڑا سا احساس تھا کہ شاید کچھ تلخی باقی ہو۔ مگر ان کی خندہ روئی، بے تکلفی اور اخلاص نے سارے خدشات پس پشت ڈال دیئے۔ میں سفارش میں جو کہہ سکتا تھا، کہہ ڈالا تھا۔ وہ میرے امیدوار کے نام اور کام سے حسب توقع واقف تھے۔ خلیل صاحب کو بلاشبہ اردو کے سب سے باخبر ادیب ہونے کا فخر حاصل تھا۔

دوسرے دن انٹرویو تھا۔ اسی دن سہ پہر کو ان کے اعزاز میں نئے ادیبوں اور شاعروں نے ایک بڑے جلسے کا اہتمام کیا تھا۔ اس دن میرا بخار بہت تیز تھا۔ اور میں اس جلسے میں شریک نہ ہو سکا۔ خلیل صاحب نے اس جلسے میں بڑی معرکہ آرا تقریر کی۔ کلاسیکی ادب، ترقی پسندی، جدیدیت — سب پر اظہار خیال کیا۔ ان کے قاموسی علم کے سبھی قائل ہو گئے۔ میرے بعض "کرم فرماؤں" نے میری عدم موجودگی کو یہ رنگ دیا کہ مظہر امام اپنے نظریاتی اختلافات کی بنا پر جلسے میں شریک نہ ہو سکے۔ مجھے خود کسی نظریاتی اختلاف کا پتہ نہیں چل سکا۔ خلیل صاحب کو اطلاع مل گئی تھی کہ میری طبیعت زیادہ خراب ہے۔ شام کو وہ اختر صاحب کے ساتھ عیادت کے لئے تشریف لائے اور انہوں نے یہ مژدہ سنایا کہ میرا کام ہو گیا ہے۔

۱۹۶۵ء کے اواخر میں خلیل صاحب نے فضیل جعفری کے خلاف ایک مضمون "صحافتی تنقید" علی سعید شیرازی کے فرضی نام سے "شب خون" میں چھپوایا۔ بہت دنوں تک پتہ نہ چل سکا کہ اصل مصنف کون ہے۔ اس مضمون پر اچھی خاصی بحث ہوئی۔ اس سلسلے میں میرا بھی طویل مراسلہ چھپا تھا۔ ایک صاحب نے "شب خون" میں ہی ایک خط چھپوایا اور تیقن سے کہا کہ یہ مضمون مظہر امام کا لکھا ہوا ہے۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ان صاحب نے میرے پاس رسائل کے بعض وہ تراشے دیکھے تھے جن کے حوالے زیر تذکرہ مضمون میں شامل ہوئے تھے۔ اس الزام سے مجھے خوشی ہوئی کہ لوگ خلیل صاحب کی تحریر پر بھی میری تحریر کا شبہ کر سکتے تھے۔ شاعر بمبئی

ہیں۔ — ۱۹۶۸ء میں ہی ریڈیو کشمیر کی جانب سے سری نگر میں ایک مشاعرہ منعقد ہوا تھا؛ اس میں کئی سرکردہ شعرا شریک ہوئے۔ ایک محفل میں، جہاں شعر و شراب دونوں کا دور چل رہا تھا۔ فراق صاحب کی کسی غیر معقول بات سے مشتعل ہو کر خلیل صاحب نے اپنے مزاج کے برخلاف انہیں کچھ سخت باتیں کہہ دیں۔ فراق صاحب کئی دنوں تک بڑے گھبرائے گھبرائے سے رہے اور شاید وہ اس واقعے کو عرصے تک نہ بھول پائے۔

۱۹۷۳ء میں کانپور کے ایک مشاعرے میں مجھے شرکت کا موقع ملا۔ میں، شاذ تمکنت، زبیر رضوی، فراق اور کئی دوسرے شعرا ایک ہی جگہ ٹھہرائے گئے۔ "شاہکار" کے فراق نمبر کیلئے فراق کے کلام کا ایک بہت ہی عمدہ انتخاب خلیل صاحب نے کیا تھا۔ فراق صاحب سے گفتگو کے دوران میں نے اس انتخاب کی تعریف کی۔ کہنے لگے: "اس سے اچھا انتخاب میں کرتا"۔ اب میں ان سے کیا کہتا کہ اگر آپ اپنے اشعار کا انتخاب کر سکنے کے اہل ہوتے تو اپنے نام سے اتنی لمبی لمبی غزلیں کیوں چھپواتے۔

میں ۷۴ء میں بہت سخت بیمار ہوا۔ نقاہت حد درجہ بڑھ گئی اور عرصے تک چلنے پھرنے سے معذور رہا۔ خلیل صاحب کو اس کا علم نہ تھا۔ وہ خود بھی ٹی بی کے مرض میں کافی دنوں مبتلا رہ چکے تھے اور کمزور ہو گئے تھے۔ وہ یونیورسٹی کے کسی کام سے گیا آ رہے تھے۔ انہوں نے مجھے خط لکھا کہ میں ان سے مل لوں، کیونکہ خود ان کی صحت مزید سفر کر کے پٹنہ آنے کی اجازت نہیں دیتی۔ اتنا وقت نہ تھا کہ میرا جواب انہیں پہنچ سکتا۔ میں دل مسوس کر خاموش ہو گیا کہ خلیل صاحب سے ملاقات کی یہ سعادت اپنی علالت کے باعث حاصل نہیں کر سکتا۔ لیکن میں خوش نصیب تھا۔ ایک صبح کیا دیکھتا ہوں کہ خلیل صاحب وہاب اشرفی کے ساتھ رکشے سے اترے میرے غریب خانے پر تشریف لا رہے ہیں۔ ان کی اس غیر متوقع آمد پر میں آبدیدہ ہو گیا۔ کہنے لگے "گیا آیا تو وہاب نے بتایا کہ خود آپ بہت علیل رہے۔ بس آپ کو دیکھنے چلا آیا۔" خلیل صاحب کی اس غیر متوقع اور خلوص، نیکی اور شرافت کے نقوش آج بھی تر و تازہ ہیں۔ شخصیت اور کردار میں بڑائی اخلاقی قدروں کے تحفظ سے ہی پیدا ہوتی ہے۔

میں ۱۹۷۶ء کے اواخر میں سری نگر آگیا۔ مئی ۱۹۷۷ء میں مجھے ریاستی سرکار کی عنایت سے جو فلیٹ رہنے کو ملا، وہ کمال احمد صدیقی کے فلیٹ کے ٹھیک اوپر تھا۔ کمال احمد صدیقی، خلیل صاحب کے ہم زلف ہیں۔ کمال صاحب اور مسز شاہدہ کمال سے خلیل الرحمٰن صاحب کا ذکر اکثر آتا رہتا۔ جن میں مایوس کن بیماری کی خبریں ہی ہوتی تھیں۔ خلیل صاحب کو لیوکیمیا یعنی بلڈ کینسر کی بیماری تھی۔ اس بیماری میں خون کے سُرخ خلیئے بننا بند ہو جاتے ہیں۔ اور آہستہ آہستہ یہ سفید خلیوں میں تبدیل ہونے لگتے ہیں۔ مجھے معلوم تھا کہ اس مرض کا کوئی علاج نہیں ہے۔ میرے سامنے تین حادثے تھے۔ سب سے پہلے میں اس مرض کے نام سے ۱۹۴۵ء میں آشنا ہوا۔ کلکتے میں ل۔ احمد اکبرآبادی کا ایک لڑکا اسی ادارے میں تعلیم پا رہا تھا جس سے میں وابستہ تھا۔ بہت ذہین، خوش شکل، شائستہ اور صحت مند لڑکا تھا۔ اچانک اس مرض کا شکار ہو گیا۔ اور تین ماہ کے اندر ہی وہ اس دُنیا سے چل بسا۔ دوسرا حادثہ ارشد کاکوی کا تھا۔ وہ کسی طرح اپنی عمر کے دو تین سال بڑھا لے گئے۔ مرحوم صدر جمہوریہ فخرالدین علی احمد کے بھائی احتشام الدین احمد کی لڑکی اسی مرض میں مبتلا ہوئی۔ بہت علاج کیا گیا۔ اسے فرانس بھی لے گئے جہاں اس بیماری کے علاج کا دعویٰ کیا جاتا ہے۔ لیکن فرانس سے اس لڑکی کی لاش بذریعہ طیارہ دہلی لائی گئی۔ مجھے یقین تھا کہ خلیل صاحب جانبر نہیں ہو سکتے۔ جب تک وقت گذر رہا ہے ان کا وجود غنیمت ہے۔ پروفیسر شپ کے سلسلے میں ان کے ساتھ جو ناانصافی ہوئی وہ شعبۂ تعلیم پر ایک بدنما داغ ہے۔ میری خوش نصیبی یہ ہوئی کہ خلیل صاحب تبدیلیٔ آب و ہوا کے لئے سری نگر تشریف لائے اور کمال صاحب کے یہاں تقریباً چار ماہ قیام پذیر رہے۔ جس دن وہ پہونچے، نقاہت کا غلبہ تھا۔ اچھی طرح چلنے پھرنے کے لائق نہ تھے۔ لیکن یہاں کی آب و ہوا نے چند ہی دنوں میں بہت خوشگوار اثر ڈالا۔ چہرے پر شگفتگی آگئی۔ تھوڑی دور پیدل سیر بھی کر لیتے۔ پھر آہستہ آہستہ پیدل چل کر ٹیلی ویژن سنٹر بھی آجاتے۔ جو اُن کی رہائش گاہ سے کم از کم ایک کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ ہم سب نے اُن کی دلدہی میں اپنے طور پر کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا۔ کے نیتر نے ریڈیو میں، میں نے ٹیلی ویژن میں، شاعر بھی

اور پروفیسر شکیل الرحمٰن نے یونیورسٹی میں کوئی نہ کوئی موقع دیکر انہیں برابر مصروف رکھا۔ اور انہیں علالت کا احساس نہ ہونے دیا۔ میں نے کچھ خوش جمالوں سے بھی بہ طور خاص متعارف کرایا، تاکہ ان کا جمالیاتی احساس تازہ دم ہو۔ جب اگست ۱۹۷۷ء کے وسط میں وہ علیگڑھ واپس لوٹے تو کافی چاق و چوبند تھے۔ دوست انہیں صحت کی مبارکباد دیتے رہے۔ کشمیر سے واپس جانے کے بعد انہوں نے مجھے ایک خط میں یہ خوش خبری دی،

"اب کمزوری بالکل نہیں ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام
معمول کے مطابق ہو رہا ہے۔"

زندگی ہم سب کو کیا کیا فریب دیتی ہے!

وہ یکم جون ۱۹۷۸ء کی شام تھی۔ سری نگر میں میری رہائش گاہ پر غیاث احمد گدی، رضوان احمد، اعجاز علی ارشد اور فردوس حسب وعدہ جمع تھے۔ سردار جعفری بھی اسی شہر میں آئے ہوئے تھے اور ایم ایل اے ہوسٹل میں قیام پذیر تھے۔ اُن سے ملنے کا پروگرام تھا۔ ہم لوگ وہاں جانے کے لئے سیڑھیوں سے اُتر ہی رہے تھے کہ پیم احمد شمیم کی ہمشیرہ رقیہ سعید ملیں۔ اُنہوں نے مجھ سے صرف اتنا پوچھا ـــــ "خلیل صاحب کے بارے میں اطلاع ملی؟" میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ کمال احمد صدیقی اسوقت گھر پر موجود نہ تھے۔ مسز کمال سے یہ بات پوشیدہ رکھی گئی۔ ان کے گھر کامران کا تار آچکا تھا، لیکن ان کے بچوں نے اسے چھپا دیا تھا۔ مسز کمال سے اتنا کہا گیا کہ خلیل صاحب کی طبیعت زیادہ خراب ہو گئی ہے اور پھر انہیں اسپتال میں داخل کیا گیا ہے۔ وہ دونوں دوسری صبح علی گڑھ کے لئے روانہ ہو گئے۔

میں نے جیسے ہی اُوپر آکر اپنی بیوی مینہ کو اس حادثے کی اطلاع دی، وہ چیخ پڑیں اور پھر دوسرے تنہا کمرے میں جاکر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ میں اپنا غم بھول گیا، اور اُنکی بے حال ہوتی ہوئی کیفیت پر انہیں دلاسہ دینے لگا۔ وہ خلیل صاحب کو بالکل اپنا بھائی سمجھنے لگی تھیں۔ اُن کا اب بھی کہنا ہے کہ ادیبوں میں وہ جتنی خلیل صاحب سے متاثر ہوئی ہیں، کسی اور سے انہیں ہوئیں۔ حالاں کہ انہیں اُردو کے بہت سے بڑے نامور ادیبوں

اور شاعروں سے ملاقات کا موقع ملا ہے۔

کافی دیر بعد میں اور غیاث احمد گدی، سردار جعفری کے پاس محض اس حادثے کی خبر دینے گئے۔ وہاں خلیل صاحب کی شخصی خوبیوں کے بارے میں باتیں ہوتی رہیں۔ پھر ہم سب کمال صاحب کے یہاں آئے۔ جعفری صاحب کو ہم نے بتادیا تھا کہ مسز کمال کو اس حادثے کا علم نہیں ہے۔ انہوں نے کمال صاحب کو الگ لے جاکر تعزیت کی۔ لیکن مسز کمال کو دلاسہ دیتے رہے کہ سب ٹھیک ہوجائے گا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی آج ہم میں نہیں ہیں۔ آج کون ایسا ادیب یا ناقد ہے۔ جس کے بارے میں کہا جاسکے وہ عصری ادب کے ہر میلان اور ہر کروٹ سے آشنا ہے، جو اردو رسائل پر گہری نظر رکھتا ہے، عہد قدیم سے لیکر عہد جدید تک کے تمام قابلِ توجہ شاعروں اور نثر نگاروں کی تحریروں کی نزاکتوں سے واقف ہے۔

خلیل صاحب اور اُردو ادب لازم و ملزوم تھے۔ وہ ادب پڑھتے ہی نہیں تھے۔ ادب جیتے بھی تھے۔ وہ ترقی پسند ادبی تحریک سے وابستہ انتہا پسند سیاسی نظریے اور اس کے یک رُخے اثرات سے بہت جلد آشنا ہوئے اور اردو میں جدید رجحانات کے لئے فضا سازگار بنانے میں اُنکا جتنا حصہ ہے، شاید ہی کسی اور کا ہو، لیکن وہ جدیدیت کی انتہا پسندی کو بھی ادب کے لئے سمِ قاتل سمجھتے رہے۔ ان کے ادبی نظریات سے میں نے ہمیشہ قربت محسوس کی ہے۔ ڈاکٹر محمد مثنیٰ رضوی، جو کسی زمانے میں خلیل الرحمٰن اعظمی سے قریب رہ چکے ہیں، اکثر اُن کی باتیں کرتے اور جب عصری ادب سے دلچسپی یا کتابوں اور رسالوں کے باب میں خوش سلیقگی کا ذکر کرتے ہوئے وہ خلیل صاحب کے ساتھ ساتھ میرا نام بھی لیتے تو مجھے غیر معمولی خوشی ہوتی۔ خلیل صاحب کا حافظہ، ان کا علم، انکی شخصیت کی نرمی ـــــ ایسی خصوصیات تھیں، جنھیں پانے کی مجھے ہمیشہ خواہش رہی۔ مجھے چند ادبی شخصیتوں سے، کسی نہ کسی اعتبار سے، قربت کا شرف حاصل رہا ہے۔ لیکن خلیل صاحب کے نام کے ساتھ اپنا نام وابستہ دیکھ کر جو سکون مجھے ملا ہے، اس کی لذت ہی اور ہے۔

ابھی حال میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے دوست راست اور عزیز

شاعر، بمبئی

دوست شہریار نے میرے ساتھ ایک مختصر قیام کے بعد اپنے ایک خط میں یہ جملے بھی لکھے ہیں:

"بمبئی کا یہ سفر میرے لئے ایک یادگار بن گیا ہے۔ اور اس کی وجہ صرف آپکی ذات ہے۔ آپ سے مل کر، آپکو دیکھ کر اور آپ کو برت کر خلیل صاحب کی یاد تازہ ہوگئی۔"

میں اسے اپنی زندگی کا سب سے بڑا compliment، سب سے بڑا اعزاز سمجھتا ہوں۔ ○○

باقی صفحہ ۶۸ خلیل الرحمٰن کی ادبی حیثیت

خود روؤں سے ایک قدم آگے بڑھ چکے تھے یا بڑھنا چاہتے تھے۔ تو اس میں برائی کیا تھی اور برائی کیوں نہیں تھی۔؟ آج کا تازہ ترین ذہنی رجحان ترقی پسندی یا جدیدیت کو حرفِ آخر یا نمونۂ کمال ماننے کے لئے تیار نہیں۔ لہٰذا اعظمی کا ادبی احساس خواہ وہ کتنا ہی غیر واضح اور نامکمل رہا ہو۔ اپنی جگہ صحیح رُخ پر تھا۔

خلیل الرحمٰن اعظمی دورِ جدید میں اُردو کے ایک معتبر نقاد تھے۔ جنھوں نے اُردو تنقید کے اس تعمیری، مثبت اور معتدل مکتبِ فکر میں اپنی ایک جگہ بنائی جس کی تشکیل تو عصر حاضر میں آل احمد سرور، اختر اورینوی، اور وقار عظیم نے کی تھی۔ اور جس کی روایات کے سلسلے رشید احمد صدیقی اور عبدالحق سے آگے بڑھ کر حالی اور شبلی تک دراز ہیں۔ لیکن شاعری میں وہ اس قبیلے کے سنجے کچھ افراد میں نظر آتے ہیں۔ جس کے سربراہ فیض، مجاز اور جذبی ہیں۔ گرچہ یہاں اعظمی کے فن کی لکیر نہ صرف یہ کہ بہت واضح نہیں ہے بلکہ بعض دوسری لکیروں میں گڈ مڈ ہوگئی ہے۔

ابھی یہ کہنا تو مشکل ہے کہ جدید اُردو ادب پر اعظمی کے اثرات کیا ہیں۔ لیکن اس میں شبہہ نہیں کہ وہ خود جدید ادب کی ایک شخصیت ہیں۔ اور اس کا کوئی تذکرہ ان کے بغیر مکمل نہیں ہوگا۔ بلکہ جب جدید ادب کے صحت مند اور تعمیری عناصر کی تلاش ہوگی تو ان میں ایک نمایاں نام اعظمی کا بھی آئے گا۔ اس لحاظ سے تاریخِ ادب میں اعظمی کا مقام محفوظ ہوچکا ہے اور ان کی ادبی حیثیت تسلیم شدہ ہے۔ ○○

عصمت چغتائی
انڈین کورٹ - پہلا منزلہ - اے روڈ چرچ گیٹ بمبئی ۱

راستے کانٹوں بھرے

ایک ایسا وقت آیا مالا ٹوٹ گئی۔ موتی بکھر گئے۔ ترقی پسند مصنفین کی انجمن نے قلابازیاں کھائیں۔ یہ سب چند مہینوں میں ہوا۔ میں اُن دنوں بیمار تھی۔ اور دو تین ماہ سے کبھی گھر کبھی ہسپتال کے چکر کاٹ رہی تھی۔ چھ سات ماہ سے کوئی میٹنگ نہیں ہوئی تھی۔ اُڑتی اُڑتی خبریں عیادت کرنے والوں سے ملتی تھیں کہ ترقی پسند مصنفین کی انجمن ٹوٹ رہی ہے۔ پھر ٹوٹ گئی۔

ذہنی خلفشار یونہی اُچٹتا سا ہوا، پھر ذہن خالی ہو گیا۔ نجی دعوتوں میں مل بیٹھتے اور لڑائی جھگڑے ہو ہوا کر بات ختم ہو جاتی۔

انھیں دنوں میرا جانا علی گڑھ ہوا۔ اور جمیلہ مجیب کے یہاں پھر نورالحسن کے یہاں میری ادھوری سی ملاقات خلیل الرحمٰن اور راہی معصوم رضا سے ہوئی۔ راہی نے نظمیں سنائیں، کچھ بحثیں کیں۔ زاہدہ زیدی بھی تھیں۔ عجیب مضحکہ خیز دور تھا۔ نوخیز ادیبوں اور شاعروں کو اس وقت اکھاڑے میں جمے ہوئے ادیبوں اور شاعروں سے عجیب عجیب شکایتیں تھیں۔ راہی حسبِ عادت زیادہ بول رہے تھے۔ خلیل خاموش بیٹھے تھے۔

اس کے چند سال بعد ایکدن علیگڑھ میں سڑک پر رکشہ سے جاتے ہوئے مڈبھیڑ ہو گئی۔ ہاتھ سے سلام دعا کا تبادلہ ہوا اور گذر گئے۔ اُنہی دنوں نئے ادیبوں کو پُرانے ادیبوں سے شکایتیں شروع ہو گئیں۔ کہ پُرانے ادیب نئے فنکاروں کو ابھرنے نہیں دیتے۔ یہ اتنی مضحکہ خیز بات تھی کہ کسی نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا۔ شکایات کا سلسلہ بڑھتا گیا۔ اور انجمن ترقی پسند مصنفین کی موت واقع ہو گئی۔ پھر یہ بھی فیصلہ ہوا کہ ترقی پسند مصنفین ختم ہو گئے اور ترقی پسندی بھی ختم ہو گئی۔ اس بات کو کوئی پچیس برس ہو گئے ہیں۔ باوجود ان فتوؤں کے اس عرصہ شاعری بھی

میں یہ الزام بھی بڑی شدت سے زور پکڑنے لگا کہ نئے ادیبوں کو چھپنے بھی نہیں دیتے یہ ظالم ادب کے ٹھیکیدار۔ یعنی ترقی پسند ادیب۔

میں اپنی بات کہتی ہوں کہ ادب میرا دلچسپ ترین مشغلہ ہے لیکن میری زندگی کا واحد مقصد کبھی نہ بنا اور نہ بنانا چاہا۔ یقین نہ آنے کی اور بات ہے۔ نئے ادیب کو دیکھ کر ہمیشہ ایک قسم کی مسرت ہوئی۔ جو روحانی اولاد کی پیدائش سے ہو سکتی ہے۔ مگر ہم نے اپنے بزرگوں کی کب سنی تھی جو نئے ادیبوں سے کچھ اُمید رکھتے۔ بلکہ ان سے زیادہ دلچسپی رہی جو ہماری نقل میں نہیں خود اپنی ذات پر بھروسہ کر کے اپنے زمانہ کی الجھنوں کو اپنے انداز میں پیش کر رہے تھے۔ ہم انھیں نہیں سمجھ پاتے تھے۔ یہ بھی سچ بات تھی کہ نئے لکھنے والوں کی تحریریں پُرانوں کی سمجھ سے بالاتر تھیں۔

نئے اور پُرانے لکھنے والوں کے درمیان خلیج پیدا ہو گئی اور اس کی وسعت بڑھتی گئی۔ شاید یہی وجہ تھی کہ جب بھی میں علی گڑھ گئی خلیل الرحمٰن سے اچٹتی ہوئی سلام دعا سے زیادہ آگے بات نہ بڑھی۔ نہ کبھی راہ و رسم بڑھانے کا خیال آیا۔ گروپ بندیوں نے ویسے ہی قافیہ تنگ کر رکھا تھا۔ بمبئی میں زندہ رہنے کا سوال گمبھیر ہوتا جا رہا تھا۔

لیکن پار سال جب میں علی گڑھ گئی تو معلوم ہوا خلیل الرحمٰن کو بلڈ کینسر ہو گیا ہے۔ نہ جانے کس رشتے سے ایک چوٹ دل کو لگی۔ ابھی تو خلیل کی عمر کچھ بھی نہیں۔ بال بچوں والا انسان مرنے کا حق نہیں رکھتا۔ جینا اُس کا فرض ہے۔

جمیلہ مجیب کے گھر کے قریب ہی اُن کا گھر ہے۔ ہم دونوں پیدل ہی چلے گئے۔ خلیل ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہنے ہڈیوں کا ڈھانچہ ایک کھرّے تخت پر بیٹھے مٹر کی پھلیاں چھیل رہے تھے۔ کچھ خاموشی سے نے مگر

پھر زندگی میں پہلی بار کھل کر باتیں کرنے لگے۔ ادھر ادھر کی باتیں کچھ ادب کی کچھ ادبی تنظیموں کی۔ پھر انگیٹھی منگائی اور تخت کے کنارے کھسک آئے اور مٹر تلنے لگے۔ انکی بیوی گاجر کے حلوے کا کٹورا اٹھا لائیں۔ اور خلیل کے تلے ہوئے تازہ تازہ مٹر اور حلوا کھاتے رہے۔ باتیں کرتے رہے۔

خلیل کو نہیں معلوم تھا کہ انھیں بلڈ کینسر ہے۔ ہر ہفتہ خون بدلا جاتا تھا۔ یا خدا جانے کیا ہوتا تھا۔ انہوں نے بڑی بے توجہی سے کچھ تفصیل بتائی تو تھی۔ اس وقت اُن کے چہرے پر موت کی زردی دیکھ کر جی اتھل پتھل ہو رہا تھا۔

نئے اور پرانے لکھنے والوں کے بیچ میں یہ منحوس دیوار کیسے تعمیر ہوئی۔ لوگ کہتے ہیں پرانے لکھنے والے روس کے پٹھو ہیں اور نئے لکھنے والوں کو سی۔ آئی۔ اے نے دیا رکھا ہے۔ ان دو گروہوں کی تقسیم سیاسی گٹھ بندی ہے۔ ان چھچھوری گالیوں سے یہ حقیقت نہیں مرتی کہ ادیب خواہ وہ کسی دور کا ہو، کسی مسلک کو لیکر آگے بڑھے اس کا رشتہ دوسرے ادیب سے نہیں کٹ سکتا۔ نہ دونوں گروہ ایک دوسرے کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ تلخیاں بڑھیں یا گھٹیں حقیقت یہ ہے کہ کوئی پائیدار زنجیر ہے جو ایک دوسرے کے وجود کو بھولنے نہیں دیتی۔ اور جب خلیل الرحمٰن پر موت کا سایہ منڈلاتا ہے تو ساری دیواریں منہدم ہو جاتی ہیں اور ایسا محسوس ہوتا ہے کوئی بڑی حساس رگ کو دھیرے دھیرے کاٹ رہا ہے۔

خلیل الرحمٰن بہت دور تھے۔ میں انہیں صرف اتنا جانتی تھی کہ وہ ہیں۔ مگر وہ کیا لکھ رہے ہیں یہ مجھ تک نہیں پہنچ پایا۔ یا میری کوتاہیوں نے مجھے ان سے قریب نہ ہونے دیا۔ انکی تخلیقات سے میں ناواقف رہی۔ بس اتنا یاد رہا ہے کہ وہ علی گڑھ کے اس جاندار گروہ سے وابستہ ہیں جو بڑا منچلا ہے۔ مخالفت میں ہی سہی مگر جان داری کا ثبوت مہیا کر رہا ہے۔ علی گڑھ سے ایسے گروہ اکثر اٹھتے رہے ہیں۔ اور علم و ادب کو کچھ نہ کچھ دیتے رہے ہیں۔ یہی یقین تھا کہ خلیل الرحمٰن بھی کچھ دے رہے ہیں۔ ضروری نہیں کہ مجھے بھی حصہ ملے جب ہی میں ایمان لاؤں۔ خلیج کے اُس پار ہی سہی وہ ہیں۔ اور بہت واضح طور پر ہیں۔

اُن سے میری آخری ملاقات اچانک ہوئی۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن شاعر بھی

پر کسی پوسٹ کے انٹرویو کے لئے ہم دونوں گئے تھے۔ خلیل بالکل ہی تندرست نظر آرہے تھے۔ میں نے سوچا موت ہار گئی اور یہ مخنی سا آدمی جیت گیا۔

کیا مسخرہ پن ہے۔ زندگی میں کوئی نہیں ملانہ مرتے ہی لوگ بڑے ذوق شوق سے مرنے والے کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ منٹو جب زندگی کے بھیانک ترین دور سے گذر رہا تھا تو لوگ نہایت بے رحمی سے اسکی کوتاہیوں کا ذکر کرتے اور ٹال جاتے۔ مرتے ہی وہ سب کو پیارا ہو گیا۔ اسے سجدے کئے جانے لگے۔ یہ کیسا ادھا دھندہ ہے۔

نئے اور پرانے ادیبوں کے درمیان دوری کس طرح پیدا ہوئی؟ وہ کون تھے جنھوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ترقی پسند ادب مر گیا۔ ترقی پسندی کا زمانہ گیا۔ مقصدی ادب کا موسم ختم ہو گیا۔ اب ادب برائے ادب کا زمانہ ہے۔ انسان کو دنیا کے دکھ سے نہیں صرف اپنے اندر گھس کر اپنی انفرادیت کی کھوج کرنا چاہیئے۔ ظاہر ہے اپنے اندر آپ کسی انجمن کو نہیں گھسا سکتے۔ وہاں آپ کو اکیلے ہی جانا ہوگا۔ لہذا سب الگ الگ ہو کر اپنے اندر ٹوٹا ہوا آدمی بکھرا ہوا آدمی تلاش کرنے لگے۔ اور پانے لگے۔ یا اور بھی شدت سے کھونے لگے۔

ترقی پسند ادیبوں اور نئے ادیبوں کے درمیان یہ خلیج بڑھتی گئی۔ یہ خلیج تنقید نگاروں نے ہی کھودی ہے۔ اور انہی اسے وسیع اور گہرا کرنے کیلئے مقالوں پر مقالے داغنے لگے۔ ان مقالوں کو بھاری بھرکم بنانے کیلئے انتہائی وزنی بیرونی تنقید نگاروں کے حوالے دیئے۔ ہم سفید قوم کے ہاتھوں ستائے گئے مگر ابھی دلوں میں انکی ہیبت طاری ہے۔ وہ جو کچھ کہیں وہ ضرور درست ہوگا خواہ ہمارے حالات پر چسپاں ہو یا نہ ہو۔ اُنکی بات سمجھ میں آئے یا نہ آئے اس پر یقین لانا ازحد عقلمندی اور ذہانت کا ثبوت ہے۔ اور کتنے حوالے درست ہیں یا نہیں یہ بیچارا اردو کا ادیب کہاں ڈھونڈ کر تصدیق کرتا پھرے۔ بوجھل بوجھل ناموں کے رعب سے ہی کام چل جاتا ہے۔ بودلیر، کافکا، ژاں پال سارترے وغیرہم کے اقوال زریں کو نہ سمجھ پانے کا کون اقرار کرکے اپنی جہالت کا ثبوت دے۔

ہم نے جب لکھنا شروع کیا اور بڑی بڑی توپیں داغنے لگیں۔ تو کان پر جوں نہ رینگی۔ ادب کے روٹی تو جڑی تھی نہیں۔ لہٰذا کبھی تنقید نگاروں کو اہمیت نہ دی۔

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر دیکھئے)

علی حمّاد عبّاسی

صدر شعبۂ انگریزی، شبلی کالج۔ اعظم گڑھ ۲۷۶۰۰۱

خلیل الرحمٰن اعظمی

کچھ یادیں، کچھ آنسو

ہاتھ میں قلم تھامے بہت دیر سے خاموش بیٹھا ہوں۔ دل غم سے بوجھل ہے۔ آنکھیں پُرنم ہیں۔ کچھ لکھنا چاہتا ہوں لیکن لکھ نہیں پا رہا ہوں۔ آخر یہ کیسا درد ہے جو الفاظ کے سانچے میں ڈھل نہیں پا رہا ہے۔ یہ کیسا غم ہے جو دل کے تاریک نہاں خانوں سے نکل نہیں پا رہا ہے......

پھر سوچتے سوچتے تھک جاتا ہوں کہ اچانک ماضی کے دھندلکوں سے ایک پرچھائیں آہستہ آہستہ میری طرف بڑھتی ہے۔ پھر دھندلے نقوش واضح ہونے لگتے ہیں اور میرے سامنے ایک جانا پہچانا معصوم چہرہ نمودار ہوتا ہے۔ اور مجھ سے ہمکلام ہوتا ہے: میں تم سے کہتا تھا نا کہ کچھ لکھتے لکھاتے رہا کرو لیکن تم نے میری ایک نہ مانی اور فوجی معاشرت اختیار کرکے اپنی ساری ادبی و فنی صلاحیتوں کو ملیامیٹ کرکے رکھ دیا۔ دیکھو اب تم اس لائق بھی نہیں رہے کہ اپنے ایک ہمدم دیرینہ کی یاد میں کچھ لکھ سکو۔ ذرا ہم رفتہ کو آواز دو۔ گزری ہوئی باتوں اور ملاقاتوں کو یاد کرو، شاید اس سے کچھ کام بنے۔

پھر اچانک وہ چہرہ فیڈ آؤٹ ہو جاتا ہے۔ پرچھائیں سمٹنے لگتی ہے۔ میں سمٹتی ہوئی پرچھائیں کے پیچھے ہو لیتا ہوں۔ اور یادوں کی پگڈنڈی پکڑ کر آج سے تقریباً چار سال قبل ستمبر ۱۹۷۴ء کی ایک صبح کے اجالے میں پہنچ جاتا ہوں جب میں خلیل سے سرسید نگر میں اُن کے مکان "اُردو باغ" میں ملا تھا۔ ملنا جلنا اس سے پہلے بھی ہوتا رہتا تھا لیکن خلیل کے دل میں وہ جو ایک حسرتِ تعمیر تھی اس کے پوری ہونے یعنی مکان بن جانے کے بعد اُن سے میری یہ پہلی ملاقات تھی۔ اور خاص بات یہ تھی کہ اس بار میں تنہا نہیں تھا۔ ساتھ میں میری بیوی اور لڑکا بھی تھا۔ جس کا داخلہ علی گڑھ میں پی یو سی کامرس میں ہوا تھا۔ خلیل ہمیشہ اپنے پرانے دوستوں سے بہت لپک کر ملا کرتے تھے۔ مجھ سے بھی اسی طرح ملے۔ بڑی دیر تک بغل گیر رہے۔ میرے شانے بھی

گالوں پر محبت کے دو چار بوسے بھی ثبت کر دیئے۔ ہمیں اس طرح ملتے دیکھ کر میری بیوی ہکا بکا رہ گئی۔ اور لڑکا بھی حیرت میں پڑ گیا کہ دو پرانے ساتھیوں میں اتنی شدید محبت کیسے ہو جاتی ہے۔ پھر باتیں شروع ہوئیں۔ بیتے دنوں کی باتیں۔ ادیبوں اور شاعروں کی باتیں۔ دوستوں اور ساتھیوں کی باتیں۔ پھر ہنسی مذاق، لطیفے، چٹکلے۔ یہ سب ہو چکا تو خلیل نے کہا: اچھا لو۔ میرا ایک شعر سنو۔

خلیل کو اچھی طرح معلوم تھا کہ شعر و شاعری کے معاملے میں میں ذرا ٹھس واقع ہوا ہوں۔ میں نے خود کسی شاعر سے اس کا کلام سننا کبھی پسند نہیں کیا۔ مشاعروں میں کبھی شرکت نہیں کی۔ لیکن خلیل کی بات اور تھی۔ انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں یہ شعر پڑھا؎

کسی نگر کا سلام لیتے تو آج پھر کیوں ملول ہوتے
وہ کیا پری رو کہ جن کے چہروں کی تحریریں مٹ چلی ہیں

شعر کیا تھا یادوں کا ایک خوشگوار جھونکا تھا۔ جو ماضی کے جھروکوں سے ایک نہائی دُھلی حسینہ کی طرح میرے دل کے آنگن میں ننگے پاؤں اُتر آئی تھی۔ پھر بہت دیر تک میں اور خلیل عالم خیال میں اس دُنیا کی سیر کرتے رہے جو تقریباً چوتھائی صدی پہلے ہم نے اپنے خوابوں میں آباد کر رکھی تھی۔ جبکہ تصوّر سے ہمارے فکر و عمل جوان تھے۔ خوابوں کی اس دھرتی پر ہم نے اپنی تمناؤں کا پہلا قدم رکھا تھا اور دشتِ امکاں کی تلاش میں چل پڑے تھے۔ پھر ہم ان "مغرور حسیناؤں" کے بارے میں جن کی طرف اس شعر میں اشارہ تھا، کافی رات گئے تک باتیں کرتے رہے اور آخر میں ان کے چہروں کی مٹتی تحریروں کو آنکھوں میں بسائے نیند کی آغوش میں چلے گئے۔

میں خلیل کو اس وقت سے جانتا ہوں جب وہ خلیل الرحمٰن اعظمی

نہ تھے بلکہ مولانا خلیل الرحمٰن مستقیمی تھے اور اسی نام سے بچّوں کے پرچوں مثلاً پیامِ تعلیم (دلی)، پھول (لاہور) اور غنچہ (بجنور) میں چھوٹے چھوٹے لیکن دلچسپ مضامین لکھا کرتے تھے۔ مستقیمی وہ اس مناسبت سے تھے کہ ضلع اعظم گڑھ میں قصبہ سرائے میر کے نزدیک واقع ان کے گاؤں کا نام سیدھا سلطان پور ہے۔ سیدھا کا ترجمہ عربی میں مستقیم ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ اپنے نام کے ساتھ مستقیمی لکھتے تھے۔ لیکن ہم لوگ یعنی ان کے ہم جماعت اور شناسا انھیں مستقیمی ایک اور لحاظ سے کہا کرتے تھے۔ وہ آدمی بڑے ہی سیدھے سادھے اور معصوم تھے۔ اسلئے مستقیمی اُن کے نام کیساتھ خوب جچتا تھا۔

اور "مولانا" وہ اس مناسبت سے تھے کہ اُن کا تعلق ایک عالمِ دین اور مذہبی گھرانے سے تھا۔ وہ ہم سے عمر میں بہت بڑے تھے۔ اس لئے اُن کی بزرگی کے اعتراف کے طور پر ہم لوگ انہیں "مولانا" کہتے تھے۔ بعد میں تو انہوں نے اپنے نام سے مستقیمی کا لفظ ڈراپ کر دیا اس اندیشے سے کہ کہیں لوگ سچ مچ انہیں سیدھا سادہ یعنی بدھو نہ سمجھنے لگیں۔ لیکن "مولانا" اُن کے نام سے جڑا رہا۔ یہاں تک کہ جب وہ علی گڑھ پہونچے تو یہ نام بھی اُن کے ساتھ لگا علی گڑھ پہونچا اور وہاں بھی ان کے قریبی ساتھی اور خاص طور سے اُن کے مربّی اور سرپرست جذبی صاحب بھی انہیں "مولانا" کہتے تھے۔ بہت دن گذرنے کے بعد جب وہ پی ایچ ڈی ہو گئے۔ تو ہم لوگوں نے انھیں ڈاکٹر کہنا شروع کیا تو انہوں نے اس پر اصرار کیا کہ ہم لوگ پہلے ہی کی طرح انہیں "مولانا" ہی کہیں کیونکہ بچپن کے اس نام میں انہیں بڑا رس، خلوص اور اپنا پن ملتا تھا۔ ویسے ایک بات کہدوں خلیل نے خود کبھی اپنے نام کے پہلے ڈاکٹر نہیں لکھا۔ اپنی حد تک وہ ڈاکٹر کے اعزاز کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔

خلیل شبلی کالج (اعظم گڑھ) میں جولائی سنہ ۱۹۴۱ء میں ساتویں درجے میں داخل ہوئے اور سنہ ۱۹۴۵ء میں ہائی اسکول فرسٹ ڈویژن میں پاس کر علی گڑھ چلے گئے۔ انھوں نے جو چار سال شبلی کالج میں گذارے وہ اس لئے اہم ہیں کہ وہی اُن کا ذہنی تشکیل کا زمانہ تھا۔ اس زمانے میں اس کے مطالعے کے جنون کو دیکھ کر شبلی اکیڈمی کے ناظم کتب خانہ مولوی عبدالباری صاحب (جن کے نام خلیل کی آخری کتاب "مضامین نو" معنون ہے) کہا کرتے تھے کہ اس لڑکے کے تیور صاف بتا رہے ہیں کہ آئندہ چل کر یہ علم و ادب کی دُنیا میں بڑا نام پیدا کرے گا۔ ان کی وساطت سے شاعر، بمبئی

خلیل کو اس زمانہ میں شائع ہونے والے تمام اہم جرائد مثلاً ادبِ لطیف، ہمایوں، ساقی، نیرنگ خیال اور عالمگیر وغیرہ پڑھنے کو مل جاتے تھے۔ اور مہتہ لائبریری سے نئے ادب کی ساری کتابیں مل جاتی تھیں اور جن نئی کتابوں کی وہ فرمائش کرتے لائبریری کے سکریٹری مسٹر برج بہاری لال وکیل فوراً ہی منگوا دیتے۔ خلیل کو کھیل کود سے کوئی خاص دلچسپی نہ تھی۔ وہ ہمہ وقت کتابوں کی دنیا ہی میں کھوئے رہتے۔ وہ تھے بڑے ذہین۔ بلا کا حافظہ پایا تھا۔ جو کچھ پڑھتے فوراً یاد ہو جاتا۔ چنانچہ ان کے ساتھ رہ کر انکی باتیں سن سن کر اُردو کے کلاسیکی اور نئے ادب کے متعلق میں اتنا کچھ جان گیا تھا کہ ادب و شعر کے مسائل پر بحث و تکرار کر کے لوگوں پر میں یہ تاثر چھوڑتا کہ میں بڑا قابل ہوں، حالانکہ معاملہ اسکے بالکل برعکس تھا۔

میں نے ستمبر ۱۹۴۷ء میں علی گڑھ میں بی اے میں داخلہ لیا۔ اس وقت علی گڑھ میں بڑی افراتفری کا عالم تھا۔ لوگ بدحواس تھے۔ پریشان تھے۔ اور بقول فیض ان پر "یادِ ماضی سے غمگیں اور دہشتِ فردا سے نڈھال" والی کیفیت طاری تھی۔ میں نے علی گڑھ پہنچتے ہی خلیل کو تلاش کیا۔ تو معلوم ہوا کہ دلّی سے علی گڑھ آتے ہوئے فسادیوں نے انہیں چھرا گھونپ کر ٹرین سے جمنا برج کے پار پھینک دیا تھا۔ ان کے ساتھ باقر مہدی بھی تھے۔ وہ بھی چلتی ٹرین سے کود پڑے اور بڑی مشکل سے خلیل کو ہمایوں کے مقبرے والے ریلیف کیمپ تک لے جانے میں کامیاب ہوئے۔

اس کے بعد خلیل علی گڑھ پہونچے تو ان سے ملاقات ہوئی۔ زخموں سے چور چور تھے۔ یوں بھی سینک سلائی تھے۔ اب اور بھی کمزور ہو گئے تھے۔ لیکن زبان پر حرفِ شکایت نہ تھا۔ باقر مہدی بھی ان کے ساتھ تھے۔ وہ ان کے دو سال سے کلاس فیلو تھے۔ اور دونوں ایک ہی کمرے میں رہتے تھے۔ باقر مہدی سے میری ملاقات ہوئی تو مجھے میر کا یہ شعر یاد آ گیا ؎

تری چال ٹیڑھی تری بات روکھی
تجھے میر سمجھا ہے یاں کم کسو نے

اور اگر اب میں یہ بتانے لگوں کہ مجھے یہ شعر کیوں یاد آیا تو یہ مضمون نذرِ دلفریبیٔ عنوان یعنی باقر مہدی کی نذر ہو جائے گا۔ لیکن خلیل کے ساتھ باقر مہدی کا ذکر میں اس لئے ضروری سمجھتا ہوں کہ خلیل کے

دوستوں میں باقر مہدی ہی وہ واحد شخص ہیں جن کا خلیل کی زندگی پر گہرا اثر پڑا۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ باقر مہدی نے خلیل کو چاہنے والوں کی طرح چاہا۔ اتنی محبت میں اتنی شدت، اتنی گرمی اور اتنی اتھاہ گہرائی تھی کہ مجھے تو باقر مہدی میں پرنس ہیملٹ کی بو باس ملتی تھی جس نے اوفیلیا کے بارے میں کہا تھا: "میں نے اوفیلیا کو اتنا چاہا ہے کہ اس کے ۴۰ ہزار بھائیوں کی محبت میرے پیار کے برابر نہیں ہو سکتی"۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ باقر مہدی جیسے مخلص دوست اس دنیا میں کہاں ملیں گے جو عام حالات کو چھوڑیئے، شدید جذباتی دباؤ کے لمحات میں بھی اپنے کسی دوست کو چھرا گھونپنے والوں سے جاکر دیوانہ وار کہہ سکے کہ "میرے دوست کو تم نے چھرا گھونپ کر مار دیا۔ اگر وہ مر گیا تو پھر میں زندہ رہ کر کیا کروں گا۔ اب دیکھتے کیا ہو۔ لو مجھے بھی مار ڈالو"۔ یہ جملے معمولی نہیں آگ کے انگارے ہیں۔ ہم میں سے کون مائی کا لال ایسا ہے جو انہیں منھ میں لیکر اگل سکے۔؟

باقر مہدی خلیل کے ساتھ ۱۹۴۵ء سے ۱۹۴۹ء تک رہے۔ اس کے بعد لکھنؤ چلے گئے۔ اس درمیان انہوں نے خلیل سے دوستی کا حق ادا کر دیا۔ ان کو اپنے کنٹرول میں رکھا۔ ان کو غلط قسم کے لوگوں سے بچایا اور بھٹکنے سے بچایا۔ وہ صحیح معنوں میں خلیل کے دوست، رہنما اور فلسفی تھے۔ اگرچہ اُن کا تعلق ایک جاگیردار گھرانے سے تھا اور ہم لوگ غریب گھرانوں کے افراد تھے۔ اور بالکل خستہ حال تھے لیکن باقر مہدی نے کبھی کسی طبقاتی برتری کا احساس تک ہمیں نہ ہونے دیا بلکہ ایک طرح سے اپنے آپ کو ڈی کلاس کر لیا تھا۔ خلیل کو انہوں نے کبھی یہ محسوس نہ ہونے دیا کہ وہ سبھلے نہیں ہیں۔ ان کی پوری دیکھ بھال کرتے اور گرمی کی چھٹیوں میں اپنے ساتھ ردولی لے جاتے۔

اس زمانے میں خلیل علی گڑھ میں بہت پاپولر تھے۔ شاید ہی کوئی ادبی محفل ایسی ہوتی جس میں وہ بلائے نہ جاتے۔ ان کو تمام باذوق گھرانوں میں مدعو کیا جاتا جہاں خواتین انکا کلام سُننے کے لئے چشم براہ رہتی تھیں۔ ہم بھی ان کے ساتھ جاتے۔ وہ اپنا کلام سُناتے ہم اپنا کام کرتے یعنی اُن کے حصّے کی مٹھائیوں پر ہاتھ صاف کرتے۔ یہ خلیل کی ادبی سرگرمیوں کے شباب کا زمانہ تھا۔ ڈھیروں نظمیں غزلیں اور مضامین لکھ ڈالے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ ان کے ساتھ رہنے کے باوجود میں نے کبھی اُن کو قلم دوات لیکر شعر کہتے نہیں دیکھا۔ نجانے کب وہ شعر کہتے اور کب کوئی مقالہ یا مضمون لکھ لیتے اور وہ جب بھی لکھتے دور کی کوڑی لاتے۔ اب آتش پر ان کے مقالات ہی کو لیجئے۔ اتنا تو میں نے بھی دیکھا کہ رسل گنج کے ایک کباڑی کی دکان سے وہ "دیوانِ آتش" ۸ آنے میں خرید کر لائے اور جھاڑ پونچھ کر ورق گردانی شروع کر دی۔ اچھے اشعار پر نشان لگاتے جاتے۔ حاشیے پر جا بجا نوٹ لکھتے جاتے اور کبھی کبھی باقر مہدی اور مجھ سے مشورہ بھی لیتے۔ اور پھر ایک صبح نجانے کیسے ہمارے سامنے ۱۲ صفحات کا مقالہ "آتش کی عشقیہ شاعری" موجود تھا۔

اب سوال یہ اُٹھا کہ اس مقالے کو چھپوایا کہاں جائے۔ ترقی پسند ادب کی نظر "نگار" (لکھنؤ) کے نام نکلا۔ خلیل نے مقالے کے ساتھ نیاز فتحپوری کو ایک چھوٹا سا خط بھی اس مضمون کا لکھ دیا کہ بہت ڈرتے ڈرتے یہ مقالہ بھیج رہا ہوں اگر پسند آجائے تو "نگار" کے کسی آئندہ شمارہ میں جگہ دیدیجئے۔ یہ مقالہ نیاز صاحب کو پسند آیا اور انھوں نے اپنے خصوصی نوٹ کے ساتھ شائع کیا۔ مقالہ چھپتے ہی لوگوں کی توجہ کا مرکز بن گیا۔ یہاں تک کہ خود پروفیسر رشید احمد صدیقی نے خلیل کو بلا کر کہا کہ میری یہ خواہش ہے کہ آپ بی۔ اے کرنے کے بعد ایم۔ اے اُردو میں داخلہ لیں۔ یہاں ایک بات اور قابل ذکر ہے کہ جب اگلی گرمیوں کی چھٹی میں خلیل لکھنؤ گئے تو نیاز فتحپوری صاحب کو یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ وہ بی۔ اے کے طالب علم ہیں۔ آتش پر ان کے سلسلۂ مضامین کی اہمیت اور وقعت یوں اور بھی بڑھ جاتی ہے کہ اُردو میں لکچرر ہونے کے بعد خلیل نے پی ایچ ڈی کرنے کا ارادہ کیا تو رشید صاحب نے ان سے کہا کہ ویسے تو پی ایچ ڈی کی ڈگری ان کو آتش پر لکھے گئے مضامین پر ہی مل سکتی ہے لیکن وہ چاہتے ہیں کہ وہ کوئی اور وقیع کارنامہ سرانجام دیں۔ اس کے بعد خلیل نے رشید صاحب کی نگرانی میں ترقی پسند ادب کی تاریخ پر تحقیقی مقالہ لکھا۔

یوں تو خلیل کی شخصیت بڑی متنوع اور پہلودار تھی لیکن انکی شخصیت کا حاوی رجحان مروّت اور دوستی تھا۔ دوستی خلیل کے لئے ایک اضطراری جذبہ تھا۔ وہ دوستی کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے تھے۔ دوستی ایک طرح سے ان کے لئے روحانی اور نفسیاتی سرچشموں کی آبیاری کا ذریعہ تھی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ دوستی انکی شخصیت کے امکانات کو وسیع کرنے اور اپنی تخلیقی حس کو مطمئن کرنے کا وسیلہ رہی ہو۔ لیکن اُن کو اچھے اور بُرے دوست کی پہچان نہیں تھی۔ وہ خود غرض اور بے غرض دوست میں فرق نہیں کر پاتے تھے۔ ان

کے اندر یہ بات میر تقی میر کے گہرے مطالعے سے پیدا ہوئی تھی کیونکہ میر بھی انسان کو اس کی تمام اچھائیوں اور برائیوں سمیت قبول کر لیتے تھے۔ خلیل کے نزدیک بھی دوستوں کو قبول کرنے اور اس کے آگے بڑھ کر ان کو گلے لگانے بھینچنے اور جذب کرنے میں کوئی اچھائی یا برائی مانع نہیں تھی۔ خلیل ایسی دوستی کے عواقب سے بے خبر نہیں تھے۔ انہوں نے "نیا عہد نامہ" کے دیباچے میں اس بات کا کھلم کھلا اعتراف کیا ہے کہ بہت سی کہانیاں ان کے اور ان کے دوستوں کے نام سے منسوب ہوئیں۔ اور اخلاقی اور سماجی اعتبار سے کوئی عیب ایسا نہ تھا جو ان کے نامۂ اعمال میں درج نہ کیا گیا ہو۔ یہ اگر سچ ہے تو پھر اس کی ساری ذمہ داری خود خلیل کے سر آتی ہے۔ اس کے لئے کسی دوست کو مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا۔

خلیل کی شخصیت سے ایک تاثر تو یہ ملتا ہے کہ وہ ادب میں ہر طرح کی انتہاپسندی کے خلاف تھے۔ لیکن دوستی کے معاملے میں وہ خود ضرورت سے زیادہ انتہاپسند تھے۔ یہ بھی کیا دوستی کہ دوست کے لئے اندھے ہو جاؤ۔ جو دوست کہیں وہ تم بھی کہنے لگو۔ اگر کوئی دوست یہ کہہ دے کہ اقبال معمولی شاعر ہیں تو تم بھی آنکھ بند کر کے اس کی ہاں میں ہاں ملانے لگو۔ ایک روز تو جاوید کمال نے ان سے یہاں تک کہہ دیا کہ مولانا! تم آدمی ہو کہ سفید چادر کہ جس نے جو رنگ ڈال دیا اسی رنگ میں رنگ گئے۔ یہی رنگ انھوں نے انجم اعظمی کے مجموعۂ کلام "لب و رخسار" کے دیباچے میں دکھایا۔ ایک تو انھوں نے اس مجموعے کا بارِ اشاعت اپنے سر لیا۔ اور پھر بڑے طمطراق سے یہ فرمایا کہ "اردو زبان میں پہلی مرتبہ ایک عشق کی انجیل شائع ہو رہی ہے جس کا نام ہے "لب و رخسار"۔ میں نے خلیل کو چڑانے کیلئے "لب و رخسار" کے دیباچے کی پیروڈی لکھی۔ اور اس کا پہلا جملہ کچھ یوں تھا "اردو زبان میں پہلی بار ہوس کی زنبیل شائع ہو رہی ہے جس کا نام ہے "گال اور ہونٹ"۔ اس پر وہ مجھ سے خفا نہیں ہوئے بلکہ کہنے لگے کہ اگر تم اس طرح کی کچھ پیروڈیاں لکھ ڈالو تو نثر میں پیروڈی نگاری میں اولیت کا سہرا تمہارے سر ہی رہے گا۔ میں نے کہا کہ میں نے تمہارے دیباچے کی پیروڈی لکھ کر مذاق کیا ہے لیکن تم نے انجم اعظمی کو عظیم شاعر صرف ان کی دوستی نبھانے کے لئے ثابت کرنے کی حماقت کی ہے۔

وہ ایسے دوستوں کے گھیرے میں رہے جن کی وجہ سے ان کو بڑی زحمتوں کا سامنا کرنا پڑا۔ بڑی تہمتیں اٹھانی پڑیں۔ یہ معاملہ آخر میں اتنا سنگین ہو گیا تھا کہ بارہ بنکی میں ان کی لگی لگائی شادی منسوخ ہو گئی۔ وہ تو خدا بھلا کرے محسن عظیم آبادی کا جنھوں نے از راہِ لطف و کرم ان کی شادی ایک سمجھدار اور سگھڑ لڑکی سے کرا دی۔ ورنہ خلیل یار کی یاری میں اس طرح بکھر جاتے کہ ان سے ہمدردی کرنے والا بھی کوئی نہ ملتا۔

اسی دوست نوازی کا شاخسانہ ان کی ترقی پسندی اور اسکے بعد کی جدیدیت پسندی بھی ہے۔ وہ ترقی پسند اس بنا پر ہوئے کہ ان کے سارے دوست مثلاً باقر مہدی، جاوید کمال، مغنی رضوی، انجم اعظمی وغیرہ ترقی پسند تھے۔ ایک طرف تو ترقی پسندوں کی انتہاپسندی سے اندر اندر کڑھتے تھے۔ لیکن ترقی پسندوں کے دفاع میں جیل یاترا بھی کر آئے اور ہیرو بن گئے۔ انہوں نے اپنی ترقی پسندی کا نظریاتی جواز بھی تلاش کیا لیکن اس کی بنیاد بھی دوستی ہی تھی۔ پھر جب جدیدیت پسندوں نے دیکھا کہ یہ شخص ترقی پسندی سے کس حد تک بیزار ہو چکا ہے۔ اور آدمی بڑا ذہین اور ساتھ میں مروتی بھی ہے۔ ان سے لیو ششبو شروع کی اور دوستی کا ناطہ تو بس جناب ہو گئے جدیدیت کے طرفدار۔ لیکن یہ طرفداری بھی "بشرطِ استواری" نہیں تھی۔ وہ جدیدیت پسندوں کی بے راہروی کو ناپسند کرتے تھے۔ اور انہی غزل کے متعلق تو صاف صاف لکھ دیا کہ اس کی اردو شاعری میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جدیدیت پسندوں سے ان کی دوستی کا اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ ایک دن میں نے ان سے کہا کہ تمہارے ایک دوست نے اردو میں ابہام اور علامت نگاری کا جو ایک ریکٹ چلا رکھا ہے جانتے ہو اس سے اردو کا کتنا نقصان ہو رہا ہے کیونکہ اگر اردو کا رشتہ عوام سے منقطع ہو گیا تو پھر اس ملک میں اس کا زندہ رہنا مشکل ہو گا — اس پر انہوں نے کہا کہ تم کیا چاہتے ہو۔ میرا وہ دوست انقلاب زندہ باد کا نعرہ لگانے لگے۔ ارے وہ سرکاری ملازم بھی تو ہے۔ وہ اپنی نوکری کو دیکھے یا اردو کی بقا کے لئے عوام سے رشتہ جوڑے۔

دوستی خلیل کی کمزوری تھی اور طاقت بھی۔ اور اسی طاقت نے انھیں شاعروں کا شاعر (poet's poet) بنا دیا تھا۔ سنتے ہیں کہ کتنے لوگ اسپنسر (SPENSER) اور کیٹس کو پڑھ

یہ دوستی نبھانے والا معاملہ بھی خوب ہے۔ ۵۳ء سے ۸۰ء تک شاعر بمبئی

مشہور ہو گئے۔ لیکن خلیل تو ان دونوں سے بھی سبقت لے گئے۔ کتنے لوگ صرف ان کے ساتھ رہ کر شاعر ہو نہ جانے کیا کیا بن گئے۔ خلیل کو ایثار کرنا اور دوسروں کی دبی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لانا خوب آتا تھا۔ کتنے ایسے لوگ جو موزوں شعر نہ پڑھ سکتے تھے خلیل کے قریب آئے اور اچھے خاصے شاعر بن گئے۔ اگر باقر مہدی کا خلیل کا ساتھ نہ ہوتا تو شاید اتنے اچھے شاعر نہ ہوتے۔ یہی حال شہریار کا بھی ہے۔ مجھے بھی خلیل نے افسانہ لکھنے پر اکسایا اور میرے افسانوں کو نوک پلک سے درست کر کے "ادبِ لطیف" اور دوسرے ادبی پرچوں میں شائع کرایا۔ لیکن میں گھامڑ قسم کا آدمی ہوں کچھ نہ بن پایا۔ کہتے ہیں بگڑا ہوا افسانہ نگار طنز نگار بن جاتا ہے۔ کم سے کم میرے بارے میں یہ بات صادق نہیں آتی۔ خلیل کی رفاقت جادو اثر ہوتی تھی۔ ان سے بچھڑ کر جادو کا اثر باقی نہیں رہ جاتا تھا۔

خلیل کی زندگی میں سب کچھ تھا۔ دوست تھے، پرستار تھے، شہرت تھی۔ لیکن اگر کچھ نہیں تھا تو بس جینے کا سلیقہ ــــ ان کے پاس نہ کوئی پروگرام تھا اور نہ کوئی Arranging Design تھی۔ لکھ رہے ہیں تو بس لکھ رہے ہیں۔ پڑھ رہے ہیں تو بس پڑھ رہے ہیں۔ جاگ رہے ہیں تو جاگ رہے ہیں۔ گھوم رہے ہیں تو گھوم رہے ہیں۔ ان کے ہاں اشعار کے نزول کے لئے کسی مقام یا وقت کی قید نہ تھی۔ ایک بار میں جاوید کمال، صغیر احمد صوفی، خلیل اور انجم اعظمی کسی دوست کو سی آف (See off) کرنے ریلوے اسٹیشن گئے۔ ٹرین آئی اور چلی گئی۔ لیکن خلیل اور انجم غائب۔ تلاش کیا گیا تو معلوم ہوا کہ دونوں شاعر صاحبان ریلوے پلیٹ فارم کے ایک نیم اندھیرے گوشے میں بیٹھے ہیں۔ اور شعر کا نزول ہو رہا ہے۔ ہم لوگ بار بار چلو چلو کی رٹ لگا رہے تھے لیکن یہ لوگ تھے کہ ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے۔ عجیب پریشانی کا عالم تھا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ان لوگوں کو وہاں سے اٹھایا کیسے جائے۔ میں نے کہا یہ لوگ ایسے نہیں اٹھیں گے۔ چلو میں ایک ترکیب نکالتا ہوں۔ میں سب لوگوں کے ساتھ وہاں گیا اور زور سے کہا مولانا! یہ تم لوگوں کی غزل ہو رہی ہے کہ کسی عورت کے ہاں بچہ پیدا ہو رہا ہے کہ جب تک بچے کا جنم نہ ہو لے عورت اپنی جگہ سے کھسک نہیں سکتی۔ یہ سنتے ہی وہ دونوں فوراً اٹھ کھڑے ہوئے۔

شاعر، بمبئی

خلیل کو جہاں تک میں نے سمجھا ہے وہ بنیادی طور پر بےفکرے اور لا پرواہ قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے اپنی صحت کی کبھی پرواہ نہ کی۔ پرہیز بھی کیا تو مجبوراً۔ دوا بھی کھائی تو مجبوراً۔ انہیں زندگی میں اگر کسی بات کا دکھ تھا تو بس وطن چھوٹنے کا۔ وہ اپنے گھر کے لئے ہمیشہ تڑپتے رہتے۔ نجانے وہ کون سی گھڑی تھی اور نجانے کیا اسباب تھے۔ جن کی وجہ سے ان کو بن باس ملا تھا۔ چنانچہ گھریلو پن کے بہت شیدائی تھے۔ اور بات بات میں لفظ "گھریلو" کا استعمال کرتے۔ یہ لڑکی کیسی ہے؟ گھریلو۔ یہ آدمی کیسا ہے؟ گھریلو۔ اس ہوٹل میں کھانا کیسا ملتا ہے؟ گھریلو۔ یہ نظم کیسی ہے؟ گھریلو۔ یہ گھر کیسا ہے؟ گھریلو۔ اور یہ سب کچھ اسلئے تھا کہ ان کا اپنا گھر چھوٹ گیا تھا۔ اس محرومی کا ذکر ان کی نظموں میں بار بار ملتا ہے۔

اتنا لکھ چکنے کے بعد اب سوچتا ہوں کہ خلیل کی زندگی کے کچھ پوشیدہ اور نظروں سے اوجھل حصوں کی نشاندہی بھی کرتا چلوں اور ان کے بارے میں کچھ ایسی باتیں بھی بتا دوں جو میرے حافظے میں محفوظ ہیں۔

خلیل کے ساتھ میں علی گڑھ میں رہتا ضرور تھا لیکن اپنے نظام الاوقات کا سختی سے پابند تھا۔ سارا کام پروگرام کے مطابق کرتا تھا۔ اکثر خلیل میرے پاس آتے اور کہتے کہ اتنا پڑھ کر کیا کرو گے فرسٹ کلاس تو تم کو ملنے سے رہا۔ وہ تو محمود صاحب دیں گے زاہدہ زیدی یا تہمینہ ہاشمی کو۔ آؤ ذرا تصویر محل تک چلتے ہیں۔ تم ہمارے ساتھ رہتے ہو تو تھوڑی ڈھارس رہتی ہے۔ تمہاری وجہ سے ہمارے سر کتنی ہی مصیبتیں آئیں اور ٹل گئیں۔

اب اس کی تفصیل سنیئے:

جب خلیل اور انجم اعظمی حالی روڈ پر ایس ایس ڈائننگ ہال کے سامنے رہتے تھے جو ان دنوں لڑکیوں کے امتحان کا مرکز ہوا کرتا تھا۔ ایک روز امتحان کے بعد میں اپنی ایک خاتون دوست سے ادھر ملنے چلا گیا اور پھر لوٹ کر خلیل کے کمرے میں چلا آیا۔ ابھی وہاں بیٹھے ہوئے مشکل سے دو چار منٹ ہوئے تھے کہ ڈاکٹر شیخ رشید منہ میں سگار دبائے۔ غصے سے لال پیلے کمرے میں داخل ہوئے۔ ان کو دیکھتے ہی خلیل اور انجم کی تو بس جان ہی نکل گئی۔ میں بھی دھک سے ہو گیا۔ ان کے ہاتھوں میں ایک سفید کاغذ تھا جس میں یہ شکایت درج تھی کہ خلیل اور انجم اور ان کے دوسرے ساتھی برآمدے میں کرسیوں پر بیٹھ کر امتحان میں آنے جانے

آنے جانے والی لڑکیوں پر آواز سے کستے ہیں اور گندے گندے اشارے کرتے ہیں۔ میں نے ڈرتے ڈرتے شیخ صاحب سے کاغذ لیا اور پڑھنا شروع کیا اور بے ساختہ میرے منہ میں دہ مارا" کا نعرہ گونج اٹھا۔ میں نے کہا' شیخ صاحب! یہ درخواست ہی سرے سے جھوٹی ہے۔ انھوں نے پوچھا' وہ کیسے؟ میں نے کہا' آپ خود ہی دیکھ سکتے ہیں کہ اس کمرے میں کرسی نام کی کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ صرف دو ٹوٹی ہوئی قبر جیسی چارپائیاں ہیں اور ایک تین ٹانگ کی میز۔ شیخ صاحب نے یہ سنا اور دوسرے ہی لمحے وہ کمرے کے باہر جا چکے تھے۔

ایک اور واقعہ سنیے:۔

خلیل اور انجم نے خوب بڑے بڑے بال بڑھا رکھے تھے۔ آج کل کے ہپیوں کی طرح۔ ایک شام ہم لوگ (خلیل، انجم اور میں) حالی روڈ سے نکل کر یونیورسٹی ہاسٹل کی طرف جا رہے تھے کہ اتفاق سے یونیورسٹی کے میڈیکل افسر ڈاکٹر کیپٹن حفیظ الرحمٰن ادھر سے اپنی کار سے گذرے۔ ہمیں دیکھ کر کار روک دی اور فوجی انداز میں ڈانٹ کر بلایا اور پوچھا کہ سر پر بالوں کا یہ جنگل کس کے غم میں اگا رکھا ہے۔ خلیل اور انجم سے کوئی جواب نہ بن پڑا صرف یہ کہکر جان چھڑائی کہ ہم غریب طالب علم ہیں بال بنوانے کے لئے ہمارے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس پر ڈاکٹر صاحب نے اپنی جیب سے ۱۲ آنہ نکال کر انہیں دیئے اور حکم دیا کہ ابھی جا کر بال کٹوا ڈالو۔ ان پیسوں کو لیکر ہم لوگ سیدھے کیفے ڈی فرنس پہونچے اور چائے، تلا قند اور نمک پاروں سے اپنی تواضع کی۔ یاد رہے سنہ ۱۹۵۲ء میں ۱۲ آنے کا اچھا خاصا ناشتہ مل جاتا تھا۔

پھر ہماری جو شامت آئی تو اسکے دوسرے ہی دن ٹھیک اسی مقام پر اور اسی وقت ڈاکٹر حفیظ الرحمٰن سے پھر مڈبھیڑ ہو گئی۔ بلا کر پوچھا بال کیوں نہیں کٹے۔ خلیل اور انجم کی سٹی گم۔ یکایک میرے منھ سے نکل گیا سر یہ دونوں بار بر شاپ پر گئے تھے۔ لیکن باربر نے جو چھ آنے میں اتنے بڑے بڑے بال کاٹنے سے انکار کر دیا۔ وہ تو ایک ایک روپیہ سے کم میں ان کے بال کاٹنے کو تیار ہی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا' نائی نٹ! اور غصے میں کار کو تیزی سے بھگاتے ہوئے وہاں سے چلے گئے۔ انکے جانے کے بعد خلیل نے کہا! یار بال بال بچ گئے۔ ورنہ آج یہ فوج کا ریٹائرڈ ڈاکٹر ہم لوگوں کا کورٹ مارشل کر ڈالتا۔

ایک اور واقعہ سنیے جس سے یقین آجائے گا کہ خلیل فطری طور پر شاعر ہی تھے۔

معصوم اور بے ضرر ہونے کی حد تک شریف انسان تھے۔ وقتی طور پر غلط صحبت میں پڑ گئے ہوں لیکن وہ رہے ہوں گے کنول کے پھول کی طرح جو اگتا تو ہے کیچڑ میں لیکن کھلتا ہے صاف پانی کے اوپر۔

واقعہ یوں ہے کہ علی گڑھ میں ہم لوگوں کے ایک استاد تھے دل پھینک اور رنگین مزاج۔ غیر شادی شدہ تھے اس لئے بیچلرز کوارٹر میں رہتے تھے۔ ہم لوگ (خلیل، باقر مہدی اور میں) اکثر شام ان کے یہاں چلے جاتے۔ اور ان کے ساتھ کافی رات گئے تک گپ شپ کرتے رہتے۔ ایک شب کیا ہوا کہ ۹½ بجے کے قریب ان سے ملنے کے لئے ایک خاتون تشریف لائیں۔ ان کے آنے کے کچھ ہی دیر بعد انھوں نے خلیل سے چائے بنانے کے لئے کہا اور ہم سے کہا کہ اب آپ لوگ تشریف لے جایئے۔ دسمبر کی ٹھنڈی رات میں ہم لوگوں کا وہاں سے نکالا جانا بلا وجہ نہ تھا۔ ہم چلے آئے لیکن خلیل کو انھوں نے روک رکھا۔

صبح کو جب خلیل سے ملاقات ہوئی اور ان سے سوال کیا گیا کہ جب اپنے استاد دوست "شب وصل حلال" کر رہے تھے تو اس وقت تم کیا کر رہے تھے؟ جواب میں خلیل نے چپ سادھ لی۔ بلکہ ایک چپ ہزار چپ والا محاورہ سچ کر کے دکھا دیا۔ لیکن ہم بھی اس طرح کی چپ کی داد کے قائل نہ تھے ——— خلیل کو تنگ کر مارا۔ آخر میں زچ ہو گئے۔ اور ہم سے کہا' اچھا یہ بتاؤ کہ اگر تم میری جگہ پر ہوتے تو کیا کرتے؟ میں نے کہا' میں کیا کرتا۔ میں تو جناب! اس حلال گوشت میں اپنا حصہ مانگتا اور حصہ نہ ملنے کی صورت میں شور مچا دینے کی دھمکی دیتا۔' اس پر خلیل نے کہا کہ تم نمبری بدمعاش ہو۔ میں تو اس وقت سائڈ روم کے عقبی دروازے سے بھاگ کر نقوی پارک میں جا چھپا تھا ———

اب کچھ چھوٹے چھوٹے واقعات بھی سنئے:۔

● خلیل کے ایک دوست کی بیوی نے کہا' آپ بازار جا رہے ہیں میرا صابن ختم ہو گیا ہے۔ یہ پیسے لیجئے اور ایک ٹکیہ صابن ساتھ میں لیتے آیئے گا۔ خلیل نے جا کر دکاندار سے کہا کہ ایک ٹکیہ عورتوں کا صابن دو۔ صابن جب دوست کی بیوی کے ہاتھ میں پہونچا تو وہ سخت برہم ہوئیں اور بولیں، آپ سے یہ صابن کس نے لانے کو کہا تھا۔ خلیل نے کہا کہ آپ نے بھی تو کسی خاص برانڈ کا نام نہیں لیا تھا، بس "میرا صابن"

ختم ہوگیا ہے' کہا تھا۔ پھر وہ سرپیٹنے کے انداز میں بولیں' ارے یہ تو سوچا ہوتا کہ آٹھ آنے کا کون سا منھ دھونے والا صابن ملتا ہے۔ خلیل نے جواب دیا' وہ تو میں نے آپ کے پیسے بچانے کے خیال سے خریدا تھا۔ اور پھر آپ جانتی ہی ہیں کہ ابھی میری شادی نہیں ہوئی ہے۔ مجھے کیا معلوم کہ عورتیں کس کس طرح کے صابن استعمال کرتی ہیں۔

● خلیل طالب علم کی حیثیت سے قرۃ العین حیدر کے بہت زبردست فین (Fan) تھے۔ ان کے افسانوں اور ناولوں کو بڑے شوق سے پڑھتے تھے گویا وہ ان کی تحریر نہیں بلکہ کسی محبوبہ کا خط ہو۔ چنانچہ اسی لگاؤ کی بنا پر انہوں نے اپنے ایک نئے کا پیار کا نام 'بیجو' رکھا تھا۔ جو قرۃ العین حیدر کے ناول "میرے بھی صنم خانے" کا ایک کردار ہے۔ ایک دن خلیل کو چھیڑنے کے خیال سے میں نے کہا' یار مولانا! اگر عینی حیدر کی گردن ذرا لمبی ہوتی تو کیا ہوتا؟ خلیل نے جواب دیا' ارے ہوتا کیا' اگر انکی گردن ذرا لمبی ہوتی تو وہ اور لمبے اور حسین افسانے لکھتیں۔ ان کی گردن کوئی قلوپطرہ کی ناک ہے جس کا اثر دنیا کی تاریخ پر پڑتا تھا۔

● ایکبار مجاز مرحوم علی گڑھ آئے۔ جاوید کمال نے انھیں لنچ پر بلایا۔ وہیں انکا ہم سے (خلیل انجم اور میں) پہلی بار تعارف ہوا۔ مجاز کے کان کمیونسٹوں نے ہم لوگوں کے خلاف پہلے ہی سے بھر رکھے تھے۔ مجاز مرحوم نے کہا کہ سُنا ہے کہ کمیونسٹ سماج کو درست کرتے ہیں۔ اور آپ لوگ کمیونسٹوں کو ۔ خلیل نے کچھ کہنا چاہا تو مجاز مرحوم نے کہا پارٹنر! چاہے کچھ بھی ہو' کام اچھا کر رہے ہو۔ خلیل نے کہا مجاز صاحب آپ اس کو اچھا کام کہہ رہے ہیں۔ یہ تو نہایت ہی لغو کام ہے۔ اب یہی دیکھئے نا' ہم لوگوں کو دیکھ کر کمیونسٹ لڑکیاں کہتی ہیں کہ وہ دیکھو تینوں منحوس جا رہے ہیں۔ پھر بھی مجاز صاحب! ہم شاد ہیں کہ ہیں تو کسی کی نگاہ میں۔

● خلیل ایک سیاسی کام سے کلکتہ گئے۔ ساتھ میں لڑکیوں کا ایک گروپ بھی تھا۔ راستے میں ایک فربہ اندام لڑکی نے خلیل سے دوستی کرلی۔ اور کلکتہ پہنچتے پہنچتے اس کو یقین آگیا کہ خلیل سیدھے سادے آدمی ہیں۔ اور اگر ان پر دست درازی کی جائے تو یہ نہیں نہیں تو کر سکتے ہیں لیکن شور ہرگز نہیں مچا سکتے۔ چنانچہ کلکتہ پہنچنے کے ایک دو دن کے اندر ہی وہ تندرست لڑکی انھیں پھسلا کر لڑکیوں کے ایک خالی کیمپ میں لے گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے کر ڈالا ان کا دھڑن تختہ۔ لیکن شاعر یعنی

واپسی پر خلیل نے ہم سے اس کا ذکر تک نہ کیا۔ بعد میں اس لڑکی نے جب خلیل کو بلیک میل کرنا چاہا تو ہم لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا۔ جو شور خلیل نہ مچا سکے تھے وہ شور ہم نے مچا دیا۔ اور خلیل سے کہا کہ پورا ماجرہ ایک ایک سکنڈ کی تفصیل سے سناؤ۔ نہیں تو ہم اس بلیک میلر سے مل کر تمہاری شادی اس سے کرا کے دم لیں گے۔ خلیل نے بڑے التجا آمیز لہجے میں کہا' خدا کے لئے ایسا مت کرنا' ایکبار تو میری ہڈی پسلی بچ گئی تھی۔ اب اس سے شادی کرا کے مجھے زندگی بھر کی سزا نہ دو۔ اسی واقع کی یادگار انکی نظم "شام وداع" ہے۔

خلیل سے میرا تعلق کل ۲۷ سال تک رہا۔ ان ۲۷ سالوں میں ہم نے ایک دوسرے کو قریب سے دیکھا' سمجھا' اور پایا۔ میں خلیل کے بارے میں اتنا تو پورے وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ خلیل سے بڑا زندگی کا عاشق اور شیدائی نہ کبھی پیدا ہوا اور نہ کبھی ہوگا۔ صحت ہو چاہے بیماری' راحت ہو چاہے اذیت' وہ ہر حالت میں زندگی پر اپنی جان نچھاور کرتا رہا۔ موت اس کا پیچھا کرتی رہی۔ اور وہ زندگی کے پیچھے بھاگتا رہا۔ اور مرتے دم تک یہی رٹ لگاتا رہا:

اے زندگی' اے زندگی' رُتبہ رہے بالا ترا

وہ زندگی کی راہ میں "شہید ظلمتِ شب" تھا لیکن ہمیشہ پکارتا رہا "کوئی روشنی' کوئی روشنی"۔ وہ بے گھر تھا اور گھر بنانے کی حسرت میں وہ تمام عمر سلگتا رہا۔ اور جب اس نے اپنا ایک گھر بنالیا اور اس کنج عافیت کو اس نے "اُردو باغ" کا نام دیدیا۔ تو وہ گھر بھی اسکو راس نہ آیا۔ وہ پھر ایک بار بے گھر ہوکر دوسرے گھر۔ اپنی مستقل قیام گاہ کی تلاش میں چل پڑا۔

یار مولانا۔!

تم نے زندگی میں کسی کو تکلیف نہیں دی۔ کبھی کسی سے چھل کپٹ نہیں کی۔ کسی کو خود اپنی طرف سے شکایت کا موقع نہیں دیا۔ لیکن جاتے جاتے تم مجھے ایک شکایت کا موقع دے گئے۔ تم خود تو چلے گئے اور مجھے اس دنیا میں اکیلا چھوڑ گئے۔ اب تم ہی بتاؤ' تمہاری یادوں کے اس حزیں انبوہ کو کہاں لے جاؤں؟ ان نہ تھمنے والے آنسوؤں کی مالا کو کیا کروں؟

ٹھہرو مولانا! تمہیں وہاں بہت دن اکیلے نہیں رہنا پڑیگا۔ میں بھی آرہا ہوں۔ اور آج ہی باقر مہدی کو خط لکھتا ہوں کہ مولانا کے بعد آخر ہم اس ناہنجار اور منحوس دنیا میں رہ کر کیا کریں گے۔ آؤ ہم بھی چلیں' اپنا مولانا وہاں اکیلے گھبراتا ہوگا!!

ڈاکٹر حامدی کاشمیری
۲۹۲ جواہر نگر، سری نگر، کشمیر

خلیل الرحمن اعظمی کی غزل ـــــ ایک مطالعہ

تقسیمِ وطن سے پہلے اور اس کے بعد کے دس بارہ برسوں تک اردو شاعری (غزل اور نظم) اقبالیت، وطنیت اور ترقی پسندی کے حاوی رجحانات کے زیرِ اثر بلند آہنگی، مقصدیت اور توضیح پسندی کی شکار رہی۔ شعرا بالعموم تجربے کی ماہیئت سے زیادہ اس کی ترسیل کے مسئلے کی طرف متوجہ رہے۔ وہ اپنے وجود کی نجی حیثیت سے دامن کشاں ہو کر اجتماع یا عوام کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اپنی بات کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچانے کے چکر میں پڑ کر وہ تجربے کی اصلیت اور سالمیت کو برقرار نہ رکھ سکے، اس دور میں گنتی کے چند شعرا مثلاً راشد، میراجی یا مجید امجد کے یہاں مروجہ روایوں سے انحراف کر کے اپنے شخصی ردِ عمل سے وفاداری کرنے کا رجحان ان کی شعری حیثیت کی سچائی اور خود اعتمادی کو ظاہر کرتا ہے حالانکہ ان کے حصے میں وہ غیر معمولی توانائی نہ آئی جو پورے عہد کے شعری مزاج کو بدل دیتی۔ یہ کام ۱۹۵۰ء کے بعد ناصر کاظمی، ابن انشا، منیر نیازی، اور خلیل الرحمن اعظمی کے ہاتھوں غیر محسوس طریقے سے انجام پایا، ان شعرا نے اپنے عہد کے شعری میلانات سے برگشتگی اور عدمِ مطابقت کے نتیجے میں ایک خاموش مگر موثر ردِ عمل کو زبان عطا کی۔ یہ ردِ عمل میر کی آہستگی کے آہنگ کی احیا کی صورت میں سامنے آیا۔ یہ صرف میریت کی نہیں، بلکہ شاعری کی احیا تھی۔

موجودہ صدی کے شروع ہی سے نظم، غزل کو پیچھے دھکیل کر میدان پر قابض ہو چکی تھی۔ اقبال، جوش اور فیض نے اسے ترجیحی طور پر اپنے خیالات و تجربات کے اظہار کا وسیلہ بنایا، لیکن ان شعرا نے نظم کے شعری خواص مثلاً اس کی خود مرکزیت، لسانی ارتقار پذیری اور ہیئتی جدت طرازی کا خاطر خواہ استعمال کرنے کے بجائے آزاد اور حالی کی قائم کردہ نظمیہ روایت (جو توضیح اور بیانیہ سے شاعر، یعنی

پہچانی جاتی ہے) ہی کی توسیع کی۔ وہ معاصر مغربی شاعری کا مطالعہ کرنے کے باوجود مغربی نظم سے فائدہ نہ اٹھا سکے۔ جہاں تک غزل کا تعلق ہے، اس کے پوشیدہ امکانات کو دریافت کرنے کے بجائے موجودہ صدی کے وسط تک اسے متنبہ قرار دیا گیا یا اگر غزل لکھی بھی گئی تو اسے غزلیہ عناصر سے محروم کیا گیا۔ اقبال نے غزل کو نظمیاتی رنگ تو دے دیا۔ لیکن اسے ترقی پسند شعرا کی طرح برہنہ نگاری کے قریب کیا۔

اس پس منظر میں خلیل الرحمن اعظمی کا غزل سے اپنی طبعی مناسبت کا اظہار کرنا اور اسے اپنے تجربات کا وسیلۂ اظہار بنانا اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ وہ زمانے کے مروجہ تصورات سے الگ ہو کر اپنے تخلیقی وجود کے تقاضوں کو سمجھتے ہیں۔ یہ ایک انفرادی رویہ تھا جو ان کے یہاں چھپ رہا تھا اور وہ ایک نئے دور کے تخلیقی مزاج سے پوری مطابقت رکھتا تھا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۵۵ء تک شاعری ایک اجتماعی تحریک کا حصہ یا ترجمان بنی رہی، شعرا چند مسلمہ یا طے شدہ موضوعات کو ہنرمندی سے نظم کرتے رہے، وہ تخلیقی عمل کے اس کرب اور اسراریت سے لاتعلق ہوتے گئے۔ جو ہجوم کا نہیں بلکہ فرد کا مقسوم ہے۔ خلیل کا ہجوم سے انحراف کر کے شخصی سطح پر دھیمی، پرسوز، داخلی اور کربناک لے میں شعر کہنا ان کی تفرد پسندی کو ظاہر کرتا ہے۔

انھوں نے ۱۹۴۲ء میں شاعری شروع کی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ترقی پسند تحریک کا غلغلہ ابھی کم نہ ہوا تھا۔ وہ بھی اس سے متاثر ہوئے اور علی گڑھ میں اس کی شاخ قائم کر کے اس کے سکریٹری بن گئے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی نے انھیں دوسرے شعرا کی طرح نظریاتی ادب کا مبلغ تو بنایا۔ لیکن یہ ان کے اندر کے شاعر میں چلنے والی کشمکش کو رفع نہ کر سکی۔ ایک تخلیقی شخصیت مکمل ذہنی آزادی اور خود مختاری کی متقاضی

ہوتی ہے۔ لیکن نظریاتی وابستگی اسے پا بہ جولاں کرتی ہے۔ اس لئے شاعر کا نفسیاتی کشمکش میں گرفتار ہونا ناگزیر ہوتا ہے۔ خلیل بھی اس کشمکش کی زد میں آ گئے، لکھتے ہیں: "ایک عجیب طرح کی نارسائی اور ناتمامی کا احساس دامنگیر رہا"۔ اس کشمکش میں ان کا اعتماد اپنے ذرائع اظہار پر سے بھی اُٹھنے لگا۔ وہ "غزل سے بدگمان" تو ہو گئے۔ لیکن اس کے اچھے اشعار کے جادو سے منکر نہ ہو سکے۔ گوگو کی اس ذہنی حالت میں انھیں کلیاتِ میر ہاتھ لگی۔ لکھتے ہیں: "انھیں دِنوں کلیاتِ میر کے مطالعے کے دوران میں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میری داخلی دُنیا میں کچھ دریچے کھل گئے ہیں"۔ انھیں محسوس ہوا کہ میر کی شاعری اُن مطالبوں کو پورا کرتی ہے۔ جو تجربے کی مؤثر پیکر تراشی کے ضمن میں اُن کے ذہن میں کہرام بپا کر رہے تھے۔ وہ اس راز سے پہلے ہی واقف ہو چکے تھے کہ نظم یا شعر میں ایسے عناصر داخل ہو جاتے ہیں جن کا شاعر کی شعوری کوشش سے تعلق نہیں ہوتا۔ یہ عمل بہت ہی پُراسرار طور پر ہوتا ہے۔ خلیل کی شعر کے پُراسرار عمل سے آگہی اُن کے گہرے تنقیدی شعور کی مظہر ہے۔ اُردو شعراء کو عام طور پر یہ آگہی مشکل ہی سے ملتی ہے۔ خلیل نے میر کی شاعری کے اس وصف یعنی پراسراریت اور تہ داری کو پہچان لیا۔ وہ اُن کے دھیمے آہنگ اور داخلی خود کلامی سے متاثر ہوئے۔ نتیجتاً وہ ترقی پسندی سے کنارہ کش ہو گئے۔ وہ خلوت گزیں ہو کر شخصی لہجے کی دھیمی گنگناہٹوں پر کان دھرنے لگے۔ اور شخصی واردات کو متشکل کرنے لگے ؎

ہم پہ جو گذری ہے بس اسکو رقم کرتے ہیں
آپ بیتی کہو یا مرثیہ خوانی کہہ لو

یہ شعر اُن کے تجربات کی ماہیت کی تفہیم کے ضمن میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مختلف موضوعات مثلاً عشق، دنیا کی ناپذیری اور شکوۂ حالات: غیرہ سے کوئی شعوری رابطہ قائم نہیں کرتے۔ یعنی وہ ایسے شاعر نہیں جو پہلے سے سوچے سمجھے گئے موضوعات کو شعری قالب میں ڈھالتے ہیں۔ اس کے علی الرغم وہ اُن واردات کے شاعر ہیں جو اپنے عہد کی حشر سامانی اور زندگی کی صعوبتوں کا مقابلہ کرتے ہوئے اُن پر گذرتے ہیں اور اُن کے حساس وجود کو ہلا کر رکھ دیتے ہیں۔ اُن کی جذباتی شخصیت گہرے طور پر متاثر ہوتی ہے۔ لیکن وہ جذبات سے مغلوب نہیں ہوتے اس لئے کہ ان کی داخلی شخصیت یک سطحی نہیں بلکہ پیچ در پیچ ہے۔ وہ جذبے کے زور کے ساتھ فکر کی متانت بھی رکھنے والے شاعر ہیں۔

ہیں۔ اُن کے یہاں تعقلی محاکمہ اور خود ضبطی بھی کام کرتی ہے۔ جب زندگی کا کوئی واقعہ انکو جھنجھوڑتا ہے تو اُن کی پوری شخصیت یعنی اُنکا ذہن عقل، جذبہ اور وجدان متاثر ہوتا ہے۔ اور پھر تخلیق کے آتشیں عمل سے گذر کر وہ تجربے کی نئی صورت گری کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کی باز آفرینی بھی کرتے ہیں۔ اس عمل میں ظاہر ہے بے لگام جذبے کے لئے کوئی گنجائش نہیں رہتی۔ تخلیق کے اس جانکاہ اور تقلیب پذیر عمل کو وہ "لہو" کے استعارے میں سموتے ہیں ؎

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

یہ دو اشعار ملاحظہ ہوں ؎

لوگ کیا ڈھونڈ رہے ہیں مری پیشانی پر
رنگ آتا ہے یہاں اپنا لہو پینے میں

پھر کوئی لے گیا ہے، چراغوں کی روشنی
تا صبح آج اپنے جگر کو لہو کرو

زندگی کے تجربات کو اپنے لہو میں تحلیل کرنا، اپنے لہو پینے یا جگر کو لہو کر لینے کے مترادف ہے۔ خلیل ایک داخلی ضرورت کے تحت زندگی کے تجربات کو اپنے داخلی وجود کا ناگزیر حصّہ بنتے ہوئے، اور پھر ان کو لفظ و پیکر میں ڈھلتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اُن کے تجربے غیر معمولی نہیں بلکہ عامۃ الورود تجربے ہیں۔ غم، محرومی، دل شکستگی یا ناکامیٔ عشق ہرگز نئے تجربے نہیں لیکن خلیل ان کو "خواص پسند" بناتے ہیں۔ وہ ان کو حقیقت کی پست سطح سے بلند کر کے ایک مخصوص ارتفاع سے آشنا کرتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ شاعر کی ذات کے خواص سے متصف ہو جاتے ہیں۔ تیسری بات یہ ہے کہ اُن کے یہاں تکمیل یافتہ شعر محض غمِ جاناں یا غمِ دوراں کا قطعی بیان ہو کر نہیں رہ جاتا بلکہ اسراریت میں رچ بس کر تلازمۂ خیال کے لئے راہ ہموار کرتا ہے۔ ایسے لمحوں میں اُن کی غزل کی لسانی تشکیل علامتی رنگ کو نمایاں کرتی ہے۔ یہاں پر یہ کہنا ضروری ہے کہ تخلیق کا ایسا طلسمی اور بارآور عمل اُن کے یہاں ہر وقت نہیں رہتا، ایسے الہامی لمحے کبھی کبھار ہی آتے ہیں، نہیں تو عام طور پر وہ بھی شعر گوئی کے اس میکانیکی عمل کے پابند رہے ہیں جو کلام منظوم پر منتج ہوتا ہے

کاغذی پیرہن" اور "نیا عہد نامہ" ایسے کلام منظوم کی مثالیں ہیں۔ لیکن ایسے کلام کو نظر انداز کرکے ہم اُن اشعار سے واسطہ رکھیں گے۔ جو تخلیقیت کا جوہر رکھتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے اشعار دیکھیے:

عمر بھر معروف ہیں مرنے کی تیاری میں لوگ
ایک دن کے جشن کا ہوتا ہے کتنا اہتمام

شبِ گذشتہ بہت تیز چل رہی تھی ہوا
صدا تو دی پہ کہاں تک تجھے صدا دیتے

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں

مندرجہ بالا اشعار کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ حقیقی زندگی کے جانے پہچانے واقعات کی عکاسی کرنے کے بجائے خالصتاً تخلیقی سطح پر ایسی صورتِ حال کو خلق کرتے ہیں۔ جو غیر مانوس ان دیکھی اور پُر اسرار ہے۔ یہ صورتِ حال حقیقی زندگی سے لاتعلقی کے باوجود قاری کے ذہن کو گمراہ یا دھندلا نہیں کرتی بلکہ اُسے زندگی کی بصیرت عطا کرتی ہے۔ یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ شاعر نادیدہ واقعات کو خلق کرکے ذہنی عیاشی کا سامان نہیں کرتا۔ بلکہ روحانی کرب اور تجسس کی تصویر کاری کرتا ہے۔ پہلا شعر لیجیے، اس میں ایک ایسے تخیلی دُنیا کی تصویر سامنے آتی ہے جہاں لوگ ہر قسم کے کاروبارِ حیات سے منہ موڑ کر "صرف مرنے کی تیاری میں معروف ہیں" اندازہ کرنا چاہیے کہ وہ کیسی دُنیا ہوگی، جہاں کے لوگ رات دن صرف مرنے کی تیاریوں میں معروف ہوں ——— کتنی عجیب اور خوفناک دُنیا! دوسرے مصرعے میں شاعر معروضی طور پر طنزاً یا تمسخراً کہتا ہے کہ ایک دن کے جشن پر کتنا اہتمام ہوتا ہے۔ شاعر اس جشنِ مرگ میں شریک بھی ہے۔ اور اس سے الگ بھی۔ اور یہی اس کا المیہ ہے۔ یوں تو شعر کو خوب نچوڑنے پر زندگی کے فنا سامانی کا تصور برآمد ہوگا۔ لیکن زندگی کی فنا سامانی کی مصوری کرنے کے علاوہ یہ شعر چند در چند کیفیات پر محیط ہے۔ یہ شعورِ مرگ، غفلت کاری، عبرت اور لایعنیت کا استعارہ بھی ہے۔

شعر ۲ میں زندگی کی کٹھنائیوں کے سامنے جذبۂ عشق کی کمزوری اور کم مائیگی کے تجربے کو ایک تمام تر تخیلی فضا میں ایک ایسی ڈرامائی کیفیت کے ساتھ اُبھارا گیا ہے کہ یہ باور کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ کہ شاعر نے اسے شعوری طور پر سوچا ہوگا، شعر کو دوبارہ پڑھیے تو یہ محسوس کرنے میں دیر نہیں لگتی کہ شاعر نے وجدانی طور پر ایک تخیلی تجربے کی شناخت کی ہے، شعری کردار شبِ گذشتہ کے ڈرامائی واقعے کو حزن و ملال کے ساتھ یاد کر رہا ہے۔ اس رات ہوا بہت تیز چل رہی تھی، اُس نے اُس تیز ہوا میں محبوب (ہمدم یا آشنا) کو مدد کے لیے بہت پکارا گیا لیکن بے سود، اور پھر کیا ہوا، یہ سب کچھ ان کہا چھوڑ دیا گیا ہے۔

شعر ۳ میں دھوپ علامتی معنویت اختیار کرتی ہے۔ شعری کردار دیر سے دھوپ میں کھڑا جل رہا ہے۔ اور سایہ سایہ پکارتا ہے۔ لیکن سایہ تو کجا، اس کی آواز بھی صدا بصحرا ہو کر رہ جاتی ہے۔ دھوپ شعور کی دہشت ناکی یا خارجی حقیقت کی سنگینی کی علامت ہے۔ اور سایہ (جو عنقا ہے) قدروں کے احساس یا تحفظ ذات کا علامیہ ہے۔

محولہ بالا اشعار سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ خلیل اپنے "دَورِ آتش و آہن" کا سامنا کر رہے ہیں، وہ جانتے ہیں کہ مشینی تہذیب نے انسان کی زندگی کو جہنم بنا دیا ہے ؎

خود اپنے اپنے جہنم میں جل رہے ہیں سبھی
عجیب دَور ہے یہ دَورِ آتش و آہن

یہ شعر اُن کے عصری شعور کی گہرائی کو ظاہر کرتا ہے۔ شعور کی اس شدت تک پہنچتے پہنچتے اُنہوں نے طویل سفر اختیار کیا ہے۔ وہ رومانی آرزو مندی کے مقام سے بھی گذرے ہیں، اور خارجی حالات سے اولیں تصادمات کے نتیجے میں "خیالی شہرِ طرب" میں مراجعت کرکے گمشدہ خوابوں کی تلاش بھی کرتے رہے ہیں ؎

آج ڈوبا ہوا خوشبو میں ہے پیراہنِ جاں
اے صبا کس نے یہ پوچھا ہے مرا نام و نشاں

پھر مرے شہرِ طرب پر نہ کوئی آنچ آئے
آج کیوں خیمۂ افلاک سے اُٹھتا ہے دھواں

شاعر بھی

جن کو آنکھوں سے لگایا تو ہمیں چھوڑ گئے
اُنھیں چہروں انہیں خوابوں کا پتا دو ہم کو

لیکن وہ شہرِ طرب کا تحفظ نہ کر سکے۔ جس دور میں وہ زندہ تھے، وہ خوابوں کی تشکیل کا نہیں، بلکہ شکست کا دور ہے، اُنہوں نے اس حقیقت کو اچھی طرح پہچان لیا۔ اس لئے وہ کیٹس یا اختر شیرانی کی طرح قنوطی نہیں ہوئے بلکہ اُنہوں نے ذہن کے دریچے کھلے چھوڑ کر نئی حقیقتوں کا سامنا کیا، اور خوابوں کے قافلوں کے بچھڑنے کی حقیقت کو تسلیم کیا ؎

کس موڑ پہ بچھڑ گئے خوابوں کے قافلے
وہ منزلِ طرب کا فسوں کون لے گیا

اُن کی غزلوں میں آشوبِ آگہی کی موثر پیکر تراشی کے کئی نمونے ملتے ہیں ؎

جب موسمِ گل آئے لے نکہت آوارہ
آ کر درِ زنداں کی زنجیر ہلا جانا

در پہ لے رہا ہو جن کے انبوہ کم سوادان
وہ خوب جانتے ہیں آشوبِ آگہی کو

بارہا سوچا کہ اے کاش نہ آنکھیں ہوتیں
بارہا سامنے آنکھوں کے وہ منظر آیا

موجودہ دور میں غزل کی بحالی کے سلسلے میں خلیل نے اہم کام انجام دیا ہے۔ اُنہوں نے اسے اس داخلی لہجے سے آشنا کیا جو اس کا وصفِ ذاتی رہا ہے۔ اور یہ اس کے لئے مسیحائی کا کام کر گیا۔ اُن کے بعد شہریار، ظفر اقبال، فاروقی اور دوسرے نئے شعرا نے اس کی داخلیت کو استحکام بخشا۔ مزید برآں خلیل نے نفسیاتی الجھنوں کی تصویر کاری کر کے غزل کے مخفی امکانات کو بروئے کار لایا۔ یہ دونوں کارگزاریاں یعنی داخلیت پسندی اور نفسیاتی تہہ داری جو خلیل نے انجام دیں، نئی شاعری کا شناخت نامہ بن گئیں۔ چند شعر ملاحظہ کیجئے۔ ان میں محرومی، تنگ مزاجی، احساسِ کم مائیگی، بے چینی، خوف اور شوریدگی داخلی لہجے میں نمود کرتی ہے۔ یہ نفسیاتی کیفیات اُن کے داخلی بحران کی پیدا کردہ ہیں۔ "نیا عہد نامہ" کی شاعری اور شاعر بھی

اس کے بیش لفظ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ایک اندرونی بحران کو گذر سے ہیں۔ انہیں بار بار محسوس ہوا ہے کہ انہیں اپنے آپ پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ وہ تصورات جو اُن کے لئے رہنمایانہ حیثیت رکھتے تھے۔ یا ان کے لئے سرمایۂ حیات تھے، بے معنی ہو گئے ہیں ؎

تری دیوار کا سایہ نہ خفا ہو مجھ سے
راہ چلتے یونہی کچھ دیر کو آ بیٹھا تھا

وہ نگہ کہتی ہے بیٹھے رہو محفل میں ابھی
دل کی آشفتگی اُٹھنے کی اجازت مانگے

اس در پہ بھی لگتا نہیں جی دیکھئے کیا ہو
ہے ایک عجب دل کی لگی دیکھئے کیا ہو

آ آ کے گذر جاتی ہے ہر موجۂ پُر خوں
ہے یاں وہی شوریدہ سری دیکھئے کیا ہو

یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ نفسیاتی سطح پر مختلف کشمکشوں سے گذرنے کے باوجود خلیل کے ذہن کی صحت قائم رہتی ہے۔ ایک طرف وہ فکری طور پر لامحدود خلاء میں انسان کی کم مائیگی اور بے بضاعتی کے احساس سے دوچار ہیں۔ یہ احساس اُنہیں ذات کی گم شدگی کے کرب میں مبتلا کرتا ہے۔ وہ شدت سے چاہتے ہیں کہ کائنات کے لایعنی تماشے میں اُنھیں اپنے "ہونے کی خبر" ملے کہتے ہیں ؎

یہ تمنا نہیں اب دادِ ہنر دے کوئی
آ کے مجھ کو مرے ہونے کی خبر دے کوئی

اس جہاں میں میرے ہونے کی گواہی کون دے
اک ہجوم اور اس میں چشمِ معتبر کوئی نہیں

دوسری طرف وہ جبلّی سطح پر جوانی، حُسن، عشق اور لذتیت سے متمتع ہونے کے خواہش مند ہیں۔ وہ زندگی کی لایعنیت کو تسلیم کرتے ہوئے بھی "جینے کی ہوس" سے باز نہیں آتے ؎

زہرِ غم پی کے بڑھی اور بھی جینے کی ہوس

زندگی بھر نہیں موت پہ لائے ایماں

سنگ رہو بازوؤں سے میرے کہ یہ گھڑی بھر بھی ہے غنیمت
ہوا کے جھونکے یہ کہہ رہے ہیں کہ رات آدھی گذر چکی ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر حال میں تخلیق شعر میں اپنی ذہنی آزادی کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں۔ اور کسی فکری نظریے کی غلامی کو قبول نہیں کرتے۔ نئے شعرا پر عام طور سے یہ الزام عائد کیا جاتا ہے کہ وہ وجودی اثرات کے تحت زندگی سے فریب شکستہ ہو کر مایوسی اور کلبیت میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ اور شاعری میں یک رنگی آ گئی ہے۔ یہ الزام اس لئے بے معنی ہے کہ شاعری موضوع نہیں بلکہ تجربے کا اظہار ہے۔ اور ہر دور میں بعض تجربے بنیادی اہمیت اختیار کر جاتے ہیں۔ جہاں تک خلیل کا تعلق ہے انہوں نے اس الزام کا پورا ابطال کیا ہے۔ وہ مایوسی کا اظہار کرنے کے ساتھ ساتھ زندگی کی لذتوں سے بھی فیض یاب ہونے میں تامل نہیں کرتے۔

خلیل خاموش طبیعت کے مالک ہیں۔ انہوں نے اپنے پیشروؤں مثلاً عظمت اللہ خان، اقبال یا میراجی کی طرح زبان و بیان اور ہیئت میں کوئی انقلاب پیدا نہیں کیا۔ ان کی شعری براںگیختگی بالکل فطری اور جبلی ہے۔ لیکن یہ اس ذہنی تہذیب سے عاری نہیں، جو کلاسیکی شعرا کے مطالعے کی دین ہے۔ اس مطالعے نے ان کی نگاہ کو دھندلایا نہیں، بلکہ تیز کیا ہے۔ اس کا ایک اور فائدہ یہ ہے کہ شعری روایت کے ادراک و تفہیم نے انھیں خود اعتمادی بخشی ہے۔ وہ اس افراط و تفریط سے بھی بچے رہے۔ جو تجربہ پسندی کے جوش میں ان کے کئی معاصرین کو خراب کر چکی ہے۔ ان کے قدم مضبوطی سے زمین پر جمے رہے۔ وہ غزل کے ہیئتی رچاؤ کی طرف متوجہ رہے۔ ان کے یہاں قدیم شعرا مثلاً غالب سے استفادے کا عمل خاصا نمایاں ہے ؎

(۱) آج ہم اپنی پریشانیٔ خاطر ان سے (غالب)
ہم چھپاتے ہیں پریشانیٔ خاطر ان سے (خلیل)

(۲) بندہ عاجز ہے گردشِ ایام (غالب)
ذرا سی دیر ٹھہرتی جو گردشِ ایام (خلیل)

(۳) برسوں ہوئے ہیں چاک گریباں کئے ہوئے (غالب)
گر ہو سکے تو چاک گریباں رفو کرو (خلیل)

شاعر بھی

(۴) یہ قاتل وعدۂ صبر آزما کیوں (غالب)
کیوں ہو کسی سے وعدۂ صبر آزما کی شرط (خلیل)

(۵) رنگِ شکستہ صبحِ بہار نظارہ ہے (غالب)
دیکھ صناع مرے رنگِ شکستہ پہ نہ جا (خلیل)

(۶) فرصتِ کاروبارِ شوق کسے (غالب)
یہ کاروبارِ شوق مکرر نہ ہو سکا (خلیل)

(۷) سب سے کسے ہے طاقتِ آشوبِ آگہی (غالب)
وہ خوب جانتے ہیں آشوبِ آگہی کو (خلیل)

خلیل کے یہاں میر، اقبال، فانی اور فیض کے کلام سے بھی خوشہ چینی کی مثالیں ملتی ہیں، غور سے دیکھا جائے تو یہ عمل ان کے تخلیقی ذہن کے بے محابا اظہار کے راستے میں بعض نامعلوم مزاحم قوتوں کو بھی ظاہر کرتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے سالم وجود کا اظہار نہیں کر پاتے، یا کسی آخری ذریعہ اظہار تک پہنچ نہیں پاتے۔ یہ وہ کوتاہی ہے جو ان کے وجود کو مکمل طور پر حرکی نہیں بننے دیتی۔ ان کے اندر کی تخلیق کے پرجوش چشمے پوری قوت سے پھوٹنے کے بجائے جستہ جستہ شعاعوں کی صورت میں خارج ہوتے ہیں۔ اور تاریک لمحوں کو منور کرتے ہیں۔ یہ لمحاتی روشنی نگاہ کو سیراب نہیں کرتی بلکہ تشنگی بڑھاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیل نازک شعری حسیت، تاثر پذیری اور کربِ آگہی کے باوجود بڑے شاعر نہ ہو سکے۔ وہ ان پابندیوں اور حد بندیوں کو بھی توڑ نہ سکے۔ جو غزل کی روایتی صنف شاعر پر عائد کرتی ہے۔ حالانکہ پابند سے پابند صنف بھی اس کی تخلیقی قوت سے پگھل سکتی ہے۔ سی۔ ایم۔ باورا نے صحیح لکھا ہے کہ "الہام شاعر کو وہ قوت عطا کرتا ہے کہ وہ ان پابندیوں کو اپنی املاک میں تبدیل کرتا ہے" جیسا کہ حالیہ برسوں میں شمس الرحمن فاروقی نے رباعی جیسی کلاسیکی اور تنگ دامن صنف کے ساتھ کیا ہے۔

اس بحث سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ خلیل روایتی شاعر ہیں، وہ روایت سے قلبی وابستگی کے باوجود اس کی گراں باری کو ناپسند کرتے ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ وہ روایتی الفاظ کے سحر سے آزاد نہ ہو سکے۔ تاہم ان کے یہاں نئے شعور کو گرفت میں لینے کے لئے روایتی زبان سے متصادم ہو کر ایک نئی شعری لسانیات کی تشکیل کی جدوجہد نمایاں ہے۔ انہوں نے بعض موقعوں پر لفظ سازی بھی کی ہے: کڑای

(باقی صفحہ ۱۰۱ پر دیکھیے)

ڈاکٹر مفضل امام رضوی
اُستاد شعبۂ اردو، راجستھان یونیورسٹی، جے پور

خلیلِ علم و ادب

ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی سے میں صرف اس لیے نہیں متاثر تھا کہ وہ میرے ہم وطن تھے بلکہ اکثر بیشتر میں نے اُن سے علم و زبان و ادب کے بعض اہم نکتے بھی سمجھے ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے اُن سے باقاعدہ طور پر شاگرد کی حیثیت سے کسب علم نہیں کیا۔ لیکن جب بھی اُنھیں کسی اہم نکتے کی طرف رجوع کیا بغیر کسی تردد اور تاخیر کے فوراً متوجہ ہوئے۔ ایک دفعہ میں نے جواب کے لئے لفافہ بھی رکھ دیا تھا۔ میری اس حرکت پر ناراض ہوئے اور میرا پتہ لکھا ہوا لفافہ واپس کر دیا۔ اور تاکید کی، اب آئندہ ایسا نہ کرنا۔ بعض دفعہ ایسا بھی ہوا جب مرحوم نے کچھ علمی و ادبی استفسار کے سلسلے میں اظہار عجز بھی کیا۔ اور کسی دوسرے کا نام تجویز کیا یا کسی تصنیف و تالیف کے مطالعے کے لئے کہا۔ یہ طریق کار اور عمل اُن کی گہری علم دوستی کا مظہر ہے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ جب میں پی ایچ۔ ڈی کے لئے تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا اُن سے بھی ملا تھا۔ طویل گفتگو کے بعد فرمایا تھا کہ میری نگرانی میں اسی موضوع (امیر اللہ تسلیم — حیات اور شاعری) پر ایک صاحب عرصہ دراز سے کام کر رہے ہیں۔ لیکن ابھی تک کام مکمل نہیں ہوا ہے۔ اب تم ہی اسے مکمل کر دو تو بڑا اچھا کام ہوگا۔ ان کے چہرے بشرے سے کبھی اس کا اندازہ نہیں ہوا کہ اُنھیں ناگوار گذرا ہو، بلکہ خوش ہوئے اور کچھ حوالے بھی بتائے تھے۔

دورانِ گفتگو وہ بہت خندہ پیشانی سے پیش آتے اور اپنی بات کی تردید کے وقت قطعی دل برداشتہ نہیں ہوتے بلکہ بڑے صبر و ضبط و تحمل سے تردید کرنے والے کے نظریے کو سنتے اور پھر جواب دیتے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا جب وہ یہ بھی کہہ دیتے کہ اس وقت مسئلہ حل نہیں ہو پا رہا ہے، پھر کسی دوسری نشست کے لئے شاعر بھی

اُظہار کیے اور جب دوسری نشست میں زیر بحث موضوع پر اظہار خیال کرتے تو استدلالی انداز بیان اور تبحر علمی سے کام لیتے اور سنجیدگی و متانت کو نہیں چھوڑتے تھے۔ اب جب کہ وہ اس دُنیا سے کوچ کر گئے ہیں، ان کی علمی و ادبی گفتگو، اور اندازِ گفتگو اور بھی یاد آتا ہے۔ دراصل یہ ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کی وفات نہیں بلکہ اس محیطِ علم و ادب میں ایک زبردست "خلیلِ علم و ادب" کا انتقال ہے جس کی تلافی ممکن نہیں ہے۔ وہ اُن شاعروں، ادیبوں، نقادوں اور اُستادوں میں نہیں تھے۔ جو صرف محدود دبستی اور نصابی شعر و ادب کے احاطے میں جیتے ہیں۔ انکی نگہ بلند میں ادب کا منظر، پس منظر اور پیش منظر بھی تھا۔ وہ رفتارِ تہذیب و تمدن کا بھی سائنٹفک تجزیہ کرتے تھے۔ اور لسانیات کے مشکل اور پیچیدہ مسائل بھی ان کی نگہِ عمیق میں رہتے تھے۔

فکر و نظر کی گہرائیاں ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی کی تحریر و تقریر کی امتیازی شان ہیں۔ جب بی۔ اے کے طالب تھے۔ اسوقت انہوں نے خواجہ حیدر علی آتش کے کلام پر جو بصیرت افروز تبصرہ کیا، جسے "نگار" جیسے اہم جریدے نے بالاقساط شائع کیا۔ اور بعد کو انجمن ترقی اُردو ہند نے کتابی صورت میں شائع کیا۔ درحقیقت خلیل صاحب کے معیارِ علم و ادب کا پہلا اعلیٰ اور گراں بہا نمونہ ہے۔ اس کے علاوہ "فکر و فن" کے نام سے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی اُنہوں نے اُردو ادب کو بخشا ہے جسکے بعض مضامین مثلاً داغ دہلوی، اور خواجہ میر درد وغیرہ مستقل تصانیف پر بھی بھاری ہیں۔ "زاویۂ نگاہ" سے "مضامین نو" تک کا سفر خلیل صاحب کی علمی زندگی اور ادبی ماحول کے نشیب و فراز کا ترجمان ہے۔ لیکن "زاویۂ نگاہ" میں ان کے بعض ادبی زاویے

اختلاف کے باوصف گہرے سلیقے اور شعور کی نمائندگی کرتے ہیں۔ اور شدّت جذبات میں بھی توازن اور اعتدال کی راہ دکھاتے ہیں۔

خلیل صاحب کا مستقل کارنامہ (نثری) "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" کی شکل میں منظر عام پر آیا۔ لیکن جو تعمق، عرق ریزی اور دل سوزی ان کے مضامین میں ملتی ہے، اس مستقل تصنیف میں نہیں۔ میرا خیال ہے کہ خلیل صاحب کی علمی و ادبی وسعتیں اور بصیرتیں کسی ایک موضوع کی پابندی قبول نہیں کر سکتی تھیں۔ اس لئے مختلف مضامین میں وہ فکری اور نظری تجزیئے کو بڑی منطقی استدلال سے پیش کرنے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

خلیل صاحب اعظم گڑھ سے آئے اور علی گڑھ کے ایسا ہو رہے کہ وہیں کی خاک میں مل گئے لیکن پرانے وطن ہمیشہ اُن کے دل و دماغ کو معطر کرتی رہی جس میں تلخیٔ حیات نے اور بھی اضافہ کیا۔ انھیں کی نظم کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو ؎

وہ گھڑی کون تھی جب مجھکو بلا لائی تھی یاس
ایک جھونکا بھی ہوا کا نہ چمن سے آیا
نے کوئی نکہتِ گل اور نہ کوئی موجِ نسیم
پھر کوئی ڈھونڈنے مجھکو نہ چمن سے آیا
میں وہ اک لعل ہوں جو بک گیا بازاروں میں
پھر کوئی پوچھنے مجھ کو نہ یمن سے آیا

سرزمین اعظم گڑھ کا یہ لعلِ گراں، دانش کدۂ شبلی دار المصنفین کا عالم، نقاد، شاعر اور ادیب اب کہاں ملے گا۔؟ OO

بقیہ صفحہ ۹۹ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزل - ایک مطالعہ

دھوپ، مانوس سلونے چہرے، رت جگے، لہولہان، گم گشتہ تمنا، کمسن پودے، پلکوں کے سائبان، آنچل کی ہوا، انبوہ کم سواداں اور خالی مکان وغیرہ سے ان کے طبع کی زرخیزی کا پتہ چلتا ہے۔

اُن کے عہد میں اقبال کے بعد راشد اور میراجی نے نئی زبان کو خلق کرنے میں پہل کی تھی۔ خلیل کے سامنے پورا میدان کھلا تھا، لیکن وہ طبعاً مہم پسند نہ تھے۔ وہ اس طوفانی لہر کے مانند تھے، جو تمام رکاوٹوں کو توڑ کر ہر چیز کو اپنے ساتھ بہا کے لے جاتی ہے۔ شاعر بھی اس عافیت کوشانہ رویے سے اُنہوں نے غالباً اپنا تحفظ تو کر لیا لیکن اُن کے اندر کی شعری قوتیں تکمیلیت کے ساتھ سامنے نہ آسکیں۔ اور پھر بدقسمتی سے بے رحم موت نے انھیں وقت سے پہلے ہی خاموش کر دیا۔ OO

بقیہ صفحہ ۸۷ راستے کانٹوں بھرے

مگر نئے لکھنے والوں کو تنقید نگاروں نے ترقی پسند ادیبوں کے خلاف بطور ڈنڈے کے استعمال کرنا شروع کر دیا۔ مگر فولادی کھوپڑیاں تب بھی نہ ٹوٹیں۔

آج یہ حال ہے کہ ہر ادیب کے پیچھے ایک تنقید نگار ٹنگا ہوا ہے۔ رسالوں میں ادب کم اور تنقیدیں زیادہ ہونے لگیں ہیں۔ بغیر مقدموں کے کوئی کتاب دم نہیں مار سکتی۔ جسے دیکھئے تنقید نگار بنیٹھا تُلا ہوا ہے۔ یہ اللہ ماری تنقیدیں نہ ہوئی جان کا جنجال ہو گئیں۔ دم ٹوٹتا ہے انہیں پڑھتے ہوئے۔ یہ تنقیدیں کچھ اندھے کی لاٹھی کی قسم کی ہوتی ہیں۔

تو خلیل الرحمٰن ایک ترقی پسند ادیب ہوتے ہوئے بھی خلیج کے اس پار پہونچا دیئے گئے۔ مگر یہ دوریاں پانی کے بلبلوں سے زیادہ وقعت نہیں رکھتیں۔ ادیب خواہ وہ کسی زمانے کے ہوں، مختلف خیالات کے ہوں۔ حتیٰ کہ دشمنی تک نوبت پہونچی ہوئی ہو، وہ ایکدوسرے کے وجود کو نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مجھ سے فرمائش کی گئی ہے کہ خلیل الرحمٰن پر کچھ لکھوں۔ میں اُن سے کتنی دُور رہی۔ تو پھر کیا لکھ رہی ہوں اور کیوں لکھ رہی ہوں اس کا جواب بھی میرے پاس نہیں۔ خیالات الجھ رہے ہیں قلم بہک رہا ہے۔ دل میں دھواں سا اُٹھ رہا ہے کسی پر غصہ آ رہا ہے۔ کیوں اور کس پر یہ بھی کچھ واضح نہیں۔ شاید خلیل الرحمٰن کی موت پر ہی نہیں۔ اُن تمام ادیبوں اور شاعروں کی ذہنی کوفت، بے قدری کا جو شکار وہ شکار ہیں۔ تمام ادیبوں اور خاص کر اُردو کا خیال دماغ کو جھلسا رہا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کا سرطان ہی ہے جس کا کوئی علاج نہیں مل رہا ہے۔ ایک جنگل ہے کانٹوں بھرا، پیر ننگے اور زخمی ہیں ـــــ ہے کوئی مرہم ان زخموں کے لئے؟ OO

ذکاء الدین شایاں
نزد سیٹی پوسٹ آفس بکریا۔ پیلی بھیت (یوپی)

شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

۱۹۵۱ء میں جب انٹرمیڈیٹ کا طالب علم تھا تو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کی لٹن لائبریری اور اس سے ملحق شعبۂ اردو کے ارد گرد عام سینئر طلبا کی وضع قطع اور اشغال سے بہت کچھ مختلف پہلی مرتبہ ایک ایسے شخص کو دیکھا ہی نہیں بلکہ محسوس کیا جو سادہ شیروانی اور پاجامے میں ملبوس ہمیشہ چند کتابیں لئے اپنے خیالوں میں غرق اور میانہ قد کی سنجیدہ روی کے ساتھ خراماں نظر آتا تھا۔ لوگوں سے معلوم ہوا کہ آپ ایم اے اردو کے طالب علم خلیل الرحمٰن اعظمی ہیں۔

یہ وہ عہد تھا جب علی گڑھ اپنی مخصوص تہذیبی اور تعلیمی سرگرمیوں کی آخری ڈوبتی ہوئی کرنوں کو سنبھالے ہوئے تھا۔ اور علی گڑھ کا ہر طالب علم اس روشنی کا امین تھا۔ ترقی پسند تحریک اپنے شباب کی منزلیں طے کر رہی تھی۔ مجاز، جوش، جگر اور فراق وغیرہ کا طوطی بول رہا تھا۔ ادب و شعر کی دنیا اور مشاعروں کے ماحول میں ان شعرا کی آوازیں علی گڑھ کے طلبا کو نئے ادبی حوصلے عطا کر رہی تھیں۔ میں نے علی گڑھ کے اسی ماحول میں پہلی بار ساحر لدھیانوی، فیض، مجاز، جذبی، اختر الایمان، جوش، جگر، فانی اور فراق کی شعری تخلیقات کا مطالعہ کیا۔ ان شاعروں کے حلقے میں فراق کی گرفت مجھ پر اتنی سخت رہی کہ میں قطعی طور پر کلام فراق کا شیدائی بن گیا۔ "شعلۂ ساز" کی شاعری نے میری روح کو ہر طرف سے جکڑ لیا۔ اور اس کے اشعار کی جمالیاتی فضا نے جیسے مجھ پر جادو کر دیا۔ میں اس احساس اور تاثر کے سیلاب سے اپنی ٹوٹی پھوٹی زبان میں کچھ الٹے سیدھے شعر بھی کہنے لگا۔ اس دور میں فراق کی شاعری کے ساتھ مجھے دوسری جس آواز نے چونکایا وہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا کلام تھا۔

ترقی ... تحریک کے کیا تقاضے اور مطالبات تھے۔ اور خارجی شاعری یا مقصدی حیثیت سے اس کا کیا منصوبہ تھا؟ میں اس سے قطعی ناواقف تھا۔ البتہ ان شعرا کی نگارشات میں داخلی اور جمالیاتی نقطۂ نظر سے جو حسن کا پرتو تھا۔ میری روح ہر لمحہ اس سے جگمگاتی تھی۔ جذبی کی "موت" مجاز کی "آوارہ" ساحر کی "مادام" فیض کے کلام جگر و فراق کی غزلوں اور اسی قبیل کی تمام شاعری کی فضا جیسے میرے جذبات کے دامن کو پکڑ لیتی تھی ؎

کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست

دوسرے رسائل کے ساتھ دہلی سے شائع ہونے والا ماہنامہ "شاہراہ" ترقی پسند تحریک کا ایک اہم وسیلہ تھا۔ انھیں جرائد کے اوراق پر میں نے خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کو پڑھا۔ اور ایسا محسوس ہوا جیسے فراق کے بعد انہی کی آواز میرے دل کو چھونے میں کامیاب ہوئی ہے۔ یہ تاثرات بڑے دل نشیں تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ میں فراق کے دوش بدوش خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کا بھی مشتاق ہو گیا۔ ادبی پرچوں میں جہاں بھی انکا کلام نظر آتا بڑے شوق سے پڑھتا اور ان کے اشعار کو یاد رکھنے کی کوشش کرتا۔ اس زمانے میں غالباً "شاہراہ" کے شمارے میں خلیل صاحب کی کوئی تازہ نظم شائع ہوئی تھی۔ عنوان یاد نہیں رہا۔ پوری نظم میں عجیب داخلی تاثر اور حسن تھا جس کی گرمی ابھی تک دل میں پوشیدہ ہے۔ نظم کا صرف ایک مصرعہ ذہن میں رہ گیا ہے:

"اب نہ بجلی ہوئی ہے جس سے دھواں اٹھے گا"

میں ۱۹۵۵ء کے وسط تک علیگڑھ رہا لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی سے دو بدو کبھی ملاقات نصیب نہ ہوئی اس میں کچھ میری کم آمیز طبیعت کو بھی دخل تھا۔ حسن مثنیٰ انور انٹرمیڈیٹ کے دو سال تک میرے

ہم جماعت اور قریبی دوست رہے۔ اور مثنیٰ صاحب خلیل صاحب کے حلقۂ دوستاں میں برابر کے شریک بھی تھے شام کو کیفے "الف لیلیٰ" میں یارانِ طریقت کی نشست ہوا کرتی تھی۔ خلیل صاحب جو اس وقت تک غیر شادی شدہ تھے۔ اپنی لاأبالی زندگی کی تمام رنگینیوں اور مصروفیتوں کے ساتھ دوستوں کی محفل کی زینت بنتے تھے۔ ان کی شاعری کا عام رجحان نظم گوئی کی طرف تھا۔ اور اُن کا پہلا شعری مجموعہ "کاغذی پیرہن" منظرِ عام پر نہیں آیا تھا۔

اعظمی صاحب سے پہلی بار میں ۱۹۵۹ء میں ملا جب میرے ہم وطن قریبی دوست جناب شمیم الدین احمد (مقیم قصبہ جہان آباد، پیلی بھیت) کی بہن سے ان کی شادی ہو گئی۔ اور اس تعلق سے ہر سال وہ کچھ دنوں کیلئے پیلی بھیت آتے رہے۔ اور اُن سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

خلیل صاحب کی زندگی کا انداز نہایت سیدھا سادہ اور ہر قسم کے تصنع سے پاک تھا۔ وہ اپنی گفتگو میں بہت محتاط اور متوازن رہتے تھے۔ اور کسی ایسی بات کا اظہار یا اشارہ مطلق نہیں کرتے تھے جس سے اُن کی بڑائی کا برائے نام پہلو بھی نکلتا ہو۔ اس کے برخلاف وہ مخاطب کی ہر خوبی کا کھلے دل سے اعتراف کرتے۔ اور ہر حیثیت سے اس کا دل بڑھاتے وہ ادب و شعر سے متعلق تمام معلومات اپنے ذہن میں محفوظ رکھتے۔ پہلی مرتبہ کی گفتگو ہی میں وہ میری اُن تخلیقات کا حوالہ دینے لگے جو ماہنامہ "نیا دور" لکھنؤ اور ہفتہ وار "دولت" علی گڑھ وغیرہ میں شائع ہو چکی تھیں۔ مثنیٰ صاحب کا جب ذکر آیا تو وہ مزید میرے قریب آ گئے اور جیسے تعجب کرنے لگے کہ میں علی گڑھ کے زمانے میں اُن سے دور کیوں رہا میری غزلیں بڑے شوق سے سنتے اور اپنا کلام کم سے کم سُناتے۔ لیکن کبھی کبھی ان پر ایک خاص کیفیت طاری ہو جایا کرتی تھی۔ اور جب وہ اپنے مخاطب کے ذوق اور معیار کو پہچان لیتے تھے تو خوب خوب سناتے تھے۔ ان کے پڑھنے کا ڈھنگ بالکل منفرد تھا۔ لہجے کے اتار چڑھاؤ میں تخلیق کی پوری کیفیت جھلکتی تھی۔ شعر پڑھتے وقت اُن کے چہرے کے تاثر میں انکی داخلی زندگی کا کرب سمٹ کر آ جاتا تھا۔ فراق گورکھپوری کی شاعری کے زبردست معترف تھے۔ زندگی کی تمام لطافتوں اور ناکامیوں سے بھرپور میر کا مغموم لہجہ آہستہ آہستہ اُن کی شاعری میں گھر کرنے لگا تھا۔ اور اب وہ نظموں کے مقابل غزل گوئی کی طرف زیادہ متوجہ نظر آتے تھے۔ میری شاعری کے تانے بانے میں وہ فراق کا عکس محسوس کر چکے تھے۔ اور جب کبھی ملتے تھا عزیز بھی

بہ انداز محبت اور شفقت کے ساتھ پوچھتے اور کرید کرید کر زبردستی پوچھتے ــــ "کہئے کون کون سی نئی غزلیں کہی ہیں۔ کیا کیا زمینیں نکالی ہیں؟"

میں نے اسی زمانے میں ان کے شعری مجموعے "کاغذی پیرہن" کا مطالعہ کیا تو احساس ہوا کہ وہ اپنے معصر ترقی پسند شعراء میں بالکل الگ اور نمایاں ہیں۔ ان کی شاعری خطابت، پروپیگنڈہ اور خارجی نظریات کی بے روح زمین پر ٹھہرنے کیلئے پیدا ہی نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران جو تازہ غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوتی تھیں، انھیں وہ خود سُنایا کرتے تھے۔

مثلاً ؎ ابھی جی بھر کے پی لو پھر نہ یہ موسم بدل جائے
نہ جانے یہ پری پھر کون سے شیشے میں ڈھل جائے

پینا نہیں حرام ہے زہرِ وفا کی شرط
آؤ اُٹھا دیں جامِ مئے جانفزا کی شرط

کبھی آیا کبھی تو ذکرِ مئے گلفام آیا
کفر آیا ترے رندوں کو نہ اسلام آیا

سی لئے ہونٹ کہ اندیشۂ رسوائی تھا
پھر بھی ہر سانس میں چھپ چھپ کے ترا نام آیا

ہم تو برباد تھے، بربادی ہوا تھا ہمیں
کیوں تری چشمِ عنایت پہ یہ الزام آیا

ادبی مسائل کے بارے میں گفتگو کرتے وقت میں نے محسوس کیا کہ انہیں اپنے کلاسیکی شعر و ادب کے سرمایہ سے گہرا لگاؤ ہے۔ وہ داغ اور حسرت موہانی جیسے شعرا کے بھی مداح تھے اور اُن کے کلام کی فنی خوبیوں پر اعتماد رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ فارسی ادبیات سے کافی شغف تھا۔ اور انھیں سب عناصر نے مجموعی طور پر انہیں بلند پایا نقاد بنا دیا تھا۔ "فکر و فن" اُن کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ تھا جس کے مطالعہ کے بعد مجھے خلیل صاحب کی تنقیدی بصیرت اور بلندی کا اندازہ ہوا۔ وہ ایسے ناقدِ ادب تھے جو مکتبی اور نظریاتی تنقید سے سخت نفرت کرتے تھے۔ سرسید اور حالی اسکول کی سادہ نثر کے وہ پیرو تھے۔ اور علمی و تنقیدی مضامین میں بے جا عبارت آرائی اور شاعری کے بوجھل پن

کو اچھا نہیں سمجھتے تھے ۔۔۔۔ وہ جب علی گڑھ میں ہوتے اور میں پیلی بھیت ہوتا تو اکثر خط و کتابت کے ذریعے ادب کے سلسلے میں بہت سی باتیں مجھے لکھ دیتے ۔ بار بار تاکید کرتے کہ میں اپنی غزلیں ہند و پاک کے ادبی رسائل کو برائے اشاعت روانہ کردوں ۔ اس طرح اعظمی صاحب نے مجھے ادب کی دنیا سے روشناس کرایا ۔ ایک مرتبہ غزل کی ہمہ گیری اور نزاکت کے بارے میں یہ نکتہ مجھ پر واضح کیا ۔ "غزل ایک ایسی صنفِ سخن ہے جس کے جسم پر تغزل کے علاوہ کوئی پیراہن گراں معلوم ہوتا ہے ۔"

اسی زمانے میں ایک ابھرتے ہوئے نوجوان شاعر کنور اخلاق محمد خاں شہریار سے خلیل صاحب نے میرا تعارف کرایا ۔ شہریار اکثر خلیل صاحب کے ہمراہ پیلی بھیت آتے رہے ۔ کبھی کبھی ہماری ملاقاتوں میں آفتاب شمسی بھی شریک ہوتے تھے ۔ میں نے خلیل صاحب کی طرح شہریار کو بھی نہایت مخلص اور سچا فنکار پایا ۔ نئی شاعری کے حلقے میں شہریار کی آواز اپنا انفرادی آہنگ رکھتی تھی ۔ کلام سناتے وقت انکی پوری شخصیت شعر کے لہجے میں ڈھلی ہوئی محسوس ہوتی تھی ۔ اعظمی صاحب انہیں حقیقی بھائی کی مثل سمجھتے اور چاہتے تھے ۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اور شہریار ہی کے اصرار پر میں نے ۱۹۶۵ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ سے اردو میں ایم اے کا امتحان امتیاز کے ساتھ پاس کیا ۔ اور ان دونوں حضرات کے خلوص اور احسانات ہی کے طفیل علی گڑھ سے پھر میرا رابطہ قائم ہوا ۔ اعظمی صاحب کی کوششوں سے مجھے وظیفہ مل گیا اور ۱۹۶۹ء تک میں علی گڑھ میں اپنے تحقیقی مقالے "اٹھارھویں صدی کی اردو شاعری کی فرہنگ" پر کام کرتا رہا ۔ ابتدا میں میرے نگراں پروفیسر خورشید الاسلام تھے ۔ لیکن چند ماہ بعد جب وہ باہر تشریف لے گئے، تو میں نے اعظمی صاحب کی نگرانی میں آخر تک اپنا مقالہ مکمل کیا ۔

اب دس سال کے بعد علی گڑھ کافی بدل گیا تھا ۔ یہاں کی تہذیبی، ادبی، تعلیمی اور ثقافتی زندگی وقت کے نئے تقاضوں کے تحت دوسرا رخ اختیار کرچکی تھی ۔ ترقی پسند تحریک کا زوال مکمل ہوچکا تھا ۔ اور اسکی جگہ جدیدیت اپنے بال و پر پھیلا رہی تھی ۔ گذشتہ عہد کے ترقی پسند ادیب علی گڑھ کی ان بدلتی ہوئی ہواؤں کے درمیان کچھ سہمے سہمے سے حالات کا مشاہدہ کر رہے تھے ۔ پروفیسر آل احمد سرور، صدر شعبۂ اردو کے متوازن اور وقت شناس ذہن نے جدیدیت کو شاعرِ علی

سہارا دیا ۔ اور اس کے روشن امکانات کی نشاندہی کی ۔ علی گڑھ کی شاعری میں اسوقت خلیل الرحمٰن اعظمی کی حیثیت ایک مضبوط پل کی مانند تھی جو قدیم اور جدید کے درمیان ایک پائیدار رشتہ بن گئی تھی ۔ خلیل صاحب کے گرد نئے اور پرانے لکھنے والوں کا ایک دائرہ قائم ہوگیا تھا ۔ اور وہ علی گڑھ کے حلقۂ ادب میں شمع محفل کی طرح تھے ۔ جہاں مسعود علی ذوقی، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، ڈاکٹر وحید اختر، شہریار، ڈاکٹر وارث کرمانی، ڈاکٹر شمیم حنفی، بشیر بدر، محترمہ ساجدہ زیدی، محترمہ زاہدہ زیدی، امین الدین اشرف، صبا جائسی، امیر عارفی، اور راقم السطور کے ساتھ دوسرے بہت سے نوجوان لکھنے والے شامل تھے ۔

علی گڑھ کے دورانِ قیام میں ۱۹۶۵ء سے میں نثر لکھنے کی طرف متوجہ ہوا ۔ ڈرتے ڈرتے ایک مضمون " اردو غزل میں لفظ شہر کی اہمیت " لکھ کر خلیل صاحب کو دکھایا ۔ انہوں نے نہایت محبت اور خلوص کے ساتھ اس میں جگہ جگہ ترمیم اور اضافہ کے مشورے دیئے ۔ (مضمون پر ان کے قلم کے حواشی اب بھی میرے پاس محفوظ ہیں) یہ مشورے نفسِ مضمون ہی سے متعلق تھے ۔ زبان و بیان کے سلسلے میں اعظمی صاحب نے کوئی قلم نہیں لگایا ۔ میرے لئے یہ بہت بڑی بات تھی ۔ مجھے نثر لکھنے کا حوصلہ ملا ۔ چنانچہ اسی سال شہریار کا پہلا شعری مجموعہ " اسم اعظم " شائع ہوا ۔ میں نے اس پر تبصرہ کرکے خلیل صاحب کی خدمت میں پیش کردیا ۔ اور وہ مضمون انھیں کے توسل سے ماہنامہ " شاعر " بمبئی میں شائع ہوا ۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے شاگردوں اور خوردوں کے اندر پوشیدہ جوہر اجاگر کرنے میں بہت ماہر تھے ۔ وہ زبردستی نظریات ٹھونسنے کے عادی نہ تھے ۔ وہ چاہتے تھے کہ باصلاحیت نوجوان ان کی رہنمائی میں ادب کی صحیح منزل تک رہنمائی حاصل کریں ۔ وہ تعلیمی اداروں کی سیاست اور جوڑ توڑ سے نالاں رہتے تھے ۔ اور اندر ہی اندر کڑھتے تھے کہ طلباء علم و ادب کی سچی لگن اور جستجو کے بجائے ذاتی رسوخ کے ذریعہ اعلیٰ درجوں تک پہنچ جاتے ہیں جبکہ شعر و ادب کے مخلص شیدائی ان وسائل کے فقدان کی وجہ سے پیچھے رہ گئے ہیں ۔ جب کسی نشست میں زمانے کا یہ المیہ زیر بحث آجاتا تو خلیل صاحب کے چہرے پر ناگواری کی پرچھائیاں ابھر آتی تھیں ۔ اور ان کا لہجہ بلا کا تلخ ہوجاتا تھا ۔ جیسے ان کا بس چلے تو سارے غلط نظام کو درہم برہم

کر دیں۔ وہ چونکہ فن کار تھے۔ اس لئے فنکاروں کی قلبی کیفیات کو محسوس کر سکتے تھے۔ اپنے خلوص کی بنیاد پر وہ میری کم آمیز نفرت کو نشانہ بھی بناتے تھے۔ لیکن یہ بھی خوب جانتے تھے کہ حقیقی فن کار سیاسی جوڑ توڑ میں ملوث ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک دفعہ میرا ایک مضمون "ناول کی زبان" "اوراق" لاہور میں شائع ہوا۔ میں نے یہ مضمون اپنے آزاد مطالعہ کی روشنی میں اس زاویے سے لکھا تھا کہ ناول کی تخلیقی زبان ہمیشہ شاعرانہ رہی ہے اور سادہ عام نثر اس سلسلے میں زیادہ تعاون نہیں دے سکتی۔ مجھے بعد کو احساس ہوا کہ یہ نظریہ خلیل صاحب کے خیال سے ٹکرا جائے گا۔ کیونکہ مرحوم حالی اور سرسید کے نثر کے دلدادہ تھے۔ میں بہت دنوں تک خلیل صاحب کے سامنے نہیں گیا۔ معلوم نہیں، وہ کیا کہیں۔ ایک خدشہ اور بھی تھا کہ اس مضمون میں اعظمی صاحب کے نظریہ کی نفی کے ساتھ ساتھ شعبۂ اردو کے ایک مشہور افسانہ نگار کی ہمنوائی کا رُخ بھی نکلتا تھا جو خلیل صاحب کے حریف تھے۔ میں شہریار سے ملا۔ اور انھیں اپنے دل کی کشمکش سے آگاہ کیا۔ تو انھوں نے اطمینان دلایا کہ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ خلیل صاحب ادب میں اس طرح کی باتوں پر یقین نہیں رکھتے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی ایک باظرف انسان تھے۔ اپنے بہت سے ہم مشرب ساتھیوں کے برخلاف انکی مے نوشی کا ایک "محدود" ظرف تھا۔ شادی کر پہلے ضرور وہ بلا نوش کہے جاتے تھے لیکن بعد کو انہوں نے اعتدال کا راستہ اختیار کر لیا تھا۔ اور آخر میں تو وہ بالکل ہی تائب ہو گئے تھے۔ ان کی مے نوشی کو ایک مرتبہ میں نے بھی قریب سے دیکھا ہے۔ اس قسم کی محفل میں شریک ہونے کا یہ میرا پہلا اور آخری اتفاق تھا۔ ہوا یہ کہ بمبئی سے آئے ہوئے عادل منصوری کے اعزاز میں شام کو بشیر بدر نے اپنی قیامگاہ (منزل بیلیں، دودپور) پر ایک نشست منعقد کی۔ جسمیں خلیل صاحب شہریار اور شہاب عراقی کے ساتھ میں بھی شریک ہوا۔ محفل جمی، پیالے رکھے گئے۔ جب میرے آگے خالی پیمانہ آیا تو خلیل صاحب معنی خیز انداز سے مسکرائے اور صرف یہ کہا "ارے یہ" ــــــ یعنی یہ کیا پینں گے یہ تو زاہد خشک ہیں۔ غرض بوتلیں آئیں ــــ ساغر لبریز ہوئے۔ میرے پیالے کو سادہ پانی سے بھر کر آداب مجلس کی خانہ پُری کی گئی۔ اور مجھے بھی اس دور ناؤ نوش میں پانی کو شراب کی طرح شاعر بنی

ٹھہر ٹھہر کر پینا پڑا۔ میں اس کوچے سے قطعی ناآشنا تھا۔ مجھے پینے ہی کے طور طریقے نہیں معلوم تھے۔ ہوش کی منزلیں تو بہت آگے تھیں۔ بہرحال لوگوں کو ان "ہوش" کی منزلوں پر آپے سے باہر ہوتے ہوئے دیکھا ضرور۔ مگر خلیل صاحب! وہ تو پینے کے بعد کچھ زیادہ ہی صاحب اور اک ہو گئے تھے۔ زبان اور خیالات میں بلا کی تندی اور بہاؤ تھا۔

اعظمی صاحب کے مخصوص حلقے میں خواجہ مسعود علی ذوقی، ڈاکٹر وحید اختر، شہریار، ڈاکٹر منیب الرحمٰن، ڈاکٹر شمیم حنفی، ڈاکٹر وارث کرمانی کے علاوہ نئی نسل کے کچھ شعرا شامل تھے۔ بشیر بدر کی شاعری کے بہت معترف تھے۔ لیکن شخصی سطح پر ان میں در پردہ اختلاف تھا۔ علی گڑھ میں تحقیق کے دوران اعظمی صاحب نے مقالے کی تیاری میں مجھے ہر ممکن ہدایات دیں، فرہنگ کی ترتیب کے سائنسی طریقے بتائے۔ ــــ اور جب میں ۱۹۷۷ء کے کانووکیشن میں علی گڑھ آیا تو وہ صاحب فراش ہو کر ہسپتال میں داخل ہو چکے تھے۔ ہسپتال میں اُن سے میری آخری ملاقات تھی۔ وہ اپنے وجود کے خون میں پوری طرح نہا چکے تھے۔ اور میر کے اس شعر کی تصویر ہوتے جا رہے تھے ؎

کہہ سکے کون ہم کو ناہموار ✲ اب تو ہیں خاک کے برابر ہم

باقی صفحہ ۱۲۱ خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید میں توازن ــــ

کہ ایسے وقت میں جب کہ شعر و ادب جمود کی طرف بڑھ رہے تھے اور شعر و ادب کے حقیقی منصب کو پس پشت ڈال دیا گیا تھا۔ فنی قدروں کو پامال کیا جا رہا تھا، خلیل صاحب نے ان سب کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیا۔ انہوں نے تنقید اور شعر کو تفریح اور کسی خاص سماجی مقصد کا ذریعہ ماننے سے انکار کر دیا اور ادب و تنقید کو ایک سنجیدہ علمی اور تخلیقی مشغلہ قرار دیا۔ انکی متوازن نظر نے انھیں بھیڑ کا حصّہ بننے سے روک دیا۔ اور اس سیلاب کے مقابل کھڑے رکھا جس میں بڑے بڑے خس و خاشاک کی طرح بہہ گئے۔ ان کی تنقید میں قید و بند اور گھٹن کا ماحول نہیں ہے۔ بلکہ یہ تنقید نئے خیالات اور نئے تجربات کی طرف بند دماغوں کو کھول دیتی ہے۔ تنقید کا یہی حقیقی تفاعل ہے۔ تنقید، جو ذہنی قوتوں کی ترتیب و جلا کر کے اعلیٰ فن پاروں سے لطف و بصیرت اخذ کرنا سکھاتی ہے۔ خلیل صاحب کی تنقید میں توازن کے عنصر نے تنقید کی اس تعریف کی تفسیر و تشریح پیش کر دی ہے۔

ابوالکلام قاسمی
شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

ہمزاد کی تلاش[1]

خلیل الرحمٰن اعظمی کا پہلا مجموعۂ کلام "کاغذی پیرہن" ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا اور اس کے دس سال بعد دوسرا مجموعۂ کلام "نیا عہد نامہ" منظرِ عام پر آیا۔ تیسرا مجموعہ "زندگی اے زندگی" "نیا عہدنامہ" کے بعد سے اعظمی صاحب کی زندگی کے آخری ایام تک کی شاعری پر مشتمل ہے۔ جس زمانے میں "کاغذی پیرہن" شائع ہوا تھا اسی زمانے میں کسی قدر تقدیم و تاخیر سے ابنِ انشاء کا "چاند نگر" اور ناصر کاظمی کا مجموعہ "برگ نے" (بھی) چھپ کر آیا تھا۔ "کاغذی پیرہن" کے ساتھ "برگ نے" اور "چاند نگر" کے ذکر کی ضرورت یوں پڑی کہ آزادی کے بعد کے چند برسوں میں جن شعری مجموعوں نے روایت کے تسلسل، تخلیقی تازگی اور زمانی معنویت Relevance کے سبب اہلِ نظر کی توجہ اپنی طرف مبذول کی تھی وہ یہی تینوں مجموعے تھے۔ ہندوستان میں ۱۸۵۷ء کے بعد ۱۹۴۷ء کا سال افراتفری، کسمپرسی اور انسانیت سوز واقعات کے سبب ایک ایسے دور کے روپ میں تبدیل ہوگیا تھا جو اپنی نوعیت کے اعتبار سے غدر اور اس سے پہلے میر تقی میر، سوداؔ اور قائمؔ کے زمانے کی دہلی کی طوائف الملوکی اور غیر مستحکم سماجی اور سیاسی نظام کی عکاسی کرتا تھا۔ اپنے دور میں سوداؔ نے قصیدہ کی معروضی objective صنف پر اپنی زیادہ توجہ صرف کی اور سوداؔ کے ساتھ قائمؔ نے بھی اس معروضیت کو شہر آشوب اور ہجویہ قصائد کی شکل میں برقرار رکھا۔ غزل کی شاعری سوداؔ نے بھی کی اور قائمؔ نے بھی، مگر دونوں کی غزلیہ شاعری میں ذروں عصر کا فقدان رہا۔ ایسے دور میں صرف ایک شاعر نے ہر چند کہ دوسری اصناف میں بھی طبع آزمائی کی مگر اس کی غزل نے اپنے زمانے کو معروض نہ بنا کر اسے اپنی شخصیت کا ایسا جزوِ لاینفک بنا لیا کہ عشق و محبت کی بہت سطحی جذباتیت اور ناکامی تک نے اپنے اطراف پھیلے ہوئے عصری حقائق اور انسانی صورتِ حال کو اپنے ساتھ اس انداز میں ہم آمیز کیا کہ سارا خارج، داخل بن اور معروض موضوع میں تبدیل ہوگیا۔ میر تقی میر کی غزلیہ شاعری اسی اجمال کی تفصیل پیش کرتی ہے ——

یہ عجیب اتفاق تھا کہ ۱۹۵۵ء کے آس پاس اردو کے جو شعری اور ادبی منظر نامے پر نمایاں تھے اُن کی اکثریت ترقی پسند تحریک کے زیرِ اثر کی جانے والی موضوعاتی اور اکہری شاعری کی اسیر تھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی، ناصر کاظمی اور ابنِ انشا کی شاعری میں جو چیز قدرِ مشترک کی حیثیت سے اپنی طرف متوجہ کرتی تھی وہ میر تقی میر کے لب و لہجے کی بازیافت تھی۔ یہاں یہ کہنے کی چنداں ضرورت نہیں کہ اس لب و لہجے میں ان تینوں شاعروں کا اپنا عہد اور اس عہد کے سیاق و سباق میں تشکیل پانے والا شعری کردار بھی شامل ہے جس کے لئے میرؔ کا لہجہ اپنے اظہار کا مناسب ترین لہجہ ثابت ہوا۔

یہ لمبی تمہید مجھے اس شعری مجموعے کے لئے باندھنی پڑی ہے جس کے بارے میں خود شاعر کا بیان یہ ہے ——

"میرا پہلا مجموعہ "کاغذی پیرہن" کتابت و طباعت کی خامیوں اور بہت سی ہلکی پھلکی نظموں اور غزلوں کی شمولیت کے باوجود ادبی حلقوں میں جس پذیرائی کا مستحق سمجھا گیا اس پر مجھے مسرت بھی ہوئی اور حیرت بھی" ——

مجھے کتابت و طباعت کی خامیوں یا ادبی حلقوں میں اس کتاب کی پذیرائی سے اس وقت کوئی سروکار نہیں، یہاں مجھے صرف یہ کہنا ہے کہ شاعر بذاتِ خود اس مجموعے میں بہت سی ہلکی پھلکی نظموں اور غزلوں کی شمولیت کا معترف ہے، اور یہیں بھی شاعر اپنے اعتراف میں حق بجانب نظر آتا ہے۔ اور جب ہم اس کا پہلا مجموعہ، بعد کے زمانے کی بیس بائیس سال کے عرصے میں پھیلی ہوئی اس کی شاعری کو پیشِ نظر رکھ کر پڑھتے ہیں تو شاعر کی خود احتسابی پر

---

[1] خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری پر یہ مضمون اُن کے آخری مجموعۂ کلام "زندگی اے زندگی" (زیرِ طبع) کے مسودہ کو پیشِ نظر رکھ کر لکھا گیا ہے۔

ہمارا یقین اور بھی پختہ ہو جاتا ہے ـــــــ اس موقع پر اگر میں خلیل الرحمٰن اعظمی کے تنقید نگاری کا ذکر کردوں تو شاید یہ بات خارج از بحث نہ ہو۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے بارے میں یہ کہنا آسان نہیں معلوم ہوتا کہ آیا وہ شاعر سے بڑے تنقید نگار تھے یا تنقید نگار سے بڑے شاعر۔ کسی بھی ایسے شاعر تنقید نگار یا تنقید نگار شاعر کے بارے میں اگر واضح طور پر یہ نظر آجائے کہ اس کی صلاحیتیں کہاں زیادہ بلکہ بہت نمایاں ہو کر سامنے آتی ہیں تو اس کو اسی میدان کا مرد میدان کہہ لینا آسان ہوتا ہے اور دوسری چیز، خواہ وہ شاعری ہو یا تنقید نگاری ایک ضمنی چیز ہو کر رہ جاتی ہے ـ خلیل الرحمٰن اعظمی کے سلسلے میں یہ فیصلہ اس لئے بھی مشکل ہے کہ اُن کی شاعری اور تنقید نگاری ایک ہی نوع کی داخلی ضرورت کی پیداوار ہیں۔ یہ داخلی ضرورت اپنے محرک کے اعتبار سے شعری ضرورت ہے۔ یہ میرا دھندلا سا تصور تھا جو اُن کی شاعری اور تنقید کے مطالعہ کے نتیجہ میں پیدا ہوا تھا اور میرے اس دھندلے تصور کو خود اعظمی مرحوم کی تحریر سے زبان ملی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

> میری تنقید نگاری میری داخلی ضرورتوں کی پیداوار تھی۔ یہ داخلی ضرورتیں میری اپنی شاعری سے تعلق رکھتی تھیں۔ میں کچھ ایسی کیفیتوں سے گذر رہا تھا جو بہت سے معرکے کہنے کے بعد بھی ان کہی رہ جاتی تھیں۔ انھیں سے ملتی جلتی کیفیات کو دوسرے شعراء کے یہاں تکمیل یافتہ صورت میں دیکھتا تو محسوس ہوتا کہ میں نے ان شعرا کو ہی نہیں بلکہ اپنے آپ کو پا لیا ہے۔

یہ اقتباس نقل کرتے ہوئے اچانک میرے ذہن میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی ایک نظم گونجنے لگی ہے، جس کا عنوان "ذاتیات" ہے اور چند مصرعے اس طرح ہیں ـــ

"میں دوسروں کی لکھی ہوئی کتابوں میں
داستاں اپنی ڈھونڈتا ہوں
جہاں جہاں سرگذشت میری ہے
ایسی سطروں کو میں مٹاتا ہوں
روشنائی سے کاٹ دیتا ہوں
مجھ کو لگتا ہے،
لوگ ان کو اگر پڑھیں گے
تو راہ چلتے میں روک کر مجھ سے جانے کیا کیا پوچھنے لگیں گے۔"

شاعری میں اپنا اظہار اور تنقید کی شکل میں احتساب، خلیل الرحمٰن اعظمی کو اپنے تخلیقی سفر سے آگاہ اور باخبر رکھتا ہے۔ یہی خود احتسابی ان کے شعری ارتقاء کی ضامن ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ان کے بعد کے مجموعے "نیا عہد نامہ" اور "زندگی اے زندگی" میں اپنے آپ کو دہرانے اور ناپختگی کی داستان ہو کر رہ جاتے ـــــــ اس کے برخلاف دوسرا اور اس کے بعد کا آخری مجموعہ بہت واضح ارتقائی سفر کی نشاندہی کرتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کا ابتدائی اور آخری مجموعۂ کلام "زندگی اے زندگی" ۱۹۶۵ء (نیا عہد نامہ کی اشاعت کا سال) کے اوائل تک کی شاعری پر مشتمل ہے۔ ایک خاص بات یہ ہے کہ اس مجموعہ کی کوئی چالیس فی صد تخلیقات ۱۹۶۵ء سے ۱۹۷۶ء تک کے گیارہ سالہ عرصے میں وجود میں آئیں اور تقریباً ساٹھ فیصد تخلیقات ۱۹۷۶ء اور ۱۹۷۸ء کے درمیان صرف دو سال کی مدت میں ـــــــ اس کا ذکر میں نے خاص طور پر اس لئے کیا کہ میں اسی سلسلے میں آپ کو ایک عجیب سی بات بتلاؤں۔ اس بات پر یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کا کام ـــــــ اور یقین کرنے نہ کرنے سے شاعری کی قدر و قیمت میں نہ اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ تخفیف۔ بات صرف یہ ہے کہ اس سے ملتی جلتی اور بھی کئی باتیں مجھے اس مجموعہ کی شاعری کے بارے میں کہنی ہیں ـــــــ یہ سب جانتے ہیں کہ اعظمی مرحوم اپنی زندگی کے آخری چند برسوں میں مذہب اور روحانیت کی طرف مائل ہو گئے تھے خصوصاً آخری دو سال، جو اُن کے لئے زندگی اور موت کی کشمکش کے سال تھے، اوراد و وظائف کی کثرت کے سال تھے۔ ایک بار گفتگو کے دوران اس کثرت سے نظمیں اور غزلیں کہنے کا ذکر آیا تو مجھ سے کہنے لگے کہ میں پچھلے دنوں کچھ عجیب و غریب تجربے سے گذرا ہوں" اتنا کہہ کر خاموش ہو گئے۔ میں نے کہا کہ آپ اپنے تخلیقی عمل سے متعلق، جہاں تک آپ اس کو اپنی گرفت میں لا سکتے ہیں، کوئی مضمون کیوں نہیں لکھتے؟ کہنے لگے کہ میرے اس زمانے کا تخلیقی تجربہ ایسا حیرت انگیز ہے کہ پتہ نہیں لوگ کیا سمجھیں۔ جب میں نے کرید کی تو بولے کہ تمہیں بتلاتا ہوں کہ شاید یہ بات تمہارے لئے قابل یقین ہو (اس سے اُن کی مراد عقیدے اور مسلک کے اعتبار سے میرے مسلمان ہونے سے تھی) انھوں نے کہا کہ "وہ شدید علالت کے دن تھے جب میری تکلیف بہت بڑھ گئی اور کسی صورت چین ہی نہ آتا تھا تو میں نے ایک بزرگ سے اس کا ذکر کیا۔ انھوں نے مجھے ایک وظیفہ بتلایا اور کہا کہ میں روزانہ اتنی بار اس کا ورد کیا کروں۔ میں نے یہ وظیفہ شروع کیا تو دو تین روز کے اندر ہی مجھ پر ایک ایسی کیفیت طاری ہونے لگی گویا ہر وقت مجھ پر شعر وارد ہو رہے ہوں میرے پاس کوئی بیٹھا بھی ہوتا تو میں اُس کی بات پر ہوں ہاں کرتا رہتا مگر حقیقت میں اسی کیفیت میں مبتلا

ہوتا' اور حتی الامکان کوشش کرتا کہ جو شعر ہوئے ہیں انھیں کسی کاغذ پر نوٹ کر لوں
کئی کئی روز تک سارے سارے رات نیند نہ آتی' میں کاغذ قلم اٹھاتا اور کچھ شروع
کرتا مگر اکثر شعر کہنے کا عمل اتنا تیز ہوتا کہ میرا قلم اس کا ساتھ نہ دے پاتا اور
بعض الفاظ چھوٹ جاتے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ اب تک میں نے یہ بات
صرف خواجہ مسعود علی ذوقی سے ہی کہی ہے" ـــــ بعد میں ایک صاحب نے
بتلایا کہ جب یہ بات مشہور ہوئی تو کئی اور اصحاب کو انھوں نے یہ سب
تفصیلات بتلائیں' شاید ریڈیو کے کسی انٹرویو میں بھی" ـــــ

شاعری چونکہ انکشافِ ذات کی بہت جینوین اور تخلیقی صورت ہے
اس لئے ذات کا انکشاف خواہ وہ کسی ورد یا وظیفہ کے نتیجہ میں ہو یا خواب
کی صورت میں وہ تخلیقی تجربہ زیادہ آسانی سے بن سکتا ہے ـــــ
یہاں اس کا امتیاز بہت ضروری ہے کہ ہمارے فوری تاثرات' جذباتی
حرکات و سکنات یا ردِّ عمل بھی ہر چند کہ ذات ہی کے اظہار کی صورتیں
ہیں' مگر میں نے ذات کے اظہار کے بجائے ذات کے انکشاف کی بات
کہی ہے اور انکشاف کسی مخفی یا پوشیدہ چیز ہی کا ہوتا ہے اس لئے یہاں ذات
کے انکشاف سے مراد ذات کے ان اسرار و رموز کا انکشاف مراد لیا جائیگا
جن سے عام اوقات انسان خود بھی بے خبر رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر شعری
کردار اپنے ساتھ وہ آسیبی قوت بھی رکھتا ہے جو اس کے اظہار کو رمز و
ایما' علامت سازی اور خواب آسا کیفیات سے دوچار کرتا ہے۔ اگر یہ
آسیب یا پُر اسرار کیفیت تخلیق کار کی ذات سے وابستہ نہ ہو تو وہ اپنی شاعری
کو سستی جذباتیت' ابھرے طرزِ اظہار اور نثر نما موزوں جملوں کا مجموعہ بنا کر
رکھ دے گا ـــــ یہی پُر اسرار کیفیت اور آسیب آسا صورتِ حال
تخلیقی عمل کی شکل میں ڈھل کر آسانی سے گرفت میں نہ آنے والی چیز بن جاتی
ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو مختلف ماہرین نفسیات و انسانیات' شاعر کے
تخلیقی عمل کو خواب یا مدہوشی کے عالم سے مشابہ قرار نہ دیتے۔ بعض ماہرین نے
اس عمل کو عبادت کے نقطۂ عروج یا جنسی عمل کی خود رفتگی سے بھی مشابہ
بتلایا ہے۔ مجھے جب اس زاویۂ نظر سے خلیل الرحمن اعظمی کی شاعری میں
اور شاعری سے کہیں زیادہ شخصیت میں بعض توجہ طلب پُر اسرار عوامل کارفرما
نظر آئے تو میں نے ان کی زندگی کے چند واقعات اور شاعری میں رونما
ہونے والی مشابہ کیفیات کے تانے بانے ملانے کی کوشش کی ـــــ میری
اس بات سے یہ قطعاً نہ سمجھا جائے کہ میں شاعری سے زیادہ شخصیت پر توجہ
دے رہا ہوں۔ میری توجہ تو صرف اس بات کی طرف ہے کہ اگر کسی شاعر کی زندگی
ہمارے سامنے اس کی شاعری کے مقصد سے کسی حد تک کھولنے میں معاون
ثابت ہوتی ہے تو ہمیں زندگی کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے ـ میں اس سلسلے
میں پہلے خلیل الرحمن اعظمی کی ہی تحریر سے دو اقتباسات پیش کرنا چاہتا
ہوں اس کے بعد ان کی غزلوں کے اشعار کے حوالے سے ان کے شعری کردار
کی تفہیم و تشخیص کی کوشش کروں گا۔ خلیل الرحمن اعظمی اپنے مجموعۂ کلام 'نیا عہد نامہ'
کے دیباچہ میں اپنی شعر گوئی کے آغاز اور اس زمانے کی اپنی ذہنی کیفیات کو
یاد کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

> غالباً فروری ۱۹۴۶ء کی بات ہے میں انٹرمیڈیٹ
> کا طالب علم تھا۔ ایک دن اچانک میں نے اپنے دل میں
> ایک ایسی خلش محسوس کی جس کا سبب مجھے خود نہیں معلوم
> تھا۔ میں نے محسوس کیا جیسے مجھے کسی سے محبت ہو گئی ہے
> لطف کی بات یہ ہے کہ محبوبہ کا کوئی وجود نہیں۔ نہ اس کی
> کوئی شکل و صورت تھی اور نہ کوئی نام اور پتہ۔ مگر ایک
> مبہم سی کسک نے میرے اندر ایک تبدیلی سی پیدا کر دی تھی
> ایسا معلوم ہوتا جیسے مجھے ایک گوشۂ تنہائی کی ضرورت
> ہے جہاں میرے ہم سبق اور عزیز ترین دوست بھی نہ
> ہوں ..... مجھے وہی بے نام صورت یاد آنے لگتی
> اور میں اس کے خیال میں رات کے پچھلے پہر تک جاگتا رہتا
> ۔ کئی بار ایسا لگا کہ میں اس کو ایک لمبا چوڑا خط لکھنا
> چاہتا ہوں ـــــ

ان سطور کے بعد اپنی پہلی نظم کو اسی طرح کی کیفیت کی زائیدہ بتلایا گیا ہے
اور پھر اپنے تخلیقی سفر کے بارے میں تفصیلی اظہارِ خیال کیا گیا ہے۔ اسی مضمون
کے آخری پیراگراف میں کچھ اس سے ملتی جلتی کیفیات کا تجزیاتی بیان ملتا ہے۔

> " کاغذی پیرہن کی اشاعت کو اب دس سال ہو گئے
> اس دوران میری ذاتی زندگی میں بعض خوشگوار تبدیلیاں
> ہوئی ہیں جن کا اثر میری نظموں کے لہجے پر دیکھا جا سکتا
> ہے ـــــ لیکن میری ذہنی تنہائی کسی نہ کسی
> صورت میں اب بھی برقرار ہے۔ اس کا تعلق اگر میری مادی
> ضرورتوں اور جبلّی خواہشوں سے ہوتا تو میں اب تک
> اس سے نجات حاصل کر چکا ہوتا' لیکن اس کی جڑیں زیادہ
> گہرائی میں اور سماجی زندگی و انسانی اقدار کی وسعتوں میں پھیلی

ہوئی ہیں میری نظر میں انسانی اقدار کا جو تصور ہے اور میں
— جو خواب دیکھتا ہوں اس کا ٹکراؤ قدم قدم پر
میرے ماحول اور معاشرے سے ہوتا ہے اور میری رُوح
غالب کی طرح فریاد کرتی رہتی ہے کہ ؎

ہزار حیف کہ اتنا نہیں کوئی غالب
جو جاگنے کو ملادیوے آکے خواب کے ساتھ

اس لئے میری نظمیں اور غزلیں اب بھی داخلی اور خارجی حقیقت
کے تصادم کی کہانیاں سناتی ہیں۔"

محولہ بالا دونوں اقتباسات میں ہر چند کہ بہت سے ایسے نکات سامنے آتے ہیں جن سے شاعر کے تخلیقی مزاج کو سمجھنے کے وسائل ہاتھ آتے ہیں لیکن میں ان سب نکات کو ایک ہی سلسلے کی کڑیاں سمجھتا ہوں۔ مبہم سی کسک، گمشدہ تنہائی کی تلاش، بے نام سی صورت کا وجود اور احساس، ذہنی تنہائی کا مختلف حلقوں میں علیٰ حالہٖ باقی رہنا، ماحول اور معاشرے سے تخلیق کار کے خواب کا ٹکراؤ اور داخل و خارج کی حقیقتوں کے تصادم کی کہانیاں یہ ساری باتیں اپنی مختلف جہات DIMENTION رکھنے کے باوجود جس حقیقت کی طرف اشارہ کرتی ہیں وہ تخلیقی آسیب اور خواب نما کیفیت کا ہی دوسرا نام ہے۔ یہ حقیقت کبھی شاعر کا ہمزاد بن جاتی ہے کبھی اس کا عکس اور کبھی ایک غیر ذاتی وجود جو اپنا نہ ہوتے ہوئے بھی اپنا ہوتا ہے۔ اس حقیقت کے اظہار کے لئے خلیل صاحب کی شاعری میں کلیدی الفاظ 'چہرا' اور 'آئینہ' کے ہیں۔ ان دونوں الفاظ کی تکرار کے ساتھ ان کے تلازمات کے طور پر — عکس، پرچھائیں، سایہ، صورت، اجنبی چھاؤں، طلسم، نقاب، نقشِ پا، خواب، ہمزاد، آدم نما، مکھوٹے — کے الفاظ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظموں اور غزلوں میں بار بار آتے ہیں اور اکثر اوقات اپنے سیاق و سباق کے اعتبار سے معنی و مفہوم کی تبدیلی کے ساتھ استعمال ہوتے ہیں ثبوت کے طور پر صرف اس مجموعہ کے اَن گنت شعر ہمارے سامنے ہیں مگر پہلے وہ چند اشعار نقل کروں گا جن میں استفہامیہ انداز نے خود کلامی کی کیفیت پیدا کر دی ہے

اب تو یہ بھول گیا کس کی طلب
دلہن پردیس پھرتی ہے مجھے

تو کون تھا، کیا نام تھا، تجھ سے مجھے کیا کام تھا
ہے پردۂ دل پر ابھی دھندلا سا اک چہرا ترا

پھر مری راہ میں کھڑی ہوگی
وہی اک شے جو اجنبی ہوگی

اب تو یاد آتا نہیں کیسا تھا اپنا رنگ روپ
پھر مری صورت دکھا دے زندگی، اے زندگی

قدموں تلے تو کچھ نہیں ہے
کس چیز کو میں کچل رہا ہوں

وہ لوگ اب کہاں ہیں وہ چہرے کدھر گئے
اے شہرِ حسن کس کی تجھے بددعا لگی

ان اشعار میں شاعر کی ذات اپنے داخلی حوالوں سے کبھی ڈرامیٹک مونولاگ کا انداز اختیار کرتی ہے اور کبھی اپنے اندر پیدا ہونے والے احساس کو سوال کا روپ دیتی ہے اب میں کچھ ایسے شعر درج کرتا ہوں جن میں داخلی حوالے اپنی جگہ پر علیٰ حالہٖ موجود ہیں مگر بات کسی ایسے ہیولیٰ کی ہو رہی ہے جو خارج میں اپنا وجود رکھتے ہوئے بھی داخلی ذات کا حصہ ہے یا اگر نہیں ہے تو شاعر کو اس کے بارے میں ایک تجسس ضرور ہے۔

اب اپنے آپ کو ڈھونڈھیں کہاں کہاں جاکر
عدم سے تا بہ عدم اپنا نقشِ پا نکلا

ایک دو پل ہی رہے گا سب کے چہروں کا طلسم
کوئی ایسا ہو کہ جس کو دیر تک دیکھا کریں

کوئی مل جائے تو رستہ کٹ جائے
اپنی پرچھائیں ڈراتی ہے مجھے

ہمارے پاس سے گزری تھی ایک پرچھائیں
پکارا ہم نے تو صدیوں کا فاصلہ نکلا

پھر مری روح مرے گھر کا پتہ
میرے سائے سے پوچھتی ہوگی

خدا کرے کہ انھیں اور کچھ ثبات ملے
وہ چند صورتیں جن پر ہے آدمی کا گماں

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

مجھ سے نہ پوچھو نام مرا روحِ کائنات
اب اور کچھ نہیں ہوں ترا آئینہ ہوں میں

جی چاہتا تو بیٹھتے یادوں کی چھاؤں میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اکھڑ گیا

دور سے اک پرچھائیں دیکھی اپنے سے ملتی جلتی
پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرہ دیکھا

میں نے دو حصوں میں جتنے اشعار درج کئے ہیں ان سب میں اور ان میں بھی جو میں آگے آپ کے سامنے پیش کرنے جا رہا ہوں، ان میں چہرہ یا آئینہ یا خواب اپنے تلازمات کی شکل میں کلیدی حیثیت سے کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہے۔ البتہ یہ سارے اشعار اپنے رنگ، خوشبو اور ذائقہ میں ایک دوسرے سے اکثر و بیشتر مختلف کیفیات سے دوچار کرتے ہیں۔ کہیں خود کلامی کا انداز ہے تو کہیں پیراڈوکس کا، کہیں استفہامیہ لب و لہجہ نمایاں ہے تو کہیں تلاش و تجسس کی اسپرٹ ملتی ہے ——

اب آپ زندگی کے آخری ایام میں تخلیقی عمل کے بارے میں شاعر کے اس عجیب و غریب تجربہ کو اپنے ذہن میں تازہ کیجئے جس کو میں نے بظاہر ناقابلِ یقین کہا تھا اور پھر ان موزوں انتباسات پر نظرِ ثانی کیجئے جس کو میں کر کے میں نے تخلیقی آسیب کی جستجو کی تھی اور ان تحریروں کو سامنے رکھتے ہوئے خلیل الرحمٰن اعظمی کی مختلف غزلوں کے محولہ بالا اشعار اور مندرجہ ذیل اشعار کی روح تک پہنچنے کی کوشش کیجئے تو شاید شاعر کی تخلیقات کی کلید آپ اپنے ہاتھ میں پائیں ——

میں تو گھر میں اپنے آپ سے باتیں کرنے بیٹھا تھا
ان دیکھا سا اک چہرہ دیوار پہ اُبھرا آتا ہے

نہ جانے کس کی ہمیں عمر بھر تلاش رہی
جسے قریب سے دیکھا وہ دوسرا نکلا

چاندی کے سے جن کے بدن تھے سونے کے سے مکھڑے تھے
کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایہ دیکھا

ایک سے لگتے ہیں سب ہی کون اپنا کون غیر
بے نقاب آئے کوئی تو ہم دیدِ دل وَا کریں

ہمارے عہد سے منسوب کیوں ہوئے آخر
کچھ ایسے خواب کہ جن کا نہیں ہے کوئی بدل

اب کوئی ایسا نہیں جس پر کروں سب کچھ نثار
اب تو برسوں سے خود اپنے سائے میں رقصندہ ہوں

سوتے سوتے چونک پڑے ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا
جو خود ہم کو ڈھونڈھ رہا ہو ایسا اک رستہ دیکھا

پوچھتے کیا ہو ان آنکھوں کی اُداسی کا سبب
خواب جو دیکھے وہ خوابوں کی حقیقت مانگے

لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے میں اپنا ہمنوا
خود اپنے ہر خیال سے ٹکرا چکا ہوں میں

آخری چند شعروں میں خواب اور خیال جس مرکزی حیثیت سے سامنے آتے ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ داخل اور خارج کی حقیقتوں کے تصادم کی داستان کس کس اچھوتے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہاں یہ گفتگو بے جا نہ ہوگی اگر میں ۱۹۶۰ء اور ۱۹۷۰ء کے درمیانی دس سال میں کی جانے والی غزلیہ شاعری کے ایک نمایاں رجحان کا ذکر کر دوں۔ میری مراد اس جدید غزل سے ہے جسے کبھی کبھی اینٹی غزل کے نام سے بھی منسوب کیا گیا، جب کہ اینٹی غزل کا نام اگر کسی ایک آدھ شاعر کی غزلوں پر منطبق ہو سکتا تھا تو وہ اس انداز کی غزلوں کے ساتھ غزل کی تہذیب اور مزاج سے واقفیت بھی رکھتے تھے اور انھوں نے محض منہ کا مزہ بدلنے کے لئے ایسے تجربے کئے تھے مگر حیرت اس بات پر ہوتی ہے کہ بے سوچے سمجھے چند ہی برسوں میں اندھے مقلدین اور فیشن پرست متشاعروں کا ہجوم ایوانِ شاعری میں شور و غوغا کرنے لگا تھا، اور اس سے کہیں زیادہ حیرت کی بات یہ ہے کہ انھیں ایسے نقاد بھی مل گئے جنھوں نے منہ چڑھانے کی غزل گوئی کے لئے جواز فراہم کرنا شروع کر دئیے تھے —— نو واردانِ شعر و ادب کا تو ذکر تو چھوڑ دیجئے بہت سے کہنہ مشق اور پہلے سے سنجیدہ غزل کہنے والوں نے بھی اس بھیڑ میں خود کو شامل کرنے کو باعثِ اعزاز جانا اور نقالی کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا۔ ایسی صورتِ حال میں جب خلیل الرحمٰن اعظمی کے اس دور کے کلام کو پڑھتا ہوں اور اس سے پہلے اور بعد کے زمانے کی ان کی شاعری پر نظر ڈالتا ہوں تو مجھے مسرت آمیز احساس ہوتا ہے کہ اعظمی مرحوم نے اپنے تخلیقی سفر میں ادبی دنیا کے کتنے نشیب و فراز دیکھے مگر کسی غیر ضروری رو نے نہ ان کے تنقیدی تصورات کے قدم ڈگمگائے اور نہ ہی اُن کی شاعری اس طرح کے کسی فیشن کو قبول کرنے پر آمادہ ہوئی —— جب کہ اعظمی ان معدودے چند شاعروں میں سے ہیں جن کی تخلیقات سے صحیح معنی

میں جدید شاعری کا آغاز ہوا تھا ـــــ آج بھی آپ خلیل الرحمٰن اعظمی کی تخلیقات کو، ان تخلیقات میں سامنے آنے والے شعری کردار کے نقطۂ نظر سے دیکھئے تو جدید تر زندگی اور آج کے انسان پر اس کے مرتب ہونے والے اثرات اور اپنے طرزِ احساس کے اعتبار سے اعظمی مرحوم بلاشبہ ایک ایسے جدید شاعر قرار پاتے ہیں جس نے ہر سطح پر شاعری کو اپنی صداقتِ اظہار کا ترجمان بنائے رکھا ـــــــ

میں نے پچھلے صفحات میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں میں چند کلیدی الفاظ کا ذکر کیا تھا ان میں ایک اور لفظ 'رات' کا بھی ہے ـــ 'رات' اعظمی صاحب کی شاعری میں کبھی اصل معنوں میں اور اکثر استعاراتی انداز میں نئے نئے انسلاکات کے ساتھ آتی ہے۔

رات وہی پھر بات ہوئی نا ہم کو نیند نہیں آئی
اپنی روح کے سناٹے میں شور سا اک اٹھتا دیکھا
رچ گیا ہے مری نس نس میں مری راتوں کا زہر
میرے سورج کو بلا لائے زندگی، لے زندگی
کیسے پچھلی رات گزری، کیسی نیند آئی تمہیں
صبح کا سورج یہ پوچھے گا تو بتلائیں گے کیا
میں نے کیا کیا نہ سنا روح کے سناٹوں میں
دل یہ کہتا ہے کہ اس رات کا منظر باندھوں

خلیل الرحمٰن اعظمی چونکہ بنیادی طور پر اس داخلی احساس کے شاعر ہیں جو خارجی دنیا سے اثر انداز ہونے اور کائنات کی غیر ذاتی حقیقتوں کو شاعر کی اپنی ذات کا اپنا مسئلہ محسوس کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولہ بالا اشعار میں 'رات' اپنے استعاراتی اور داخلی انسلاکات کے ساتھ بار بار شاعر کا موضوع بن کر بھی مختلف حسی پیکروں کی تخلیق میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ اگر آپ 'نس نس میں راتوں کے زہر کے رچ جانے' 'رات کے گزرنے اور نیند آنے کے بارے میں دن کے سورج کے سوال کرنے اور رات اور روح کے سناٹے کے تعلق اور اظہار کے اس اسلوب پر غور کریں تو یہ غور کرنا محسوس فکر بن کر آپ کے سامنے آئیگا۔ اس موقع پر ایک چیز اور بھی توجہ طلب ہے کہ ہمارے عہد کے اکثر غزل گو شعراء نے پیکر تراشی اور امیج سازی کے عمل کو بیشتر جگہوں پر صرف امیج سازی تک محدود رکھا ہے جبکہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے حسی پیکر ان کے طرزِ احساس اور اسلوبِ اظہار کی ہم آہنگی اور اظہار کی داخلی ضرورتوں کے نتیجے میں معرضِ وجود میں آتے ہیں۔

عشق، انسانی زندگی کا آفاقی اور عالمگیر جذبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس لئے کسی بھی صنفِ شاعری میں اس جذبہ کا چھوٹ پڑے بغیر ناتکمیلیت کا احساس باقی رہتا ہے۔ عشق کو اگر آپ عام معنوں میں استعمال کریں جب بھی کوئی مضائقہ نہیں ویسے اس لفظ کو کسی قدر وسیع معانی و مفاہیم کے سامنے پیشِ نظر رکھا جائے تو اندازہ ہوگا کہ یہی جذبہ کبھی قوتِ حیات (VITAL FORCE) بن کر زندگی کو توانا اور متحرک بناتا ہے اور یہی جذبہ فنونِ لطیفہ میں فنکار کے اپنے اظہار کو ایک جمالیاتی عنصر سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ غزلیہ شاعری کی پوری روایت اس جذبے کے اظہار کے بڑا ہا پہلوؤں کی عکاسی کرتی ہے ـــ

سوال یہ ہے کہ کوئی شاعر عشق و محبت یا جمالیاتی اقدار کو اگر اپنے مقصد کی نقابی کے طور پر استعمال کرتا ہے تو وہ ہماری توجہ کا مستحق کیوں کر ہو۔ ہم کسی بھی شاعر کو صرف اسی مسئلے پر نہیں بلکہ اس کی شاعری میں پیش ہونے والے سارے ہی مسائل پر اسی وقت توجہ سے دیکھیں گے جب وہ یا تو ذاتی اور منفرد قسم کا زاویۂ نظر سامنے لاتا ہو اور اگر ذاتی نہیں تو کم از کم یہ تو ہونا ہی چاہئے کہ مسائل سے متعلق اس کا طرزِ احساس اس کے عہد کے طرزِ احساس سے لگا نہ کھاتا ہے ـــــ میں پچھلی سطور میں یہ بتلا چکا ہوں کہ خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے طرزِ احساس کے اعتبار سے نہ صرف یہ کہ جدید حسیت کے شاعر ہیں بلکہ ان کا نام ان معدودے چند شعراء میں بہت نمایاں ہوگا جن کے زاویۂ نظر کے طفیل اردو غزل کو ہم عصر حسیت سے قریب آنا نصیب ہوا ہے۔ آپ ان اشعار پر ایک نظر ڈالئے اور دیکھئے کہ ان کے دو مصرعوں میں عشق اور محبت اور پرانے مسلمات کے کلاسیکی تصور کی ایک جھلک دیتے ہوئے شاعر کس طرح اپنے ذاتی اور منفرد زاویۂ احساس سے ہمیں بیسویں صدی کے درمیانی برسوں میں لا کھڑا کرتا ہے۔

وہ نگہ کہتی ہے بیٹھے رہو محفل میں مگر
دل کی آشفتگی اٹھنے کی اجازت مانگے
زہر پی کر بھی جیوں میں یہ الگ بات مگر
زندگی اس لبِ رنگیں کی حلاوت مانگے
یہ دل کا درد تو ساتھی تمام عمر کا ہے
خوشی کا ایک بھی لمحہ ملے تو اس سے ملو
اپنا مقصد تھا یہی اے منبعِ آسودگی
بس تشنگی بس تشنگی گو پاس تھا دریا ترا
تمام عمر اسی پیچ و تاب میں گزری
کہ آسماں کو ترے پاؤں پر جھکا دیتے

جب نیند آگئی ہے صدائے جرس کو بھی
میری خطا یہی ہے کہ کیوں جاگتا ہوں میں

موجودہ عہد کے تہذیبی انتشار اور اس انتشار کے نتیجہ میں انسانی زندگی کی لامرکزیت اور غیر یقینی اور تشکیک آمیز صورتِ حال کو نہ صرف یہ کہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے قریب سے دیکھا ہے بلکہ ذاتی طور پر اس کو جھیلا بھی ہے اور محسوس بھی کیا ہے۔ اس کے نتیجے کے طور پر ان کے یہاں تشکیک، جذباتی بحران اور نارسائی کا احساس جگہ جگہ ملتا ہے۔

اس فکر میں کہ کل بھی نہ ہو آج کی طرح
ہم کر سکے نہ آج کے زخموں کا اندمال

سنا ہے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی
جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا

جو تعمیر کی کنجِ تنہائی میں
وہ دیوار اپنے ہی سر پر گری
اگر گھر سے نکلوں تو پھر تیز دھوپ
مگر گھر میں ڈستی ہوئی تیرگی
میں جیتا تو پائی کسی سے نہ داد
میں ہارا تو گھر پر بڑی بھیڑ تھی

اگرچہ غیر کے ہاتھوں ہی بے اماں ہوا
مگر میں اپنی طرف سے بھی بدگماں ہوا

بنے بنائے سے رستوں کا سلسلہ نکلا۔
نیا سفر بھی بہت ہی گریز پا نکلا

اور تو کوئی بتاتا نہیں اس شہر کا حال
اشتہارات ہی دیوار کے پڑھ کر دیکھیں

مقفل ہیں ہاتھ پاؤں میرے
پھر دھن میں کیوں سے چل رہا ہوں
پیروں تلے تو کچھ نہیں ہے
کس چیز کو میں کچل رہا ہوں

یہ تمنا نہیں اب دادِ ہنر دے کوئی
آ کے مجھ کو مرے ہونے کی خبر دے کوئی

آخری شعر میں انسان کے وجود اور وجود کے ذریعے تخلیقی ہونے والے

فن یا ہنر کی تحسین کی تمنا ہونے یا نہ ہونے کو ناقابلِ اعتنا گردانتا اور 'وجود' کی شہادت کی تلاش کا مسئلہ نئے عہد کے انتشار اور جذباتی بحران کا ہی پیدا کردہ ہے۔ اسی تصویر کا دوسرا رُخ خلیل الرحمٰن اعظمی کی نظم "میں گوتم نہیں ہوں" میں پیش ہوا ہے۔ اس میں شاعر خود کو اپنے عہد کے گوتم ہونے سے انکار کرتے ہوئے ایک ایسے تجربے کا بیان کرتا ہے جو گوتم بدھ کی طرح حقیقت کی جستجو کے سفر سے مشابہ ہے۔ 'مگر گیان کی خواہش کہاں پہنچاتی ہے'
چند مصرعے دیکھئے

مجھے جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر کے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے
اور دور تک — بس خلا ہی خلا ہے —

"میں گوتم نہیں ہوں" کے علاوہ اس مجموعہ کی چند اور نظموں میں 'انسانی وجود' کا مسئلہ مختلف انداز میں شاعر کے شعور پر حاوی ہوتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ یہاں میں انسانی وجود کو 'وجودِ محض' کے مسئلے سے قدرے مختلف سمجھتے ہوئے اعظمی صاحب کی شاعری کے توسط سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ ان نظموں میں جو انسان منعکس ہوتا ہے وہ اپنے خیر و شر کا آپ ذمہ دار ہے یہ اپنی قسمت کا فیصلہ خود کرتا ہے اور اپنی ناکامیوں کے لئے کسی اور کو ذمہ دار اور انتشار کے لئے کسی اور کو موردِ الزام قرار نہیں دیتا ——

یہ انسان کچھ اتنا ٹوٹا ہوا اور منتشر ہے کہ اس کی زندگی زمانی تسلسل یا ماہ و سال کی زندگی نہیں کہی جا سکتی، وہ ہر لمحہ ایک نئی زندگی جیتا ہے اور لمحے کی زندگی اس کے پچھلے لمحے سے مختلف یا متضاد ہے۔ زندگی کے لمحاتی اختلاف اور تضاد نے حقیقت دیکھنے کے اس کے زاویۂ نظر میں بھی تبدیلی کی ہے اور اب ایک ہی حقیقت لمحوں کی تقسیم کے اعتبار سے اپنی ماہیت کی تبدیلی

کے ساتھ منکشف ہوتی ہے ـــــــ "پچھلے جنم کی کتھائیں" ایک ایسی ہی نظم ہے جس کا کچھ بھی نظر آنے والا انسان خود کو ہر لمحہ دوسرے سے الگ اور ایک نیا وجود تصور کرتا ہے ـ

وجودی انسان کا بہت مربوط اور منظم عکس ہمیں اعظمی صاحب کی طویل نظم "نیا آدمی" میں ملتا ہے۔ یہ نظم اپنے ہیئتی اور تعداد کے اعتبار سے بھی ایک بہت ہی خوبصورت اور مکمل نظم ہے۔ اس نظم کا مرکزی کردار ایک ایسا شخص ہے جس کو اپنے آباء و اجداد سے کچھ ایسے صحیفے ملے ہیں جو اس کی اور اس جیسے دوسرے لوگوں کے اعمال اور زندگی کا تعین کرتے ہیں۔ مگر انھیں میں سے کسی ایک صحیفہ میں اس شخص پر ایک نئے آدمی کی بشارت منکشف ہوتی ہے اور وہ نئے آدمی کی تلاش میں نکل کھڑا ہوتا ہے، اس کے ساتھ اسی کی طرح کے دوسرے لوگ بھی ہیں مگر تلاش و جستجو اور انتظار کے باوجود وہ نیا آدمی انھیں کہیں دکھائی نہیں دیتا۔ اس کتاب کو بار بار پڑھا جاتا ہے اور نئے آدمی کی شناخت کے نشانات ڈھونڈھے جاتے ہیں مگر منزلوں منزلوں خاک اڑانے کے باوجود انھیں ناکامی کے علاوہ اور کچھ نہیں ملتا اور ناچار وہ مجبور ہو کر وہ اپنی قسمتوں کا فیصلہ خود کرتے ہیں اور انھیں نیا آدمی اپنی ذات میں ہی مل جاتا ہے ـ

اور پھر یوں ہوا
ہم نے اپنے گھروں میں
جلائے خود اپنے دیئے
ہم نے بکھرے ہوئے خواب
ٹوٹے ہوئے آئینے
پھر سے جوڑے
بجھے جسم کی راکھ سے
سر اٹھائے ہوئے ایک ننھے سے شعلے کو
اور اپنے چہرے میں
اک اور چہرے کو دیکھا
پھر اپنے لہو کی صدائیں سنیں
اور اپنے لئے
آپ اپنی کتابیں لکھیں ـــ

اس نظم کے مطالعہ سے ہمیں اس شعری کردار کا سراغ مل جاتا ہے جو خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلوں میں بہت بکھری ہوئی شکل میں دکھائی دیتا ہے ـــــــ اس شعری کردار کے خد و خال کا تعین "نیا عہد نامہ" اور "زندگی اے زندگی" کی غزلوں سے ـ جستہ جستہ کے مختلف اشعار میں جھلک دکھلانے کے ٹکڑوں کو جوڑ کر بہ آسانی کیا جا سکتا ہے۔

ہمارے یہاں اس وقت جو شاعری کی جا رہی ہے اُسے دو بہت نمایاں خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، ایک خانے میں تو ایسے شاعروں کا کلام رکھا جائے گا جس کی ادبی تربیت آزادی کے بعد کے ماحول میں ہوئی اور دوسرے خانے میں ایسے شعرا آئیں گے جن کی شعری کاوشیں آج بھی استادی و شاگردی کے زمانے کی یاد دلاتی ہیں اور جو پرانی لفظیات اور کلیشز کے تحت اسیر ہیں۔ ہم پہلی قسم کے شاعروں کو زندہ ادب کی گفتگو کرتے ہوئے قابل ذکر بھی نہیں سمجھتے مگر یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے۔ ایسے لوگ ہر دور کا طرح کسی بھی شعری تجربے کرنے والوں اور پرانی لفظیات سے انحراف کرنے والوں کی ٹانگ کھینچتے رہے ہیں سو آج بھی ایسے لوگ پائے جاتے ہیں ـــــــ ان دو خانوں کے علاوہ ہماری شاعری میں بیک وقت جتنے رجحانات نمایاں ہیں ان کی تقسیم کے لئے ہمیں کئی اور خانے بنانے ہوں گے۔ میں نے یہ بحث یہاں اس لئے اٹھائی ہے کہ آپ کو یہ سوچنے پر آمادہ کر سکوں کہ آخر خلیل الرحمٰن اعظمی اور ان جیسے معدودے چند شعراء کو کس خانے میں رکھا جا سکتا ہے ـــ میں جہاں تک غور کر سکا ہوں خلیل الرحمٰن اعظمی کی ذہنی تربیت قدیم اور روایتی ماحول میں ضرور ہوئی تھی مگر اپنے دور کے معاصر بہت سے شعراء کے برخلاف انھوں نے اپنے تخلیقی سفر میں عصری تبدیلیوں کا نہ صرف ہمیشہ خیال رکھا بلکہ بدلتے ہوئے زمانے اور اس کے ساتھ بدلتی ہوئی اقدار کا انھیں عرفان بھی حاصل رہا ـــــــ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری ہمیں اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ شاعر مسلّمہ اقدار، روایات، عقائد اور نظریات کے کھوکھلے پن کو محسوس کرتے ہوئے مثبت انسانی اقدار کے خاتمے اور فقدان پر افسردہ اور حیران ہے، مگر اس کے ساتھ ساتھ وہ عصر زندگی کی حقیقتوں کی شناخت بھی رکھتا ہے۔ اس ملی جلی کیفیت کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کی شاعری میں کبھی طنز کا لہجہ غالب آ جاتا ہے تو کبھی لایعنیت ABSURDITY کے رویے کا اظہار ہوتا ہے اور کبھی مثبت اقدار کے خواب اور ٹوٹتے ہوئے رشتوں اور قدروں کے تقابل کرنے اور ان کے مابین ربط کی تلاش و جستجو کا انداز نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے ـ

سر پھرے سب جمع ہوں سب کے سروں پر ہو ایاغ
بس چلے تو ہم بھی ایسا جشن اک برپا کریں!

جو حشر ہوگا سو ہوگا سفینۂ جاں سے
یہی بہت ہے کہ اک بحر بے کنار ہوں میں

یاروں نے جا کے خوب زمانے سے صلح کی
میں ایسا بد دماغ یہاں بھی بچھڑ گیا

بس اک حسینؓ کا نہیں ملتا کہیں سراغ
یوں ہر گلی یہاں کی میں کربلا ملی

آدم کے واسطے یہ زمیں تنگ ہو گئی
آدمؑ کو حق رہائش بہت ہے یاں

ٹی چنمیا پہنچی گورِیا سب دھوبی کے گھاٹ پہ جائے
سب کے میل کو اک پانی سے دھونے والا دھوتا ہے

'آئینہ در آئینہ' 'ان کہی' اور 'لمحے کی موت' کے عنوانات کی نظمیں بھی اسی قبیل کی ہیں۔ ان نظموں میں وقت کی حقیقت اور وقت کے پس منظر میں اقدار کی شکست و ریخت اور اس پر شاعر کے شدید ردِ عمل کا اظہار ملتا ہے ——— "زندگی اے زندگی" کی اور بھی کئی نظمیں اپنے طنزیہ لب و لہجہ، خود کلامی اور استفہامیہ انداز کے پس منظر میں اسی حقیقت کو پیش کرتی ہیں۔ اس مجموعہ کی نظموں میں چند نظمیں خلیل الرحمٰن اعظمی کی زندگی کے اُن آخری دو سالوں کی ہیں جن کو پہلے ہم میں نے زندگی اور موت کی کشمکش کے سال کہا ہے۔ آپ ذرا اس آدمی کے بارے میں سوچئے جو دو سال تک خونی سرطان کے مرض میں مبتلا ہے اُسے اپنے مرض کا علم ہے اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ موت ہر لمحہ اس کے سر پر منڈلا رہی ہے۔ ایسے کسی شخص کے لئے عام طور پر سوائے خود ترحمی کا انداز اختیار کرنے یا زندگی کے بارے میں منفی رویہ اختیار کرنے کے کوئی اور چارۂ کار نہیں ہوتا۔ مشیت کے اس جبر کو دیکھئے اور پھر ایک نظر شاعر کے اس دور کے کلام پر ڈالئے تو پتہ چلتا ہے کہ شاعر اس جذباتی اور ناقابلِ برداشت حقیقت کو جس طرح انگیز کرتا ہے جیسے اس کے لئے موت زندگی کے خاتمہ کے بجائے زندگی کا ایک لازمی حصہ اور ناگزیر انجام ہو۔ اس کے یہاں یہ حقیقت موت کے خوف یا ہیبت کی شکل میں سامنے نہیں آتا بلکہ زندگی پر اس کا یقین کچھ اور پختہ ہو جاتا ہے اور اس کی شاعری میں 'زندگی' اور وجود کے مسائل تخلیقی تازگی اور ندرت کے ساتھ رونما ہوتے ہیں ———

وہ اس صورتِ حال میں اپنے تخیل کی مدد سے اس شہرِ خموشاں کی سیر کرتا ہے جسے ہم 'قبروں کا شہر' کہہ سکتے ہیں' وہ "کتبے" لکھتا ہے اور ان کتبوں میں بڑی ہی زندہ دلی کے ساتھ مرنے والے کی موت پر اس کے تاثر بھی

متعلقین اور دنیا کے دوسرے انسانوں کے تاثرات کا مطالعہ کرتا ہے۔ وہ اپنی غزلوں میں 'زندگی' کے لفظ کو نئے رنگ، نئے آہنگ اور نئی تخلیقی قوت کے ساتھ بار بار استعمال کرتا ہے اور کسی طرح بھی زندگی کی شکست تسلیم کرنے پر آمادہ نظر نہیں آتا۔

میں آخر میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی دو طویل نظموں "سانپ نامہ" اور "تانڈو ناچ" کا ذکر کرنا چاہوں گا۔ ان دونوں نظموں میں الفاظ کے ساتھ اصوات کی سطح بہت نمایاں ہے۔ ان میں شاعری اور موسیقی کچھ اس طرح مل گئی ہے کہ شاعری لفظوں کے سہارے فضا آفرینی کا کام کرتی ہے اور موسیقی اصوات کی مدد سے مختلف ایسی کیفیات اور جذباتی ارتعاشات پیدا کرتی ہے جو اس فضا کو خوف اور تحیر سے بھر دیتی ہے ——— "تانڈو ناچ" پر چند سطور میں کچھ کہنا ممکن نہیں اس لئے اس کو کسی اور موقع کے لئے چھوڑتا ہوں اور آپ سے رخصت ہوتا ہوں — OO

عبد الحمید
معرفت منور علی، ۴۹۳، سلطان پور بھاوا، الٰہ آباد

خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید میں توازن

سرور صاحب کے تنقیدی اندازِ فکر کو اگر ایک لفظ میں ظاہر کرنا مقصود ہو تو "توازن" سے بڑھ کر کوئی اور صفت انکے لئے موزوں نہیں معلوم ہوتی۔"

(ترقی پسند ادبی تحریک صـ ۳۶۲)

خلیل الرحمٰن اعظمی ایک عہد آفریں شخصیت کے مالک تھے۔ ہو سکتا ہے کہ بادی النظر میں "عہد آفریں شخصیت" والی بات کچھ بڑی معلوم ہو لیکن اگر خلیل صاحب کی خدمات کو، ان کے ادبی کارناموں کو، ان کی بے لاگ تنقیدوں کو، اس کے اصل سیاق و سباق سے الگ نہ کیا جائے۔ تو یہ بات کچھ ایسی غلط نہ معلوم ہوگی۔ عہد آفریں شخصیت میں توازن کی جس خوبی کا پایا جانا اشد ضروری ہوتا ہے خلیل صاحب میں وہ خوبی بہ درجہ اتم موجود تھی۔ انکی تنقیدوں میں یہ خوبی کھل کر سامنے آتی ہے۔ دراصل جب تک کسی آدمی میں کامل اندرونی اور بیرونی ہم آہنگی پائی نہیں جاتی، تب تک اس کی شخصیت کا بڑا بننا ناممکنات میں سے ہے۔ توازن کی یہ خوبی خلیل صاحب کی تنقید کو ادھر یا اُدھر ہونے نہیں دیتی یا دوسرے الفاظ میں افراط و تفریط سے محفوظ رکھتی ہے۔ اردو تنقید میں ایسا توازن کم پایا جاتا ہے۔ ادھر یا ادھر ہونے کا رجحان ہمیشہ ہی بہت زیادہ رہا ہے۔ اس کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ گروہ بندی کا عمل دخل بہت ہی زیادہ رہا ہے۔ اپنے آپ کو غیر جانبدار رکھ کر، معروضی طور سے کسی ادبی مسئلے پر غور و فکر کرنے والے ہمیشہ سے کم رہے ہیں۔ گروہ بندی اور نظریاتی اکھاڑے بازی نے ادب کے بنیادی مسائل کی طرف اور فروع سے ہٹ کر اصل کی طرف سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی ہے۔ خلیل صاحب نے اپنے لئے یہ مہلت حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے اپنی مشہور کتاب "ترقی پسند ادبی تحریک" میں آل احمد سرور کی تنقیدوں کا تجزیہ کرتے ہوئے جو مندرجہ بالا بات

شاعر، بمبئی

کہی تھی، وہ خود ان کی تنقیدوں پر حرف بہ حرف صادق آتی ہے۔ اسی توازن کے عنصر کی بدولت انھوں نے آزادیٔ رائے اور خود اپنی نظر سے دیکھنے اور اپنے ذہن سے سوچنے پر زور دیا۔ اس عالم میں کہ ترقی پسندی کے ایک بندھے ٹکے تصور کا دور دورہ تھا۔ اور اس تصور سے ہٹ کر سوچنے کی جرأت اچھے اچھوں میں نہ تھی۔ اس وقت خلیل الرحمٰن اعظمی نے "ترقی پسند ادبی تحریک" جیسی معرکۃ الآرا، کتاب لکھی۔ جس میں انہوں نے معروضی طریقۂ کار سے تحریک اور اس کے ادب و تنقید کا تجزیہ کیا۔ یہ کتاب عملی تنقید کا کارنامہ کہی جا سکتی ہے۔ خلیل صاحب نے یہاں ترقی پسندی پر لکھتے ہوئے صدہا عصری ادبی مسائل جن کا تعلق ہر عصر سے رہا ہے، ان سب کا احاطہ کیا ہے۔ انکی باریک بینی اور ژرف نگاہی پر حیرت ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خلیل صاحب کی تنقیدوں سے چودھری محمد نعیم کی اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ "خلیل صاحب اردو ادب کی جیتی جاگتی انسائیکلوپیڈیا تھے"۔ بڑے بڑے چٹان مسائل کو خلیل صاحب نے جس طرح حل کیا ہے، وہ ادب کا ایک کوہ کن ہی کر سکتا ہے۔ خلیل صاحب نے ہمیشہ شاعر کو شاعر سمجھنے اور ادب کو ادب سمجھنے پر اصرار کیا ہے۔ دراصل انکا سابقہ خود بھی اوّل اوّل متعصب ذہنوں، لاصفت نقادوں اور ایک ہی ڈھول کو پیٹنے والے محدود استعداد، نعرہ بازوں سے پڑ چکا تھا۔ وہ شروع ہی سے ادب کو مذہبی عقیدہ سمجھنے سے گریزاں تھے۔

پہلے پہل خلیل صاحب نے چند دوستوں کے ساتھ مل کر علی گڑھ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی تھی۔ وہ اس انجمن کے سکریٹری بھی تھے۔ اس سلسلے میں جیل یاترا بھی کر آئے تھے۔ وہ خود لکھتے ہیں:

"انجمن کی سرکردگی کا بار، بار بار میرے کاندھوں پہ ڈالا گیا۔"

لیکن دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ وہ دھیرے دھیرے ترقی پسند تحریک، اس کے مخصوص عقائد اور لائحۂ عمل سے دور ہوتے گئے۔ اس کی مکمل داستان "نیا عہد نامہ" کے دیباچہ میں بیان ہوئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں :

"میری شاعری ابھی ابتدائی دور سے گذر رہی تھی۔ علیگڑھ میں نئے ادب اور نئے افکار سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کا ایک خاص حلقہ بن گیا تھا۔ جس میں اشعر ملیح آبادی مرحوم، قاضی سلیم، فرید بخش قادری، سید مصلح الدین باقر مہدی، اصغر عباس، تصور حسین زیدی، سید یوسف حسن اور ریاض الدین نیر شامل تھے۔ انھیں دنوں ہم سب نے مل کر علی گڑھ انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ڈالی۔ جس کے جلسے ہر ہفتہ الحمرا ریستوراں میں ہونے لگے۔" (نیا عہد نامہ" دیباچہ)

آگے انہوں نے بتایا ہے کہ ان جلسوں میں ہر مکتبۂ فکر کے شاعر اور ادیب آتے تھے۔ اس کے بعد تقسیم کا ہنگامہ برپا ہوا۔ اور کچھ دنوں کے لئے تمام ذہنی و ادبی مشاغل ترک ہو کر رہ گئے۔ پھر دوبارہ "کلیاتِ میر" نے خلیل صاحب کی زندگی میں جان ڈالدی۔ تقسیم کے بعد دوبارہ علی گڑھ میں انجمن کی تنظیم ہوئی۔ اور خلیل صاحب پر اس کا بار ڈالا گیا۔ لیکن اب انھیں رفتہ رفتہ محسوس ہونے لگا تھا کہ انجمن میں وہ فراخ دلی اور کشادگی باقی نہیں رہی۔ انجمن کی اس کمی نے خلیل صاحب کو ذہنی و عملی سطحوں پر انجمن سے دور کرنا شروع کر دیا۔ لکھتے ہیں :

"میں زندگی اور ادب کے سلسلے میں اس تصور سے مطابقت نہیں کر پاتا تھا۔ جس میں ضرورت سے زیادہ غلو کیسے پن اور سنجلہ نقطۂ خیال کی کارفرمائی ہوتی۔ پرانی مذہبی اخلاقی اور تہذیبی قدروں سے میں نے اپنا ناطہ اسی لئے توڑا تھا کہ میرے نزدیک ان میں ادعائیت اور انجماد پیدا ہو گیا تھا۔ اور وہ زندگی کے نامیاتی اور حرکی تصور کا ساتھ نہیں دے پا رہی تھیں۔ ترقی پسندی میرے نزدیک زندگی کے انھیں حرکی تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کا نام تھا۔ مگر میں آہستہ آہستہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ ترقی پسندی کے دعویدار ترقی پسندی کا بھی جامد اور محدود تصور رکھتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں جس شدت سے کام لے رہے ہیں، وہ اسی نوعیت کی ہے جو داعظوں اور محتسبوں کی خصوصیت ہے۔ اور جن سے بیزار ہو کر میں نے اس تحریک کے دامن میں پناہ لی تھی۔" ("نیا عہد نامہ" دیباچہ)

اس اقتباس کو پڑھتے ہوئے اس کا بھی ضرور خیال رکھنا چاہیے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی ایک مولوی گھرانے کے فرد تھے۔ اور انھیں مذہب و اخلاق کی ایک قدیم اور کڑی روایت ملی تھی۔ لیکن اس روایت سے بیزار ہو کر انھوں نے تحریک میں پناہ لی تھی، اس لئے کہ وہ حقیقت کو ہمہ جہت اور ہزار رنگ سمجھتے تھے اور حقیقت کو بطور کل ہی دیکھنا پسند کرتے تھے۔ کسی جزو پر زور دینے سے اور اسی کو سب کچھ سمجھ لینے سے حقیقت کا مکمل عرفان نہیں ہو سکتا ہے۔ ادب بھی چونکہ حقائق کے اظہار کا ایک سلسلہ ہے۔ اس لئے وہ بھی ہمہ جہت اور ہزار رنگ ہے۔ وہ کسی ایک نظریے یا ایک اسلوب کا اسیر نہیں ہے۔ زندگی کی طرح ادب بھی ارتقا پذیر نامیاتی کل ہے جس کی ہزار شکلیں اور ہزار طور دور بہ دور دیکھے جا سکتے ہیں۔ ادب میں نئے تجربات ہمیشہ ہوتے رہے ہیں۔ نئے مسائل اور نئے ماحول کی وجہ سے ادب میں شکست و ریخت اور تخریب و تعمیر کا عمل ہمیشہ ہوتا رہا ہے۔ اس رنگا رنگی اور بوقلمونی سے گھبرا کر یک رنگی اور تاریک حجرے میں پناہ لینا، زندگی اور زندگی کے ارتقا کی نفی کرنے کے مترادف ہے۔ اور ترقی پسندی کا نام لیکر یک رنگی اور محدودیت میں پناہ لینے والوں کی کمی نہ آج ہے نہ کل تھی۔ اس یک سطحی ذہنیت، جزو کو کل سمجھنے والی صفت نے ادب میں کیسے کیسے ہولناک منظر دکھائے ہیں۔ کبھی غزل کو کل شاعری مان لیا گیا اور کبھی غزل کو ایک دم ٹاٹ باہر کیا گیا۔ کبھی کلاسیکی ادب و شعر کے سرمائے سے رُو گردانی کی گئی اور کبھی ماضی پرستی کو شعار بنایا گیا۔ غرض کہ ادب و زندگی کا تعلق ثابت کرنے والوں نے زندگی کو بھی یک جہت اور ادب کو بھی یکسر سمجھ لیا، جس کے نتیجے میں ادب میں ایسی یکسانیت آگئی کہ ادب کے قاری کو ادب سے توبہ تلّا کرنی پڑی۔ خلیل صاحب ادب زندگی میں خانہ گری کے قائل نہیں ہیں۔ ادبی بصیرت نے انھیں یقین دلایا ہے کہ زندگی ساکت ہے نہ ادب جامد۔ شاعر اور ادیب کا تخلیقی عمل اتنا یک رنگ، اکہرا، نہیں ہوتا جتنا ادب کی جمالیاتی اقدار سے گریز کرنے والوں نے سمجھ لیا ہے۔ وہ ایسا پیچ پیچ ہوتا ہے کہ بظاہر ایک تجربہ کا اظہار ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر کئی تجربوں کے پس منظر شامل رکھتا ہے۔ ایک عکس کے پیچھے سینکڑوں عکس نظر

تے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خلیل صاحب ادب میں "موضوع" کی جگہ "مواد" بولنے پر زور دیتے ہیں۔ اگر موضوع اکہرا ہوتا ہے تو مواد تہ در تہ ہوتا ہے، جس میں ہزار ہا دوسرے عناصر کی آمیزش ہو جاتی ہے۔ تخلیقی عمل اسی مواد کو ہیئت بخشتا ہے۔ یعنی تجرید کا متبادل تلاش کر کے تجسیم کا عمل کرتا ہے۔ خلیل صاحب بہ وضاحت و قطعیت لکھتے ہیں:

> محض نظم، محض غزل اور محض آزاد نظم پر اصرار کرنے والوں کی ہم نوائی میں نہیں کر پاتا تھا۔ اس لئے کہ میری سمجھ کے مطابق ان اسالیب اور ہیئتوں میں کوئی تضاد اور اثرات نہیں ورنہ یہ ہیئتیں اپنی جگہ پر اٹل اور ساکت و جامد ہیں۔ اسی طرح ذاتی شاعری، غم جاناں، غم دوراں داخلیت اور خارجیت وغیرہ کی تقسیم۔ اور ان کی طول طویل بحثیں بھی مجھے بے معنی نظر آتیں۔ اور نہ یہ بات دل میں بیٹھتی تھی کہ ان میں سے کسی ایک کو طلاق کیوں دی جائے۔ تخلیقی عمل ادیب کی شخصیت، افتاد طبع، اس کی زندگی کے محسوسات و تجربات کی نوعیت اور اس کی انسانی و سماجی تعلقات کے ایک پیچ در پیچ سلسلے کا نام ہے۔ ان تمام مراحل سے فطری طور سے گزرنے کے بعد ہی شعر، نظم یا ادب پارہ اپنے اندر وہ کیفیت پیدا کر سکتا ہے جو اسے جمالیاتی قدر اور فنی حسن عطا کرتی ہے۔"
>
> ("نیا عہد نامہ" دیباچہ)

کسی باہری نظریے، اوپر سے لادے ہوئے عقیدے کی حکمرانی کی مخالفت اور اس کے بجائے فنی حسن اور جمالیاتی قدر پر زور، دنیا، نیز سماجی تعلقات کی طرح شاعر کی ذات کو بھی اہمیت دینا یہی جدیدیت کا بنیادی پتھر ہے۔ اور اس پتھر کو نصب کرنے والوں میں خلیل صاحب سب سے اوّل اور آگے تھے۔ ان کی شخصیت کا فطری توازن تھا جس نے ان سے اپنی نگاہ کی وفاداری پر زور دیا۔ یہ جدیدیت کی طرف پیش قدمی تھی اور رہبری بھی۔ ایک حبس زدہ غیر ادبی ماحول سے نکلنا تھا اور ادب و شعر کی دنیا کی رنگارنگی کے دائرے میں داخل ہونا تھا۔ خلیل صاحب نے ہمیشہ فیشن اور فارمولے سے ہٹ کر شاعری کی اور تنقید لکھی۔ چنانچہ ان کی تنقیدوں میں واضح طور سے ہم عصر نقادوں سے اختلافات ملتے ہیں۔ جدید غزل ہو یا جدید نظم، نثری نظم ہو کہ آزاد نظم، خلیل صاحب ہر صنف شعر کے لئے ایک واضح اور منطقی رائے رکھتے ہیں جو کبھی بھی اپنی روایت سے الگ نہیں رہتی۔ ان کی بیشتر باتوں کو قبول کئے بنا آج بھی چارہ نہیں ہے۔ اپنی شاعری یا تنقید کے بارے میں وہ دوسروں کے برعکس کسی کی خوش فہمی میں مبتلا ہونا نہیں چاہتے۔ اپنا بھی اسی طرح معروضی تجزیہ کرنے کی ہمت رکھتے ہیں جتنا دوسروں کے لئے۔ ان کا یہ اقتباس اس کی گواہی کیلئے کافی ہے:

> "جب بھی اپنی پچھلی نظمیں نقل کرنے بیٹھتا ہوں تو ان میں سے پچاس فیصدی ایسی نکلتیں جن کے بارے میں مجھے گمان ہوتا جیسے یہ میری ناجائز اولاد ہیں۔ اور انہیں اپنے نام سے منسوب کرنے میں مجھے پس و پیش ہو رہا ہے بقیہ پچاس فیصدی ایسی ہوتیں جو کسی نہ کسی جذباتی تعلق کے بناء پر مجھے عزیز ہوتیں لیکن دوبارہ دیکھتا تو وہ کئی اعتبار سے ناپختہ، ناتمام اور ناتراشیدہ نظر آتیں اور اسی الجھن میں بیاض خالی پڑی رہ جاتی۔"
>
> ("نیا عہد نامہ" دیباچہ)

اس طرح اپنے فن پاروں کا تجزیہ کرنا، جائزہ لینا اور وہ بھی فن کار کے لئے پل صراط سے گزرنے سے کم نہیں۔ لیکن بات یہ ہے کہ جس طرح ذہنی و ادبی توازن نے دوسروں کے بارے میں غلط رائے قائم کرنے سے باز رکھا، اسی توازن نے خود کو اپنے بارے میں کسی خوش فہمی کی گنجائش نہ رکھی۔ اسی طرح خلیل صاحب کی تنقیدوں میں حقیقت پسندی اور حق گوئی کی وہ روشنی ملتی ہے جو آگے چل کر جدید نقادوں کے یہاں جیکا جزو بن کر پیدا کرتی ہے ادب کی لازوال قدروں اور ادب کی اضافی قدروں کا شعور اب تک اردو تنقید میں عام نہیں ہوا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ لازوال قدروں کو اور اضافی قدروں کو لازوال قدریں سمجھ لیتے ہیں۔ یا دونوں کو باہم گڈمڈ کر دیتے ہیں۔ کسی وقت آزاد نظم سے نفرت کا اظہار کرنا، اور بعد میں خود بھی لمبی لمبی آزاد نظمیں کہنا (علی سردار جعفری)، کسی موقع پر ادب کو سماج میں تبدیلی و انقلاب لانے کا آلۂ کار تصور کرنا اور تخلیقی عمل کو یک رخا سمجھ کر مواد و ہیئت کی خانہ بندی کرنا، پھر موضوعات کی نیا دتی کو تخلیق کار کی عظمت کی دلیل بتلانا (احتشام حسین، ڈاکٹر عبدالعلیم)، کلاسیکی سرمائے

شاعر یکسی

یک قلم مسترد کرنا، ادب و شعر کا تفاعل سمجھ بغیر شعرا کو رجعت پرست سمجھنا یا تجربہ کرنے والوں کو نراجی کہنا (سجاد ظہیر، علی احمد، اختر حسین رائے پوری) یہ سب ایسی باتیں ہیں جو ظاہر کرتی ہیں کہ ادبی و جمالیاتی اقدار کو اضافی و سماجی و اخلاقی اقدار کو ادبی اقدار سمجھ لیا گیا ہے۔ اقدار کی اس بے شعوری یا مبہم شعور نے ایک مدت تک ادب کو ادب کے علاوہ سب کچھ سمجھنے پر اصرار کیا اور اسے سماج کا غلام بنائے رکھا۔ اس سلسلے میں غیر متوازن نقیدوں نے ادب کے قاری کو حیران اور ادب کے خواب کو پریشان کئے رکھا۔ شاعروں اور پروپگنڈسٹوں کا بول بالا ہوا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ خود کو ادیب و شاعر کہنے والے تو یہ کہتے رہے کہ ادب کی فی نفسہ کوئی اہمیت نہیں جب تک وہ عوامی نہ ہو، انقلاب کا مدعی نہ ہو، یا اشتراکی نقطۂ خیال سے نہ لکھا گیا ہو، لیکن دوسری طرف وہ لوگ جن کو سیاست داں اور کوچۂ ادب سے نابلد کہا جاتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ادب کیا ہے؟ اور ادب کا کام کیا ہے؟ اور ادیب کون ہے؟ سیاست داں کون ہے؟ ترقی پسند تحریک کی دوسری کانفرنس منعقدہ الٰہ آباد میں تقریر کرتے ہوئے پنڈت نہرو نے کہا تھا:

> "ایک بات سے میں جھجکتا ہوں وہ یہ کہ ایسا ادب (یعنی اشتراکی ادب) لکھتے وقت اکثر لوگ خاص خاص فقرے خاص نعرے دہرانے لگتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس طرح انھوں نے زبردست خیال رکھ دیا لیکن معقول لکھنے والے کے لئے یہ زیبا نہیں اور نہ اس میں آرٹ ہے، نہ کوئی خاص بات، نہ کوئی خاص پیغام، ایسی چیزوں کی جگہ صرف سیاست میں ہے۔"

(ترقی پسند ادبی تحریک ص ۴۹)

ایک سیاست داں کی زبان سے یہ فقرے جہاں خوشی کا باعث ہو سکتے ہیں وہیں ادب کے ایک المیے کو بھی پیش کرتے ہیں کہ ادیب و شاعر کو یہ سمجھانے کی ضرورت پیش آگئی ہے کہ ادب کیا ہے اور اس کا تفاعل کیا ہے؟ پنڈت جی نے آگے ادیبوں کو یہ بھی کہا ہے کہ آپ جو کچھ بھی کہیں مگر آپ کی بات [illegible] کے ذریعے ہونی چاہیئے [illegible] منطق کے ذریعے" ادب کو بہت [illegible] یوں منطق کے پیمانے پر ناپا گیا ہے۔ دراصل منطق کا تعلق براہِ راست شعور کی اوپری سطح سے ہوتا ہے اور ادب کو عوام سے خاص طور سے منسلک کرنے والے یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ شاعر یعنی

عوام یک سطحی ذہن رکھتے ہیں اور اس قسم کے ذہن میں منطق کے پیمانے پر کسی ہوئی بات ہی سما سکتی ہے، اس لئے عوامی ادب کے نعرہ باز ایسے ادب پر سب سے زیادہ زور دیتے ہیں جس میں تخیلی عناصر کم سے کم ہوں۔ اور ایسے ہی ادب کو "حقیقت پسند ادب" کا نام دیا گیا، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ جوش ملیح آبادی کو شعر کے ایک سے زیادہ سعی ہونے میں شعر کی خامی نظر آئی۔ خلیل صاحب نے بار بار اس خیال کا اعادہ کیا ہے کہ فن کار کا تخلیقی عمل ایک پیچ در پیچ عمل ہے جس میں ہم کسی ایک عنصر کو سب سے زیادہ اہم قرار نہیں دے سکتے، بلکہ اس تخلیقی عمل میں بہت سے عناصر کے امتزاج سے ایک وحدت صورت پذیر ہوتی ہے۔ اس وحدت کو بطور ایک کل کے ہی دیکھنا چاہیئے۔ اس کل میں منطق اور غیر منطقی تخئیلی عمل سبھی قسم کے عناصر شامل ہوتے ہیں۔ اس کل کے حصے بخرے کرنے میں کہیں جزو کو کل نہ سمجھ لیا جائے۔ اس لئے وہ مواد و ہیئت کی دوئی کے قائل نہیں ہیں۔ احتشام صاحب کی تنقیدوں کا تجزیہ کرتے ہوئے انہوں نے مواد و ہیئت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ تقریباً حرفِ آخر ہے اور انکی حیرت انگیز بصیرت پر شاہد ہے۔ لکھتے ہیں:

> ہمارا خیال ہے کہ تخلیقی ادب میں جس چیز کو ہم مواد کہتے ہیں وہ غیر تخلیقی ادب سے مختلف ہوتا ہے اور تخلیقی ادب میں ہیئت کی نوعیت بھی جداگانہ ہوتی ہے۔ تعمیری یا غیر تخلیقی ادب (جس میں علوم و فنون سے متعلق کتابیں اور صحافتی مضامین بھی آجاتے ہیں) جو مواد رکھتا ہے اس کی صورت سادہ ہوتی ہے۔ اسے موضوع کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اسمیں کوئی خیال، کوئی علم، کوئی واقعہ، یا کوئی اطلاع بیان کی ایک منطقی ترتیب کے مطابق تحریری صورت اختیار کرتی ہے۔ مگر تخلیقی ادب جیسے شاعری، ناول، ڈرامہ اور افسانہ وغیرہ جیسی اصناف شامل ہیں۔ اس میں موضوع ادیب کے تخیل، اس کی قوتِ اختراع، اس کے کائناتی مشاہدے اور اس کے شخصی عمل سے آمیز ہو کر ایک نئی کیفیت اختیار کرنا شروع کرتا ہے، اب وہ ایک سادہ موضوع سے ہٹ کر ادیب کا ذہنی اور حسی تجربہ بن جاتا ہے اس تجربہ کو ہم مواد کہتے ہیں۔ ...... ہیئت میں تبدیل ہو جانے کے بعد مواد اور ہیئت ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم

ہو جاتے ہیں۔۔۔۔۔۔ ادب کے متعلق یہ تصور گمراہ کن ہے کہ فلاں کا مواد اچھا ہے چاہے اس کی ہیئت اچھی نہ ہو یا اس کے برعکس یہ کہنا کہ فلاں کی ہیئت خوبصورت ہے چاہے مواد جیسا ہو۔"

(ترقی پسند ادبی تحریک ص ۲۶۹)

یہ طویل اقتباس خلیل صاحب کی تنقیدی ژرف نگاہی کی دلیل ہے۔ ادب کی کلی وحدت اس سے عیاں ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انھوں نے جہاں ہم عصر ادب پر نظر ڈالی ہے' یہ باریک بینی اور بھی نمایاں اور قابلِ دید ہے۔ جہاں انھوں نے ترقی پسند تنقید کے غیر ادبی معیاروں پر نکتہ چینی کی ہے وہیں جدید ادب اور جدید ادیبوں کی ہمت افزائی کی ہے کہ جدید ادب کا بنیادی اصول انسانی ذہن کی تخلیقی آزادی ہے۔ یہ تخلیقی آزادی ہمیں ہمیشہ مائل بہ ارتقا رکھتی ہے۔ اور زندگی کی حقیقت کا مکمل عرفان بخشتی ہے۔ خلیل صاحب کی تنقیدی نگاہ نے جدید ادب کی جیسی تفہیم پیش کی ہے اور نئے ادبی مسائل کا جیسا تجزیہ کیا ہے وہ ہمارے عہد کے کتنے ہی خود ساختہ نقادوں کے لئے چیلنج کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید غزل اور جدید نظم کے بعد جدید افسانے کے بارے میں بھانت بھانت کی باتیں کی گئیں۔ اور ابھی یہ بازار گرم ہے۔ لیکن یہاں بھی زیادہ نگاہیں مرکزی نکتے پر پہنچنے کے بجائے ادھر ادھر چکراتی رہیں' پہلے تو جدید غزل اور نظم نے چکر میں ڈالا تھا لیکن بعد میں جدید افسانے نے تو گویا بھنور کی کیفیت پیدا کر دی کہ نقاد اور تنقید غوطے کھانے لگے اور دونوں ہی کی عافیت خطرے میں پڑ گئی۔ اور پھر نثری نظم' اینٹی غزل' اینٹی افسانے نے تو نقاد کا پورا امتحان ہی لے ڈالا۔ اب اس میں کچھ کو کامیاب اور کچھ کو ناکام تو ہونا ہی تھا۔ نقاد کا منصب دراصل ایسی ہی طوائف الملوکی میں معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس کی دیدہ وری ان ہنگاموں میں ادب اور غیر ادب' اختراع اور فیشن' تجربہ برائے تجربہ اور تخلیقی تجربہ میں امتیاز کر لیتی ہے۔ اس کا ذہن آزاد' فعال اور غیر جانبدار ہوتا ہے۔ وہ فن کو اس کے عہد کے عوامل و محرکات اور فن کار کے نفسیاتی پس منظر میں رکھ کر دیکھ سکتا ہے۔ اور اس طرح تعینِ قدر کر سکتا ہے۔ خلیل صاحب کی ہمہ گیر شخصیت نے ماضی کے ادبی ورثے سے لے کر موجودہ عہد تک کے ادبی سرمائے کا احاطہ کر رکھا ہے۔ جدید نظم کی پوری تاریخ انھوں نے "نئی نظم کا سفر" کے دیباچے میں سمیٹ لی ہے۔ ۱۸۵۷ء سے

شاعری' بھی

۱۹۳۶ء تک اور پھر آزادی کے بعد نئی نظم پر تفصیلی نظر ڈالی ہے۔ نئی نظم نگاری کا تجزیہ اور اس کی تفسیر کرتے ہوئے انھوں نے نئی نظم کے بنیادی محرکات کو اجاگر کر دیا ہے۔ انہیں بنیادی محرکات کی لاعلمی کے باعث کتنے ہی لوگ تنقید میں رسوا ہوئے ہیں۔ اس مسئلے سے عہدہ برآ ہونے کے لئے خلیل صاحب کی یہ چند سطریں پڑھئے:

"۱۹۵۵ء کے بعد اردو نظم نگاروں کی ایک نسل سامنے آئی ہے۔ یہ نسل ان نوجوانوں کی ہے جنھوں نے آزادی اور تقسیم کی فضا میں آنکھ کھولی تھی۔ یہ دور برصغیر ہند پاک میں تہذیبی' سیاسی' اخلاقی اور سماجی اقدار کی شکست اور پائمالی کا دور ہے۔ نظریہ' عقیدہ' نصب العین' آدرش' خوش آیند مستقبل کا خواب' جماعتی وابستگی اور اجتماعی تحریکوں پر یقین کا طلسم ایک ایک کر کے بکھرنے لگا۔۔۔۔ یہ کیفیت ایک طور پر عالم گیر بھی کہی جا سکتی ہے اور انسان کے موجودہ المیہ اور کرب کے پیچھے اس طرح ہزارہا اسباب و عوامل ہیں۔ مغرب میں اگر سائنسی اور صنعتی تہذیب کی حشر سامانیاں ہیں تو ہمارے یہاں آزادی' جمہوریت' مساوات اور رواداری' انسانیت' سماجی روابط اور اس طرح کی دوسری حقیقتوں کی بے حرمتی ہے۔ اس کیفیت نے اردو نظم کو بھی متاثر کیا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں جو رجحان ابھر کر سامنے آیا ہے وہ نظم میں شخصی طرزِ احساس اور انفرادی زاویۂ نظر پر اصرار کا ہے۔"

("نئی نظم کا سفر" دیباچہ)

اسی طرح جدید غزل کے سلسلے میں افراط و تفریط سے الگ ہو کر' اس کے محرکات کا جائزہ لیا ہے۔ مجموعی طور پر جدید شاعری اور جدید ادب پر جتنا کچھ لکھا گیا ہے۔ جدید غزل' جدید نظم اور جدید افسانے پر اس نسبت میں کم لکھا گیا ہے۔ ایسے حضرات کی کمی نہیں جو جدید غزل کو ظفر اقبال کی اینٹی غزلوں تک محدود کرتے ہیں اور آج بھی "سورج کو چونچ میں لئے مرغا کھڑا رہا" کی دہائی دیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ادب کے بے شعوروں کی ایک خاص جماعت میں رکھنا چاہیے۔ لیکن ایسے حضرات جو سنجیدہ مطالعہ کرتے ہیں انھوں نے بھی جدید غزل کو منھ

نہیں لکھا ہے۔ جدید غزل پر خلیل الرحمٰن اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی، وزیر آغا اور چند دوسرے لوگوں کے وقیع مضامین کو چھوڑ کر اور کچھ قابلِ ذکر نہیں ہے۔ نئی حسیت اور نئے رویے نے مختلف اصناف میں اپنا اظہار کیا ہے۔ سب سے پہلے تو یہ ضروری ہوتا ہے کہ نئی حسیت کو ہر رُخ سے پہچانا جائے۔ اس کے بعد اس حسیت کے ہر اظہار کی تہہ تک بہ آسانی پہونچا جا سکتا ہے۔ غزل کی اپنی ایک محکم روایت رہی ہے اور جدید غزل بھی اس روایت سے الگ نہیں ہے۔ لیکن اس روایت نے آج پنج شاخے کی شکل اختیار کر لی ہے۔ جدید غزل میں روایت کے تاگے کو صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ خلیل صاحب اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ :

> "غزل کی اپنی ایک مستحکم روایت یہ ہے کہ اس نے ہمیشہ رمز و ایمان کا سہارا لیا ہے اور علامات اور اشاروں میں گفتگو کرتی رہی ہے۔ جب بھی غزل نے اپنے مخصوص ایمائی اور رمزیاتی انداز کو ترک کر کے دوسری ڈگر اختیار کی ہے۔ اس کا دار ہلکا پڑ گیا ہے۔" (مضامینِ نو صفحہ)

جدید غزل نے غزل کی روایت میں نئے ابعاد کا اضافہ کیا ہے۔ ڈکشن میں تبدیلی ہوئی ہے۔ نئی علامات اور نئی ترکیبوں کا اضافہ ہوا ہے۔ رموز و علائم کے لئے الفاظ نئے ماحول سے لئے گئے ہیں۔ نئی حسیت کا اپنا الگ ردِّ عمل ہے اور اپنا مخصوص طرزِ اظہار۔ یہ نئی حسیت اور نیا رویہ ہر موضوع کو اپنے طور سے سمجھتا اور پیش کرتا ہے نہ کہ پہلے سے بنے بنائے طریقوں سے یا پہلے سے بنی بنائی ترکیبوں سے۔ لیکن ہر حال میں غزل آج بھی رمز و ایما ہی کا سہارا لیتی ہے نہ کہ برہنہ گفتاری کا۔ اس بات کو سمجھنے کے بعد ہم غالباً جدید غزل کی تفہیم اچھی طرح کر سکتے ہیں اور بے بنیاد الزام تراشی سے بچ سکتے ہیں۔ لیکن نئی غزل ہو یا نیا افسانہ یا نثری نظم ــــ ان سب کا روایت سے تعلق اور روایت سے جگہ جگہ انحراف و انقطاع دونوں برابر اہمیت کے حامل ہیں۔ دشواری دراصل وہاں پیش آتی ہے جہاں سے یہ اصناف انحراف و انقطاع کی صورت اختیار کرتی ہیں کہ ان نئی صورتوں کی عادی ہماری نگاہ نہیں ہوتی۔ اس لئے بادی النظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ روایت سے اس نئی شکل کا کوئی تعلق نہیں۔ یہی صورتحال نئے افسانے کی ہو گئی ہے ـــ اپنے مضامین اور گفتگو میں خلیل صاحب نے ان نئی انقطاعی شکلوں پر خاطر خواہ روشنی ڈالی ہے۔ انکا دار ہمیشہ بھرپور اور انکی بات ہمیشہ جامع ہوتی ہے۔ وہ ہمیشہ نئے فن پارے

شاعر، بمبئی

کو اس کی پوری روایت کے سیاق و سباق میں رکھ کر دیکھتے ہیں۔ اسلئے نئے فن پاروں کا انقطاعی صورت کی تفہیم نسبتاً آسان ہو جاتی ہے۔ لیکن اس کے لئے شرط ہمہ گیر شخصیت کا ہونا ہے۔ ایسی ہمہ گیر شخصیت جو متوازن اور دُور رس نگاہ بھی رکھتی ہو۔ مثلاً خلیل صاحب نے نثری نظم کا جائزہ لیتے ہوئے ادبِ لطیف کے فن پاروں کی طرف واضح اشارہ کیا ہے۔ کیونکہ ادبِ لطیف کے نثر پاروں میں بھی الفاظ کا شاعرانہ تفاعل کام کر رہا تھا۔ اور الفاظ کا شاعرانہ تفاعل جہاں بھی ہوگا اسے ہم شاعری ہی کہیں گے خواہ نثری شاعری ہی کہیں۔ شعر و ادب کے بنیادی نقطوں پر کہیں واضح اور کہیں بین السطور خلیل صاحب اشارہ کرتے جاتے ہیں۔ بہ حیثیت مجموعی خلیل صاحب کی تنقید پر نظر ڈالنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تنقید جامع، متوازن اور بھرپور ہوتی ہے۔ اُن کی تنقیدوں میں تشنگی کا احساس نہیں ہوتا۔ اور دھیان بار بار توازن اور تناسب کی طرف جاتا ہے۔ یہ تنقید سطحی اور لفظی آرائش سے ہٹ کر براہِ راست فنی حقائق سے بحث کرتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ ایک خوشگوار نثری آہنگ پوری تنقید میں جاری و ساری ہوتا ہے۔ ہو سکتا ہے نثر کی یہ خوبی آستانۂ شبلی کا معنوی فیض ہو۔ انھوں نے اپنی تنقیدوں میں معروضی، تجزیاتی اور عملی تنقید کی اعلیٰ مثالیں پیش کی ہیں۔ شگفتہ نثر کے ساتھ ساتھ معنوی گہرائی خلیل صاحب کی تنقید کو کبھی بھی سطحی اور ہلکی نہیں ہونے دیتی۔ وہ دراصل ایک قاموسی آدمی ہیں۔ یہاں اس کی وضاحت ضروری ہے کہ انہوں نے قاموسی آدمی مجنوں گورکھپوری کو کہا تھا۔ معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے دوسرے نقادوں کا مطالعہ کرتے ہوئے خود اپنی شخصیت اور اپنی تنقید کا مطالعہ پیش کر دیا ہے۔ جس طرح آل احمد سرور کے بارے میں کہی گئی بات خلیل صاحب پر صادق آتی ہے اسی طرح مجنوں گورکھپوری کو دی ہوئی قاموسی آدمی کی اصطلاح بھی ان پر پوری طرح چسپاں ہے۔ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس توازن جس کی طرف بار بار اشارہ کیا جا چکا ہے کسی وجہ سے ان کی تنقید ہنگامہ خیز نہیں ہے یا ادب میں کسی نئے بُعد کی طرف اشارہ نہیں کرتی۔ لیکن اسکے باوجود ان کی تنقید حقیقی اور گہری ضرور ہے۔ اور حالانکہ وہ بہت پُرسکون معلوم ہوتی ہے لیکن اس سکون تک ہزاروں فکری نشیب و فراز کے بعد خلیل صاحب پہونچے ہیں۔ یہ فکری نشیب و فراز یقیناً ہنگامہ خیز رہے ہوں گے۔ خیر ان سب سے بڑی بات یہ ہے

باقی صفحہ ۱۰۵ پر دیکھیے

نسیم شہنوی
۱۴۳ ۔ ٹی ٹی ۔ آئی کیمپس، سیہور ۔ (ایم ۔ پی)

خلیل الرحمن اعظمی "نیا عہدنامہ" کے آئینے میں

شعر و ادب اور علوم و فنون سے تعلق رکھنے والی ہستیاں ہر عہد میں نظر آتی ہیں۔ شعراء اور نثر نگاروں کے کارنامے اور انکی خدمات کا ذکر تاریخ ادب میں کیا جاتا رہا ہے۔ لیکن کچھ ہستیاں ایسی ہوتی ہیں جو عہد ساز کہی جا سکتی ہیں۔ عہد جدید میں سر سید اور ان کے رفقاء ایسی ہی عہد ساز ہستیوں میں گنے جاتے ہیں۔ عہد جدید میں تاریخی حالات کے اثرات کے زیر اثر لکھنؤ اور دہلی کی مرکزیت ختم ہوگئی اور ہندوستان کے مختلف علاقوں میں اہل قلم پیدا ہوئے۔ اس طرح شعر و ادب ہندوستان گیر پیمانے پر عام ہوا۔

ہندوستان کے اس نقشہ پر اعظم گڑھ شبلی کی وجہ سے نمایاں ہوا۔ کم و بیش ایک صدی کے عرصہ میں اعظم گڑھ نے تین اہم ادبی شخصیتوں کو جنم دیا۔ یہ ہیں شبلی، پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی۔ شبلی نعمانی[1] عناصر خمسہ کا سب سے کم عمر لیکن "رفیع عنصر" تھے۔ شبلی نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اعظم گڑھ میں مستقل قیام کیا اور "دار المصنفین" کی بنیاد ڈالی۔ انہوں نے مشرقی یوپی کے اس خطّے میں ایک ایسا چراغ روشن کیا جس کی روشنی زمانے کے ساتھ بڑھتی ہی گئی۔ پروفیسر احتشام حسین اور ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی جیسی شخصیتوں نے ادب میں گراں قدر اضافے کئے۔ شبلی سر سید تحریک کا سرگرم عنصر تھے۔ احتشام حسین نے ترقی پسند تحریک کو وقار بخشا۔ خلیل الرحمن اعظمی نے شاعری کی ابتدا جمالیاتی اور رومانی طرز کی شاعری سے کی لیکن ان کا فن ابتداً ترقی پسندیت کے زیر اثر پروان چڑھا اور انہوں نے ترقی پسندیت سے جدیدیت کی مراجعت کی لیکن آہستہ آہستہ انہوں نے یہ ثابت کیا کہ وہ مقلد نہیں بلکہ منفرد حیثیت کے مالک بھی ہیں۔ ترقی پسندیت سے جدیدیت کی طرف آئے لیکن دونوں کی ہی انتہا پسندی سے انہوں نے اپنے دامن کو محفوظ رکھا۔ یہی ان کا کارنامہ اور انکی عظمت کا ثبوت ہے۔ شاعری اور تنقید نے انہیں یکساں شہرت دی۔ ان کے شعری مجموعے "کاغذی پیرہن" (۱۹۵۵ء) "نیا عہدنامہ" (۱۹۶۵ء) مضامین کے مجموعے "فکر و فن" "زاویۂ نگاہ" اور "مضامین نو" مفصّل تنقیدی مقدمے کے ساتھ مرتبہ کتابیں "مقدمہ کلام آتش" "نوائے ظفر" "نئی نظم کا سفر" اور انکی تحقیقی تصنیف "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" ہیں۔ ان کے علاوہ مختلف موضوعات اور ادبی مسائل پر تحقیقی اور تنقیدی مضامین ہند و پاکستان کے اہم ادبی رسائل کی زینت بنتے رہے ہیں۔

اعظمی کو ہم آج نقّاد کی حیثیت سے بھی اہمیت دیتے ہیں اور ایک شاعر کی حیثیت سے بھی۔ انہیں ابتداً شہرت شاعر کی حیثیت سے کم اور نقّاد کی حیثیت سے زیادہ ملی۔ آتش پر ان کے مضامین نے جو "نگار" میں شائع ہوئے لوگوں کو چونکا دیا۔ انھوں نے حسرت پر جو مضمون "نگار" کے "حسرت نمبر" میں لکھا اس کی داد نیاز فتحپوری نے دی۔ جوش ملیح آبادی پر انھوں نے سخت تنقید کی یہ بھی بڑی جرات کا کام تھا۔ کیوں کہ اس زمانہ میں جوش اردو کے ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے ایک ایسے شاعر تھے جس پر اعتراض کا تصوّر ہی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ خلیل الرحمن اعظمی کی بے باک اور جرأتمندانہ تنقید صرف چونکانے کے لئے نہ تھی بلکہ وہ نتیجہ تھی عمیق مطالعہ اور غور و فکر کا۔ تنقیدی کارناموں کی اس منزل پر اعظمی کچھ دنوں کے لئے ٹھہر گئے اور شاعری کی طرف زیادہ توجّہ کی۔ ان کے کلام کے مجموعے "کاغذی پیرہن" اور "نیا عہدنامہ" اردو شاعری کے سرمایے میں اہمیت رکھتے ہیں۔ اس مدت میں وہ عملی تنقید کے ساتھ ساتھ نظریاتی تنقید کی طرف بھی مائل ہوئے اور تنقید کا ایک صحت مند نظریہ پیش کیا۔ اس دور میں اعظمی نے شاعر

---

[1] شبلی نعمانی ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔

شاعر، بمبئی

اور نقاد دونوں حیثیتوں سے یکساں اہمیت حاصل کی ہے۔

"نیا عہد نامہ" ان کا دوسرا مجموعۂ کلام ہے اسے خلیل الرحمٰن اعظمی کے فن کی معراج کہا جائے تو نامناسب نہ ہوگا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے جس دور میں شاعری کا آغاز کیا اس دور میں اُردو شاعری میں نیا ذہن اُبھر رہا تھا۔ لوگ روایتی شاعری سے اپنے دامن چھڑا کر اسلوب اور ہئیت کے لئے نئے نئے تجربے کر رہے تھے۔ شاعری کو عام انسانوں کے مختلف قسم کے جذبات اور احساسات سے ہم آہنگ کرنے کا رواج عام ہو رہا تھا۔ جدید تحریک سے خلیل الرحمٰن اعظمی بھی قریب آئے۔ انکی یہ وابستگی جذباتی نہیں بلکہ ان کے ذہنی رجحان کی وجہ سے تھی۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے اس تحریک سے گہری دلچسپی دکھائی اور اسے آگے بڑھانے میں سرگرم رہے۔ وہ لکھتے ہیں ؂

"میری شاعری ابھی ابتدائی منزلوں سے گذر رہی تھی علی گڑھ میں نئے ادب اور نئے فنکار سے دلچسپی رکھنے والے نوجوانوں کا ایک خاص حلقہ بن گیا تھا جس میں اشتر ملیح آبادی مرحوم، قاضی سلیم، فرید بخش قادری، سید منہاج الدین، باقر مہدی، اصغر عباس، تصور حسین زیدی، سید یوسف حسن اور ریاض الدین قیصر وغیرہ شامل تھے۔"

(دیباچہ "نیا عہد نامہ" ص۱۳)

یہ لوگ کسی بھی طرح تنگ نظری اور انتہا پسندی کے شکار نہ تھے بلکہ بڑا ہی متوازن نظریہ رکھتے تھے۔ اگرچہ یہ ادب میں فرسودہ روایات کی مخالفت کرتے تھے۔ لیکن ترقی پسندیت کے نشے میں آکر اپنے قدیم ادبی سرمائے کو یکسر مسترد کرنے کیلئے کبھی بھی آواز بلند نہیں کرتے تھے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی کی ابتدائی تخلیقات میں عشقیہ رنگ جھلکتا ہے۔ اس دور کی اکثر نظمیں "زلیخا کی آنکھیں" "خیام کے نام" "تخیل کے دیوتا" "اجنبی سائے" وغیرہ کے عنوانات سے لکھی گئی ہیں۔ اس دور کی ابتدائی نظموں میں "دوستی" اور "حبسِ دوام" وغیرہ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی تھی۔ مشہور نقاد کلیم الدین احمد نے انکی نظم "حبسِ دوام" کو ایک اچھی نظم قرار دیا تھا۔ دراصل خلیل الرحمٰن اعظمی کی تخلیقات کا نیا لہجہ اور نئے افکار و خیالات لوگوں کو متاثر کئے بغیر نہیں رہتے تھے۔ اکثر انکی تخلیقات میں داخلیت اور خارجیت کے جذبات کے ٹکراؤ کی وجہ سے ڈرامائیت کی خوبیاں پیدا ہوگئی ہیں اور اس طرح ایک شاعر ابھرا

ہی نظم میں کئی طرح کی آوازیں گونجتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے میر کے کلام سے بہت زیادہ اثر قبول کیا ہے۔ اسی وجہ سے ان کے یہاں بھی جگہ جگہ غمِ زندگی اور محرومیت کا احساس دکھائی دیتا ہے۔ لیکن انھوں نے میر کے کلام کا مطالعہ ایک نئے انداز سے کیا ہے جس کی وجہ سے ان کے یہاں انسان دوستی اور فراخدلی سے زندہ رہنے اور زندگی سے نباہ کرنے کا ہنر دکھائی دیتا ہے۔ ان کے کلام کی یہی انفرادی خوبیاں ان کو اپنے ہم عصر شعراء سے بالکل الگ کر دیتی ہیں۔ لیکن میر سے بہت قریب ہو سکنے کے باوجود وہ اپنی راہ الگ بنانے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ان کی ابتدائی دور کی نظموں اور غزلوں کا مجموعہ "کاغذی پیرہن" کے عنوان سے ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا جس کا دیباچہ اُردو کے مشہور نقاد اسلوب احمد انصاری نے لکھا۔ اگرچہ کاغذی پیرہن کی اکثر تخلیقات میں احساسات اور جذبات کی ناپختگی اور ہم آہنگی جگہ جگہ دکھائی دیتی ہیں۔ جس کا انھیں بھی احساس تھا۔ وہ خود معترف ہیں ؂

جب بھی اپنی پچھلی نظمیں نقل کرنے بیٹھتا ہوں تو ان میں سے پچاس فیصدی ایسی نکلتیں جن کے بارے میں مجھے گمان ہوتا جیسے میری ناجائز اولادیں اور انھیں اپنے نام منسوب کرنے میں مجھے پس و پیش ہو رہا ہے۔ بقیہ پچاس فیصد ایسی ہوتی جو کسی نہ کسی جذباتی تعلق کی بنا پر مجھے عزیز ترین ہوتیں لیکن انھیں دوبارہ دیکھتا تو وہ کئی اعتبار سے ناپختہ، ناتمام اور ناتراشیدہ نظر آتیں۔

(دیباچہ "نیا عہد نامہ" ص۱۲)

لیکن اسکے باوجود ان کی تخلیقی قوت اور فنی خوبیوں سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ آج بھی "کاغذی پیرہن" کی بیشتر نظمیں ادبی حلقوں میں مقبول رہی ہیں۔

دوسرا مجموعہ "نیا عہد نامہ" ۱۹۶۵ء میں شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں ۳۰ غزلیں، ۴۴ نظمیں کچھ ہجویات اور ایک شہر آشوب شامل ہے۔ خلیل الرحمٰن نے "کاغذی پیرہن" اور "نیا عہد نامہ" کے درمیان دس سال کا سفر طے کیا ہے۔ اس مدت میں وہ زندگی کے خوشگوار اور ناخوشگوار واقعات سے دوچار ہوئے۔ مختلف مسائل نے ان کے ذہن پر اثر ڈالا ہے۔

جیسے جیسے تجربات میں اضافہ ہوا اور مشاہدات میں پختگی آئی تو ان کے غور و فکر کے دھارے بھی تبدیل ہو گئے۔ "نیا عہد نامہ" کی بیشتر تخلیقات میں انھیں جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہوئی ہے۔ اس مجموعے کے بارے میں آل احمد سرور لکھتے ہیں:

> خلیل الرحمٰن اعظمی کے "کاغذی پیرہن" میں شوخیٔ تحریر کا سبھی کو احساس ہوا تھا۔ ان کا دوسرا مجموعہ "نیا عہد نامہ" زندگی اور حسن سے ایک نئی گہری محبت کا نقش جمیل بن کر سامنے آیا ہے۔ اعظمی کی اپنی آواز ہے۔ اپنا لب و لہجہ اور اپنا آہنگ ہے۔ یوں ان کے یہاں میر کی نشتریت بھی محسوس ہوتی ہے۔ مگر اس دور کے مسائل اور معاملات کے شعور نے نشتریت میں ایک نئی نوک پیدا کر دی ہے۔
>
> ("نیا عہد نامہ" پہ تبصراتی نوٹ، آل احمد سرور)

آل احمد سرور صاحب نے جس انداز سے ان کی شاعری پر اپنی رائے کا اظہار کیا ہے یقیناً یہ ساری خوبیاں ان کے یہاں پائی جاتی ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلیں عام روایتی انداز سے ہٹی ہوئی ہیں اور ان میں داخلیت اور خارجیت کی حدیں ختم ہوتی محسوس ہوتی ہیں اور ان غزلوں میں انسان کی وہ کیفیات جھلکتی ہیں جن سے آج کا انسان دوچار ہے۔ اور اس وجہ سے ان کے یہاں اشعار میں معانی کی کئی سطحیں ابھرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اس مجموعہ کی غزلیں جدید تر ذہنی کیفیات اور طرز احساس کی نمائندگی کرنے لگتی ہیں ان میں ایک نئی فضا کا رنگ جھلکتا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلوں میں پرانی علامتوں سے گریز کیا ہے۔ اور ساتھ ہی گھسی پٹی لفظیات کے بجائے تازہ علامتیں اور الفاظ کے نئے تلازمے استعمال کرنے سے ان میں ایک نیا ذائقہ پیدا ہو گیا ہے۔ ان کے ان الفاظ کو جسے ہم روزمرہ کی زندگی میں ہر جگہ زندہ جاوید اور محسوس شکل میں دیکھتے ہیں۔ مثلاً سورج، چاند، اندھیرا، سویرا، رات، دن، شام، تنہائی، سناٹا، دھند، دھواں، ہوا، دھوپ، سایہ، پرچھائیں، چہرہ، آواز، دریچہ، گھر، کمرہ، دروازہ، سڑک، راستہ، سمندر، بادبان، موسم، زمین، جزیرہ، درخت، پتہ، فصل، ٹہنی، خاک، پتھر، راکھ، ریت، ابر، حصار اور اس طرح کے بہت سے الفاظ نئی معنویت کے ساتھ استعمال کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے ان لفظیات اور اس کی مخصوص فضا میں ایک تبدیلی دکھائی دیتی ہے۔ حالانکہ ان کی بیشتر غزلیں بنیادی روایات سے ہٹی ہوئی نہیں ہیں پھر بھی شاعر نے بھی

انہوں نے واعظ و محتسب، صیاد و گل چیں، ساقی، موسیٰ و طور، قیس و فرہاد کے استعمال سے پرہیز کیا ہے۔ دراصل انہوں نے پرانی اور روایتی علامتوں کو ذہنی کیفیات کے اظہار کے لئے ناکافی سمجھ کر خود اپنے ماحول اور زندگی سے قریب ترین علامتیں وضع کی ہیں۔ اس لئے ان غزلوں کو ہم اپنے بہت قریب محسوس کرتے ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ابتداً عشقیہ اور جمالیاتی انداز کی غزلیں لکھی ہیں۔ اس دور کی تخلیقات میں وہ ساری خصوصیات موجود ہیں جو اس طرح کی غزلوں کا طرۂ امتیاز ہوتی ہیں۔ اس کے باوجود وہ غزلوں کے روایتی انداز خصوصاً اشاروں، کنایوں سے باتیں نہ کرتے ہوئے اپنی مجبوریوں اور لاچاریوں کو بہت سادہ ڈھنگ سے پیش کرتے ہیں۔ انکی یہی سادگی اور معصومیت دل کی گہرائیوں میں اتر جاتی ہے۔ اور انکی غزلوں کا سحر قاری کے ذہن پر بہت دیر تک چھایا رہتا ہے۔

میرے شعروں سے بھی بڑھ کر تیری صورت حسیں
کس طرح تجھ کو میں اپناؤں مری زہرہ جبیں
تو مجھے چاہے نہ چاہے یہ ترے بس میں تو ہے
اور میں تجھ کو نہ چاہوں یہ مرے بس میں نہیں
جلد آجا کہ کہیں بیت نہ جائے موسم
جلد آجا کہ ابھی جاگ رہی ہے زمیں

ان کی بیشتر غزلیں ہنگامی حالات، اجتماعی جذبات اور تاثرات سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہیں بلکہ ان میں ایک عام قاری کے جذبات اور احساسات کی ترجمانی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی آوازیں دور سے آتی ہوئی بلکہ جانی پہچانی معلوم ہوتی ہیں۔ انھیں خوبیوں اور انفرادی لب و لہجے نے ان کو دوسروں سے ممتاز بنایا ہے۔ ایسی غزلوں کے چند اشعار پیش کئے جا رہے ہیں۔ جن سے ان کے انفرادی لب و لہجہ اور تاثرات کو بآسانی محسوس کیا جا سکتا ہے ؎

ہنگامۂ حیات سے جاں بر نہ ہو سکا
یہ دل عجیب دل ہے کہ پتھر نہ ہو سکا
میرا لہو بھی پی کر نہ دنیا ہوئی جواں
قیمت میرے جنوں کی برابر نہ ہو سکا

ایک اور غزل میں اسی طرح کے جذبات کی عکاسی ہوئی ہے۔ اس کے چند اشعار ملاحظہ کیجیے ؎

آج رستا ہے در و بام سے یہ کس کا لہو
میری گم گشتہ تمنا تیری آہٹ تو ملی
دیکھتے دیکھتے مرجھا گئے کمسن پودے
وقت کی آگ سے اس باغ کی ہر شاخ جلی

ان کے پہلے مجموعہ "کاغذی پیرہن" پر میر کا رنگ غالب ہے۔ "نیا عہد نامہ" کی اکثر غزلوں میں بھی میر کا رنگ جھلکتا ہے۔ جگہ جگہ تنہائی، محرومی، غمزدگی اور یاسیت کے آثار دکھائی دیتے ہیں لیکن ان سے زندگی سے فرار ہونے کا کوئی جذبہ نہ پیدا ہوا کر بلکہ زندگی سے نباہ کرنے کا حوصلہ ملتا ہے۔ مثلاً انکے اس شعر کو دیکھئے ؎

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

اس شعر میں بھی یہی رنگ جھلکتا ہے ؎

زندگی جو میرے نالوں کی شناسا نکلی

خلیل الرحمن اعظمی کے یہاں ۱۹۵۵ء کے آس پاس نئی نقطۂ نظر سے تبدیلی دکھائی دینے لگتی ہے کیوں کہ اسی زمانے میں شاعری خصوصاً نظم نگاری کے میدان میں ہیئت اور اسلوب کے لحاظ سے کئی تجربات ہو رہے تھے۔ انھوں نے بھی اس نئی تبدیلی کا خیر مقدم کیا۔ وہ لکھتے ہیں ؎

"شعر و ادب کا تعلق بنیادی طور پر شاعر و ادیب کی شخصیت، اس کے مزاج اس کی افتادِ طبع اور اس کے تجربات و محسوسات کی نوعیت سے ہے یہ تجربات و محسوسات جس قدر بھی حقیقی ہوں گے، انکی جڑیں بھی زندگی میں اتنی گہری ہوں گی"

(جدیدیت اور ادب۔ جدید تر غزل ص ۲۴۶)

ادب میں حقیقت نگاری کا تصور جامد نہیں بلکہ متحرک اور تغیر پذیر ہے۔ خلیل الرحمن اعظمی بھی اس نظریے کے معترف رہے ہیں اور وہ اچھی طرح سمجھتے تھے کہ ایک چیز کا رشتہ کئی چیزوں سے ہو سکتا ہے۔ اس لئے کوئی بھی تخلیق اس وقت تک زندہ اور قائم رہنے والے فن پارے کا مقام نہیں لے سکتی جب تک کہ اس کے دامن میں بدلتے ہوئے حالات اور مسائل کو جگہ نہ ملے گی وہ یہ بھی محسوس کرتے تھے کہ ہنگامی حالات یا طے شدہ پروگرام کے تحت کی گئی شاعری کا اثر دیرپا نہیں ہوتا اور نہ ہی اس سے حقیقت نگاری کا مقصد پورا ہوتا ہے۔ ساتھ ہی ایسی تخلیقات ہر دور میں نئی کہلانے کی مستحق شاعری بھی نہ ہوں گی۔ اس لئے کہ ہر دور کے حالات اور مسائل الگ الگ ہوا کرتے ہیں۔ آج کوئی نظریہ نیا ہے تو کل وہی پرانا ہو سکتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ تحریر کرتے ہیں :

"مسلک اور نصب العین ہر دور میں پیدا ہوتے اور اپنی موت آپ مرتے رہتے ہیں۔ لیکن تخلیقی ادب کی پہچان یہ ہے کہ اس کی دل کشی اور تازگی اس وقت بھی برقرار رہے مسلک یا نصب العین سے لوگوں کو ذرہ برابر بھی دلچسپی نہ ہو۔ انسان دوستی کا بنیادی عقیدہ یا حسن، صداقت اور خیر کی جستجو اور اس کے لئے لگن اور خلوص جیسی چیزوں سے تو کسی سچے فن کار کو انکار نہیں ہو سکتا۔ اس لئے کہ ان کے بغیر کسی قسم کے احساس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا"

[جدیدیت اور ادب۔ جدید تر غزل ص ۲۴۶
خلیل الرحمن اعظمی]

ادبی تخلیقات میں نئی تبدیلی اور نئے تجربات لازمی ہیں اس طرح اردو ادب میں جدید نظریات کا رجحان کسی ادبی تحریک سے بغاوت کا نتیجہ نہیں بلکہ وہ عوامل ذمہ دار ہیں جو اس سے قبل رائج تھے۔

خلیل الرحمن اعظمی کی نظمیں خصوصاً "تنہائی سے آگے" "قیدی" "میں اور میں" میں بیانیہ یا خطیبانہ لب و لہجہ نہ اختیار کر کے ہوئے علامتی اسلوب سے کام لیا گیا ہے جن کی وجہ سے ان نظموں کا کینوس بہت وسیع ہے اور ان میں جو مناظر یا کردار پیش کئے گئے ہیں وہ دور رس اور وسیع تر حقائق کا استعارہ بن جاتے ہیں۔ انکی نظم "قیدی" میں بھوک، خواب اور نیند جیسی علامتیں استعمال کی گئی ہیں۔ اگرچہ قیدی خود ایک علامت ہے جو آج کے انسان کے لئے استعمال کی گئی ہے۔ جس طرح قیدی زنداں کوٹھری میں رہ کر طرح طرح کی اذیتیں برداشت کرتا ہے۔ اسی طرح آج کا انسان بھی اپنے چاروں طرف گھٹن، بے چینی اور کرب کے ماحول سے دو چار ہے۔ قیدی آزاد نہیں ہوتے اس لئے انہیں اپنی بہت سی خواہشات سے محروم رہنا یقینی ہے لیکن وہ لوگ جو بظاہر آزاد فضا میں سانس لے رہے ہیں محرومیوں اور مجبوریوں کا شکار ہیں۔ اسلئے وہ بہت ساری خواہشات خواب دیکھ کر ہی پورا کر لیتے ہیں۔ نظم "قیدی" کے اس بند کو ملاحظہ کیجئے ؎

بھوک کی آگ جو بجھتی ہے تو نیند آتی ہے

نیند آتی ہے تو کچھ خواب دکھاتی ہے مجھے
خواب میں ملتے ہیں کچھ لوگ بچھڑ جاتے ہیں
ان کی یاد اور بھی رہ رہ کر ستاتی ہے مجھے

(قیدی)

اسی طرح نظم "تنہائی سے آگے" میں جن احساسات اور تاثرات کو پیش کیا گیا ہے۔ آگے چل کر یہی احساسات اور تاثرات بعض بنیادی حقائق کی تلاش و جستجو پر ختم ہوتے ہیں۔ اس نظم کا ایک بند دیکھئے ؎

ان خلاؤں سے نکل کر کہیں پرواز کریں
آؤ کچھ سیر کریں ذہن کی پہنائی میں
کیوں نہ دریافت کریں ایسی گزرگاہوں کو
بات کرتی ہیں مسافر سے جو تنہائی میں

(تنہائی سے آگے)

نیا عہد نامہ کی بیشتر نظموں میں داخلی اور خارجی احساسات کے ٹکراؤ سے ایک قسم کا کرب اور تضاد کی کیفیات محسوس ہوتی ہیں۔ مثلاً "بن باس" "سایۂ دیوار" اور "دوسری ملاقات" وغیرہ میں جو شکست و پسپائی کا عالم دکھائی دیتا ہے اس کی وجہ سے ان میں ایک ذہنی تضاد پیدا ہو گیا ہے۔ پھر بھی ان نظموں میں طرزِ فکر، اسلوب اور لب و لہجہ کے لحاظ سے نئی فضا روشن ہے۔ ان کی نظم "دوسری ملاقات" کا یہ بند دیکھئے جس میں انسان کے کرب اور بے بسی کی عکاسی کی گئی ہے ؎

خاک میں روندا ہوا چہرہ مگر دلکشی
آنکھ میں ہلکا تبسم دل میں کوئی ٹیس سی
یادوں سے لپٹی ہوئی بیتے ہوئے لمحوں کی گرد
پیرہن کے چاک میں گہرے غموں کی تازگی (دوسری ملاقات)

ایک اور نظم "بن باس" بھی اسی انداز میں لکھی گئی ہے۔ اس کا بند ملاحظہ فرمائیے ؎

یوں تو کہنے کی نہیں بات مگر کہتا ہوں
پیار کا نام کتابوں میں لکھا دیکھا ہے
جب کبھی ہاتھ بڑھایا ہے کسی کی جانب
فاصلہ اور بھی کچھ بڑھتا ہوا دیکھا ہے
بوند بھر دے نہ سکا کوئی محبت کی شراب
یوں تو پیمانہ کا مے خانہ لٹتا دیکھا ہے

(بن باس)

خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں طرز اور لہجہ کی تبدیلی کھٹکتی نہیں بلکہ اس سے ان کی نظموں میں سادگی اور بے ساختگی کا ماحول پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ ماحول پڑھنے والوں کو اپنے بہت قریب کر لیتا ہے ـــــ اس طرح کا ماحول ان کی نظموں "نیا عہد نامہ" اور "فاصلہ" وغیرہ میں ملیگا۔ ملاحظہ کیجئے ؎

ایک ذرا اور قریب آؤ تمہیں پہچانوں
کیا تمہیں ہو؟ یہ وہی تم ہو؟ وہی ہیں خد و خال
وہی جس کے لئے چھپ چھپ کے عبادت کی تھی
جس کے دیکھے سے مرے دل کو قرار آتا تھا
جس کی چاہت ہی میں بنتے ہیں ابھی تک مہ و سال

(فاصلہ)

آنے ہی کو ہیں ملن کی گھڑیاں
سورج کہیں غم کا ڈوبتا ہو
مہکی ہو کہیں پہ شب کی دلہن
کچنار کہیں پہ کھل رہا ہو
ہر گام پہ ایک ہو عالم
ہر موڑ پہ اک نیا خدا ہو

(نیا عہد نامہ)

خلیل الرحمٰن اعظمی نے صرف غزلیں اور نظمیں ہی نہیں لکھی ہیں بلکہ انھوں نے ہجویات اور شہر آشوب بھی لکھے ہیں اور اُن کی یہ تخلیقات بھی بہت مقبول ہوئیں۔ اُنھوں نے اس کے توسط سے دورِ حاضر کے شاعروں، ادیبوں، نقادوں، دانشوروں اور سیاستدانوں کو اپنے طنز و مزاح کا نشانہ بنایا ہے۔ ہمارے نقطۂ نظر سے "نیا عہد نامہ" میں شامل "ایک شہر آشوب" اور "تذکرہ شعرائے اردو" "نقد نامہ" اور ناجنس وغیرہ ہجویات نظموں اور غزلوں سے کم نہیں ہیں۔ اگرچہ شہر آشوب اور ہجویات قدیم اصناف ہیں اور جن کا ذکر آج بے معنی سا نظر آتا ہے لیکن خلیل الرحمٰن اعظمی نے جدید حسیات کو بہ واسطہ پیش کر کے ان اصناف کو گویا ایک نئی زندگی دی ہے۔ جب یہ شاعری میں جو کرب اور موجودہ معاشرے سے جو نفرت اور بیزاری

پائی جاتی ہے اس کا اظہار ان کی ان تخلیقات میں ہوا ہے۔ ان میں بڑا تیکھا طنز ہے اور اس کی مثالیں شہر آشوب میں بھی ملتی ہیں۔ انھوں نے اس کے ذریعے دورِ حاضر کے شاعروں، ادیبوں، پروفیسروں، نقادوں طالب علموں اور عورتوں کے خاکے بڑی باریکی سے تراشے ہیں اور ان کا قلم لوگوں کی دکھتی رگوں پر بڑی چابکدستی سے رکھا گیا ہے۔ انھوں نے شہر آشوب کے ذریعے ان مختلف موضوعات پر روشنی ڈالی ہے۔

ایک دور میں شاعر اپنے کلام کی شعریت اور اس کی گہرائی، اشعار کی معنویت ہی مشاعروں میں کامیابی اور ناکامی کی ضمانت ہوا کرتی تھی۔ مگر آج کے سامعین کی اکثریت کا ذوق بالکل بدل چکا ہے۔ انھیں شاعروں کے کلام کی گہرائی اور اس کی معنویت سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ مشاعروں میں صرف وہ شاعر مقبول ہوتے ہیں جو شاعر کم اور گویے زیادہ معلوم ہوں۔ ساتھ ہی ان کے کلام کا معیار بھی پست ہو تو ساری داد انھیں کی قسمت میں آتی ہے۔ شہر آشوب کے اس بند کو دیکھیے ؎

مشاعروں میں غزل خواں ہیں شاعرانِ کرام
سنا رہے ہیں بڑے سُر سے اپنا وہ کلام
جو کامیاب گویے ہیں اُن کے اُونچے دام
بدل سمجھتا ہے محفل کا اس کو مجمع عام
غزل ہو پست تو کچھ اور ہوتی ہے مقبول

وہ جو صحیح معنوں میں اہلِ علم نہیں لیکن بڑی فنکاری سے اپنا پروپیگنڈہ کرتے پھرتے ہیں۔ ان کی طرف اشارہ ملاحظہ کیجیے ؎

بغل میں جس کی ہو اب ردّیوں کا پشتارہ
اسی کے علم کا بجتا ہے خوب نقّارہ
وہی ہے صاحبِ فن جو ہے فن کا ہرکارہ
وہ جس کا نام چلے ہے اسی کا پو بارہ
جو منبروں پہ کھڑا ہو وہی ہے آج رسول

خلیل الرحمن اعظمی کا خیال ہے کہ درس گاہوں پر اکثریت سے ایسے لوگوں کا قبضہ ہے جن میں علمیت و شعور کی کمی ہونے کے ساتھ ہی زندگی کے تجربات سے بھی بے بہرہ ہیں۔ لیکن المیہ ہے کہ ایسے ہی افراد کی جڑیں درسگاہوں کی زمین میں گہری پہنچ گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں سے شاعر بھی انصاف کی اُمیدیں رکھنا قطعی ناممکن ہے۔ شہر آشوب کے اس بند میں انھیں جذبات کو سپردِ قلم کیا گیا ہے ؎

وہ درس گاہوں میں تعلیم پر ہیں مامور
کہ جن میں علم و دانش، نہ زندگی کا شعور
کسی کے رُخ پہ خباثت کسی کے سر میں فتور
ملے جو موقع تو بن بیٹھیں نادر و تیمور
یہ دے کے ڈگریاں کرتے ہیں انکے دام وصول

اُنہوں نے ایک خاص قسم کے پروفیسروں پر یوں طنز کیا ہے ؎

وہ جن کے نام کے آگے لگا ہے پروفیسر
کوئی غلام جرنلی کا تو ہے کوئی جوکر
کسی کا چہرہ ہونق کسی کا دل پتھر
اکڑتے پھرتے ہیں یوں جیسے جنگی کے افسر
یہ جمع کرتے ہیں بازارِ علم کے محصول

خلیل الرحمن اعظمی یہ محسوس کرتے تھے کہ اُردو ناقدین میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں ہے جو تنقید کی محض چند اصطلاحات کا سہارا لیکر ادبی تخلیقات کی خوبیوں اور خامیوں کو پرکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور ایسے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ تنقید کا کام ختم ہو گیا حالانکہ ایسے نقادوں کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ ایسے نقاد ان کی تنقید کا نشانہ اس بند میں بنے ہیں ؎

یہاں ادیب کم ہیں مگر نقاد بہت
کہ جن کا علم بہت سرسری و نام نہاد
کوئی کلرک کوئی مدرسے کا ہے اُستاد
رٹی رٹائی سی کچھ اصطلاحیں انکو یاد
کہ جن کو اپنے مضامین میں کرتے ہیں منقول

اُردو شاعری میں وقتاً فوقتاً ہجو لکھنے کا رواج رہا ہے۔ ان ہجویات کے ذریعے اپنے معاصر شعرا کو کمتر اور مروجہ رواجوں کو تنقید کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔ "نیا عہد نامہ" کی ہجویات بھی اسی انداز پر لکھی گئی ہیں ان اصناف کا سہارا لیکر خلیل الرحمن اعظمی نے اپنے عہد کے شعرا اور اُردو زبان و تحریک کا دم بھرنے والے اشخاص کی نقلیں اپنے نقطۂ نظر سے پیش کی ہیں۔ اُنہوں نے "تذکرہ شعرائے اُردو" اور "نقد نامہ" کے عنوان سے لکھی گئی ہجویات میں انہیں اپنے طنز کا نشانہ بنایا ہے۔

"تذکرہ شعرائے اردو" کے ان اشعار کے ذریعے لوگوں پر کڑی چوٹ کی گئی ہے۔

ہر طرف ہیں مشاعرے برپا
جن میں سلے کے نام اُردو کا
سارے قوال، ڈوم اور ڈھاری
کنجڑے، قصاب اور بزاری
بھیس میں شاعروں کے آتے ہیں
غزلیں سب لحن سے سناتے ہیں
پڑھتے ہیں یوں کلام بازاری
جیسے بیچتے ہوں ترکاری

کیسے کیسے ادیب رنگا رنگ
ماں ہے ٹینی کسی کی باپ کلنگ
کوئی لنگڑا ہے کوئی لولا ہے
کوئی آندھی کوئی بگولا ہے

جس نے دو شعر کر لئے موزوں
یا کہانی نما کوئی مضموں
لکھ کے چھپوالیا رسالوں میں
وہ غریب آگیا حوالوں میں

لیکن ان میں ایک ایسا طبقہ ہے
جس کا ہر جا کلام چھپتا ہے
دوستی ان کی ہر ایڈیٹر سے
ہر منسٹر سے ہر گورنر سے
دعوتیں ہر جگہ اُڑاتے ہیں
پوز کیا کیا سنئے بناتے ہیں
ہر رسالے میں ان کی اک تصویر
ان کی ہر نظم جیسے اک تقریر

یہی اب رہبرانِ اُردو ہیں
اب یہی پاسبانِ اُردو ہیں

ہمارا خیال ہے کہ خلیل الرحمٰن نے ہجویات اور شہر آشوب جیسی قدیم اصناف کو پیش کر کے انھیں دوبارہ زندگی دینے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ان تخلیقات میں موضوعات کے ٹکراؤ اور بیان میں انتہا پسندی کی وجہ سے قاری کی دلچسپی کو زیادہ دیر تک برقرار رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکے ہیں۔ مثلاً نقدنامہ میں بھی تقریباً انھیں موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ملاحظہ کیجئے ؎

کیا کہوں تم سے حال اُردو کا
ہے چمن پائمال اُردو کا
خاک اب آئے لطف شعر و سخن
ہر طرف پھر رہے ہیں زاغ و زغن

ان ہجویات اور شہر آشوب میں سنجیدہ طنز و مزاح کا عنصر غالب ہے۔ جن کو قاری پڑھتے وقت قہقہہ لگاتے ہوئے سنجیدہ ہونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہی ان کی کامیابی کا راز ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے شعری تخلیقات میں خارجی زندگی کا ادراک بھی ہے اور فرد کے داخلی زندگی کے پیچیدہ مسائل کو بھی جگہ دی گئی ہے۔ ایک طرف ان میں پہلا شعری روایات کو بھی جگہ ملی ہے اور دوسری طرف نئے اسالیب اظہار کی جستجو پائی جاتی ہے۔ انھوں نے ہئیت کا چونکا دینے والا تجربہ بھی نہ کیا اور نہ ہی مواد کی ہئیت پر ضرورت سے زیادہ ترجیح دی۔ ۱۹۳۶ء کے بعد اُردو نظم میں مواد، طرزِ فکر اور اسلوب و اظہار کے اعتبار سے نئے میلانات سامنے آئے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ نظم میں ہئیت اور اظہار کے کئی اہم تجربے بھی کئے گئے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے بھی یہ کوشش کی ہے کہ نظم کی زبان اور اس کا ذخیرۂ الفاظ، موضوع کی مناسبت سے متنوع ہوں لیکن اس کا بھی پورا خیال کیا گیا ہے کہ مواد اور پیرایۂ بیان ایک دوسرے میں پوری طرح جذب ہو کر نظم کو ایک اکائی کی شکل میں تبدیل کر دیں۔ ساتھ ہی نظم میں الفاظ، تراکیب، تشبیہات و استعارے عام ذہنی تصورات اس طرح اُبھر جائیں کہ یہ سب مواد اور پیرایۂ بیان کا ایک لازمی جز بن جائیں۔ انھوں نے نظم کو تکرارِ خیال یا مسلسل غزل کے انداز سے نکال کر ایک ایسی صورت دینے کی ہر ممکن کوشش کی ہے کہ جس سے نظم مجموعی حیثیت سے بھرپور تاثر پیدا کرے۔

اسلم عمادی

(۶/۱۱-۶-۱۵۰، ہمایوں نگر، حیدرآباد ۲۸-۵۰۰ اے پی)

خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں

کھلے گا تم پہ کبھی راز حیات صد آہنگ
سنو سنو مری بکھری ہوئی صداؤں کو

آہ! ان شاعروں میں سے ایک اور پس پردہ فنا ہوا جن کو دیکھ دیکھ کر ہم اُردو میں شاعری کرتے تھے۔ جن کا کلام ہم میں شعریت کو اُبھارتا ہے۔ خلیل صاحب کی معتبر آواز اپنی نرم آہنگی کے ساتھ اشعار میں ہمارے ذوق کے معیار کو بلند کرتی ہے۔ کتنے ہی رسائل تو میں نے صرف انکی غزل دیکھ کر اپنے ذاتی کتب خانے میں جمع کئے تھے۔ اور اگر ان کی کوئی غزل اب بھی شائع ہو تو ایسا ہی کروں گا۔ لیکن وہ منبع جہاں سے اشعار کے سکے رائج ہوتے تھے، وہ نور جس سے یہ نور ریزے اور نوری کرنیں ہم تک پہنچتی تھیں، وہ دریا جس سے ہمارے سامعہ اور باصرہ کو ترا وٹ پہنچتی تھی نذر دست مکاں ہو گیا۔ کبھی کبھی یوں لگتا ہے کہ کاش حقیقت اتنی دل شکن نہ ہوتی۔

خلیل صاحب کی غزلوں کے اشعار کسی نہ کسی طرح میرے لاشعور سے مناسبت رکھتے تھے اور انکی بازگشت میرے ذہن میں ہوتی ہی رہی ہے۔ جب بھی انکی غزل پڑھتا ہوں وہ میرے ذہن میں جا بستی ہے اور رہ رہ کر سر اُبھارتی ہے۔ کبھی کبھی تو جی چاہتا ہے کہ اس ذہنی تسلط کے شکنجے سے آزاد ہو سکوں۔

اعظمی صاحب کی شاعری واحد متکلم کی شاعری ہے۔ وہ شاعر کی ذات پر مرکوز ہے۔ اپنی انفرادیت کا احساس، زندگی کی تہی دستی کا گلا، حال و مستقبل کی یکسانیت، ایک سنجیدہ سی مایوسی، تلاش راہِ نجات اور وہ بھی اس مفروضہ پر مبنی کہ کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اور ایسے ہی موضوعات خلیل صاحب کی شاعری کے تانے بانے ہیں۔

اعظمی صاحب کی شاعری نہ جانے کیوں "بجھے بجھے تبسم" کی طرح شاعر بھی

لگتی ہے۔ اور یہ بجھا بجھا سا تبسم سارے عالم پر محیط ہے۔ ہماری زندگی اور ہمارے احساسات سے اتنا قریب ہے کہ ہمیں انکا ہر شعر "دل لگتا" اور "دل پسند" محسوس ہوتا ہے۔ ان کے کلام کا لب و لہجہ سنجیدہ اور "متوازن" ہے۔ جو یہ صاف صاف اعلان کرتا ہے کہ شاعر تجربہ کرنے کے لئے مشق سخن نہیں کرتا بلکہ اس کے پاس جو کچھ کہنے کو ہے وہ اپنی ذات کے احساسات سے سراسر طور پر مطابق ہے۔ یہ سنجیدگی قاری کو الفاظ کے پیچھے چھپے ہوئے ان جذبات تک جانے پر متوجہ کرتی ہے جو تخلیق شعر کی وجہ ہیں۔ وہ ان تشنہ باتوں کا کرب محسوس کر سکتا ہے

اعظمی صاحب کا کلام لگاتار چھپنے والی شاعری سے مختلف تھا۔ ان کی ہر غزل دوسری غزل سے ممتاز طور پر جُدا لگتا رہا ہے۔ اور رسائل میں چھپنے کا چسکا اس میں محسوس نہیں ہوتا۔ ہر غزل کا ہر شعر کچھ نہ کچھ ذکر کرنا چاہتا ہے۔ کوئی نہ کوئی نوکیلی بات غیر جذباتی لب و لہجہ میں کہنا چاہتا ہے۔ اعظمی صاحب کی غزلیں عموماً چھ تا آٹھ اشعار پر مشتمل ہوتیں۔ نہ ان میں طوالت ہے، نہ ردیف و قافیہ سے کھیلنے کا گمان ہو نہ اتنی مختصر کہ نامکملیت کا احساس ہو۔ "بجھے بجھے تبسم" کی علامت ان کی غزلوں کے ہلکے ہلکے سلگنے کو واضح کرتی ہے۔

خلیل صاحب غزلوں میں جس زندگی کا ذکر کرتے ہیں وہ ایک طویل سفر ہے۔ اور جسکی مدت لمحہ لمحہ گھٹتی جا رہی ہے۔ جسمیں کوئی مسئلہ آسانی سے حل نہ ہو سکا۔ کتنی الجھنیں ہیں جو یقیناً سلجھتی ہی نہیں۔ صرف تسکین ذات کے لئے منطق استعمال کیجاتی ہے۔ اُن کی غزلوں میں جو فکری آہنگ ہے۔ وہی انکی نظموں میں بھی نمایاں ہے۔ انکی شاعری میں جو واحد متکلم ہے وہ ایک شاعر ہے۔

اور ایسا شاعر جو خواب دیکھتا لیکن خواب کی تعبیر سے گریزاں ہے۔ جسے سفر میں خوابوں کی فصلوں کو کچلنا پڑتا ہے۔ اور وہ بھی کسی موسم پر کئی برسوں قبل ان کی ایک غزل شاعر میں شائع ہوئی تھی۔ بڑی خاصی غزل تھی۔ اس کے چند شعر سنئے ؎

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں
سایہ سایہ پکارتا ہوں
سونا ہوں کرید کر تو دیکھو
مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں
لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت
ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں
ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش
ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

اس غزل میں جو آواز صاف صاف ابھرتی ہے، وہ شاعر کی آواز ہے۔ ہر شعر میں شاعر ہی کا کرب واضح ہے۔ وہ زندگی کی سنسان اور بے امان رہگزر پر تنہا کھڑا ہے۔ کھڑا اسلئے کہ منزل کا کوئی تعین نہیں۔ سمت کی کوئی شناخت نہیں اور ہر طرف دھوپ ہی دھوپ ہے۔ کسی سمت جانے میں نجات نہیں۔ اس لمحہ اس میں سوائے اس کے تاب نہیں کہ سائے کو آواز دے۔ سایہ امان ہے، نجات ہے، اور سایہ ہی غالباً اس کی منزل۔ اسی طرح شاعر بد ذوق اور شخص ناشناس لوگوں سے ـــــ بلکہ دنیا سے ایک پھیکے سے لہجے میں کہتا ہے کہ میں حقیقت اور اصلیت میں ایک قسم کا سونا ہوں۔ قیمتی اور گراں ہوں لیکن آہ یہ ناقدر دنیا کہ میں اجنبیت اور بے حسی کی مٹی میں دبا ہوا پڑا رہ گیا اور میری ہستی گردشِ وقت کی طرح کج رو ہے اور پھر اس سے بھی بڑھ کر ٹوٹے ہوئے آئینہ کی طرح ہے۔ اور آخری شعر شاعر کے کردار کا عکاس ہے۔ میں نے اس غزل کو اسلئے مطالعہ کے لئے منتخب کیا کہ اس غزل میں چند باتیں نوٹ کرنے کی ہیں: (۱) موضوعات جو اُن کی شاعری میں پائے جاتے ہیں۔ مثلاً بے سمت اور بے سہارا سفر اپنی انفرادیت کا احساس اور زمانہ کی ناقدری کا گلہ۔ وقت کی کج روی کا شکوہ۔ سخنور کی نمائندگی (۲) پوری غزل میں لب و لہجہ کی وحدت اور اظہار میں تسلسل۔ غزل، غزل مسلسل سے بہت کچھ ملتی جلتی (۳) الفاظ جو نہ چونکانے والے شاعرانہ بھی

نہ کسی طرح انوکھے۔ ان نکات پر اگر آپ غور کریں تو ایک خاص شعری رویے کی وضاحت ہوتی ہے۔ اور یہ شعری رویہ خلیل صاحب کی نظموں اور غزلوں دونوں میں یونہی موجود ہے۔

ہمارا عہد خوابوں کا عہد ہے۔ خود میری شاعری میں خوابوں کا ذکر بار بار آیا ہے بلکہ میں خوابوں کو راہِ فرار سمجھتا ہوں۔ اور ایک مختصر لمحہ کے لئے راہِ نجات۔ خلیل صاحب کی شاعری میں خواب ایک غیر حقیقی تصور کے مطابق ہے۔ ایسی تصویر کی طرح جس کا نہ کوئی وجود ہے نہ کوئی تعبیری حیثیت۔ یہ خواب یونہی رسماً دیکھے جاتے ہیں۔ اور زندگی کی مصروف اور مجبور دوڑ میں روند دیئے جاتے ہیں۔ اس کا سبب کیا ہے:

ہمارے عہد سے منسوب کیوں ہوئے آخر
کچھ ایسے خواب کہ جن کا نہیں ہے کوئی وطن

اور خوابوں کی تعبیر ایک سعی لا حاصل ہے۔ اور خوابوں سے اُمید لگانا ایک لایعنی سا فعل ـــــ اور انجام ـــــ

پوچھتے کیا ہو ان آنکھوں کی اداسی کا سبب
خواب جو دیکھے وہ خوابوں کی حقیقت مانگے

اور مصلحت یہی ہے کہ صورتِ حال کی اس خارزار دوڑ میں اس ہجوم میں جو مسائل اور کلفتوں سے لدا ہوا ہے اپنے ذاتی جذبات آرزوؤں اور خوابوں کو پامال کر دیا جائے۔ اور ضرور اس مصلحت کا کوئی گھناؤنا راز ہوگا ؎ کوئی تو بات ہوگی جو کرنے پڑے ہمیں
اپنے ہی خواب اپنے ہی قدموں سے پائمال

اور ان مسائل اور اس کشاکش میں جب شاعر اپنے سفر کو شروع کرتا ہے تو وہ سمجھتا ہے کہ کبھی نہ کبھی اسے گیان پراپت ہوگا۔ کبھی نہ کبھی اسے اس اُلجھاؤ اس کرب اور اس بے اصل زندگی کا کوئی نہ کوئی حل ـــــ کوئی نہ کوئی راستہ، کوئی نہ کوئی سمت ملے گی۔ وہ ابھی گوتم بدھ کی طرح حیات کو سمجھنے کے لئے بے چین ہے۔ اسے معلوم ہے کہ اس کی تلاش و جستجو میں گوتم بدھ کی تلاش جیسی جولانی اور [illegible] نہیں۔ لیکن:

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے ہی آپ کو ڈھونڈنے جا رہا ہوں

کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے گیان ہوگا — (میں گوتم نہیں ہوں)

اور اس تلاش میں جو شاید خود کہیں نہ کہیں ختم ہوگئی ایک ایسی منزل بھی آئی کہ زندگی کی رسوم و قیود زندگی کے قواعد و ضوابط نے ظرفِ وجود کو خالی کر دیا۔ وجود کی حیثیت اس کے علاوہ کچھ نہیں رہی کہ وہ ایک بدن اور چہرہ کا نام رہ گیا۔ وجود کے اندر خلق ہوئی وہ شمع جو روغنِ طلب سے روشن تھی، بجھی بجھی سی ہوگئی۔ پیکر کی اہمیت ہستی سے بڑھ گئی۔ بلکہ پیکر نے ہستی کو اس طرح اسیر کر لیا کہ اصل شاعر اصل روح کہیں گم ہوگئی۔ شاعر خود اپنے وجود کے بارے میں مشتبہ ہوگیا۔ کیا اس کی کوئی پہچان ہے۔ کیا اس کی کوئی حقیقت ہے۔ اس کے علاوہ کہ وہ اپنے عہدہ اپنے فن اور اپنے تعلقات سے پہچانا جاتا ہے۔ کیا خود اس کی بھی کوئی ہستی ہے۔ گویا اس کی تلاش و جستجو کی سمت بیرونِ ہستی سے خود اپنی ہستی کی طرف آجاتی ہے۔ اور یہ جستجو اب وہ خلش نہیں رکھتی۔ اب تو ایک قسم کی خود سپردگی تھا ایک قسم کی گم گشتگی ہے۔ وہ بار بار کہتے ہیں ؎

یہ تمنا نہیں اب دادِ ہنر دے کوئی
آکے مجھ کو مرے ہونے کی خبر دے کوئی

راستہ پُرپیچ ہے اور ہمسفر کوئی نہیں
سب مرے ہمشکل ہیں مجھ سا مگر کوئی نہیں

اس جہاں میں میرے ہونے کی گواہی کون دے
اک ہجوم اور اسمیں چشمِ معتبر کوئی نہیں

ہر گھڑی عمرِ فرومایہ کی قیمت مانگے
مجھ سے آئینہ مرا میری ہی صورت مانگے

اور کبھی تو یوں بھی ہوتا ہے کہ شاعر ایسا محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ ایک روندی ہوئی راہ گذر پر ایک دہرائی ہوئی ہستی کی طرح گذر رہا ہے۔ وہ علامتیں جو اس راہ گذر کے اطراف سے نظر آتی ہیں۔ شاعر، بھی

وہ شبابتیں وہ مناظر وہ اشخاص اور وہ مسائل جو اسے ہر طرف بکھرے ہوئے نظر آتے ہیں اسے یہ غور کرنے پر مجبور کرتے ہیں کہ جیسے روز و شب ماہ و سال کی اس مسافت میں وہ ایک دہرائی ہوئی شخصیت ہے۔ یہ اس کا کوئی نیا جنم ہے۔ اور ہر لمحہ کی تبدیلی میں اس کا جنم بدلتا جاتا ہے۔ وہی علامتیں نئی شناخت پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہیں۔ انہیں کی پہچان جو ہستی کی حیثیت کو ملتی ہے۔ گویا جامد اشیا بدلتی ہیں یا بدل بدل کر دکھائی دیتی ہیں تو مسافر کو خود اپنے میں تبدیلی لگتی ہے۔ وہ ہر لحظہ ایک نیا جنم لیتا ہے اور

میں پھر سوچتا ہوں
کہ میں کون ہوں
کیونکہ میں پچھلے لمحے میں جو کچھ تھا اور وہ نہیں ہوں
تو کیا میں ہر ایک لمحہ پچھلے سے نیا جنم لیتا ہوں
ہر اک لمحہ اک عمر ہے
تو کیا میں ہر اک لمحہ ایسی کتھائیں سناتا ہوں
— جو پچھلے جنموں سے منسوب ہیں
— (پچھلے جنم کی کتھائیں)

ایسے ہی سوالات ابھرتے ہی رہتے ہیں جو ان کے ذہن میں خلش انگیزی کرتے ہیں۔ لیکن گویا یہ سوالات جامد ہیں' لاینحل ہیں اور پتھروں کے مجسموں کی طرح صدیوں سے انسان کو خوف زدہ بلکہ وہم زدہ کرتے آرہے ہیں۔ وقت گذرتا ہی جا رہا ہے ؎

آتے ہیں اور گذرتے ہیں کتنے ماہ و سال
صدیوں سے راستے میں کھڑے ہیں کوئی سوال

تو کیا ہوا۔ یہ ناقدری کیسی ہے جو مٹی میں دبے ہوئے سونے کی تلاش نہیں کرتی۔ یہ فلسفے کیسے ہیں جو انسان کو اسکے اصل سے دور کرتے ہیں۔ یہ فلسفے کیسے ہیں جو انسان کو اس کے اصل سے دور کے لہو سے لالہ زار کر دیا ہے۔ یہ دانش کیسی ہے جو جذبات کو بھڑکاتی ہے اور شاعر میں احساسِ نامرادی کو بھڑکاتی ہے۔ تہی دستی کو عیاں کرتی ہے۔ یہ دل کا درد کیسا ہے کہ انبساط کا ایک مختصر سا لمحہ بھی فردوسِ سکون و راحت لگتا ہے۔ یہ لٹنے کا احساس کیسا ہے۔ یہ دل کی بستی کے اجڑنے کا سماں کیسا ہے۔ شاعر یہ سوالات نہ خود اٹھاتا ہے نہ اٹھانے کی ہمت رکھتا ہے۔ وہ تو صرف اپنے محسوسات کو سادہ

ب و لہجہ میں دردانگیز طور پر بیان کرتا ہے۔ اس کے محسوسات میں سکی خشک لبی یا شائستگی، دل گرفتگی اور گرسنہ مزاجی کی جھلک نمایاں ہے۔ شاعر کا اندازِ بیان اس کے جذبات کی ترسیل کا بیشتر عمل انجام دیتے ہیں۔ یہ اندازِ بیان ہی خلیل صاحب کو اپنے عہد کے غزل گویوں میں ایک جداگانہ مقام دلاتا ہے۔ اور جدید شاعر دعویٰ کے ساتھ خلیل صاحب کو نیا شاعر قرار دیتے ہیں کہ ان کی شاعری مرکوز بر ذات اور اظہارِ خالص کی عمدہ مثال ہے۔ کیوں نہ پھر خلیل صاحب کے کچھ اور اشعار سنا دوں ؎

یہ اور بات ہمارے لہو کی پیاسی ہے
مگر زمینِ چمن پھر بھی ہے زمینِ چمن

اس پہ بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا
غم سا پرانا دوست بھی آخر بچھڑ گیا

کوتاہیوں کی اپنی میں تاویل کیا کروں
میرا ہر ایک کھیل مجھی سے بگڑ گیا

ہوا کے جھونکے جو آئیں تو ان سے کچھ نہ کہو
جو آگ خود ہی لگائی ہے اس میں جلتے رہو

یہ دل کا درد تو ساتھی تمام عمر کا ہے
خوشی کا ایک بھی لمحہ ملے تو اس سے ملو

آہ! ان اشعار کو پڑھتے پڑھتے نہ جانے کیوں ایسا لگتا ہے کہ خلیل صاحب یہیں کہیں موجود ہیں۔ اور اُن کے اشعار کا دفتر کھلا ہے۔ جسمیں سے اشعار کی تتلیاں اُڑ اُڑ کر ہر طرف رنگ بکھیر رہی ہیں۔ میں چاہونگا کہ خلیل صاحب میرے ساتھ رہیں

خلیل الرحمٰن اعظمی کے انتقال سے اُردو ادب میں ایک قد آور شاعر کا خلا پیدا ہوا ہے۔ وہ ایک ایسے شاعر تھے جنھوں نے نثری تنقیدی اور شعری تخلیقات کا ایک گراں بہا سرمایہ پیچھے چھوڑا ہے۔ ماہنامہ "کتاب نما" کا خاص نمبر۔ نئی نظم کا سفر۔ ان کی تنقیدی اور انتخابی صلاحیت کی دلیل ہے۔ جس کا پیش لفظ اُردو کی نئی شاعری کی سمت مقرر کرنے میں ایک اہم دستاویز کی حیثیت رکھتا ہے۔ خلیل صاحب کی تحریروں میں انتہا پسندی نام کو نہ تھی وہ کسی خاص اندازِ ادب کی وکالت پر مصر نہ تھے۔ ان کا انداز محققانہ اور مہذب تھا۔ اور ان کی اسی خوش روی اور علمی بصیرت نے انھیں نئے ادب میں منفرد شاعر اور ادیب بنا دیا۔ اور شاید ہم بھی ان کے ہم زبان ہونے کا دعویٰ کہیں کر سکتے ؎

ہم سا کوئی ملے تو کہیں اس سے حالِ دل
ہم بن گئے زمانے میں کیوں اپنی ہی مثال

اربابِ اُردو ادب کو خلیل صاحب کے اشعار ہمیشہ انکی یاد دلاتے رہیں گے

OO

آغا رشید مرزا

۲/۷ ٹوپسیا ایکزیٹینشن روڈ کلکتہ ۔ ۷۰۰۰۱

ختم فسانے مٹی کے

خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم ترقی پسند تحریک سے متعلق تھے۔ ان کا یہ تعلق ایک تحریک ایک انجمن تک ہی محدود نہ تھا وہ ذہنی فکری طور پر بھی ترقی پسند رہے تھے اور آخر دم تک رہے۔ اُردو زبان جسے ترقی پسند تحریک نے ایک نیا موڑ دیا تھا خود سیاسی انقلاب کی زد میں آ گئی۔ کرشن چندر نے ایک مرتبہ دوران گفتگو مجھ سے کہا تھا ابتداً میں خود بھی تقسیم کے موافق تھا اور میں نے اس کی مخالفت میں کچھ لکھا بھی نہیں تھا۔ دو بھائی ایک ساتھ نہیں رہ سکتے تو اُن کے علیٰحدہ رہنے میں کوئی ہرج نہیں ہے لیکن یہ ایک بہت بڑی غلطی تھی۔ اگر تقسیم نہ ہوتی تو اُردو کی کیا بات ہوتی۔ چار چاند لگ جاتے۔

وقت کے ہاتھوں اسے چار چاند تو نہ لگ سکے البتہ یہ چاند گہن میں ضرور آ گیا۔ سیاست نے اُردو پر مذہب کا لیبل لگایا' اسے وطن سے بے وطن' گھر سے بے گھر کیا اور خانہ بدوش بنایا' تاکہ یہ خانماں ہو کر وقت کے ہاتھوں برباد ہو جائے' آپ مٹ جائے' اپنی موت آپ مر جائے لیکن جسے خدا رکھے اُسے کون چکھے۔ اُردو کی کشش' اس کی جاذبیت اور اس کے حسن نے دلوں میں جو گھر بنایا تھا وہ بنا ہی رہا۔ اُسے کوئی نہ اُجاڑ سکا۔ وہ دشمن کی دسترس سے باہر تھا۔ اور یہی وہ گھر ہے جہاں اُردو کو سر چھپانے کی جگہ ملی' اماں ملی' پناہ ملی اور اب بھی یہی ایک اس کا گھر ہے جہاں کسی بادِ مخالف کا گذر نہیں۔

اس انقلابی بحران میں ترقی پسند تحریک کو بھی کتنے نشیب و فراز سے گذرنا پڑا۔ کتنے انتشار سے دوچار ہونا پڑا۔ ملک تقسیم ہوا اس کے ساتھ فنکار جس کا کوئی ملک نہیں ہوتا وہ بھی تقسیم ہوا۔ اس افراط و تفریط میں بہت سے پاکستان کھسک گئے جو یہاں رہے اُن میں سے اکثر معاشی ضروریات کے پیشِ نظر فلم کی نذر ہو گئے ان میں سے بعض کا تعلق اس تحریک سے برسبیلِ تذکرہ برائے نام ہی رہا۔ اکثر نے ترقی پسندی اور جدیدیت دو کشتیوں میں پاؤں رکھا تاکہ دونوں میٹھے رہیں۔ کچھ نے تو اقتدار کی مدح سرائی اور سرکار کی قصیدہ خوانی میں ایسے لگے کہاں سے آگے متقدمین کی قصیدہ خوانی میں ملت نظر آئی۔ خودداری کے احساس اور ضمیر پر وہ گراں گذری۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آزادی کے بعد جہاں تو معاشرہ اور اہلِ اقتدار کی بدعنوانیوں پر گرفت زیادہ مضبوط کرنے کی ضرورت تھی وہاں قصیدہ خوانیاں ہونے لگیں۔ خطابات و انعامات میں لگ گئے کچھ نے تھوڑا کچھ نے کام تھوڑا کچھ شہرت لے کر خوش ہو گئے کچھ دولت پا کر اپنے موقف سے الگ ہو گئے۔ وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ آزادی کی جنگ سے زیادہ آزادی کے بعد نئے معاشرہ کی تشکیل کے لئے جنگ کرنے اور مستعد رہنے کی ضرورت ہے۔

یہ وہ دور تھا جب ایک نئی نسل نئی پود جنم لے چکی تھی اور پروان چڑھ رہی تھی۔ وہ چاروں طرف راہبری کے لئے حیرانی سے دیکھ رہی تھی کہ کس طرف جائے۔ ترقی پسند بحالطور پر اُن کی راہبری نہ کر سکے۔ مفاد پرستوں کے ہاتھ موقع آیا اُن کی بن آئی اور وہ کھیل کھیلے۔ انھوں نے ادب اور ادیب دونوں کو مختلف پارٹیوں اور فرقوں میں بانٹ دیا۔ اپنا اُلّو سیدھا کیا۔ ادب میں بے ادبی اس حد تک پہنچ گئی کہ متقدمین شعبدہ باز' جادوگر' بازیگر ٹھہرائے گئے۔ ترقی پسند' جدت پسند' قدامت پسند' ہر ایک اپنی اپنی پسند رکھنے والے ایک دوسرے پر کیچڑ اُچھالنے لگے۔ بات ذاتیات تک بھی پہنچنے لگی۔ جو یہ کھیل کھلا رہے تھے اُن کے پو بارہ ہو گئے۔

عام طور پر آپس کے کسی فساد اور ہنگامہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس کا جہاں منہ اُٹھا دوڑ پڑا جس کا جہاں سینگ سمایا نکل پڑا جس کے جو جی میں آیا کیا وہی ادب میں بھی ہوا۔ نئی پود کچھ تو بے راہ ہوئی اور جن کو صحیح راہ ملی انھیں منزل کا نشان نظر نہ آیا۔ کوئی سمت دکھائی نہیں دی اور جنھیں کوئی راہ نہ ملی انھوں نے خود اپنی راہ نکال لی۔ غلط یا درست یہ انھیں بھی کہیں نہ کہیں پہنچا ہی دے گی اور پھر یہ بھی ایک راستہ بن جائیگا اور اس پر چلنے والے بھی کچھ نہ کچھ

پیدا ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا اور یہی ہو رہا ہے۔ کئی برس یہ طوفان اُٹھتے رہے، ہنگامے ہوتے رہے جو دست و گریباں تک بھی پہنچے۔ بھڑکا دینے والے بھڑکا دیتے رہے۔ آخر اب چند برسوں سے فضا میں کچھ سکون پیدا ہوا۔ لہجہ میں تبدیلیاں ہوئیں وہ خس و خاشاک جو اُڑ رہی تھی بند ہوئی لیکن جو نقصان ہونا تھا ہو چکا۔ فرقہ بازی، پارٹی بندی ہوں کی توں اپنی جگہ قائم ہے۔ ادب، ادیب، مدیر اور رسائل مختلف خانوں میں بٹ چکے ہیں۔ ترقی پسندی، جدت پسندی، قدامت پسندی، علامت پسندی، جمہوریت پسندی، اشتراکیت پسندی اور اس میں بھی روس پسندی، چین پسندی، امریکہ پسندی وغیرہ وغیرہ کتنے خانے ہیں اور ان کی کتنی شاخیں ہیں۔

چنانچہ فنکار ہر کس بقدر ہمت اوست۔ اپنا اپنا سر، اپنا اپنا سودا، اپنی اپنی پسند اپنے اپنے نظریات میں لپٹا ہوا اپنی اپنی پارٹی کا لیبل لگا ہوا شعر و ادب تقسیم ہو رہا ہے۔ قاری کے پلے کچھ پڑتا ہے یا نہیں اور وہ کہیں پہنچتا بھی ہے یا نہیں اس طرف کسی کی نظر نہیں۔ ادب کا کیا مقصد ہونا چاہئے۔ اس کے فرائض کیا ہیں۔ معاشرہ کی طرف سے اس پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ وقت کی کیا ضرورت ہے۔ زندگی کے کیا تقاضے ہیں۔ عوام سے اس کا کیا رشتہ ہونا چاہئے اور وہ رشتہ استوار ہے یا نہیں۔ ان باتوں سے کسی کو سروکار نہیں۔ بس جو کچھ لکھا ہے چھپ جانا چاہئے۔ چھپ گیا کام ہو گیا۔

بہرحال ان تمام ہنگاموں اور شور شرابہ میں چند آوازیں ایسی بھی تھیں جن کی گونج ہر حال میں سنائی دیتی رہی۔ یہ آوازیں یہ نام انگلیوں پر گنے جاسکتے ہیں ان میں سے بعض نے اپنی ضروریات کے لئے کچھ سستا ادب تخلیق کیا تو ترقی پسندی کے شایانِ شان عظیم ادب بھی وہ ہمیں دیتے رہے وقت اور حالات کی رفتار پہ ان کی گرفت رہی ان ہی چند آوازوں کی وجہ سے ترقی پسندی کا نام اور اس تحریک کا مقصد زندہ رہا۔

ان چند آوازوں میں خلیل الرحمٰن اعظمی کی آواز بھی شامل رہی اور وہ سب سے نمایاں سب سے الگ اس کی ایک شناخت تھی۔ ترقی پسندی کے ساتھ حق پسندی ان کا طرۂ امتیاز تھا۔ اور اس حق پسندی کے لئے انھوں نے اپنوں کی مخالفت سے بھی گریز نہ کیا۔ وہ کبھی ہوا کا رُخ دیکھ کر اس کے ساتھ نہیں چلے، مصلحت پسندی کا نشانہ نہیں بنے، نعرہ بازی نہیں کی ان کا مسلک آخر دم تک یہی رہا۔

روک دو گر غلط کہے کوئی ٹوک دو گر غلط چلے کوئی

ان کے تیس سالہ ادبی سفر کا جائزہ چند اوراق میں لینا کسی کے بس کی بات نہیں۔ مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ جس راہ سے گزرے ایک ایسا سنگِ میل چھوڑ گئے جو آنے والی نسلوں کو منزل تک پہنچنے کی سمت بتاتا رہے گا اور ان کی

راہبری کرتا رہے گا۔ ہر صنفِ ادب میں ان کی کچھ امتیازی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے انھیں ادب میں ایک امتیازی مقام حاصل ہوا۔

یہاں پہلے میں فنِ لطیف خصوصاً شاعری سے متعلق ایک کام کی بات کہتا چلوں جس کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ بہت عرصہ ہوا مجھ سے ایک ماہر موسیقی نے کہا تھا کہ فن کوئی بھی ہو جب تک اس میں پاکیزگی نہ ہو PIETY کامیابی مشکل ہے اور وہ اس کے بغیر کچھ اور تو ہو سکتا ہے لیکن فن نہیں ہو سکتا۔ ایک زمانے کے بعد تقریباً اسی خیال کا اظہار اختر الایمان نے اپنی شاعری سے متعلق ایک گفتگو میں کیا تھا۔ انھوں نے اس پاکیزگی کو مذہب کے لفظ سے یوں معنون کیا کہ شاعری میں کامیابی کے لئے مذہب کا تقدس ضروری ہے۔ اسی بات کو انھوں نے اپنے مجموعۂ کلام "یادیں" کے پیش لفظ میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

> "۔۔۔ شاعری میرے نزدیک کیا ہے۔ اگر میں اسے ایک لفظ میں واضح کرنا چاہوں تو مذہب کا لفظ استعمال کروں گا۔ کوئی بھی کام جسے انسان ایمانداری سے کرنا چاہے اس میں جب تک وہ لگن اور تقدس نہ ہو جو صرف مذہب سے وابستہ ہے اس کام کے اچھا ہونے میں ہمیشہ شبہہ کی گنجائش رہے گی ۔۔۔۔ میں اپنی شاعری کو اپنا ایمان اور مذہب سمجھنے میں کوتاہی نہیں کرتا۔"

میں یہاں اس میں یہ اضافہ ضرور کروں گا کہ یہ تقدس فنکار کے فن کے ساتھ ساتھ اس کے کردار و عمل میں بھی ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر وہ کامیاب فنکار تو ممکن ہے ہو جائے لیکن اس کے فن میں وہ تاثر پیدا ہونا مشکل ہے جو قلب کو گرما دے روح کو برما دے جیسا کہ ایک عالم بے عمل کی تحریر و تقریر اثر سے خالی ہوتی ہے اور دلوں تک پہنچنے سے قاصر رہتی ہے۔

کسی فنکار کے فن اور اس کی زندگی کے کردار و عمل میں مذہب کے تقدس کا یکجا ہونا بھی جب ہی ممکن ہے کہ وہ مذہب کے بتلائے ہوئے ان اصولوں پر سختی سے عمل کرے۔ وہ تقدس حاصل ہوتا ہے چنانچہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے فن اور ان کی زندگی دونوں میں یہ تقدس ہمیں ملتا ہے وہ پابندِ صوم و صلوٰۃ تھے دین دار تھے۔ زندگی میں ان کا یہ مذہبی تقدس اور دین داری ان کے انتقال کے بعد بعض حلقۂ خیال کی نظر میں دقیانوسیت اور جرم بن گئی۔ اسی سلسلہ میں ہفتہ وار صدقِ جدید لکھنؤ میں "بلا تبصرہ" کے عنوان سے ایک دلچسپ خبر نظر سے گزری جو قارئین کی دلچسپی کے لئے درج ہے۔

بلا تبصرہ "معاصر" تحریک" نئی دہلی مارچ ۱۹۶۵ء میں اس کے مدیر گوپال متل کے قلم سے :-

"عصری ادب کے تازہ شمارہ میں جدید شاعروں کے جرائم کی جو فہرست شائع ہوئی ہے وہ کافی دلچسپ ہے۔
عابد منصوری صاحب کا مشغلہ نماز پڑھنا ہے جس کا ذکر وہ سوالنامے کے جواب میں فرماتے ہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی جو ایک زمانہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین علی گڑھ کے سکریٹری تھے آخیر عمر میں پابند صوم و صلوٰۃ ہو گئے۔ یہی نہیں بلکہ نعت وغیرہ لکھنے اور دقیانوسی حد تک مذہبی خیالات کا اظہار کرنے لگے تھے۔ عمیق حنفی بسم اللہ سے آغاز کلام کرنے لگے اور نعت وغیرہ تصنیف کرنے لگے۔"

اس فہرست کو پڑھ کر اکبر کا مندرجہ ذیل شعر یاد آ گیا۔ ؎

رقیبوں نے رپٹ لکھوائی ہے جا جا کے تھانے میں
کہ اکبر نام لیتا ہے خدا کا اس زمانے میں"

(صدق جدید لکھنؤ ۱۲ مارچ ۱۹۶۵ء)

بہرحال مجھے تو یہاں صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ فن میں مذہب سے وابستہ جس تقدس کی اہمیت اور ضرورت ہے وہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے فن ان کی زندگی کے کردار و عمل دونوں میں موجود ہے اور یہ نہ صرف ان کے فن بلکہ کردار کو بھی نمایاں کرتا ہے۔

اب میں یہاں ان کی ایک نظم "مٹی کا گیت" پر ایک مختلف زاویۂ نگاہ سے اظہارِ خیال کروں گا۔

ان کی اس نظم میں زندگی کی بے ثباتی، دنیا اور اس کے رشتہ ناطوں کی ناپائیداری، اس کا مآل فنا اور موت سے ہم آغوشی ہے۔ اس کا اظہار انھوں نے ایک ایسے عبرت آموز انداز میں کیا ہے کہ نظم کا ہر شعر از دل خیزد بر دل ریزد کا تاثر رکھتا ہے۔ یہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی شاعری اور اس نظم کا بنیادی تخیل قنوطیت، زندگی سے گریز اور فراریت کے جذبات پیدا کرتا ہے۔ لیکن یہ کلام کا صرف ایک ظاہری رُخ ہے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو اس خیال میں زندگی اپنی تمام تر حقیقتوں کے ساتھ جلوہ گر اور رواں دواں نظر آتی ہے۔

یہ خیال بھی عجیب ہے کہ وہ شے جس کا رشتہ زندگی سے اٹوٹ ہے، جس سے مفر ناگزیر ہے اس کا ذکر، اس کا بیان، اس کی یاد قنوطیت اور فراریت پیدا کرتی ہے جبکہ وہ بجائے خود زندگی کی ایک حقیقت ہے اور زندگی کا ایک ایسا اہم حصہ ہے جسے فراموش کرنا ہی زندگی کو فراموش کرنا ہے یہ خیال زندگی کے ہر زہر کے لئے تریاق کا کام دیتا ہے اس خیال سے ایک طرف عبرت آموزی ہوتی ہے تو دوسری طرف جرأت مندی اور دنیا سے بے خوفی بھی پیدا ہوتی ہے، کچھ کرنے اور کر گزرنے کی ہمت بھی پیدا ہوتی ہے۔ آخر مرنا ہی ہے تو کچھ کر کے ہی مریں۔ انتہائی مایوسی اور ناامیدی میں بھی یہی خیال زندگی کی ہر دلعزیز ہے۔ یہی خیال انسان کو باطل کے خلاف سینہ سپر کرتا ہے، ظلم کے خلاف جذبۂ جہاد، شوقِ شہادت پیدا کرتا ہے۔ یہی وہ خیال ہے جس کے دل نشین ہوتے ہی ظالم کا ہاتھ ایک دفعہ ظلم سے رک جاتا ہے۔ گنہگار فسق و فجور سے تائب ہو جاتا ہے۔

زندگی کی بے ثباتی زندگی کی ایک عظیم حقیقت ہے جس کا نقش دلوں پر بٹھا کر اس کی حقیقت دکھا کر لینے والوں نے بڑے بڑے کام لئے ہیں، بڑے بڑے کام کئے ہیں، بڑے بڑے معرکے سر کئے ہیں۔ اس وقت مٹی کی یہ زندگی، مٹی کا یہ انسان، مٹی کا یہ کھلونا ٹوٹ کر، مٹی میں مل کر بھی مٹی نہیں ہوتا جاوداں ہو جاتا ہے۔

آئیے خلیل کا "مٹی کا گیت" اسی روشنی میں اسی زاویۂ نگاہ سے دیکھیں دنیا ایک تماشا گاہ ہے زندگی کی ہر جہت میں ایک تماشا ہو رہا ہے۔ طرح طرح کے کھلاڑی طرح طرح کے کھیل کھیلنے کھلانے میں لگے ہوئے ہیں سیاست کا کھیل، حکومت کا کھیل، طاقت کا کھیل، مذہب کا کھیل، دولت کا کھیل مطمحِ نظر سب کھلاڑیوں کا ایک ہی ہے اور وہ ہے — جیت! مال و دولت کی جیت، حکومت کی جیت، طاقت کی جیت، کرسی کی جیت نام و نمود شہرت کی جیت۔ اور اس جیت کے لئے کھلاڑی اپنی عزت، شرافت انسانیت، ضمیر، ایمان سب کچھ داؤں پر لگانے اور ہارنے کو تیار ہے۔ اس وقت یہ آواز بلند ہوتی ہے اور اس شے کی حقیقت بتاتی ہے جس کے پیچھے وہ دیوانہ وار دوڑ رہا ہے۔

مٹی کے سب رنگ انوکھے سب دیوانے مٹی کے
مٹی کے سب کھیل کھلاڑی نئے پرانے مٹی کے
مٹی کی سنسار کایا، مٹی کی ہی ساری مایا
کنکر پتھر، سونا چاندی سولہ آنے مٹی کے،

اے کٹیا کے رہنے والے اپنی پسماندگی سے احساس کمتری نہ کر شہروں کی چکا چوندھ محلوں کی شان و شوکت سے مرعوب نہ ہو۔ تیرا گاؤں

مٹی کا ہے تو اس شہر کی حقیقت بھی مٹی کی ہے۔ اور تیری کٹیا مٹی کی ہے تو یہ محل دو محلے بھی مٹی کے ہی ہیں تو اگر چاہے تو ان کے در و دیوار ہلا سکتا ہے۔

مٹی کے سب محل دو محلے مٹی کی چھوٹی سی کٹیا!
مٹی کے سب دیئے، یہ شمعیں سب پروانے مٹی کے

مٹی کی سب گلیاں، اپنی مٹی کے سب گاؤں ہمارے
مٹی کے سب شہر بسے ہیں، مٹی کے سب ویرانے

مذہب کو کھیل بنانے والو، مذہب کا کھیل کھلانے والو، مذہب کے نام پر خون کی ہولی کھیلنے والو دیکھو حقیقت سب کی کیا ہے

مٹی کے سب دیوتا دیوی، مٹی کے سب گرجا مسجد
کیا سیتا کیا کالی ماتا، سب افسانے مٹی کے
مٹی کی میٹھی بنسی، مٹی کی سی چنچل رادھا
مٹی کے کرشن کنھیا، سب گانے مٹی کے

اے ہم صفیر، اے ہم نشیں، اے ہم نفس، اے ہم دم۔ مایوس نہ ہو اپنی مٹھی بھر مٹی میں وہ شعلہ پیدا کر کہ وہ ظلم و استبداد کے دیو پیکر کو جلا کر خاکستر کر دے۔ یہ ظالم و جابر خود ساختہ زمین کے خدا مٹی کے ہی ہیں۔ ان سے خوف زدہ نہ ہو مٹی کے ان من مانی کرنے والوں کا کوچ نقارہ بھی بجے گا اور ان سے کہے گا گھر چل گھر چل کہ یہی مٹی کا گھر تیرا گھر ہے۔

دھڑ دھڑ دھڑک رہی ہے ہر ہر چھاتی مٹی کی
سر سر سرک رہے ہیں سارے شانے مٹی کے
مٹی مٹی مٹی باجے ۔۔۔۔ باجے کوچ نقارہ
گھر چل گھر چل، گھر چل گھر چل او من مانے مٹی کے

کتنے بادشاہ، شہنشاہ، کج کلاہ اپنا سر پُر غرور لئے اس دنیا میں آئے گئے، ان کے ملک، ان کی املاک، ان کے تاج ان کے تخت سب تاخت و تاراج ہو گئے، کوئی نام و نشان بھی ان کا باقی نہ رہا۔ اس لئے اے مٹی کے انسان اپنی حقیقت کو پہچان اس رعونت سے زمین پر نہ چل کہ اسی مٹی میں تجھ کو ملنا ہے۔ راہِ راست چل، نیکی کی راہ چل کہ انجام کار مٹی اوڑھنا مٹی ہی بچھونا ہے۔ یہ آواز جس طبلہ سے نکل رہی ہے وہ مٹی کا ہے، شاعر بیٹا۔

یہ ناچنے والے اور یہ ناچ سب مٹی کے ہیں۔ یہ تارِ نفس کا ایک تارہ جو بج رہا ہے مٹی کا ہے۔ اس کے پس پردہ جو آواز آ رہی ہے وہ کہہ رہی ہے۔ اللہ بس باقی ہوس

تاک دھنا دھن تاک دھنا دھن بولے طبلہ مٹی کا
ناچو، ناچو، ناچو، ناچو، سب رقصانے مٹی کے
دھما دھو، دھما دھو، دھما دھو، دھما دھو، دھکا مٹی سا تانڈو
اس کے پیچھے یا ہو یا ہو سب مستانے مٹی کے

مٹی کی چادر میں چھپیں گے، قبر بنے گی مٹی کی
سب مٹی میں مل جائیں گے، ختم فسانے مٹی کے
ختم فسانے مٹی کے

اور مٹی کے فسانے ختم ہوئے اور مٹی کے فسانے سنانے والا بھی ختم ہوا لیکن اپنا نام اپنا کام جاوداں کر گیا ○○

بقیہ: صفحہ ۱۳۹ - خلیل الرحمن اعظمی مرحوم

ہی ملازمت کے بعد ایسے ٹک گئے کہ وہیں پیوندِ خاک ہو گئے۔ اُن کی جد و جہد کی زندگی سے قطع نظر بعد کی زندگی بے حد پُر سکون گذری۔ ۱۹۵۸ء میں جہاں آباد بنی کھیت کے ایک معزز خاندان میں شادی کر لی تھی۔ راشدہ بیگم صاحبہ سے اُنہیں چار بچے ہیں۔ جن میں سے پہلے تین لڑکے اور ایک چھوٹی سی لڑکی ہے۔ بڑا لڑکا بی۔ اے میں پڑھ رہا ہے۔ چھوٹی لڑکی ہما چھ سال کی ہے جو سُنا ہے بڑی ہونہار ہے۔

اعظمی صاحب کسی زمانے میں بیحد ترقی پسند بلکہ کمیونسٹ بھی تھے۔ لیکن اپنی عمر کے آخری چند سالوں میں مذہب کی جانب اُن کا میلان بڑھ رہا تھا جس کا ثبوت اُوپر کے اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے۔ (ع)

"خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں" ۔۔۔۔ ○○

سلیم تمنائی
دودھ پیر ساگر - عید گاہ، میسور - ۱

چھوڑ کر تجھ کو کہیں اور نکل جائیں گے

علی گڑھ "تالا" قفل، مکھّی اور مسلم یونیورسٹی کیلئے مشہور بھی معروف بھی۔ تالے کی مضبوطی کے بارے میں وہ جانے جس کے پاس بڑی تجوری اور ندی کنارے ایک بنگلہ ہو۔ مسلم یونیورسٹی کو بھی جو دیکھے وہ جانے، جو نہ دیکھے وہ بھی۔ چار دانگ عالم مشہور۔ رہا مکھّی اور مچھر کا معاملہ ایک لطیفہ عرض کر دوں۔

دودھ گرم ہو رہا تھا، بڑی سی کڑھائی میں۔ ہمارے دوست کا من للچایا۔ اتنے میں ایک نہیں، دو چار مکھّیاں اس میں گریں۔ اور دودھ کی جلی پانی مانگ نہ سکیں۔ مالک تھے ایک مولانا۔ جس کسی کی ریش مبارک ہو وہ "مولانا" خواہ مخواہ کہلاتا ہے۔ کچھ دیر خاموش رہے، شاید اس کا رس کس پوری طرح دودھ میں اتر جانے کے منتظر تھے۔ پھر چمچ سے نکال پھینکا۔ اب ہمارے دوست جن کے دانت ہونے کے باوجود دودھ پینے کو دل چاہا تھا۔ باادب عرض کیا۔ مولانا اس میں مکھّی ڈبکی لگا جان بحق تسلیم ہوئی، جس کی لاش ابھی ابھی آپ نے نکال پھینکی۔

"تو کیا اونٹ پڑے گا؟" مولانا کا خیال ان کے خیال میں لاجواب تھا۔ راستے میں پانی کی پڑیاں سی ٹنکی یا مٹکے (بمبئی یہ آج کل بدنام ہے خصوصاً بمبئی میں) سے مچھر بھی "ان لگاتے ہوئے نکلے اور ہمیں دیکھ پردے دار خواتین کی طرح شرما کر یا چور کی طرح اپنے آپ کو چھپانے کی خاطر اندر گھس گئے۔ کچھ ان میں اکثر پانی کو پیارے ہو گئے ہوں۔ اور اسی پانی سے ہمیں حلق تر کرنا پڑتا تھا۔

یہ سن کر خلیل الرحمٰن خوب خوب ہنسے اور کہا۔ "آپ کہاں شاید ان چیزوں کی کمی ہے۔ یہاں مچھر دانی کے بغیر سونا دشوار ہے۔"

"اور کھٹمل کے بغیر بھی" میں نے کہا "جنوب میں اس کا عام رواج نہیں ہے۔"

شاعر بمبئی

۲۰ اپریل ۱۹۵۶ء کی بات ہے۔ جب پہلی بار آپ سے ہاتھ ملانے کا موقع ملا۔ اس وقت آپکی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بڑے تپاک سے ملے۔ میں بالکل اجنبی تھا۔ یا میں سمجھ رہا تھا۔ وہ میرے لئے یقیناً اجنبی نہیں تھے۔ کیونکہ اعظمی صاحب کو میں نے پڑھا تھا۔

میں نے آپکا افسانہ ۱۹۴۸ء کے سالنامہ عالمگیر میں پڑھا ہے۔"

اب پتہ چلا کہ اعظمی صاحب کے لئے میں اجنبی نہیں ہوں۔ "مگر مجھے اس بات کا علم نہ تھا کہ آپ جنوب سے تعلق رکھتے ہیں۔ آپ ہماری زبان میں بھی تو لکھتے ہیں۔

اس پر آبروئے ادب رشید احمد صدیقی کی ایک بات یاد آگئی۔ جس کا ذکر میں نے اپنے مضمون مطبوعہ "پیام" حیدرآباد اور "ایشیا" دہلی میں کیا ہے؟

"ارے آپ بڑے بدنام آدمی ہیں" رشید صاحب قبلہ نے فرمایا۔ "میں نے آپ کو "ہماری زبان" "عالمگیر" وغیرہ میں پڑھا ہے۔"

اللہ رے بزرگی ان بزرگوں کی، چھوٹوں پر شفقت اور ہمت افزائی، ہماری زبان کا ذکر خیر چھڑ گیا تو میں نے ان کے اپنے "میراصفحہ" کی تعریف کی، مسکرا کر کہا: اس صفحہ کی بھی عجیب کہانی ہے۔ پرچہ پریس جا رہا ہے۔ کاتب صاحب منتظر ہیں اور میں لکھے جا رہا ہوں۔ ختم کر کے ان کے ہاتھ تھما دیتا ہوں۔

صمد شاہین اور ممتاز شیریں کے "نیا دور"[1] کا ذکر چھڑ گیا جس میں (شاید) پہلی منظوم کاوش شرف رد ہوئی تھی۔ وہ ممتاز شیریں کے دلدادہ تھے۔ میں نے اپنی دوسری نظم انہیں بھیج دی۔ جو لوید میں چھپ گئی۔[2]

---

[1] ۱۹۴۴ء میں پہلا نمبر شائع ہوا تھا۔ [2] ۱۹۴۶ء (جولائی، اگست) کے نمبر میں بعنوان "نقش ناتمام" چھپی۔

تسلیم صاحب: میں چاہتا ہوں کہ جنوب کے ادب سے ہم واقف ہوں۔ اور شمال سے جنوب کے لوگ اور شمال و جنوب کی تقسیم ہو ختم ہو۔ مجھے "ہماری زبان" میں رفعت زہرہ کا مضمون "اپنے دشمن" پسند آیا۔ وہ جنوب کی ہی ہیں۔

میں نے مسکرا کر کہا: "وہ میری بڑی بہن ہیں۔"

دوسری ملاقات شعبۂ اردو میں ہوئی۔ ڈاکٹر عبدالغفار شکیل کی کتاب "فعدافغانی" مسودہ ڈاکٹر مسعود حسین خاں صاحب تک پہونچانے کی ذمہ داری میرے سپرد تھی۔ رشید احمد صدیقی، جذبی، مسعود حسین خاں، سید ظہیر الدین علوی، نسیم قریشی وغیرہ سے ملاقات کے بعد اعظمی صاحب کو آنکھیں ڈھونڈتی رہیں۔ اتنے میں وہ چلے آئے۔

"کب آئے آپ؟ چلئے گھر چلتے ہیں۔"

میں اُن کے ساتھ گھر پہونچا تو کہا کہ گرمیوں میں لکھنے پڑھنے کا کام خاصہ ہو جاتا ہے۔ کمرہ بند، پنکھا آن (on) اور اس گرمی اور لُو میں ملاقاتی غائب۔"

اعظمی کی مختلف کتابوں کا ذکر چھڑ گیا۔ اور انہوں نے باتوں کے بیچ "قومی زبان" کراچی کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا "بابائے اُردو کے قلم سے مجلس ادب، بنگلور کے رسالہ جنوبی ہند کا بہترین ادب پر تبصرہ پڑھ کر رسالہ پڑھنے کی خواہش ہوئی۔" میں نے کہا میرے ساتھ وہ رسالہ ہے۔ میں کل پہونچا دوں گا۔

"بڑی اچھی کوشش ہے۔" اعظمی نے کہا۔ جنوبی ہند کی زبانوں سے ہم ناواقف ہیں۔ انسان کو سمجھنے کے لئے زبان بھی ایک سہارا ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ ترجمے کے ذریعے جنوب کا ادب ہم تک پہنچے اور اسی طرح اُردو ادب جنوبی ہند کی زبانوں میں ترجمے کے ذریعے ان تک پہنچے۔

میرا کوئی چار بار علی گڑھ جانا ہوا۔ اُن سے ملے بغیر کبھی نہ لوٹا۔ عجیب طلسم تھا ان کی شخصیت میں۔ وہ نوجوان نسل میں خاصے مقبول تھے۔ اور اُن کی ہمت افزائی کو فرض سمجھتے تھے۔

جنوب کے ایک مشہور اُردو رسالے کے ایک مدیر نے ان کے رسالے کے لئے بھجوائی ہوئی ایک غزل دکھا کر کہا کہ یہ لوگ عجیب ہیں۔ اپنے شاگردانِ عزیز کی غزلیں بھی روانہ کر کے شائع کرنے پر زور دیتے ہیں۔ شائع ہونے کے بعد اس قسم کے خطوط روانہ کرتے ہیں: "جناب! فلاں کی غزل بڑی معیاری ہے۔ اس کے شائع کرنے پر مبارکباد۔ شاعر میری دیتا ہوں۔ انہیں آئندہ بھی ضرور شائع کیجئے۔"

اُستاد کو ہر حال حاتم ہونا چاہیئے۔ بخیل نہیں۔ واقعی اعظمی نے نئی نسل کی ہمت افزائی کے لئے بہت کیا ہے۔ یہ خوبی اس قابل ہے کہ دوسرے بھی نقش قدم پر چلیں۔ اسی طرح نئی نسل کو ان کے

"اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ انہیں کچھ نہ کہو"

کہنے کی ضرورت محسوس نہ ہوگی۔

میرے عزیز دوست ڈاکٹر عبدالغفار شکیل، ریڈر شعبہ لسانیات مسلم یونیورسٹی علیگڑھ سے اعظمی کی بیماری اور کینسر کی بات سُنی تو دل بھر آیا۔ آنکھیں نم ہوگئیں۔ والدہ محترمہ اسی مرض کا شکار ہوئی تھیں۔ آخری سانس اور آخری گھڑی تک ہوش و حواس اور کرب، بلا کا عالم۔ اللہ پناہ دے۔ اللہ دشمنوں کو بھی اس سے بچائے۔

میں نے اُن کی بیماری کی بات جانے بغیر ایک خط لکھا تھا مگر جواب نہ پا کر بڑا تعجب ہوا۔ جب اس مرض میں مبتلا ہونے کی خبر پائی تو انہیں تسلی و تشفی کا خط تحریر نہ کر سکا۔ کیونکہ میں اس بیماری کی تباہ کاری سے واقف تھا۔

ہونی ہو کر رہی میرا وہ کوئی نہ تھا۔ صرف دو چار ملاقاتیں اور ایک آدھ خط۔ بس دوستی کی یہی ساری کائنات۔ لیکن ایک بڑا ناطہ نہ صرف انسانیت کا، تحریر کا بلکہ ادب کا بھی۔ بڑا با ادب تھا وہ۔

یکایک میری نظر اپنے البم پر پڑی۔ چند تصویر بُتاں، چند حسینوں کے خطوط۔ اور اعظمی نے اپنی پہلی ملاقات کی یاد میری اسی آٹوگراف بک میں مندرجہ ذیل شعر لکھ کر چھوڑی تھی ؎

چھوڑ کر تجھ کو کہیں اور نکل جائیں گے
ہم ترے بس میں بھی لے گردشِ ایام نہیں

آخر مسافر ہم سب کو چھوڑ کر دور بہت دور نکل گئے۔

رشید الدین
مددگار مترجم (اردو) نظامتِ ترجمہ حمایت نگر۔ حیدرآباد - ۲۹

خلیل الرحمن اعظمی مرحوم

۱۹۷۸ء نے اُردو کے کئی ادیب و شاعر چھین لئے۔ اُن میں سے تین شاعر و ادیب ایسے تھے جن سے میرے ذاتی مراسم تھے اور جن کے بچھڑنے کا مجھے ذاتی طور پر قلق ہے یہ تین شخصیتیں اعجاز صدیقی مدیر شاعر یعقوب عثمانی (اورنگ آباد) اور خلیل الرحمن اعظمی کی تھیں۔ اول الذکر دو شخصیتوں پر میں نے اپنے تاثرات قلمبند کئے تھے۔ جو روزنامہ "سیاست" حیدرآباد کے ادبی اڈیشنوں میں شائع بھی ہو چکے لیکن اعظمی مرحوم پر میں اب تک کچھ نہیں لکھ سکا۔ آج "شاعر" کے ذریعے اپنا یہ فرض پورا کر رہا ہوں —— ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی اُردو کے ایک ذہین شاعر اور متین نثر نگار تھے۔ میں آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکا کہ وہ ایک اچھے شاعر تھے یا اچھے نثر نگار۔ جب ان کی کوئی نظم یا غزل پڑھتا تھا تو خیال ہوتا کہ یہ شخص بس شاعری کے لئے پیدا ہوا ہے لیکن جب کوئی مضمون نظر سے گذرتا تھا تو یہ گمان ہوتا تھا کہ اس شخص کو بس نثر ہی لکھنا چاہیئے۔ نہایت میٹھی، ملائم، سلیس اور دل میں اُتر جانے والی ہوتی تھی اُن کی نثر۔ میں شروع سے انکی نظم و نثر کا دیوانہ رہا ہوں۔ اور انکی زندگی ہی میں انہیں اس تعلق سے خراجِ تحسین پیش کر چکا ہوں۔

اُن کا پہلا شعری مجموعہ "کاغذی پیرہن" تھا۔ جسے ۱۹۵۵ء میں آزاد کتاب گھر، دہلی نے بڑے اہتمام سے شائع کیا تھا۔ اس وقت میں اورنگ آباد کالج میں انٹر کا طالب علم تھا۔ دوسرے سال جب میں بی اے میں آیا تو کالج لائبریری میں انکی یہ کتاب ہاتھ آئی۔ اور میں اسے ایک ہی نشست میں پڑھ گیا۔ پڑھنے کے بعد اس کتاب نے مجھے اتنا متاثر کیا کہ میں فوری انکی ذات پر ایک مضمون لکھنے بیٹھ گیا۔ یہی مضمون جنوری ۱۹۵۷ء کے "شاہراہ" (دہلی) میں "خلیل الرحمن اعظمی —— نئی پود کا ایک ذہین شاعر" کے عنوان سے شائع ہوا۔ مضمون کے شائع ہونے کے بعد شاعر، یعنی میں نے انہیں ایک خط لکھا جس کا جواب اُنھوں نے فوری دیا:

عزیزی رشید صاحب!
آپکا خط ملا۔ مضمون مجھے پسند آیا۔ شکریہ ادا کرنا تو محض رسمی بات ہوگی لیکن میری خواہش ہے کہ آپ تنقید کیطرف رجوع کریں۔ مستقبل میں آپ سے اچھی اُمیدیں وابستہ کی جا سکتی ہیں۔"

۱۹۵۶ء میں ان کے تنقیدی مضامین کا پہلا مجموعہ "فکر و فن" بھی شائع ہو گیا۔ یہ کتاب بھی مجھے اپنی لائبریری سے ملی اور شعری مجموعہ کی طرح ہی پسند آئی۔ اسوقت میرا بی۔ اے کا امتحان قریب تھا (سن غالباً ۱۹۵۸ء تھا) لیکن اسکے باوجود میں نے وہ کتاب شروع سے آخر تک پڑھ ڈالی اور بیساختہ طور پر "خلیل الرحمن اعظمی —— ایک نقاد کی حیثیت سے" کے عنوان سے ایک مضمون بھی لکھ ڈالا جو بعد میں ماہنامہ "خیال" کامٹی میں شائع ہوا۔

۱۹۶۰ء میں میں ملازمت کے سلسلہ میں حیدرآباد آ گیا۔ اس شہر میں ایک ادارہ محکمہ ترجمہ میں نوکری کر کے میری ادبی سرگرمیوں کو اور جلا ملی اور یہیں بہت سی کتابوں کے مصنفین سے بھی ملاقات کا موقع ملا جن میں اعظمی مرحوم بھی شامل تھے۔ غالباً ۱۹۶۷ء میں وہ ایک مشاعرہ کے سلسلہ میں حیدرآباد آئے تھے۔ شہریار بھی ساتھ تھے۔ معلوم ہوا کہ رائل ہوٹل (نامپلی) میں ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایک دن صبح ہی ناشتہ کے فوراً بعد دفتر جاتے ہوئے میں رائل ہوٹل پہونچا۔ نیچے ہی ڈاکٹر مغنی تبسم مل گئے جنھوں نے روم نمبر بھی بتا دیا۔ ان کی تصویر پہلے دیکھ چکا تھا! اسلئے پہچاننے میں دیر نہ لگی۔ سُرخ و سپید رنگ، چھریرہ بدن، کھڑا چہرہ، اوسط قد، اور مجسم شرافت —— یہ تھے ڈاکٹر خلیل الرحمن اعظمی جن کی تحریریں پچھلے دس سال سے میں پڑھ رہا تھا۔ اور اُنکا غائبانہ معترف

اس دن اعظمی صاحب سے بہت سی باتیں ہوئیں۔ اُن لوگوں نے ناشتہ نہیں کیا تھا۔ اور ناشتہ آنے میں کچھ دیر تھی۔ اس لئے شہریار صاحب بہت بے چین ہو رہے تھے۔ اتنے میں ناشتہ آ گیا۔ اعظمی صاحب نے مجھے بھی کھانے کو بُلایا اور دیر تک اصرار کرتے رہے لیکن میں ناشتہ کر کے آیا تھا اور اُن سے صرف باتوں کا خواستگار تھا۔ اس لئے معذرت چاہ لی۔ پھر بھی اُنھوں نے میرے لئے چائے کا آرڈر دیدیا۔ ناشتے کے دوران بھی وہ باتیں کرتے رہے۔ مجھ سے بولے آخر آپ اس طرح مضامین کب تک لکھتے رہیں گے کوئی کتاب شائع کیجئے۔ پھر مجھ سے بولے "آپ یہاں کے ادبی حلقوں میں جاتے ہیں یا نہیں۔ جایا کیجئے۔ سلیمان اریب، انور معظم اور مغنی تبسم وغیرہ اچھے لوگ ہیں۔ اُن سے ملا کیجئے"۔ میں نے جواب دیا کہ "یقیناً یہ اچھے لوگ ہیں اور میں ان سے ملتا رہتا ہوں"۔ غالباً وحید اختر اس وقت تک علی گڑھ منتقل ہو چکے تھے ———— رات میں اعظمی صاحب اور شہریار صاحب دیگر بیرونی مہمانوں کے ساتھ انور معظم اور جیلانی بانو صاحبہ کے ساتھ کھانے پر مدعو تھے۔ وہاں بھی اُن سے ملاقات رہی لیکن کچھ خاص بات چیت نہ ہو سکی کیونکہ بہت سے مقامی اور بیرونی ادبی شخصیتیں وہاں جمع ہو گئی تھیں اور اعظمی صاحب سے بات چیت کی خواہاں تھیں۔ وہیں سے وہ لوگ اسٹیشن گئے جو قریب ہی واقع تھا۔ میں بھی دیگر لوگوں کے ساتھ اسٹیشن تک گیا۔ اسٹیشن پر بولے کبھی ادھر بھی آیئے۔ میں نے وعدہ کر لیا۔ لیکن اسے ایفا نہ کر سکا۔ اس کے بعد نہ وہ کبھی حیدر آباد آئے اور نہ میں علی گڑھ گیا۔ ویسے ان کی تحریریں پڑھتا اور حال چال معلوم کرتا رہتا تھا۔

۱۹۷۶ء کے اوائل میں یہ اطلاع ملی کہ اعظمی صاحب بیمار ہو گئے ہیں۔ جگر خراب ہو گیا ہے۔ علاج جاری ہے۔ پھر سُننے میں آیا کہ انھیں بلڈ کینسر ہو گیا ہے اور دلّی میں زیر علاج ہیں۔ پھر ماہنامہ "شب خون" کے ذریعے انکی صحت یابی کی اطلاع ملی۔ مجتبیٰ حسین صاحب بھی ایکبار دلّی سے آئے تو انکی زبانی اس بات کی توثیق ہوئی کہ کشمیر میں اپنے ہم زلف کمال احمد صدیقی کے پاس رہنے کے بعد انکی صحت کافی اچھی ہو گئی ہے۔ اور نیا خون بننا شروع ہو گیا ہے۔ لیکن کچھ دن بعد کمال صاحب خود حیدر آباد آئے تو معلوم ہوا کہ طبیعت پھر خراب ہو گئی ہے۔ اور ہر تیسرے چوتھے دن نیا خون جسم میں داخل کر کے فاسد خون خارج کرنا پڑتا ہے۔ کمال صاحب نے بتایا کہ وہ خود آنے سے پہلے خون دیکر آئے ہیں۔ یہ غالباً ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔

پھر ۱۹۷۸ء آ گیا۔ معلوم ہوا کہ اعظمی صاحب علیگڑھ واپس ہو گئے ہیں اور یونیورسٹی جانا بھی شروع کر دیا ہے۔ ایلوپیتھک علاج سے مایوس ہوکر ہومیوپیتھک علاج شروع کر دیا ہے۔ اور کچھ افاقہ بھی محسوس کر رہے ہیں۔ لیکن مئی ۱۹۷۸ء کے آخری ہفتے میں مرض نے شدت اختیار کر لی اور یونیورسٹی ہاسپٹل میں داخل کر دیئے گئے۔ جہاں سے ۲۸ مئی کو واپس گھر آ گئے۔ طبیعت بگڑتی ہی رہی اور یکم جون کو پونے دو بجے دوپہر میں اپنے مکان "اردو باغ" علیگڑھ میں اعظمی صاحب نے زندگی کی آخری سانس لی اور اپنے لاکھوں شیدائیوں کو غم زدہ چھوڑ گئے۔

اعظمی صاحب کی جملہ ۱۰ مطبوعہ کتابیں ہیں جن میں کچھ شعری اور کچھ نثری مجموعے ہیں۔ اُن کی آخری کتاب "تنقیدی مضامین" کا مجموعہ "مضامین نو" تھا۔ جو انہوں نے ۱۹۷۷ء میں بستر علالت سے چھپوایا تھا جس کے دیباچہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی زندگی کے دروازے پر موت کی دستک سن لی تھی۔ :

> "اِس کتاب کی ابھی ایسی کوئی جلدی نہ تھی مگر
> گذشتہ ایک سال سے موت و حیات کی جس کشمکش سے
> گذر رہا ہوں اس نے زندگی میں بے ثباتی اور ناپائیداری
> کے نقوش کو اور گہرا کر دیا ہے۔ یوں تو میں اللہ کی
> رحمت سے مایوس نہیں ہوں۔ مگر اسکے بُلاوے اور
> اس کی پکار پر لبیک کہنے کو اپنے لئے باعث فخر سمجھتا ہوں"

خلیل الرحمٰن اعظمی مرحوم کی زندگی بڑی سلمت سیدھی تھی۔ انہوں نے میٹرک کے بعد ہی اپنا گھر بار چھوڑ دیا۔ انٹر سے لیکر پی۔ ایچ۔ ڈی تک اُنہوں نے اپنے پیروں پر کھڑے ہوکر تعلیم حاصل کی۔ ترقی پسندی کی علّت میں انہیں زندگی میں جیل بھی جانا پڑا۔ ۱۹۴۷ء کے فسادات میں فسادیوں کے ہاتھوں جاں بہ لب بھی ہوئے اور علیگڑھ یونیورسٹی میں اپنوں ہی کے ہاتھوں اُس سے بھی گہرے زخم کھائے۔ اعظمی صاحب کو مسلم یونیورسٹی علیگڑھ میں اُردو کی پروفیسری اور شعبۂ اُردو کی صدارت نہ مل سکی اس کا تلق اُن کے ہر ہمدرد کو رہے گا۔

اعظمی مرحوم نے آوارگی میں زمانے کی سیر کی لیکن علیگڑھ یونیورسٹی

باقی صفحہ ۱۳۵ پر دیکھئے۔

شاعر کیفی

ڈاکٹر قاضی عبیدالرحمٰن ہاشمی
جامعہ ملیہ، دہلی۔ ۲۵

خوشبو کی ہجرت

گذشتہ چند برسوں میں ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں ہماری ادبی زندگی کے کئی اہم ستون یکے بعد دیگرے گر گئے، لیکن یہ عجیب بات ہے کہ جتنا ماتم خلیل صاحب کا کیا گیا وہ شاید کسی بڑے سے بڑے ادیب کے بھی حصے میں نہیں آیا۔ خلیل صاحب جب زندہ تھے تو اُن کی شاعری اور تنقید کو کوئی غیر معمولی اہمیت حاصل نہ تھی، لیکن اُن کی اچانک اور غیر متوقع موت نے سب کو یکسر مبہوت سا کر دیا۔ کون سوچ سکتا تھا کہ خلیل صاحب اتنی جلد ہمیں سوگوار کر جائیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ جولائی ۷۸ء میں اُن پر اچانک جس بیماری کا حملہ ہوا تھا اُسے میں مرض الموت سے تعبیر کر سکتا ہوں اس لئے کہ ایسی اور اس نوع کی تکلیف میں جس میں خلیل صاحب مبتلا ہو گئے تھے میری نظر سے آج تک کوئی مریض نہیں گزرا، لیکن اس جاں گسل تکلیف سے بھی وہ صحیح و سلامت نکل آئے اور اُس وقت مرے جب اُن کی صحت تقریباً نارمل تھی۔ کہا جاتا ہے کہ اُن کا اس طرح اچانک خاتمہ بلڈ کینسر سے ہوا۔ جیسے بھی ہوا ہو، خلیل صاحب کی پیاری تصویر اب بھی ہماری نظروں میں بسی ہوئی ہے۔ اور لگتا ہے کہ وہ زندہ ہیں۔ خلیل صاحب سے میرا تعلق بہت پرانا نہ تھا۔ ۱۹۶۹ء میں جب میں نے علیگڑھ میں ایم اے (اردو) میں داخلہ لیا تھا اس سے قبل میں اُن سے واقف بھی نہ تھا۔ خلیل صاحب سے میرا رشتہ گرچہ ہمیشہ شاگرد اور استاد ہی کا رہا لیکن مجھے یہ سعادت حاصل رہی کہ میں نے اُن کو دوستوں کے درمیان بھی دیکھا، بحیثیت معلم اور بحیثیت ایک انسان کے بھی دیکھا اور سبھی حیثیتوں سے انھوں نے مجھے ہمیشہ متاثر کیا۔

سب سے پہلے مجھے خلیل صاحب کو بحیثیت معلم دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ خلیل صاحب کبھی اپنی علمیت اور غیر معمولی ذہانت سے کسی طالب علم کو مرعوب کرنے کی کوشش نہ کرتے تھے لیکن یہ عجیب اتفاق ہے کہ طالب علم لاشعوری طور پر اُن سے اتنے زیادہ مرعوب رہتے تھے کہ اُن کا غیر معمولی احترام دل میں پیدا ہو جاتا تھا۔ پڑھاتے وقت اُن کی شخصیت کا جوہر کھل کر سامنے آ جاتا تھا، ایسا اعتماد، ایسی طباعی اور حافظہ ہمارے اساتذہ میں تقریباً ناپید ہے۔ مضمون کوئی بھی ہو، شاعری کا ہو یا فکشن، تنقید

شاعر۔ بمبئی

یا تحقیق، خلیل صاحب جس موضوع پر بولتے تھے اُن کی بصیرت ہر آن ایک نئی حقیقت کا انکشاف کرتی تھی، ذہن کے تمام بند دریچے کھل جاتے تھے۔ اُن کی کلاس میں ایک پُر وقار خاموشی اور سناٹے کا عالم ہوتا تھا۔ ایک ایسا سحر جو کسی طرح ٹوٹتا نہ تھا۔ پوری کلاس محویت کے عالم میں اکثر وقت کے تصور سے بے نیاز ہو جاتی تھی۔ خلیل صاحب کا امتیاز یہ تھا کہ وہ چبائے ہوئے نوالوں اور گھسی پٹی باتوں سے گریز کر کے علم کی جستجو میں نئی راہوں کا انتخاب کرتے تھے، لیکن نئے پن کی خاطر وہ غلط راہ پر چل پڑنے والے آدمی نہ تھے۔ وہ اُس طالب علم کی بڑی قدر کرتے تھے جو اپنی ذہانت کا استعمال کر کے کسی انوکھے اور نئے ذائقے کی خبر لاتا تھا۔ ان کے یہاں تجسس کا عمل تخلیق کے عمل سے مربوط تھا۔ وہ سادہ مگر موثر اور دلنشین زبان کا استعمال کرتے تھے اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ محض الفاظ کے پجاری نہ تھے، الفاظ کی سیپوں میں بند مفہوم پر نظر زیادہ رکھتے تھے۔ خلیل صاحب کی کلاس میں داخل ہوتے ہی جس قسم کی تشنگی کا احساس رہتا تھا وہ واپسی پر کامل آسودگی میں بدل جاتا تھا۔ وہ علم کی سچی پیاس رکھنے والوں کے لئے ایک بہتا ہوا گہرا دریا تھے جس کا پانی اپنے اندر مٹھاس رکھتا ہو۔ ان سب باتوں کے باوجود کہ وہ صرف شعبۂ اردو علیگڑھ ہی میں نہیں بلکہ پوری یونیورسٹی میں ایک ممتاز استاد کی حیثیت سے مشہور تھے، اپنے شاگردوں کو اپنے کسی نجی یا ذاتی مقصد کے حصول کا ذریعہ بنانا اپنے شایانِ شان نہیں سمجھتے تھے۔ مجھے معلوم ہے کہ یونیورسٹی میں خلیل صاحب کی عزت کرنے والے طالب علموں کی اچھی خاصی تعداد تھی جو اُن پر اپنی جان چھڑکتے تھے لیکن خلیل صاحب نے اپنی پوری زندگی میں کبھی کسی طالب علم کو اپنے لئے آلۂ کار کے طور پر استعمال نہیں کیا جبکہ اس کے برعکس ہمیں ہر جگہ ایسے ...... اساتذہ بھی ملتے تھے جو برابر اپنے شاگردوں کو اس قسم کا درس دیتے تھے اس لئے کہ اس کے سوا انھیں کچھ آتا ہی نہ تھا۔ خلیل صاحب کو ان باتوں کی ضرورت اس لئے نہیں تھی کہ انھیں اپنے اوپر اعتماد تھا۔ وہ خوب سمجھتے تھے کہ جو لوگ اس قسم کے حربے استعمال کرتے ہیں وہ عموماً اپنے جہل اور سفلہ پن ہی کی

مدافعت کے لئے لیا کرتے تھیں خلیل صاحب کی ذات اور عیب سے پاک تھی خلیل صاحب سے میرا رشتہ بعد بروز اسی لئے پختگی حاصل کرتا گیا اور انھوں نے میری نگاہ میں ایک برگزیدہ تر انسان کا مقام حاصل کر لیا کہ علیگڑھ میں انھوں نے میرے آٹھ سال کے قیام کے دوران ایک بار بھی یہ موقع نہ دیا کہ میں ان کا کوئی ذاتی کام کر دیتا۔ حالانکہ میرے دل میں یہ آرزو بار بار پیدا ہوتی تھی کہ خلیل صاحب مجھ سے کوئی کام لیں، لیکن میری آرزو کبھی نہ پوری ہو سکی حالانکہ وہاں ریسرچ اسکالرس کا جس طرح استحصال ہوتا ہے اس کی نظیر کسی دوسری یونیورسٹی میں ملنا محال ہے۔ مجھے اس مرحلے میں بھی خلیل صاحب کی آدمیت سے بھرپور شخصیت برابر متاثر کرتی رہی۔ ان کی نظر صرف میرے کاموں پر رہتی تھی وہ کبھی مجھ سے کام نہیں لیتے تھے ان کی خواہش ہمیشہ یہی رہی کہ میں ایک باعزت انسان کی طرح اپنا علمی کام مکمل کر لوں اور پھر کسی روزگار سے لگ جاؤں۔ یہ سب کچھ اُن کی زندگی میں ان کی مدد سے ہو گیا لیکن اس سب کا صلہ میں انھیں کچھ بھی نہ دے سکا حتیٰ کہ اُن کی مٹی میں بھی شرکت سے محروم رہ گیا۔ یہ ہے ایک معلم اور یونیورسٹی کے استاد کا کردار جس کا تجربہ میری طرح ہر اس طالب علم نے کیا ہے جسے کبھی خلیل صاحب کی قربت نصیب ہوئی۔ خلیل صاحب کے مزاج کی مخصوص صفت ان کی مشرقیت تھی، اس کے کچھ آداب و رسوم تھے جس کی پابندی کے سبب شاگرد اور استاد کے مابین انتہائی قربت کے باوجود ایک فاصلہ رہتا تھا جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ طالب علم اور استاد کے درمیان ذہنی فاصلہ نہیں ہونا چاہیئے وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ استاد اگر واقعتاً استاد ہے یعنی وہ نااہل نہیں ہے تو شاگرد اُس سے ہمیشہ مرعوب رہتا ہے اور یہ چیز علمی درسگاہوں کیلئے بہرحال ضروری ہے۔ خلیل صاحب ہمارے قدیم تعلیمی نظام اخلاقیات کے ماننے والے تھے جس میں گرو بہرحال گرو ہوتا ہے اور چیلا اپنے گرو کے منصب سے آگاہ ہوتا تھا۔ اس دور کی بدنصیبی یہ ہے کہ اب گرو اور چیلے اس طرح شیر و شکر ہو کر سامنے آتے ہیں کہ بالکل ہم نوالہ و ہم پیالہ بن جاتے ہیں۔

خلیل صاحب کی شخصیت کا دوسرا رُخ اُس وقت سامنے آتا ہے جب وہ دوستوں میں ہوتے ہیں۔ خلیل صاحب کے دوستوں کا حلقہ خاصا وسیع رہا ہے کسی زمانے میں اُن کے سب سے ملنے جلنے دوست باقر مہدی ہوتے تو کبھی حسن نعیم اور پھر یہ تعداد گھٹتے گھٹتے چند لوگوں تک محدود ہو گئی۔ علیگڑھ میں شہریار، وحید اختر اور ذوقی صاحب۔ علیگڑھ سے باہر محمود ہاشمی، شمس الرحمٰن فاروقی شمیم حنفی کو وہ دوست کم اپنا چھوٹا بھائی زیادہ سمجھتے تھے۔ ویسے ان کا تعلق بڑا لوگوں سے تھا جن کا نام گنوانا ایک مشکل کام ہے اس میں اُن کے ذہنی ہمسفروں کا بھی شمار کر لیجئے جو کتابوں کی دنیا میں ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ یوں تو اُن کا تعلق عموماً شاعر۔ بھی ادیبوں اور شاعروں سے رہتا تھا لیکن اُن کے چاہنے والوں اور ان کی بیماری کے دنوں میں ان کیلئے رونے اور دعا کرنے والوں میں کثیر تعداد ایسے لوگوں کی تھی جو عام آدمی تھے۔ ان کے پڑوسی، یونیورسٹی کے طلباء و اساتذہ، پھل اور دودھ بیچنے والے سڑک کا فقیر اور گھر کا بھنگی۔ اس اعتبار سے انھیں مرجعِ خلائق کہتا ہوں۔ خلیل صاحب میں یہ خوبی تھی کہ وہ دوستوں کی انجمن میں جانِ انجمن بن جاتے تھے۔ خود بھی خوب ہنستے تھے اور دوسروں کو بھی ہنساتے تھے، لطائف و ظرائف کا ایک نہ ختم ہونے والا سلسلہ جو چند لمحوں کو یادگار بنا دیتا تھا لیکن اگر محفل علمی اور ادبی ہو تو خلیل صاحب کی بھاری بھرکم، پُر وقار اور متوازن شخصیت اپنی ذہانت اور فطانت کے جوہر آشکارا کرتی تھی۔ بحث و تمحیص میں اکثر انھیں کی رائے کو وقعت اور اعتبار حاصل رہتا تھا۔ ادیب دوستوں کی حوصلہ افزائی اُن کا خاص شیوہ تھا لیکن سرپرستی کا کوئی مظاہرہ نہیں کرتے تھے۔ وہ اپنے شاعر دوستوں کے اشعار بڑے شوق سے سنتے تھے۔ اچھے شعروں کی داد دیتے تھے۔ اپنی مخصوص بذلہ سنجی کے سبب دوستوں کیلئے اپنے ناگزیر تھے جس کا اعتراف اُن کے ہر دوست کو ہوگا۔ ان کی ذات میں خشونت اور تشنج کی کیفیت یا کوئی کامپلیکس نہیں تھا۔ وہ انتہائی مُہذب، ادبی ذوق، یار باش اور بے ضرر شخص تھے۔ اُن کی شخصیت میں ایک عجیب معصومیت تھی جو عموماً بڑے ادیبوں اور دانشوروں میں کم نظر آتی ہے۔ اس معصومیت کا اظہار ان کے کھلکھلا کر ہنسنے اور قہقہوں میں ہوتا تھا جو زمانے کے تمام آلام کو تھوڑی دیر کے لئے معدوم کر دیتے تھے اور ان کی شخصیت کہیں زیادہ دلنواز نظر آنے لگتی تھی۔ میں نے انھیں دوستوں میں کبھی جھگڑتے نہیں دیکھا اور نہ تعلقات کو ان کی جانب سے کم ہوتا ہوا یا ختم ہوتا ہوا پایا۔ شہریار سے ان کو جو تعلقِ خاطر رہا ہے وہ کسی سے پوشیدہ نہیں۔ شہریار جب یہ کہتے ہیں کہ "خلیل صاحب میرے لئے سب کچھ تھے" تو وہ بہت سی ان کہی باتیں بھی اس جملے میں کہہ جاتے ہیں۔ اُن کا تعلق شیفتگی کی اس منزل میں داخل ہو گیا تھا جہاں سالک اور مقصود میں کوئی حجاب باقی نہیں رہتا۔ ایک پر دوسرے کا گمان ہونے لگتا ہے۔ وحید اختر سے ان کے تعلقات ذاتی بھی تھے اور ادبی و شعری بھی۔ ان کے درمیان اختلافِ رائے بھی ہوتا تھا لیکن کبھی بدمزگی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ وحید اختر خلیل صاحب کی علم سے وفاداری اور خلوص کے سبب ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور علیگڑھ میں سب سے زیادہ انھیں سے ملتے جلتے تھے۔ خلیل صاحب نے وحید اختر کے الحاد اور دہریت کے اوہام کو کبھی شک کا نشانہ بھی نہیں بنایا۔ اُن کے مراثی بھی وہ شوق سے سنتے تھے اور وہ تقاریر بھی جن سے خدا کے وجود کی نفی ہوتی ہے۔ ذوقی صاحب سے خلیل صاحب کے تعلقات کی نوعیت بزرگ دوست کی تھی جیسا کہ میں نے پہلے

محسوس کیا ہے کہ خلیل صاحب کی ذات میں ایک ایسی وضع داری تھی جو اُن کی شخصیت سے جدا نہیں ہے اس لئے وہ اپنے بعض دوستوں سے تعلقات نبھانے میں بڑی احتیاط سے کام لیتے تھے۔ نعتی صاحب انھیں لوگوں میں ہیں جو خلیل صاحب کو بے حد عزیز رکھتے تھے اور ان کی تحریر کو بڑے شوق اور لطف اندوز ہو تے تھے۔ خلیل صاحب کی اکثر شامیں نعتی صاحب کے گھر پر ہی گذرتی تھیں جہاں چائے کا دور چلتا تھا اور دلچسپ باتیں ہوتی تھیں ادبی بھی اور گھریلو بھی۔ علیگڑھ سے باہر جن دوستوں کا نام ان کی زبان پر ہر وقت رہا کرتا ان میں محمود ہاشمی اور شمس الرحمٰن فاروقی ہیں یہ دونوں صاحبان شہر یار کی طرح عمر میں ان سے کافی چھوٹے ہیں لیکن خلیل صاحب جتنا ان لوگوں میں کھلتے تھے اتنا کہیں نہیں دیکھا گیا۔ ایک عجیب ہی یارانہ تھا جس کی تشریح نہیں کی جا سکتی۔ محمود ہاشمی سے ملتے وقت ان کا چہرہ مسرت سے کھِل اُٹھتا تھا۔ اُن سے اُن کے تعلقات برسہا برس پُرانے تھے۔ انھیں بھی کم و بیش شمیم حنفی صاحب ہی کی طرح اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے اور ان کی خداداد ذہانت اور شرارت کے بڑے معترف اور مدّاح تھے۔ فاروقی صاحب اُن کے ہم وطن بھی تھے اور ہم مشرب بھی، اُن کی علمیت اور بیک وقت مشرق و مغرب دونوں ہی ادبی روایات سے واقفیت کے سبب اُن کی بڑی قدر کرتے تھے خلیل صاحب سے اُن کے تعلقات بڑے گھریلو قسم کے تھے۔ شمیم صاحب وہ بے پناہ محبت کرتے تھے۔ اُن کے پُر خلوص اور ستھرے علمی ذوق کی تعریف اکثر مجھ سے کرتے تھے اور انھیں اچھے اور سمجھدار لکھنے والوں میں شمار کرتے تھے خلیل صاحب کے بارے میں اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ بڑے صائب الرائے اور ادبی معاملات میں بے لاگ تھے۔ اس لئے کہ نئے یا پُرانے ادیبوں میں صرف انھیں کو انھوں نے سراہا ہے جن کے یہاں کوئی جوہر قابل نظر آیا ہے۔ شمیم صاحب کے بارے میں بھی ان کی رائے بہت اچھی اور صحیح تھی۔

خلیل صاحب بحیثیت انسان ایک انوکھے کردار کے مالک تھے، وہ نہ فرشتہ تھے نہ شیطان، ایک مکمل انسان کو جن ناگزیر خوبیوں یا خامیوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب اُن کی ذات میں موجود تھیں، البتہ ایک وصف جو اس دور کے آدمی میں عام ہو گیا ہے، ریاکاری، ان کے بس کی نہ تھی، ایک سے زائد چہرے نہ رکھتے تھے جس کا ثبوت وہ تمام عمر اپنے عمل اور کردار سے فراہم کرتے رہے۔ ان کی شخصیت میں ایک نوع کی سادگی اور بھولا پن تھا جو کسی تصنع کے سبب نہ تھا۔ وہ ادب اور شاعری میں ایک بڑا اور نمایاں مقام رکھنے کے باوجود بھی خود ستائی یا اپنی عظمت کے ترانے سننے یا سُنانے کے لئے تیار نہ تھے، اُن کے اندر جس قسم کی خود آگہی تھی وہ ان کی انا کو مشتعل یا برگشتہ کرنے کے بجائے مزید امکانات کو بروئے کار لانے سے عبارت تھی۔ وہ ہر انسان کو نہ صرف اس کا جائز مقام دیتے تھے بلکہ خود سے بہتر سمجھتے تھے اور شاید اسی لئے ان کی عزت سب سے زیادہ تھی خلیل صاحب جن پر ترقی پسند تحریک کے عروج کے زمانے میں الحاد اور بے دینی کا لیبل لگا ہوا تھا۔ آگے چل کر مذہب اور اس کی روح سے بہت قریب آ گئے، بیماری کے دنوں میں کسی ضعیف الاعتقادی کے سبب نہیں بلکہ بر بنائے اخلاص اور قرآن پاک کی تلاوت پابندی سے کرتے تھے اور نماز بھی پڑھتے تھے، مذہب اُن کو ورثہ میں ملا تھا، اُن کا خاندان اعظم گڑھ کے علمائے دین کا خاندان تھا۔ ان کے والد مولانا محمد شفیع صاحب خود ایک انتہائی بزرگ اور دیندار شخص تھے۔ ابتدا میں خلیل صاحب مذہب سے اس لئے منحرف سے ہو گئے تھے کہ وہ جس قسم کی روشن خیالی اور متحرک فکر کے گرویدہ تھے انھیں مذہب کی اد عائیت اور منجمد فکر میں نظر نہ آئی تھی لیکن دھیرے دھیرے محسوس ہوا کہ انسان کا ہر دور میں سب سے بڑا روحانی اور ذہنی سہارا مذہب ہی رہا ہے اس سے مفر ممکن نہیں ہے البتہ مذہب کے معاملہ میں وہ کشادہ قلبی کے حامل تھے۔ اسلام کے پیرو ہونے کے باوجود دیگر مذاہب اور ان کے زعماء کی اُن کی نگاہ میں بڑی قدر تھی، انھوں نے حال ہی میں مذہب کا گہرا مطالعہ بھی کیا تھا اور بتدریج اُن کے عقیدے میں گہرائی اور خلوص پیدا ہوتا گیا۔ گذشتہ سال گرمیوں میں جب وہ کشمیر گئے تو نماز فجر سے فارغ ہونے کے بعد وادی میں چہل قدمی کرنے نکل جاتے تھے اور بتاتے تھے کہ اپنے ساتھ ایک تسبیح رکھتے تھے جس کی مدد سے کئی ہزار مرتبہ درود شریف اور دوسری دعاؤں کا ورد بآسانی اور ہر روز کر لیتے تھے۔ علیگڑھ جامع مسجد میں خلیل صاحب نماز جمعہ پابندی سے ادا کرنے جاتے تھے۔ میں نے ایک خاص بات دیکھی کہ وہ مسجد میں ہمیشہ ایک مخصوص جگہ پر بیٹھتے تھے۔ اس جگہ کے علاوہ کسی دوسری جگہ پر بیٹھتے نہ دیکھا۔ خلیل صاحب مشرق کے دلدادہ تھے اس لئے مذہب جو مشرقی تہذیب کا ایک خاص نشان امتیاز رہا ہے اس سے بہت دنوں تک کنارہ کش نہیں رہ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ان نام نہاد دانشوروں کو بہت اچھی نظر سے نہیں دیکھتے تھے جو کبھی ادب اور تنقید میں مغرب سے مرعوبیت کے سبب اور اپنی ناقص اور ادھوری معلومات کے سبب ایک طرح کی مزاحمت پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ خود ہر قدر کو پامال کر کے اقدار کے بحران پر واویلا کرتے تھے اسی لئے وہ جدیدیت کے سب سے بڑے حامی ہونے کے باوجود اپنی کلاسیکی ادبی روایت اور دانشوری کو کبھی حقارت کی نظر سے نہ دیکھتے تھے۔ ان کی مشرقیت ان کی زندگی کے ہر شعبے میں داخل ہو گئی تھی، ادب و شعر میں مشرقی معیار نقد اور مشرقی سرچشموں کی جستجو اور احیاء

(باقی صفحہ ۱۴۵ پر دیکھئے)

تسم جہاں
لیکچرار شعبۂ اُردو - سندروتی مہیلا کالج - بھاگلپور۔

خلیل الرحمن اعظمی، ایک تاثر ایک تبصرہ

اُردو ادب سے میری دلچسپی بڑی پُرانی رہی ہے۔ غالباً ۱۴۔ ۱۵ سال کا عرصہ بیت چکا۔ اُس وقت میں اُردو آنرس کی طالب علم تھی، اردو آنرس کی طالب علم ہونے کے ناطے شعر و ادب سے دلچسپی ایک فطری بات تھی ــــ اس وقت میں نے پہلی مرتبہ اپنے چھوٹے ماموں (علیم اللہ حالی صاحب) کی زبانی اعظمی صاحب کا نام سنا تھا، شاید ۱۹۶۵ء یا ۱۹۶۶ء ہوگا۔ اس وقت اعظمی صاحب کسی کام کے سلسلہ میں پٹنہ آئے ہوئے تھے۔ مجھے تو شرف ملاقات نصیب نہیں ہو سکا لیکن ماموں محترم کی زبانی ان کا تذکرہ بار بار سنتے سنتے پتہ نہیں کیوں اعظمی صاحب کا نام اس طرح میرے ذہن کے پردے پر چھا گیا کہ میں بہت جلد انھیں اپنا محبوب نقاد تسلیم کرنے لگی (اس وقت میں شاعروں میں اختر الایمان سے بہت زیادہ متاثر تھی، ان کا پہلا مجموعہ "یادیں" اسی وقت منظر عام پر آیا تھا، اس کی اکثر نظمیں نہ جانے کیوں میرے دل کے ساز پر مضراب کا کام کرتی تھیں) نہ جانے عمر کی وہ کون سی منزل تھی جب چاہتے اور نہ چاہتے ہوئے بھی ذہن و دل خواہ مخواہ کے لئے کسی ان دیکھی شخصیت کا اس طرح پجاری بن جاتا تھا کہ آج سوچتی ہوں تو ہنسی آتی ہے۔

اعظمی صاحب سے میرا تعارف تو کبھی نہیں ہو سکا لیکن میں دل مندر میں اُن کی پرستش ہنوز کرتی رہی ہوں۔ بڑھتی ہوئی عمر کے ساتھ ساتھ میرے خیال و فکر میں، میری پسند و ناپسندیگی میں میرے عادات و اطوار میں بڑا فرق آچکا ہے لیکن یہ عجب بات ہے کہ اعظمی صاحب کو اپنا محبوب نقاد میں اس وقت بھی سمجھتی تھی اور آج بھی جبکہ عمر کی اس منزل پر پہنچ گئی ہوں جہاں عقل جذبات پر حاوی ہو جاتی ہے مجھے ایسا لگتا ہے کہ شاید میری پسند آج سے ۱۴ سال پہلے بھی جبکہ پسند و ناپسند کا معاملہ بالکل جذباتی ہوا کرتا ہے) بڑی بالیدہ تھی۔

بہرکیف! اعظمی صاحب میرے محبوب نقاد پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ اگرچہ اعظمی صاحب کی شخصیت شاعر کے اعتبار سے بھی بے حد مشہور رہی ہے بلکہ اُن کا اصل میدان تو شعر و شاعری ہی ہے جیسا کہ انھوں نے خود "فکر و فن" کے دیباچہ میں تحریر کیا ہے کہ

"مضمون نگاری کو میری ادبی زندگی میں ثانوی حیثیت حاصل ہے میں نے اپنی شخصیت کے سارے عناصر کی ترتیب و تہذیب اب تک اسی نقطۂ نظر سے کی ہے کہ شعر کے پردے پر اپنی روح کو بے نقاب کر سکوں۔"

گویا مضمون نگاری کو انھوں نے اپنی ادبی زندگی میں ثانوی درجہ دیا ہے لیکن اس کو کیا کہا جائے کہ مجھے تو وہ نقاد کی حیثیت سے ہی کہیں زیادہ بھلے لگتے ہیں ــــ میں انھیں ایک بہترین شاعر بھی تسلیم کرتی ہوں، اس میں شبہ نہیں کہ "کاغذی پیرہن" اور "نیا عہد نامہ" اُن کی بیش قیمت شعری صلاحیتوں کا مظہر ہیں لیکن اگر کوئی مجھ سے یہ پوچھے گا کہ تمہارا محبوب شاعر کون ہے تو میں اختر الایمان کا نام لوں گی اور محبوب نقاد کے باب میں خلیل الرحمٰن کا ــــــــ

اگرچہ تنقید کے نام پر اُن کے یہاں "فکر و فن" "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" "نوائے ظفر" "مقدمہ کلام آتش" اور چند بکھرے ہوئے مضامین کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ کیونکہ انھیں زیادہ لکھنے کا خبط کبھی نہیں رہا۔ جب کبھی انھوں نے قلم اٹھایا تو پہلے اچھی طرح موضوع سے متعلق واقفیت حاصل کر لی ہے۔ اُن کا خیال ہے کہ:۔

لکھتے وقت پتہ نہیں کیوں میرا یہ ضمیر گوارا نہیں کرتا کہ تنقید کے نام پر شاعر کے کلام کی تشریح کی جائے۔ محض اس کے زمانے کے حالات اور سماجی پس منظر کو بیان کر دیا جائے یا صرف اس کی خوبیاں ہی کو بڑھا چڑھا کر بیان کر دیا جائے۔ میرا تو یہ عقیدہ رہا ہے کہ یا تو تنقید لکھی ہی نہ جائے اور اگر نقاد ہاتھ میں قلم لے تو اسے اپنے شعور کا ساتھ بھی نہ چھوڑنا چاہیئے اور نہ ایمانداری سے گریز کرنا چاہیئے۔

(فکر و فن۔ صفحہ ۸۶)

یہ عقیدہ اور یہ نظریہ صرف تحریری نہیں، اعظمی صاحب ہر جگہ اس پر کاربند رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مقدار کے لحاظ سے اُن کے کارنامے مختصر ہیں لیکن معیار کے اعتبار سے کم نہیں ہیں اور انہی مختصر کارناموں کے باوجود ان کا شمار اردو کے اہم نقادوں کی صف میں ہوگا۔

اس مختصر سے مقالہ میں اعظمی صاحب کے تمام تنقیدی کارناموں کا جائزہ ممکن نہیں ہے۔ ہمارا ابھی میرے پیش نظر اُن کی کتاب ہے پہلا تنقیدی مجموعہ "فکر و فن" ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار ۱۹۵۶ء میں اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس میں ہر مضمون کے نیچے اس کا سن تحریر درج ہے — اس مجموعہ کی زیادہ تر تخلیقات اُن کے طالب علمی کے زمانے کی ہیں، لیکن وہ جو ایک مثل مشہور ہے ناکہ "ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات" اعظمی صاحب کے ہونہار ہونے کا ثبوت بھی اُن کے اسی مجموعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔

"فکر و فن" میں کل دس مضامین شامل ہیں، اگرچہ موضوع کے اعتبار سے کوئی بھی مضمون چونکا دینے والا نہیں ہے، لیکن اعظمی صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ عام اور جیش یا اُفتادہ موضوعات میں بھی اپنی طرز فکر اور انداز نگارش سے ایک نیا رنگ اور ایک نئی بات ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ اُن کے نظر کی وسعت بھی اُن کے تقریباً تمام مضامین سے عیاں ہے۔ کسی موضوع پر سوچنے سمجھنے کا اُن کا ایک مخصوص و منفرد زاویۂ نگاہ ہے۔ مثلاً اپنے ایک مضمون "جوش ملیح آبادی" میں وہ درمیان مضمون جوش کو موجودہ دور کا نظیر بتاتے ہوئے نظیر کی شاعری پر ایک سرسری سا جائزہ پیش کرتے ہیں لیکن یہ سرسری جائزہ نظیر کی شاعری کی قدر و قیمت کا کتنا صحیح اندازہ ہے۔ وہ کہتے ہیں :-

> نظیر کی نظموں کی اس لحاظ سے بڑی تاریخی اہمیت ہے کہ جب عوامی اور جمہوری زندگی کی تصویر کشی اور اس کے تجزیاتی رُخ سے ہمارے شعراء بے توجہی برت رہے تھے اس کا سب سے بہتر نمونہ ہمیں نظیر کے کلام میں مل جاتا ہے، لیکن نظیر ایک آرٹسٹ نہیں بلکہ ایک اچھے فوٹوگرافر ہیں ..... نظیر کا ذہن اپنے اندر فکر نہیں رکھتا، اس میں تہیں اور تخلیق کی اندرونی لگن نہیں بلکہ ان کے دماغ کا سانچہ سیدھا سادہ سپاٹ سا ہے جو ایک کیمرے کی طرح ہر نوع کی تصویر کھینچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔"

نظیر کے سلسلے میں یہ رائے مجھے بڑی نپی تلی ہوئی لگتی ہے، حقیقت یہ ہے کہ نظیر کے بارے میں یا تو نقادوں نے تعریف کے پُل باندھے ہیں یا پھر تنقیص شاعر۔ بنیٔ۔

کی انتہا کو پہنچ گئے ہیں۔ بعض تو انھیں اُردو ادب کا تنہا تابندہ ستارہ گردانتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو انھیں شاعر ہی نہیں تصور کرتے ہیں (ملاحظہ ہوں گلشن بے خار میں شیفتہ کے خیالات) — انکار و آمار کی یہ افراط و تفریط اُردو تنقید میں عام ہے' — حسرت کے سلسلہ میں بھی اکثر ارباب نقد و نظر نے بڑے جذباتی انداز میں اُن کا درجہ اردو شاعری میں متعین کیا ہے۔ ان کی شاعری کی محبوبیت اور ہر دلعزیزی نے بعض اچھے ناقدوں کو بھی مغالطہ میں ڈال دیا ہے اور وہ انھیں اُردو کا صف اوّل کا شاعر اور نئی غزل کا مجدد وغیرہ بتاتے ہیں لیکن اعظمی صاحب نے اُس وقت جبکہ حسرت کی شہرت اور محبوبیت کا سحر اُردو دنیا پر چھایا ہوا تھا اور اُن کے انتقال کو صرف چند ہی ماہ ہوئے تھے اُن کی شاعری پر جو تنقید پیش کی ہے اُس میں اُن کی شاعری کی خوبیوں اور خامیوں کا ایسا اچھا جائزہ پیش کیا ہے کہ اسے کھرے اور کھوٹے کی اصل پرکھ کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ اعظمی صاحب ایک متوازن دماغ اور شریف کردار کے مالک تھے۔ وہ جذبات کی رَو میں کبھی نہیں بہتے تنقید نگار کی ذمہ داریوں کو وہ پوری طرح سمجھتے ہیں۔ ناقد کے فرائض منصبی معلوم ہیں۔ نقاد کی رائے میں اگر توازن و اعتدال نہیں تو وہ ادبی دنیا میں ہنگامے تو ضرور بپا کر سکتا ہے لیکن ایک صحت مند تخلیقی فضا کو پیدا نہیں کر سکتا ہے۔

توازن اور اعتدال کا مفہوم بعض لوگوں کے نزدیک یہ ہے کہ گول مول بات کہی جائے اور "ہاں" اور "نہیں" کے بیچ اپنی رائے کو معلق رکھا جائے لیکن اعظمی صاحب کے یہاں یہ انداز نہیں ہے، وہ جو بھی بات کہتے ہیں صاف اور سلجھے ہوئے انداز میں، بہکنا اور بہکانا اُن کی عادت نہیں —

اعظمی صاحب کسی فن پارے کا جائزہ لیتے وقت خواہ مخواہ کے لئے کسی اصول اور نظریہ کی عینک نہیں لگاتے بلکہ اُن کا طریق کار یہ ہے کہ وہ اس ادب پارے کا براہِ راست مطالعہ کرتے ہیں اور اسی طرح اسے سمجھنے اور سمجھانے اور اس کی ادبی قدر و قیمت متعین کرنے کی کوشش کرتے ہیں — اُنھوں نے ہمیشہ اچھی قدروں کو سراہا ہے — آتش و ظفر پر اُن کا جو مقدمہ ہے اس سے صاف ظاہر ہے کہ انھیں اُردو کے قدیم سرمایہ سے بھی بڑی گہری دلچسپی رہی ہے۔ وہ ان لوگوں میں نہیں جو روایت سے بغاوت میں اپنا بڑا پن سمجھتے ہیں، بلکہ اعظمی صاحب نے ادب میں روایت کی اہمیت کو سراہتے ہوئے جدیدیت کی طرف قدم بڑھائے ہیں۔ اپنے تنقیدی مجموعہ فکر و فن میں جہاں انھوں نے غالب، درد، ظفر اور داغ پر قلم اٹھایا ہے

دیں یا جوش، جمیل، مجاز و جذبی بھی اُن کا موضوع بنے تھے۔ اعظمی کی تنقید کی بڑی خوبی خلوص اور دیانت داری ہے۔ وہ صحافتی اور کاروباری قسم کی تنقید سے ہمیشہ گریز کرتے رہے، سب سے زیادہ تنقید کا مقام ان پر وہ آیا جب انھوں نے اپنے ہمعصروں پر قلم اٹھایا اور اس معاملے میں انھوں نے بڑے اعلیٰ ظرف کا ثبوت دیا ہے۔

"الفاظ" مئی جون ۱۹۷۸ء کے شمارے میں ابن انشا کے کچھ خطوط اعظمی صاحب کے نام شائع ہوئے ہیں۔ ایک خط میں ابن انشا اعظمی صاحب کو لکھتے ہیں :-

"تمہیں ایک بات بھی لکھنی تھی اور وہ یہ کہ تم اپنے خلوص کی وجہ سے
اُن گنے فرشتوں پر جو تنقید کے میدان کے سرے پر سوار
یاں ہر ملک سے فائق ہو، ہر زمانہ اپنے شاعر اور تنقید نگار خود پیدا
کرتا ہے۔ تم اصل میں شاعر بھی ہو اور تنقید نگار بھی ——
تم بڑے آدمی بنے والے ہو، لکھتے رہو، پڑھتے رہو، سوچتے رہو
اور سمجھتے رہو، لیکن دیکھنا اپنا قلم کسی کے ہاتھ بیچنا نہیں۔ تم
میں ایک بڑی خوبی تمہاری کاسہ لیسی نہیں ہے۔ اپنے ہمعصروں
کے متعلق تمہارا محبت اور اپنائیت کا رویہ مجھے پسند ہے۔"

یہ عبارت اگرچہ ایک نجی خط کی ہے لیکن اس سے اعظمی کی تنقید پر بڑی اچھی روشنی پڑتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اعظمی اس دور کے ایک ایسے نقاد ہیں جنھیں ہم آسانی سے فراموش نہیں کر سکتے۔ کاش! وہ کچھ دن اور زندہ رہتے اور اردو ادب کے گیسو سنوار سکتے۔ لیکن موت نے کب کسے بخشا ہے اور کس کو مہلت دی ہے، وہ اعظمی جو دوسروں کی جوانمرگی پر آنسو بہاتے تھے۔ اپنے ایک مضمون —— چند لمحے ابن انشا کے ساتھ" میں انشا کی موت پر اظہار افسوس کرتے ہوئے لکھتے ہیں : -

"ابن انشا سچ مچ جواں ہی مرا۔ اکیاون سال کی عمر کوئی عمر ہوتی ہے۔
کاش! اعظمی صاحب میری آواز سن سکتے تو میں بھی اُن سے پوچھتی
پچاس سال کی عمر بھی کوئی عمر ہوتی ہے —— ؟
مگر میری آواز تو خلاؤں میں گونج رہی ہے" اعظمی صاحب تو ہم سب سے دور
بہت دور ایک ایسی دنیا کو جا چکے ہیں جہاں سے تو کوئی بھی لوٹتا نہیں ہے

تم کو ہونا ہی تھا جدا ہم سے
وقت کو کیوں بُرا بھلا کہیے!

○○

قائم کرنا ممکن ہو سکا۔ مشرقی ثقافت سے ان کی گہری دلچسپی اُن کے گھر کے در و بام سے بھی آشکارا ہوتی ہے جس کی تعمیر میں انھوں نے اپنے طور پر اس کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ خلیل صاحب بوہیمین کلچر کے سخت مخالف تھے۔ باقر مہدی سے ان کے اختلاف کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ پچھلے دنوں علیگڑھ میں چند نوجوانوں نے یونیورسٹی کے منجمد ماحول میں دراڑ ڈالنے کی کوشش کی لیکن ان میں بشمول میرے نادان زیادہ اور دانا کم تھے جنھیں خلیل صاحب اچھی نظر سے نہ دیکھتے تھے، البتہ ان افراد میں بھی اگر ذہانت کی کوئی کرن نظر آتی تھی تو وہ انھیں ضرور متاثر کرتی تھی اور وہ خوش ہوتے تھے۔ خلیل صاحب ادبی معاملات میں بے حد سخت تھے مگر ذاتی اور نجی معاملات میں شکستوں کی فصل کاشت کرنا اُن کا مقدر تھا۔ وہ کوئی کام نفع و ضرر کے خیال سے قطعاً بلند ہو کر کرتے تھے۔ وہ مادی اعتبار سے بہت بدحال تو یقیناً نہ تھے لیکن دنیا کا فہم جس کے گماشتے زندگی کی آسودگی کے لئے جوڑ توڑ کی سیاست سے جانتے ہیں اس سے وہ بالکل کوئی علاقہ نہ رکھتے تھے۔ انھیں اس محاذ پر اپنی ناکامی کا کوئی شدید رنج بھی نہ تھا۔ اُن کے معدود چند لوگوں نے محض اسی میزان پر تولنے کی کوشش کی ہے وہ دراصل دھوکے میں مبتلا ہوئے ہیں۔ خلیل صاحب کے لئے پروفیسر شپ یا کوئی منصب کوئی خاص مسئلہ نہ تھا۔ اس معاملہ میں وہ قطعاً ایک مختلف قسم کے آدمی تھے انتہائی گوشہ گیر، قناعت پسند اور مستغنی۔ یہی وجہ ہے کہ علیگڑھ یونیورسٹی میں باوجود اصرار کے انھوں نے کبھی کسی اعزازی منصب کو قبول کرنے پر آمادگی ظاہر نہ کی۔ علیگڑھ اور دوسری جگہوں پر یہ چیزیں وہ ہیں جن کی تلاش اور حصول میں یار لوگ اس طرح مارے پھرتے ہیں کہ پیروں میں چھالے پڑ جاتے ہیں۔ اسی طرح پروفیسر شپ بھی ان کے لئے کوئی بہت بڑا اعزاز نہ تھی جس کے لئے وہ کوشش کرتے، ہماری یونیورسٹیوں میں آج کل جس قسم کے پروفیسر حضرات ہیں اور ان کی علمیت کا جو معیار ہے خلیل صاحب بغیر پروفیسر ہوئے بھی ان حضرات سے کہیں زیادہ عزت و احترام کے مالک تھے۔ وہ علیگڑھ چھوڑ کر کہیں باہر جانا پسند نہیں کرتے تھے ورنہ بہت پہلے وہ اس منصب پر فائز ہو گئے ہوتے۔ علیگڑھ سے انھیں جو انس تھا اس کے اسباب کئی ہیں۔ علیگڑھ ملک کی دیگر یونیورسٹیوں کے مقابلے میں ہمیشہ ایک ممتاز حیثیت کی مالک رہی اور ہر زمانے میں اس یونیورسٹی سے بعض صاحب کمال وابستہ رہے جن میں رشید احمد صدیقی، مجنوں گورکھپوری، آل احمد سرور وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ خلیل صاحب ان بزرگوں کی قائم کی ہوئی علمی روایت کے سفر کو جاری رکھنے میں مصروف تھے۔ اُن کے دم سے نہ صرف شعبۂ اردو کا بھرم قائم تھا بلکہ یہ ذات تمام اردو دنیا کے لئے سرمایۂ افتخار تھی۔ ○○

بقیہ ۱۴۲ خوشبو کے ہجرت سے

اُن کے ادعائی ہونے کی دلیل نہ تھی بلکہ اس سے اُردو تنقید میں ایک توازن شائع ہی بھی

کمزور طبقوں کو تحفّظ اور امداد دیجئے

ہریجنوں اور دیگر کمزور طبقوں پر مظالم ہمارے سماج پر دھبّہ ہیں۔ یہ ہماری ترقی میں رکاوٹ ڈالتے ہیں۔

آیئے بھارتی روایات کا احترام کریں
ہم سب ایک ہیں

davp 79/5

ناشر۔ بمبئی۔

جمیل مظہری

ہائے خلیل الرحمٰن

نہ شرر ہیں نہ تجلی نہ تپش ہے نہ دھواں — اک بجھی شمع پہ تقدیرِ شبستاں گریاں

کس سے ظلمت میں ہو اعلانِ سحر کی امید — سوئے جاتے ہیں وہی لوگ جو دیتے تھے اذاں

سوزِ تہذیبِ وطن اسکے چراغوں کا سکوت — مرگِ تجدیدِ سخن مرگِ خلیل الرحمٰن

اپنے ہی ساتھ وہ سب لے گئے اناللہ — لے کے آئے تھے جو توسیعِ ادب کے امکاں

فن کے رخسار پہ آئی تھی جو سرخی سو گئی — زرد ہے چہرۂ اردو بھی عیاں را چہ بیاں

سب بنے جاتے ہیں آنسو کہ نہیں قدر شناس — گوہرستانِ ادب میں جو گہر ہیں تاباں

اُس کی تنقید سے مہتاب بنے کتنے دیئے — مجھ سے ذرّے پہ بھی ہے اسکے قلم کا احساں

جس نے دیکھی ہوں تبسم کی تہوں میں آہیں — جس نے سونگھے ہوں یخستاں میں شررہائے نہاں

جس کو آتا ہو نظر زنگ کے پردے میں بھی رنگ — ایسی تنقیدی بصیرت ہے جمیل آج کہاں

اعظمی کا ہے یہ غم مظہریِ زارِ عظیم — اسکے اظہار کو کافی نہیں اشکوں کی زباں

خون بھی ٹپکا کے قلم سے یہ لکھو سالِ وفات
ہائے خاموش ہوا آج خلیل الرحمٰن

۱۹۷۹ء

بلراج کومل

منظرِ شب

(خلیل الرحمٰن اعظمی کی نذر)

میں ارضِ منظرِ شب میں
دلِ افسردہ و مجروح کا
دستِ تمنا سے سنہری بیج بوتا ہوں
اسے پہروں مسلسل سینچتا ہوں
جوئے روشن سے
دُعا کرتا ہوں
سجدہ ریز ہوتا ہوں
کہ تخمِ خیالِ مرگ
نخلِ خواب بن جائے
نمو کے برگ و گل میں
صبح اٹھلاتی ہوئی آئے
مرا سنگِ ندامت
گرمیِ حسرت سے شاید موم ہو جائے

میں ارضِ منظرِ شب میں
جنم لیتا ہوں، پیہم قتل ہوتا ہوں
نمودِ نغمہ و نے کے تسلسل سے گذرتا ہوں
فرازِ شعلہ اسرار ہوں شاید
دیارِ لمحۂ مرگِ مسلسل سے گذرتا ہوں

○ ای ۱۲۹ کالکاجی، نئی دہلی

نورالحسن ہاشمی

○

ہے یہ دنیا کون ہوتا ہے کسی کا آشنا
یاں تو بن جاتے ہیں اک دم آشنا نا آشنا

دید اور وا دید پر موقوف ہے کارِ حیات
پاس اپنے کیا ہے جز چشمِ تماشا آشنا

یاد ایام کہ جب تم سے شناسائی نہ تھی
آشنائے دل تھے ہم اور دل تھا اپنا آشنا

ایک ہم ہیں جو نہیں واقف کہ ہم ہیں کون ہے
یہ تو خورشید سے ہے ذرّہ ذرّہ آشنا

منحصر اپنی نظر پر ہے تماشائے جہاں
کیسی دنیا جب نہ ہو دیدہ نظارا آشنا

ہم کہاں ڈھونڈیں اقامت گاہ اخلاص و یقیں
آسماں کس کا رفیق آئینہ کس کا آشنا

داغ ہے دل پر خلیل اعظمی کا ہاشمی
ہو نجات اس کو بچارا ہم سے بھی تھا آشنا

○ اسمٰعیلیہ بلڈنگ یونیورسٹی روڈ، لکھنؤ

شاذ تمکنت

زمیں کا قرض

[خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں]

زمیں کا قرض ہے ہم سب کے دوش و گردن پر
عجیب قرض ہے یہ، قرض بے طلب کی طرح

ہمیں ہیں سبزۂ خودرو، ہمیں ہیں نقشِ قدم
کہ زندگی ہے یہاں موت کے سبب کی طرح

ہر ایک چیز نمایاں ہر ایک شے پنہاں
کہ نیم روز کا منظر ہے نیم شب کی طرح

○

تماشا گاہِ جہاں عبرتِ نظارہ ہے
زیاں بدستِ رفاقت کے کاروبار گے

اُڑتی جاتی ہے بام و درِ حیات سے دھوپ
بچھڑتے جاتے ہیں ایک ایک کر کے یار مرے

میں دفن ہوتا چلا ہوں ہر ایک دوست کے ساتھ
کہ شہر شہر ہیں بکھرے ہوئے مزار مرے

○ ۱۷۳/اے معظم پورہ حیدرآباد

وفا خلیلی

○

اقبال ہو تیرا افزوں، منزل بنے جادہ ترا
اے کاروانِ رنگ و بو! چلتا رہے رستہ ترا

ناحق جنوں بدنام ہے، سب کچھ خرد کے کھیل ہیں
اے روشنی! اے روشنی! ظاہر ہوا چہرہ ترا

اے عصرِ دانش کچھ بتا! آخر یہ کیسا گُل کھلا
اک رات میں یہ فاصلہ، کل تک جو تھا اپنا ترا

چہروں کو پڑھ لینے کا فن جس جس کو بھی حاصل ہوا
اے زندگی! اُن پر کھلا اچھا بُرا عقدہ ترا

ہم پر عبث ہیں تہمتیں، ہم جانتے ہیں نیک و بد
اے آگہی! اے آگہی! کیا خوب ہے پردہ ترا

موجوں میں وہ نغمہ نہیں، بے شور سطحِ آب ہے
طوفاں کسی رُخ سے اٹھے چڑھتا رہے دریا ترا

قتلِ وفا پر خوش لگا، جو شخص بھی ہم کو ملا
چاروں طرف اے زندگی! روشن رہے شعلہ ترا

○ "ایوانِ اردو" حیدرآباد ۵۰۰۰۰۰

عبدالصمد تپش

○

اس جہانِ مہ و پرویں سے پرے اور بھی ہیں
کچھ ٹھکانے مری نظروں کے لیے اور بھی ہیں

صرف زندان و سلاسل ہی پہ موقوف نہیں
حق پرستوں کے لیے کتنے صلے اور بھی ہیں

ایک ہم ہی تو نہیں مہر بہ لب بیٹھے ہیں،
کتنے لب تیری رفاقت میں سلے اور بھی ہیں

اُن کی زلفوں کا فسوں کم تو نہیں تھا لیکن
سلسلے گردشِ دوراں سے ملے اور بھی ہیں

مصلحت کا یہ تقاضا ہے کہ چُپ ہوں ورنہ
مجھ کو کچھ اپنے رفیقوں سے گلے اور بھی ہیں

اُف ری شادابیِ گلشن کہ بایں زور خزاں
کتنے پتے ابھی شاخوں میں ہرے اور بھی ہیں

○ لکھمینیا۔ بیگوسرائے

قاضی حسن رضا

○

نشیبِ دل سے صدا دے کے بار بار مجھے
فرازِ کوہ سے نیچے نہ تو اتار مجھے

پڑا ہے رن تو پیادہ ہوں شہسواروں میں
کہیں ہلاک نہ کر دے کوئی سوار مجھے

لہو بکھیر دیا ہے سفید کاغذ پر
اسی قصور پہ کرتے ہیں سنگسار مجھے

نہ روکے کہ بگولے طواف کرتے ہیں
بلا رہا ہے بڑی دیر سے غبار مجھے

بکھر گیا ہوں خود اپنی ہی جستجو میں رضاؔ
ہوا کے دوش پہ ہونا نہیں سوار مجھے

○ قاضی پورہ۔ کھنڈوا

شبیر علی خاں شکیب

بہ یادِ خلیل اعظمی

آج پھر آئی علیگڈھ تیرے پروانوں کی یاد
تیرے دیوانوں کی، تیرے حشر سامانوں کی یاد
دم قدم سے جن کے ہنگامے تھے تیری بزم میں
نازشِ میخانہ تھے جو، ایسے پیمانوں کی یاد
آ رہی ہیں یاد الحمرا[1] کی رنگیں ساعتیں
کتنی غزلوں، کتنی نظموں، کتنے افسانوں کی یاد
برمحل، بے ساختہ، ترشے ہوئے فقروں کا لطف
گرمیِ محفل تھی جن سے، ان زباں دانوں کی یاد
وہ رشید[2] و اختر و جذبی کی نکتہ سنجیاں
وہ سخن فہموں کی صحبت، اُن کے کاشانوں کی یاد
اشعر[3] و باقر، خلیل اعظمی و آرزو
بزمِ رندانِ ادب کے چاک دامانوں کی یاد
کھو گئے جو وقت کے صحرا میں اُن لمحوں کا غم
جو مکمل ہو نہ پائے ایسے ارمانوں کی یاد
کیوں نہ ہو ہر سانس میں صدیوں کا کربِ جاں گسل
جب کہ ہر لمحہ لیے آتا ہو طوفانوں کی یاد
داغ تازہ بن گئے ہیں آج تیری موت سے
اعظمی، تو نے دلائی کیسے افسانوں کی یاد

[1] الحمرا ۱۹۴۶ کے علی گڈھ کا ایک کیفے جہاں انجمن ترقی پسند مصنفین کی نشستیں ہوا کرتی تھیں [2] پروفیسر رشید احمد صدیقی مرحوم، پروفیسر اختر انصاری، ڈاکٹر معین احسن جذبی، [3] اشعر ملیح آبادی مرحوم (ایک شعلہ مستعجل)، باقر مہدی، ڈاکٹر مختار الدین آرزو۔

آزر بارہ بنکوی

نذرِ خلیلؔ

آنکھیں عروسِ شعر و ادب کی بھگو گئی
اک معتبر صدا جو فضاؤں میں کھو گئی

جس نے عروسِ شعر کو بخشا نیا شعور
توڑا ہے جس نے معنی و الفاظ کا غرور

جس کے بیاں میں کیف تھا تحریر کی طرح
جس نے غزل کو حسن دیا میرؔ کی طرح

پیرایۂ قدیم بھی، رنگِ جدید بھی
ناصح بھی اور تیغِ تغزل کا شہید بھی

جس کی صدائے غم نئے آہنگ سے قریب
گاہے گلِ حسیں تو کبھی سنگ کے قریب

جو گردشِ حیات سے لیتا رہا خراج
محور تھا جس کی فکر کا اس وقت کا سماج

جس نے کیا قبول شب و روز کا اثر
رفتارِ کارواں ہی پہ جس کی رہی نظر

دستور سازِ شعر و ادب، فکر کا خلیلؔ
پہلے بھی سنگِ میل تھا اب بھی ہے سنگِ میل

محلہ کٹڑہ امام باڑہ - بارہ بنکی

مختار شمیم

رشتہ

کبھی اس کو خوابوں میں دیکھا نہیں تھا
کبھی ٹوٹ کر اس کو چاہا نہیں تھا
ملاقات اس کے مرے درمیاں ہو —
— یہ سوچا نہیں تھا

مگر
وہ مری سوچ،
مرے خیالات میں،
مری تنہائیوں میں —
مرے ساتھ رہتا
وہ اِک اجنبی — !

جو —
مرے سُکھ میں ہنستا
مرے دُکھ میں روتا
بھلا کون تھا وہ — ؟
مرے اس کے مابین گو فاصلے تھے
— بڑی دُوریاں تھیں
مرے اس کے مابین نزدیکیاں تھیں

خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام

○

جو سوچیے تو یہ عالم تمام حیرت ہے
جو دیکھیے! تو ہر اک واہمے کی صورت ہے

ہم اپنے آپ سے یارو بچھڑ گئے کب کے!
جو کھو گیا ہے ہمیں میں اسی کی چاہت ہے

انھیں یہ خوف کہ صحرا و دشت لا محدود
ہمیں یہ وہم خیالِ سفر غنیمت ہے

چھٹے جو دھند تو آنکھیں بھی دیکھ لیں منظر
پسِ غبار مگر کوئی اور صورت ہے!

○ گورنمنٹ نیو گرلز کالج قلعہ میدان، اندور (ایم پی)

شاہد میر

○

بہا کے آبِ رواں اس کو توڑ پھوڑ گیا
یہ کم نہیں ہے وہ دریا کا رخ تو موڑ گیا

کچھ اس ادا سے ہوا ہے کہ مہرباں موسم
ہر ایک پیڑ کا جیسے لہو نچوڑ گیا

نہیں ہے اس کا کہیں اندراج خبروں میں
تمام شہر کو جو حادثہ جھنجھوڑ گیا

نہ سبزہ زار نہ کوئی نشاں ہے پانی کا
وہ شہ سوار کہاں لا کے مجھ کو چھوڑ گیا

ہیں سوگوار عزیزوں کے ساتھ دشمن بھی
بچھڑنے والا بالآخر دلوں کو جوڑ گیا

عجیب شخص تھا وہ بھی ذرا سی رنجش پر
تمام سلسلۂ رسم و راہ توڑ گیا

بہا کے خون کسی بے گناہ کا شاید
لہو کے نقش مری آستیں پہ چھوڑ گیا

خلیل الرحمن اعظمی
کی
نذر

بچھڑنے والے سے کوئی کہہ دے
ابھی تو موسم جواں ہوا تھا
ابھی تو سبزے نے آنکھ کھولی تھی اس زمیں پر
ابھی تو ذکرِ صبا ہوا تھا
روش روش پر
خلوص کے پھول کھل اٹھے تھے
رفاقتوں کا شجر
ابھی تو ہرا ہوا تھا
بچھڑنے والے سے کوئی کہہ دے
ابھی بچھڑنے کی رت نہیں تھی
ابھی تو موسم جواں ہوا تھا

○ گورنمنٹ کالج بانسواڑا (راجستھان)

نذرانے

ساغر مہدی

(خلیل الرحمٰن اعظمی کی وفات پر)

اداس لہجے کا اک مغنی
حیات کا بے نوا مسافر
جو شام ہی سے چراغِ مفلس کی طرح روشن
بجھا بجھا سا، تھکا تھکا سا
عجیب اندازِ بے نیازی
ہوائے غم میں بھی نے نوازی
وہ کاغذی پیرہن میں ملبوس
آج بھی گنگنا رہا ہے
حیات کو عہد نامۂ نو سنا رہا ہے
غمِ شش آنکھوں میں شہرِ آشوب کو سنبھالے
سفید چادر میں سو رہا ہے
صدائیں الفاظ دے رہے ہیں
خیال شانے جھنجھوڑتا ہے
کتابیں شیلف سے نکل کر
ہیں خاک بر سر
قلم سیاہی کی آخری بوند سے خبر کی
سیاہ سرخی پہ حاشیے سے بنا رہا ہے
عزیز، احباب، ہم قلم سب
پھر اپنے سونے کو گرم مٹی میں
یوں دبا کر پلٹ رہے ہیں
تمام رشتے سمٹ رہے ہیں
چڑھے ہوئے آنسوؤں کے دریا بھی
آخرِ کار گھٹ رہے ہیں
ہم اک ورق اور الٹ رہے ہیں

مرحوم کے شعری مجموعے "کاغذی پیرہن" اور "نیا عہد نامہ"

○ سید واڑا، بہار پیٹھ، ایولہ
ساغر مہدی

خلیل الرحمٰن اعظمی سے ایک سوال

الف احمد برق

ادب کی شاہراہ پر
تم نے
اپنی آگہی کی روشنی سے
جلائی تھی
ہر قدم پر اک نئی قندیل
کہ جس سے
جانے کتنے
نودمیدہ، شب گزیدہ
کمسن و نازک ستاروں نے
ضیا پائی
مگر
یہ ناگہاں
آ خود وجود اپنا بجھا کر
ہمارے اور اپنے درمیاں
دھندلی سی ایک چادر تان کر
ہر اک چشمِ تمنا سے
بصارت چھین کر
ہماری بے بسی سے بے خبر
چپ چاپ
سوئے منزلِ مقصد چلے ہو
اگر تم کو
اندھیرے ہی میں رکھنا تھا
تو بتلاؤ
خلوص و وضع داری کی
بھیانک آگ میں
یوں ایک مدت تک
خود کو جلانا
کیا ——
ضروری تھا؟

○ اے ۳۹، خلاصی پالیہ، مین روڈ، بنگلور

شجرِ سایہ دار

[خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں]

[illegible]

اک شجرِ سایہ دار تھا
جس کی
گھنیری چھاؤں کے نیچے
تھکے ہارے مسافر
اک ذرا سی دیر کو رُک کر
تھکن کو بھول جاتے تھے
اور اُن
ٹھنڈے خنک سایوں کے نیچے
چلنے والی
سرسراتی وہ ہوا
مدہوش کرتی تھی انھیں ....
وہ اپنے پاؤں کے چھالوں
کی سوزش بھول کر
گھڑی یا دو گھڑی کو
نیند کی آغوش میں بھی جا پہنچتے
اور
ذرا سی دیر میں
بیدار ہونے پر
رواں ہو جاتے منزل کو
اور اس کے بھی سوا .....
فضاؤں پر دھند لکے
شام کے جب چھانے لگتے تھے
کہ جب
دھیرے ہی دھیرے
رات کی کالی سیہ چادر
نشاں سے بے نشاں کر دیتی سمتوں کو
عجب مسحور کن سی روشنی
رستہ دکھاتی تھی
جو بھٹکے راہگیروں کو
نہ جانے کون سا لمحہ تھا وہ
جب تیز جھکڑ، ریت والی کالی آندھی
ایک کالے دیو کی مانند آئی
کہ جس کی طاقتوں نے
اُس شجر کو کر دیا
اپنے ہی مسکن سے جُدا
جڑیں اُکھڑیں
بہت سی بھوری مٹی
ہر طرف بکھری
فضا میں اک بھیانک چیخ گونجی
زمیں تھرا اٹھی
اور آسماں ہلنے لگا
بڑی حیرت فزا سی بات ہے
کہ جس جا پر کھڑا تھا
روشنی والا،
گھنیری چھاؤں والا
وہ شجر مہرباں
واں پر ابھی تک
پہلے ہی جیسا
بڑا ہی مہرباں
اور نرم و پُراسرار سایہ ہے
مسافر چلتے چلتے
تھک کے آجاتے ہیں اس جانب
اور اس کے بھی سوا
بھٹکے مسافر
رات کے کالے اندھیروں میں
نشاں پاتے ہیں
اپنی بھولی بسری،
کھوئی سمتوں کا
وہ سائے اور وہ مدھم شعاعیں
اب تلک موجود ہیں واں پر
چلو ان خنک سایوں اور ان مدھم شعاعوں کی طرف
کہ شاید پھر سفر آسان ہو جائے!

شاعر، بمبئی

مناظر عاشق ہرگانوی

چشم خوں بستہ

(خلیل الرحمٰن اعظمی کی یاد میں)

چاند
سورج
اور زمین
گنگا
ہمالہ
اور اپنی زندگی سے
اوب کر
جانے کہاں کس شہر میں
تم جا بسے ہو
ہاں مگر اتنا کہوں گا
لاکھ تج کر
اس جہاں کو تم گئے ہو
روشنی کا پھیلتا
اک جال سا
اُردو زباں کو
دے گئے ہو
آدمی کا
وقت کا
انسانیت کا
فلسفہ سمجھا گئے ہو
فن تمہارا جاوداں ہے
اور تم بھی جاوداں ہو!

○ صدر شعبۂ اردو، مارکھم کالج، ہزاری باغ (بہار)۔

رونق گیاوی

قطعہ

(بیاد خلیل الرحمٰن اعظمی)

حیات آفریں لمحوں کا ذائقہ بھی گیا
ادب کے شہر میں لفظوں کا مرتبہ بھی گیا
بجھائیں پیاس کہاں تشنگانِ شعر و ادب
حصولِ مقصدِ ہستی پہ تبصرہ بھی گیا

○ گول گھر۔ جھریا (بہار)

انجم آراء انجم

یادوں کے سائے

کہاں کھو گیا ہے وہ مرد جواں
لہو شاعری میں ہے جس کا رواں
نئے ساز پر گیت گائے تھے جس نے
نیا موڑ جس نے ادب کو دیا
کہاں ہے وہ معصوم سی شخصیت
غموں کے جو پر ربط پیہم
حیات آفریں گیت گاتا رہا
جہاں میں نہ احساں کسی کا لیا
اُٹھا کر سر اپنا ہمیشہ چلا
کسی سے شکایت نہ شکوہ کسی کا
بھروسہ بس اپنے خدا پر کیا
طلب کی نہ اس نے کبھی جاہ کی
نہ مال پر تھی نہ اس کی نظر
'گواہ' 'کاغذی پیرہن' جس کے فن پہ
'نیا عہد نامہ' جو تصنیف کر کے
بلندی فکر و نظر پا گیا
سجا کر گلستانِ اُردو کو اپنے قلم سے
نئے رنگ اس میں وہ بھر کر
چلا ہے کہاں ہم سے منہ موڑ کر
کہ ہے آج بے رنگ 'اُردو کا باغ'[1]
تخیل کے غمگیں افق پر
مسلسل اُبھر آئے ہیں ساتھیو
لرزتے ہوئے اس کی یادوں کے سائے

[1] 'اُردو باغ' مرحوم کے مکان کا نام ہے۔

نوحہ شاعر — در ماتمِ شاعر

[خلیل الرحمٰن کی یاد میں]

سیّد فرحت

فکر و فن، نقد و نظر، شعر و سخن ہیں سوگوار
کس کے غم میں آج اہلِ انجمن ہیں سوگوار

سازِ دل کو چھیڑتی تھی جسکی مضرابِ کلام
جس کا دنیائے ادب میں امتیازی تھا مقام

زندگی کے واسطے جو زہرِ غم پیتا رہا
حوصلے سے پھر بھی اس دنیا میں وہ جیتا رہا

ہائے بدقسمت ہے کس درجہ مری اُردو زباں
جس کے خرمن پہ ہیں گرتی پے بہ پے یہ بجلیاں

ہائے اس تھوڑے سے عرصے میں گئے کیا اہلِ فن
مدتوں روئے گی جن کو محفلِ شعر و سخن

آتشِ نمرود سوزِ غم تھا جس کے واسطے
وہ خلیلؔ اِس دور میں اب دوسرا کیسے ملے

دے گئی آخر دغا اس کو یہ فانی زندگی
مر نہیں سکتی ہے لیکن اس کی رُوحِ شاعری

زندگی اس کی نظر آئے گی اب اشعار میں
وہ نظر آئے گا مستقبل کے ہر فنکار میں

جو بانسری پہ موت کی گاتا رہا نغمہ ترا
اُس مغنّی سے بھلا ٹوٹا ہے کیوں رشتہ ترا

کارِ عبث ہے بے وفا کرتے ہیں ہم تیرا گلہ
یہ بے وفائی تو سدا دنیا میں ہے شیوہ ترا

چپکے چپکے کہہ رہی ہے کیا یہ رُوحِ زندگی
غور کر نادان بے بنیاد ہے شکوہ ترا

پیکرِ خاکی میں کیا محصور ہے نورِ حیات
کر نظارا وا اگر ہو دیدۂ بینا ترا

شعر و فن کی زندگی اس جسمِ خاکی سے نہیں
ہے امر وہ شاعرِ معصوم و بے پروا ترا

○ فرحت کدہ - دودھ پور - علی گڑھ

آفاق احمد ناظر

نذرِ خلیل

عجب ہے خدا کی یہ قدرت
اندھیرا، اندھیرا، ہر اک سو اندھیرا
ابھی کچھ دنوں قبل ....
سورج کی سب روشنی کو زمیں پی گئی تھی
زمیں کی نگاہیں کھلے آسماں کی طرف
چاند کے زرد چہرے کی رعنائیاں
جذب کرنے کی خواہش لئے، مستقل گھورتی ہیں
واقعی ......
یہ زمیں کتنی بھوکی پیاسی ہے روزِ ازل سے
تمھیں کس طرح میں بتاؤں
"زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے"
اندھیرا، اندھیرا، ہر اک سو اندھیرا
یہ تینوں
سورج، زمیں، چاند
کس طرح ایک صف میں آگئے
ہر اک گھر میں ظلمت نے گھر کر لیا ہے
گہن لگ گیا ہے
ہماری غزل، گیت، تنقید کی خانقاہوں میں
ظلمت کا پہرہ پڑا ہے
گہن لگ گیا ہے

○ پوسٹ جلال پور، ضلع فیض آباد۔ یوپی

مہتاب حیدر نقوی

ایک منظر

خدا کے فرشتے
سبھی آسمانی کتابوں کو سر پر اٹھائے ہوئے
تیز قدموں سے نیچے اُترتے چلے آ رہے ہیں
کہ کشتی ہواؤں کے رُخ پر رواں ہو گئی ہے
ورق، در ورق سب کتابیں
زمیں سے فلک تک بکھرتی چلی جا رہی ہیں
ہوائیں بہت تیز ہونے لگی ہیں
کوئی اپنی کشتی کو بپھرے ہوئے تند دریا میں ڈالے

ہمیں یہ گماں تھا
کہ ہم آسمان و زمیں کے
ہر اک راز سے خوب واقف ہیں
اور علم والے ہیں
لیکن — !
کہیں سے مسلسل صدا آ رہی ہے
"کہ سب وہم تھا
جھوٹ کہتے تھے تم
ہاں — ازل کے اسیروں میں
اک تم بھی تھے"
اور پھر
سارا منظر بدلنے لگا
لوگ روتے رہے
کہ کشتی ہواؤں کے رُخ پر
رواں ہو گئی ہے
خدا کے فرشتے سبھی آسمانی ....

چودھری محمد ارشد
سکراول . ٹانڈہ (فیض آباد) یو - پی

خلیل الرحمن اعظمی پر ایک بحث

شش کاء

ڈاکٹر برق ○ فادر جیف

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

غالب کے دوسرے اشعار کی طرح یہ شعر بھی اس کی بلند کاوش و فکر کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے، جس میں عصری حسیت و آگہی کے عناصر اس کے محسوسات کا شاعر ہونے کی دلالت کرتے ہیں۔ اور یہ محسوسات ہی وہ زندہ جاوید حقیقت ہے، جس کا اعتراف بلا مبالغہ شاعر جب اپنے شعری معاصرین کرتا ہے تو فکری علائم، شعوری عرفان، بصیرت و بصارت، اس کے والہانہ وجد کی رہین منت ہوتی ہے۔ تلاش و جستجو کی دھوپ چھاؤں کو اپنی مٹھیوں میں قید کرنے پر ہی شعروں میں آفاقیت کا رچاؤ آتا ہے۔ اور یہی آفاقیت اشعار کی دائمی حیات کی ضامن ہوتی ہے۔ کیونکہ زندگی اپنے اندر متنوع درجات رکھتی ہے۔ جو بلا شبہ انسانی نفسیات سے مربوط ہیں۔ یہ نفس ہیئت، سارے ہی ادوار میں یکساں تقاضا کرتی ہے۔ جب متقاضی عناصر کا حصول نہیں ہوتا تو تنگ، وہ کے اسلوب بدل جاتے ہیں۔ اندازِ فکر دوسرا ہوتا ہے۔ لیکن مونس جبلی تقاضے ہی ہوتے ہیں۔ خواہ وہ عصر غالب ہو یا عصر حاضر۔

فادر جیف: بات سمجھ میں آتی ہے ـــ بے شک غالب میں سارے ہی جبلی تقاضوں کا احساس بدرجہ اتم موجود ہے۔ اور اسی لئے اس کے اشعار عصری حسیت و آگہی کے مفہوم کا احاطہ کرتے ہیں۔ یہی اس کی آفاقیت بھی ہے۔ اور ہر اعتبار سے یہی اس کی عظمت بھی

ڈاکٹر برق: (کچھ سوچتے ہوئے) ہاں اس کی شعری آفاقیت تو مسلم ہے۔ لیکن عظمت! ـــ بحیثیت شاعر تو وہ عظیم ہے ہی ـــ مگر میری بحث اس سے نہیں۔ دیکھنا تو یہ ہے کہ جو شعر میں نے تمہیں سنایا۔ وہ یوں ہی اس کے کسی تخیلاتی پیکر کا نتیجہ ہے یا کسی ذہنی عرفان کے تحت عصر نو کے کسی مخصوص آدمی اور اس کے گرد و نواح کی فضا پر محیط ہے۔

فادر جیف: دونوں ہی باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن ان دونوں ہی باتوں کے لئے جبلی تقاضوں کے حقیقی عرفان کا ہونا ناگزیر ہے۔

ڈاکٹر برق: تو پھر سنو! ـــ غالب نے جب یہ شعر کہا تھا تو اس کے تخیل میں وفا اور جفا، زود پشیماں کا کوئی پیکر نہ تھا۔ اور نہ ہی وہ خود وہاں تھا بلکہ شراب کے دو پیگ چڑھا کر عصر حاضر میں نکل آیا تھا اور اس عظیم المرتبت انسان شاعر، نقاد کی زندگی کا خاموشی سے مطالعہ کرنے لگا تھا۔ جس نے غزل کو ایک نیا مزاج بخشا۔ اور اردو غزل میں جدت طرازیوں کے لئے نئے ابواب کھل گئے۔ نت نئے افق روشن ہوئے۔ اجالے میں ایک قافلہ ناہموار راستوں کو عبور کرتا رہا۔ اور وہ دیکھتا رہا۔ ہمیشہ کی طرح اپنے شکستہ عریاں تن کو کاغذی پیرہن دیتا رہا۔ کتابوں کی سیج پر سوتا رہا۔ قلم کی نوک پر چلتا رہا۔ لیکن اس روز، جب وہ ـــ بہت تھکا ہوا تھا۔ بستر پر لیٹ کر چند منٹ کی نیند چاہتا تھا۔ چند لمحوں کا سکون! ایک ذرا سی سو لینے کی خواہش!! ـــ وہ جون ۱۹۷۸ء کا پہلا دن تھا۔ ـــ صحرا کی گرم ریتوں کو اپنے شانے پر ڈھونے والی ہوائیں شہر میں داخل ہو چکی تھیں ـــ اور سرد و سرد کمروں سے باہر زرد زرد آندھیاں چل رہی تھیں ـــ اوپر لٹکتا ہوا سورج ٹوٹ کر نیچے آ گیا تھا۔ اور ساری دھرتی کا دھک دھک کرتا ہوا سینہ جھلس گیا تھا۔ ایک آتش فشاں پھوٹ پڑا تھا۔ تب شاعر یعنی

لالٹین کی پیلی پیلی روشنی ۔ دھندلی روشنی میں اسے سفید کاغذ کا لباس کے ساتھ دھرتی کی کوکھ میں اُتار دیا گیا تھا۔ فوری تدابیر کی گئی تھیں۔ اور قبر کی کچی مٹی کو جھلملاتی ہوئی ایک حسین ریشمی چادر سے ڈھک دیا گیا تھا۔ جس پر تحریر تھا "پروفیسر خلیل الرحمٰن اعظمی" ——— غالب کے دو پیک کا نشہ اُتر چکا تھا۔ کیونکہ وہ شعر جو ابھی پہلے سنایا ہے۔ وہ قبر کے کتبے پر کندہ تھا۔

فادر جیفرے: اوہ ! تو تم اس طرح سے سوچ رہے ہو (ایک لمحہ کی خاموشی۔ چہرے پر ناگواری، پھر ہونٹوں پر مسکراہٹ، انتہائی نرم آواز) پیارے برق ! تم سے چوک ہوگئی ہے۔ تم خلیل اعظمی کے پروفیسر ہونے کے اعزاز سے اداسی پہلو کو نظر انداز کر رہے ہو۔ تھوڑی سی مغز ماری کرلو تو بات سمجھ میں آجائے گی کہ علی گڑھ مسلم یونیورسیٹی کا یہ کتنا مستحسن اقدام ہے۔ بھئی یہ تو اس بے باک جیالے کی ادبی خدمات کا اعتراف ہے ——— اسکی پچیس سالہ خدمات کا اعتراف۔ اس کی شعبۂ اُردو میں محنت اور جفاکشی کا اعتراف۔ اس کی علمیت و اہلیت کا اعتراف، اس کے جرأت مند ناقد ہونے کا اعتراف۔ اُردو کے ایک نڈر اُستاد کا اعتراف۔ ایک منفرد شاعر کا اعتراف۔ اور عہدِ نو کے ایک عظیم الشان نمایاں ادیب ہونے کا اعتراف۔

ڈاکٹر برق: (طنزیہ انداز) اعتراف ! موت اور اعتراف !! ——— کھیل اور ایک دلکش مذاق۔ (ہلکا سا مذاق ——— پھر مخاطب کرکے) فادر ! ——— جن اعترافات کی بوچھار ہوئی ہے۔ کیا مجھے اس سے انکار ہے ؟ لیکن سچ سچ بتاؤ کہ کیا یہ ایک مذاق نہیں ہے۔ مرنے والے کی تضحیک نہیں ہے۔ اگر وہ بقیدِ حیات ہوتا تو کیا اُردو والے اسے آسانی سے معاف کردیتے؟ یونیورسیٹی سے اسکو یہ اعزاز مل جاتا ؟ ؟

فادر جیفرے: بے شک ! جو ہونا ہوتا ہے۔ اپنے معینہ وقت پر ہو کے رہتا ہے۔ یہ ایک ناقابلِ تسخیر حقیقت ہے۔ آج اگر خلیل اعظمی ہمارے درمیان ہوتے تو ابھی وہی کچھ ملتا، جو کچھ ملنا تھا۔ بھلا حقوق کبھی کہیں مارے جاتے ہیں۔ اور پھر اُردو والے نبند کے ماتے نہیں۔ جو زیادتیاں تادیر پنپتی رہیں۔ استحصال ہوتا رہے۔ جب اُردو والے سارے ہی دشوار گذار مراحل سے پنجہ آزما ہوسکتے ہیں۔ ملکی مسائل اور سیاست تک میں حصہ لے سکتے ہیں۔ جنگِ آزادی کی لڑائی لڑ سکتے ہیں۔ اُردو اور دوسری زبانوں تک کے جائز حقوق دلوانے کے لئے کوشاں رہ سکتے ہیں۔ تو کیا اپنے کسی ہمدم، دوست، راہ نما کے لئے کچھ نہیں کرسکتے۔ کروڑوں اُردو پرست، اُردو دوست، اُردو والوں کے دل کی یہ بات ہے۔ آواز ہے۔ مفلس کی آہ ہے۔ جس کی قبولیت میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں۔ آج ہم کو روشن مستقبل کے آثار دیکھ کر سکونِ قلب حاصل ہوا ہے۔ ایک ذرا سی چھاؤں ملی ہے کہ حقوق بحال کر دیا گیا ——— اب رہا غالب کا شعر۔ تو شعر ہر اعتبار سے درست ہے۔ لیکن معنی و مفہوم کا تجزیہ بیجا ہے غلط ہے۔ تصحیح کرلو۔

ڈاکٹر برق: (ناگواری سے) فرسودہ خیالات ہیں۔ اگر خلیل اعظمی ہمارے درمیان ہوتے تو انہیں حتی الامکان کوشش کرکے کچھ بھی نہ دیا جاتا۔ یہ صدیوں کی روایت ہے۔ انگنت خلیل کے ساتھ یہی ہوچکا ہے۔ ولی سے لیکر میر تک۔ اور میر سے لیکر خلیل، اقبال، بلکہ عصرِ حاضر تک کتنے نام ایسے مل جائینگے۔ جن کی زندگی میں انہیں انکا جائز مقام دیا گیا ہو۔ انکی زندگی کی صعوبتوں کی بابت سنجیدگی اختیار کی گئی ہو۔ ان کے حقوق کی بحالی کے لئے کوئی مثبت اقدام کیا گیا ہو۔ ان کے افکار کو نظر انداز نہ کیا گیا ہو۔ صحیح جائزہ لیا گیا ہو اور سراہا گیا ہو۔ اس طویل مسافت میں کیا کچھ نہ ہوا۔ ادب میں کیسے کیسے موڑ آئے۔ طوفان آئے۔ بارش ہوئی، دھوپ بھی نکلی۔ کتنا تغیر و تبدل ہوا۔ لیکن کیا ہوا۔ کون سا شاعر ہے، کون سا کہانی نویس، ناقد اور صحافی ہے، جو مخلصانہ، منصفانہ برتاؤ سے گذارا گیا ہو ——— یہی ہوتا رہا اور ہوتا رہے گا، کہ جب شہر، سماج، خاندان، گھر کی رسوائی کی تہہ دار گرد اپنے جسم پر لپیٹے ایک انسان سفر پر نکل جاتا ہے تو سارا شہر ماتم کرتا ہے۔ پرچم سماج جھکا دیا جاتا ہے۔ جھنڈ در جھنڈ لوگ اکٹھا ہوتے ہیں۔ آپس میں تبادلۂ خیالات ہوتا ہے۔ جانے والے کو بڑے بڑے اعزازات سے نوازا جاتا ہے۔ خاندان کا خاندان جانے والے کی

اہمیت کا اعتراف کرتا ہے۔ گھی، شکر کا مالیدہ چڑھایا جاتا ہے اور پوجا کے پھولوں سے گھر گھر پوجا ہوتی ہے ـــــ اب اگر اس روایت سازی کا غائر مطالعہ کیا جائے تو تضحیک کا مخرج بآسانی نکل آئے گا۔ تاہم سابقہ نشتر زنی و نمک پاشی نظر انداز نہ کی جائے۔

فادر حنیف: میں تمہارے خیالات سے متفق نہیں۔ کیوں کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ صدق دل سے۔ اس میں پاکیزہ جذبوں کی کارفرمائی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر برق: لیکن یہی صدق دلی اور پاکیزہ جذبے اس سے پہلے کیوں نہیں کارفرما ہوتے۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے وہ محسوس تو کرے۔ جبکہ یہی ایک دوسرے کیلئے سب کرتے ہیں۔ اور برابر کہتے ہیں۔ ہر بار ہاتھ ملتے ہیں۔ ہاتھ ملنے میں جاتا کیا ہے سوائے کالے ہاتھوں کی کالک چھوٹنے کے۔ اب اسے کیا نام دوں۔ اپنی خود غرضی کہوں، عظمت کا اعتراف کہوں۔ تضحیک کہوں، یا غالب نے جو کچھ کہا ہے، وہی کہہ دوں۔

فادر حنیف: کچھ نہ کہو۔ مفروضات سے پرہیز کرو۔ زمانہ جو کہتا ہے، وہ کہو۔ اسی نگاہ سے دیکھو، وہی کچھ محسوس کرو۔ وہی کچھ کہو اور وہی کچھ کرو۔

ڈاکٹر برق: یہ بات حقیقت از بعید ہوگی۔ اور اگر اس حقیقت کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو بھی خلیل اعظمی کی شخصیت ایک سوالیہ نشان بنی رہتی ہے۔ کسی مفروضے کے تحت اگر یہ نشان بھی فراموش کر دیا جائے تو غالب کی آفاقیت تو آفاقیت۔ اسکی شاعرانہ عظمت تک مشکوک ہو جاتی ہے۔

فادر حنیف: (حیرت سے تکتے ہوئے تیز لہجہ میں) کیوں؟ عظمت کیوں مشکوک ہو جاتی ہے؟

ڈاکٹر برق: اسلئے کہ غالب نے اپنے شعر کے ذریعے مرحوم کی زندگی اور گرد و پیش پر مبنی جو اشاریت دی ہے۔ اس کی نفی ہوتی ہے۔ اور اگر یہ منفی ہے تو غالب کی صد سالہ برسی کی تقریبات کے موقع پر اس کی عظمت کے اثبات کا تم نے جو ایک پہلو اس کی پیغامبرانہ شان کے تحت اجاگر کیا تھا۔ اور مزید یہ کہا تھا کہ غالب نے ایک اقبالؒ کے پیدا ہونے کی بشارت دی تھی۔ وہ اشعار ہیں نا، جنھیں ذریعہ بنایا تھا ؎

شاعر بکنی

آں راز کہ در سینہ نہاں است نہ وعظ است
بردار تواں گفت و بہ منبر نتواں گفت

فادر حنیف: ہاں یہ سچ ہے۔ اس نے بشارت دی تھی (ایک لمحہ رک کر بڑبڑانے کے انداز میں) آں کس کہ شد صاحب نظر دین بزرگاں خوش نہ کرد ـــــ بیشک اس کے اشعار کہ معلوم ہوتا ہے کہ بعد میں ایک اقبال آنے والا ہے۔

ڈاکٹر برق: آخر کیوں۔ کہ تمہارے نزدیک جب خلیل اعظمی کی زندگی اور بعد مرنے تک کے حالات کا اس کا وہ شعر احاطہ نہیں کر سکتا تو اس طرح کے شعروں میں اقبالؒ کے آنے کی بشارت کیونکر ہو سکتی ہے؟

فادر حنیف: تو کیا یہ ضروری ہے کہ وہ شعر غالب نے خلیل اعظمی ہی کے لئے کہا تھا۔ یہ ضروری ہے کہ اس کا یہیں تجزیہ کیا جائے؟

ڈاکٹر برق: ہاں ضروری ہے! اور نہیں بھی۔ اگر نہیں تو اس کے ذہن میں نہ کوئی اقبال تھا اور نہ ہی اقبال کے عصر تک اسکی رسائی تھی۔ یہ محض مفروضات ہیں۔ اور اگر ضروری قرار دیا جاتا ہے۔ تو یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی پہونچ خلیل اعظمی تک تھی۔

[کچھ وقفہ کیلئے دونوں ہی خاموش رہتے ہیں۔ فادر پیالے سے تیز کافی کا ایک گھونٹ بھرتا ہے اور نیم تلخی کے احساس سے منھ بگاڑ لیتا ہے۔]

ڈاکٹر برق: (پائپ سلگا کر خلا میں کچھ تلاش کرتے ہوئے) خلیل اعظمی کیلئے پروفیسری کا درجہ ناکافی ہوگا۔ اور سچ تو یہ ہے کہ یہ اس کی انسانی عظمت کی توہین ہوگی۔ کیونکہ وہ صرف اردو شعبے سے منسلک نہ تھا، صرف استاد نہ تھا، سراپا انسان تھا۔ سب سے پہلے شاعر تھا۔ حقیقتوں کو کرید نے والا کھجلاتے ہوئے زخموں میں تیلی گھونپ کر تادیر ہلاتے رہنے والا کہ جب تک سارا مواد بہہ کر زخم صاف نہ ہو جائے۔ ایک ایسا ہی جرأت مند ناقد تھا وہ۔ اگر یہ درجہ اسے تبھی مل جاتا جب selection Committee ہوئی تھی۔ تو ذاتی طور پر کیا وہ خوش ہوتا۔ وہ خوشی، وہ روحانی اور اچھوتی محبت ایسے لوگوں کو تب ہی ملتی ہے جب اسکے افکار

منظرِ عام پر آتے ہیں اور لوگ نیک نیتی، صدق دلی سے اس کے خیالات کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہیں۔ اس کی بصارت و بصیرت کا احساس کرتے ہیں۔ اس کی آواز اپنے جذبوں کی اساس محسوس کرتے ہیں۔ اس کے تصور میں اپنی تصویر دیکھتے ہیں اور اپنے وجود کا احساس کرتے ہیں۔ برنارڈ شا کی تحریر ہی تو تھی کہ میں ساری ENCYCLOPAEDIA BRITANNICA لکھنے کی نسبت ALICE IN WONDERLAND کا مصنف ہونا زیادہ پسند کرونگا ——— تو پسندیدگی کی اشاریت ہمیشہ اساسی ماہیت لئے ہوئے ہوتی ہے۔ حقیقت کا اعتراف ہوتا ہے۔ تاہم اس کی موجودگی ہی میں اگر اسے اسکی DUE دے دی گئی ہوتی تو اتنا ضرور ہوتا کہ وہ اپنے بچوں کے مستقبل کے لئے بہتر طور پر سوچ سکتا۔ مکان کی تعمیر کے سلسلے میں یونیورسٹی کا جو قرضہ چڑھا ہوا ہے۔ اس کی ادائیگی کے لئے جلد از جلد کوئی نہ کوئی قدم اٹھا سکتا۔ اپنی خانگی زندگی میں توازن پیدا کرتا۔

فادر جیفر: ہاں یہ تو ہے۔ لیکن یہ اس لئے نہیں ہو سکا کہ رخنہ اندازیاں شروع ہو گئی تھیں۔ کچھ لانبے، کالے کالے ہاتھ آنے لگے تھے جو سورج کی آب و تاب کو ڈھانپنا چاہ رہے تھے۔

ڈاکٹر برق: اور ان ہاتھوں کو کاٹ لینے سے خلیل اعظمی نے گریز کیا۔ یعنی اپنے لئے کچھ بھی نہ کیا۔ صرف اپنا جسم، اپنا دماغ، اپنی مدح بانٹتے رہے۔ صدیوں پرانے عام رجحان کے برخلاف۔ جو عصرِ جدید میں کچھ زیادہ نمایاں ہو چلا ہے۔ محرکات اور عوامل عہدِ نو کی برق رفتاری کا ساتھ دے رہے ہیں۔ مروجہ اقتدار کرسی، عہدہ، بالادستی کی لڑائی ہر قماش کے لوگوں میں ——— تمام شعبوں میں بتدریج بڑھ رہی ہے۔ ان عناصر کا خلیل کے ہاں فقدان ہے۔ ورنہ وہ بھی لیبل پسند ہوتا۔ اپنے نام کے ساتھ ڈگریوں کی لائن کھڑی کرتا۔ اپنے مسودات کو سوچے سمجھے پلان کے تحت طبع کراتا۔ اپنی خوب سے خوب تر PUBLICITY کرتا۔ بناوٹ اور تصنع کا حصاری ہوتا، شہرت کا پجاری، نام و نمود کا خواہاں اگر وہ ہوتا تو ایک منفرد تاریخ ساز حیثیت بنانے کے لئے خود کوشاں ہوتا۔ زیادہ سے زیادہ کتابیں لکھتا۔ فرسودہ مفروضات سے لیکر دل اور محسوسات کی اعلیٰ شاعری اور نثر نگاری

شاعر، ببئی

تک ایک موضوع بھی نہ چھوڑتا۔ اپنی کتابوں پر دیباچہ لکھواتا۔ تاکہ آئندہ نسل جب کتابوں کی ورق گردانی کرے تو اسے اردو ادب کا چوتھا ستون تسلیم کرے۔

فادر جیفر: تو کیا اس کی غیر معمولی شہرت اور مقبولیت، علمی وقار اور تجربے مشتبہ ہیں؟ اس کی انفرادی تاریخ ساز حیثیت نہیں بن سکی۔

ڈاکٹر برق: لیکن ان سب کے لئے وہ بذاتِ خود کوشاں تو نہ تھا۔ سچ یہ ہے کہ اندھیاری رات میں جب چاند نکلتا ہے تو جلتے ہوئے، مضطرب، روشنی اور سکون کے متلاشی لوگ اپنے احساسات سے جان لیتے ہیں کہ چاند نکلا ہے۔ چاند میں کب اس خواہش کی دریافت کی جا سکتی ہے کہ وہ خود کو تسلیم کرانے کے لئے سعی کرے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ وہ چاند ہوگا تو نکلے گا۔ اندھیرے میں چمکے گا۔ اس میں روشنی ہوگی۔ جلتی ہوئی آنکھوں کو ٹھنڈک ملے گی۔ اور یہ سب کچھ نہ ہوگا تو چاند کی چاندنی، اُجلاپن، بلندی و عظمت مسلم نہ ہوگی۔ اس خود آگہی کا تقاضا نہ تو تکنیکی لوازمات، مفروضات، مصنوعی، لیبل پسند تنگ رو، کھوکھلے اسلوب سے پورا ہو سکتا ہے۔ اور نہ ہی شداد کی جنت رہ سکتی ہے۔ اس کے لئے تو ناگزیر عرفان، بصیرت، فکری اور حقیقی توانائی و برنائی کی ضرورت ہوتی ہوگی۔ حیات و کائنات کے پُرپیچ رموز، بسیط حقیقت، زماں و مکاں کی زبوں حالی۔ صعوبت و اضمحلال سے گزرنا پڑتا ہے۔ لمحہ لمحہ کے تمام متنوع محسوسات کو دسترس میں لانا پڑتا ہے۔ جو بڑے ہی پُرپیچ، بے ڈول، اُدھڑے اُدھڑے اور بکھرے بکھرے سے ہیں۔ اس صحیح ترجمانی اور ترسیل و ابلاغ کے لئے ہمارے یہاں جب اسے کوئی FORM نہیں ملتا تو وہ نثری نظموں کے لئے ایک جگہ کہتا ہے:

"آزاد یا نثری نظم کا جو صحیح تصور ہے۔ جیسے کہ میں نے بتایا تھا VERSE LIBRE کا۔ وہ جس تصور کے تحت لکھی جاتی ہے۔ اسے منظوم کرنا یا اسے ایسی نثر بنانا جس میں منطقی تسلسل ہو۔ یا باقاعدہ پیراگراف ہو، کاما، فل اسٹاپ ہوں PUNCTUATION ہو۔ وہ بھی غلط ہوگا۔ میں تو کہتا ہوں کہ آپ اسے اس طرح سے

رہنے دیجئے۔ اس میں جس طرح کا اُلجھاؤ ہے۔ اس میں جس قسم کی بے ترتیبی ہے۔ اسمیں گرامر کو جس طرح سے توڑا گیا ہے۔ اس میں SEQUENCE کو جس طرح سے توڑا گیا ہے۔ وہ سب اسی طرح سے رہنے دیجئے۔ وہ سب اسی طرح سے رہےگا۔ تب وہ صحیح معنوں میں نثری نظم ہوگی۔"[1]

اس نے عصرِ نو کی جس حقیقت اور جس زندگی کو محسوس کیا ہے اور جاندار کی صفات پائی ہے۔ اس میں ایسی تصویریں عنقا ہیں جو آپس میں مربوط ہوں اور جس کی ترسیل وابلاغ دوسرے کسی FORM میں ہو سکے۔ البتہ وہ بشارت بھی دیتا ہے کہ یہ FORM جس میں مشینی دور کی بھرپور عکاسی ہو سکتی ہے۔ زندگی کی موجودہ بکھری ہوئی منتشر منطقی ربط سے عاری صورتوں اور پیچیدہ تر حقیقتوں، دھندلکوں، اندھیروں کو سمو سکتا ہے۔ یہ صرف اسی کی دسترس میں ہوگا جو زندگی کا شاید تجربہ بہت گہرا اور وسیع رکھتا ہو۔ لفظوں کے تخلیقی استعمال پر قادر ہو۔

نادر حنیف: صحیح ہے اور وہ مہتاب کی عظمت رکھتا ہے اور نئی شاعری پر اس کا احسان ہے۔ لیکن ——— لیکن، مجھ میں نہیں آتا کہ اتنی گہری حقیقت اس میں آئی تو کیونکر آئی کہ وہ کہے۔ اگر پھول ہے تو پھول ہی کہیے۔ تانبے کو تانبہ اور اسی کو باسی ہی پیش کیجیے۔

ڈاکٹر برق: یہ راز اس کی شاعری سے بآسانی برآمد ہو سکتا ہے۔ اس کی شخصیت، اس کے ذاتی کردار سے بھی، جو اقوال و افعال سے یکسانیت پر مبنی ہے۔ اور جب یہ دونوں ہی یکساں ہوتے ہیں اور شخصیت بڑی چست اور پُروقار ہوتی ہے۔ اپنے اندر ایک ایسی گوناگوں خودداری رکھتی ہے۔ جس کے محور پر بگی سے بگی تصویر کیوں نہ ٹھہرے۔ تصویر کے جبلی اور موصلی عناصر کا وجدان ہو ہی جاتا ہے۔ یہ وجدان ایک طرف اندر کے فن کار کو اکساتا ہے تو دوسری طرف اخلاص و محبت، خدمت گذاری کے جذبوں کی آبیاری کرتا ہے۔ اور اسی لئے وہ سب کا چاہنے والا، انتہائی پیارا دوست بھی تھا۔ دوستوں کی قدر کرتا تھا۔ دوستوں کو اپنے گھر پر بلا کر خوش ہوتا تھا۔ خوب مہمان نوازی کرتا تھا۔ خواہ اس کی خارجی زندگی میں انتشار ہو یا سلیقہ، تنگ دستی، تہی دامنی ہو یا خوش بختی ہو خوشحالی ہو۔ دودھ پور کا مکان ہو، آنند بھون یا ذاکر باغ والا مکان ہو۔ کہیں کوئی بھی مقام ہو، دوستوں کا وہی جمگھٹ، اس کی وہی خندہ پیشانی، طعام و قیام کا وہی انتظام، وہی محفلیں، ادب اور ادب کی سیاست، اردو کے الجھنے مسائل پر گفت و شنید۔ ادب اور انسان کی قدر دانی کا شیوہ اسی کا تھا۔ وہ دوسروں کی تخلیقات بغور پڑھتا، تعریفیں کرتا اور دوسروں سے بھی خاطر خواہ پذیرائی کا متمنی ہوتا۔ شعر و سخن کی محفلیں ہوتیں تو ہمیشہ دوسروں ہی کے اشعار سُناتا۔ تبصرہ کرتا اور خوب سراہتا۔ بعد ازاں جب اپنے اشعار کی طرف مائل ہوتا تو وہ بھی چند شعر ——— اس کا وہ مخصوص ترنم کتنا پُرسوز ہوتا تھا، جیسے سارے ہی ذہنی اور داخلی کرب کو وہ اپنی الم انگیز آواز کے تاثر اور آہنگ کے ذریعہ نکال دینا چاہتا ہو۔ کاش کہ اس کے کرب کو کوئی محسوس کرے۔

نادر حنیف: جمیل مظہری اور پرویز شاہدی کی شاعری خلیل کو بہت پسند تھی۔

ڈاکٹر برق: جمیل مظہری اور پرویز شاہدی ہی کیوں؟ ——— اساتذہ کی پُرانی شاعری ——— بزرگ شاعروں اور ہم عصر جدید طرازی تک، ہر کسی کی شاعری، اس کی پسندیدہ شاعری تھی ——— شرط یہ ہے کہ وہ زندگی کی شاعری ہو۔ عہدِ نو کی بکھری ہوئی زندگی کی مجروح اور منتشر تصویروں سے خالی نہ ہو۔ دراصل وہ زندگی کی ہر صورت اور اس کے ہر تنوع کو ہمہ وقت دیکھنے کے لئے کوشاں نظر آتا ہے۔ خواہ وہ انسانی جذبات، مہمان نوازی، دوسروں کے افکار، اپنے خیالات، بصیرتی تنقید، محسوسات کی شاعری کے تحت کیوں نہ ہو۔ اور یہی اس کا فنی ریاض بھی تھا۔

نادر حنیف: بات سمجھ میں آتی ہے۔ خلیل اعظمی کو پانے کے لئے ان کے افکار کا بھرپور جائزہ ہی ایک سہارا ہے۔ میں تو ان کی نادر یادوں کو محفوظ کروں گا۔ انہیں کتابی صورت دے کے منظرِ عام پر لاؤں گا۔

ڈاکٹر برق: (ایک طویل سانس لیکر) اب دیکھو کیا ہوتا ہے۔ مجھے تو اس وقت اندھیرا ہی اندھیرا نظر آ رہا ہے۔ جس میں ساری

[1] "شب خون" شمارہ۔ فروری، مارچ، اپریل ۱۹۷۰ء
ناصر بمبئی

ہی تخلیقات پڑی ہیں۔ اندھیرے غار میں وہ تخلیقات سسک سسک کر آنسو بہا رہی ہیں۔ اور ان کی بیوہ خالی ہاتھ اٹھائے اپنے معبود حقیقی کو دیکھ رہی ہیں۔

فادر حنیف: اس طرف بھی توجہ دی جائے گی۔ اور مخصوص توجہ! ـــ اب وہ بے سہارا ہیں نا۔ تو اُن کا سہارا ہم بنیں گے۔ ان کے کم عمر بچوں کی تعلیم اور اُن کے مستقبل کی بہتری کے لئے ہم کوشاں ہوں گے۔ ایک آواز بلند کی ہے۔ خلیل اعظمی کے ورثہ کو ان حقوق دلانے کی آواز۔ بیگم خلیل کے لئے یونیورسٹی سے معقول لازمت فراہم کرنے کی آواز۔ اُن کے بچوں کی مفت تعلیم اور رہنے کی آواز۔ ان کے لئے عدالتی سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لئے کارروائی کی آواز۔ دوستوں اور اندو والوں کی آواز۔ کہ اب اس کے سوا کرنے کے لئے رہا ہی کیا ـــ وہ دوست۔ وہ احباب۔ جن سے اجنبیت کی دیواریں گرا کر ازلی محبت حاصل کرنے اور ایک دائمی رشتے کے قیام کے لئے خلیل اعظمی کوشاں ہوتے۔ ان دوستوں کے دل کی آواز۔ روح کی آواز۔

ڈاکٹر برق: (ایک تلخ مسکراہٹ کے ساتھ) یہ آواز ہے۔ اور میرے نزدیک صرف آواز۔ جو فضائے بسیط کا احاطہ بھی نہیں کر سکتی۔ کنکریوں کی مانند اچھل اچھل کر سطح پر آجاتی ہے۔ سوکھی زمین میں جذب ہو جاتی ہے۔ محض تاریخ کا حصہ کہلاتی ہے۔ ان آوازوں کے بےشمار نقوش تاریخ کے صفحوں پر پھیلے ہیں۔ اور ذہین، بے غرض انسان کی بیوہ پیٹ کاٹتی رہی ہے۔ اور اس کے بچے بھوک سے تڑپتے رہے ہیں۔ اور تعلیم نیز وظیفہ! ـــ یہ محض ایک خیال ہے۔ اگر کبھی کسی کو کچھ ملا بھی تو ہزار جان قربان ہو سکنے کے بعد مہینے میں صرف اتنا جتنا کہ ایک ہفتہ سیکر پائپ میں تمباکو جلتی ہے۔ تم سگار پیتے ہو ـــ ہاں خلیل سے عقیدت اور بچوں سے ہمدردی کر تو ساری ہی آواز صرف اتنا کر دکھائے کہ بیگم خلیل معاشی اعتبار سے آسودہ ہو کر اپنے بچوں کو پال سکیں اور یونیورسٹی SELECTION COMMITTEE ـــــ جب ہوئی تھی۔ اس تاریخ سے تیئیس مئی تک خلیل اعظمی کو جو تنخواہ ملی ہے وہ ایک پروفیسر کی تنخواہ کے حساب سے جوڑ کر جو رقم آئے اُسے انکی بیوہ کے حوالے کر دے۔ اس کے بعد خلیل اعظمی پر جو قرض ہے۔ یونیورسٹی اس قرض کی مساوی قسطیں اتنی بنا دے جس کی ادائیگی وقت پر ہو سکے ـــــ لیکن میں جانتا ہوں فادر ـــ کہ اتنا بھی نہیں ہوتا ہے۔ یہ ہاتھ جتنی تیز رفتاری سے کُلے جاتے ہیں، اسی تیزی سے جھاڑ بھی دیئے جاتے ہیں ـــ ایک فن کار جب اپنی تخلیقات کو چھوڑ کر اپنے خالق سے جا ملتا ہے تو تنہے ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے OO

مجنوں گورکھپوری

آتش کا نیا مطالعہ

انسان کے بہت سے حوصلے ایسے ہوتے ہیں جو اپنی تمام ابتدائی تاب و توانائی کے ساتھ عمر کے آخری ایام تک باقی رہتے ہیں مگر کسی طرح پورے نہیں ہو پاتے اور نہ جانے کتنے منصوبے ایسے ہوتے ہیں جن کو آدمی مرتے دم تک پورا کرنے کا عزم رکھتا ہے مگر جن کی کسی نہ کسی وجہ سے تکمیل رہ جاتی ہے۔ میں جس زمانے میں اُردو شاعری کے اساتذۂ قدیم پر ایک خاص ذوق اور ولولے کے ساتھ لکھ رہا تھا۔ اُس وقت بہت سے شعراء میری فہرست میں شامل تھے، ان میں آتش بھی تھے ضمنی طور پر بعض تحریروں اور پھر زبانی کئی موقعوں پر خاص کر اپنے طلبا کو مخاطب کر کے سرسری طور پر آتش کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار کر چکا ہوں۔ مجھے آتش کے ساتھ وہ شغف نہیں رہا جو میرے بعض دوستوں مثلاً فراق گورکھپوری کو رہا ہے۔ آتش کے کلام کا نصف سے زیادہ حصہ میری جلد پر بھی اثر نہیں کر پاتا لیکن یہ احساس مجھے روزِ اول سے تھا کہ اگر آتش لکھنؤ کی فضا سے الگ رہتے اور ناسخ جیسے پہلوانِ سخن سے انھیں مقابلہ کرنا نہ ہوتا تو ان کی شاعری کا وہ انداز ہوتا جو اُن کے منتخب کلام کا ہے۔ اس منتخب کلام کا حجم بھی کم نہیں ہے۔ اگر ان کے دیوان کی دو جلدوں کو نچوڑ کر ایک مختصر جلد کر دیا جائے تو بھی اُن کا نام صفِ اوّل کے شعراء میں ہوگا اور اس حالت میں اُن کا اثر زیادہ سریع زیادہ واضح اور زیادہ پھیلا ہوگا۔ وہ یقیناً غالب اور مومن کے ہم نشینوں میں ہیں بشرطیکہ اُن کے کلام کا صحیح انتخاب کر کے پڑھنے والوں کے سامنے پیش کیا جائے آتش اپنے مزاج و کردار اور اپنی اصلی فطرتِ شعری دونوں اعتبار سے اپنے زمانے اور ماحول کے لئے ایک "بدرنگ" اور بے میل چیز تھے۔ وہ فطرتاً شاعر تھے اور صحیح معنوں میں صوفی باصفا بھی۔ اگر خارجی عوارض و اسباب کے وہ شکار نہ ہو گئے ہوتے تو وہ اُردو شاعری میں یقیناً ایک نیا عنوان ہو سکتے تھے۔ اُن کے اندر وہ صلاحیتیں اور قوتیں تھیں جو اردو شاعری میں ایک حافظ پیدا کر سکتی تھیں۔ یہ دعویٰ اُردو کے کسی دوسرے شاعر کے بارے میں نہیں کیا جا سکتا ایسے اشعار آتش کے دیوان کی دو جلدوں میں ہم کو کافی تعداد میں ملتے ہیں، جن میں وہی رندی و سرمستی، وہی قناعت و بے نیازی، وہی عارفانہ وجدان موجود ہے جس سے خسرو، حافظ اور جامی جیسے عارف شاعروں کا خمیر تیار ہوا ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ آتش کے بہترین اشعار کو پڑھ کر ہمارے دلوں میں افسردگی پیدا نہیں ہوتی۔ آتش کے کلام کا اثر یاس و اضمحلال نہیں بلکہ ولولہ و نشاط ہے۔ سب سے پہلے امداد امام اثر نے کاشف الحقائق میں ہم کو اس طرف توجہ دلائی کہ آتش کے کلام کی ایک عام انفرادی خصوصیت "مردانگی" ہے۔ آتش جس وقت دنیا کی بے ثباتی، قناعت اور درویشی کے مضامین باندھتے ہیں، اُس وقت بھی وہ ہمارے اندر مجہولیت اور پستی نہیں پیدا کرتے۔ مختصر یہ کہ کوئی تیس سال سے آتش پر لکھنے کا ارمان ہے جو کسی طرح پورا نہ ہو سکا اور اب پورا ہونے کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔

میرا خیال ہے کہ اُردو شاعری کے اساتذۂ قدیم میں مصحفی اور آتش پر لکھنا سب سے مشکل کام ہے اور انھیں پر سب سے کم لکھا گیا ہے۔ مصحفی سے اس وقت بحث نہیں۔ آتش پر اب تک مستقل مضامین کی شکل میں یا ضمنی طور پر جو کچھ لکھا گیا ہے وہ زیادہ تر سطحی اور سرسری ہے۔ کسی نے آتش کے مزاج اور اُن کی شاعری کی رُوح میں ڈوبنے کی کوشش نہیں کی۔ سب اُوپر سے مطالعہ کر کے اُوپری باتیں کہہ گئے ہیں۔ ۱۹۴۸ء میں "نگار" نے آتش پر ایک مضمون بالاقساط شائع کرنا شروع کیا جس کے لکھنے والے کے نام کی جگہ خلیل الرحمٰن اعظمی دیا ہوا تھا۔ پہلی قسط پر میں نے سرسری نظر ڈال کر چھوڑ دیا تھا لیکن دوسری قسط کو میں نے اتفاق سے غور سے پڑھا اور مجھے محسوس ہوا کہ آتش پر پہلی بار سوچ سمجھ کر لکھا جا رہا ہے اور آتش کا حق ادا کیا جا رہا ہے۔ اس احساس کے تحت میں نے پہلی قسط کو پھر سے پڑھا اور بڑے تحمل کے ساتھ پڑھا اور پھر پورا مضمون دلچسپی کے ساتھ پڑھتا گیا۔ مضمون ختم کرنے کے بعد لکھنؤ میں جب نیاز صاحب سے میری ملاقات ہوئی

تو میں نے اُن سے پوچھا کہ اس مضمون کا لکھنے والا کون ہے، اور اسی کے ساتھ میں نے کہا کہ پہلی بار آتش پر ان کے ماحول اور اُن کے فطری مزاج کو سمجھ کر لکھا گیا ہے۔ کوئی آٹھ نو سال بعد مضمون کے مصنف خلیل الرحمن اعظمی سے ملاقات ہوئی اور مختلف ادبی مسائل پر اُن سے گفتگو کر کے مجھے محسوس ہوا کہ یہ شخص بولتا کم ہے اور سوچنے سمجھنے کی کوشش زیادہ کرتا ہے۔ یہ تھا خلیل الرحمن اعظمی سے مل کر میرا پہلا تاثر۔

کتاب کا پہلا باب "تذکرہ" ہے جس سے شبہ ہوتا ہے کہ عام تذکروں کے قسم کی کوئی چیز ہوگی اور اس میں رسمی تحقیقی موشگافیوں سے کام لیا گیا ہوگا لیکن پڑھنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ایک طرف تو لکھنے والے نے آتش سے متعلق قدیم و جدید مآخذ میں سے کسی کو چھوڑا نہیں ہے، دوسری طرف اُن کے سلیقۂ انتخاب کی داد دینی پڑتی ہے۔ کہاں سے کیا لینا چاہیئے اور کیا چھوڑ دینا چاہیئے، یہ فن مصنف کو معلوم ہے۔ جو کچھ مواد آتش کی زندگی اور ان کے کردار کے متعلق انھوں نے جہاں تہاں سے فراہم کیا ہے اس کو بڑے فنی شعور کے ساتھ ایک تخلیقی ہیئت دی ہے اور مضمون اپنی جگہ پر شخصیت نگاری کی ایک کامیاب مثال ہے جس میں تحقیق کی یبوست کا کہیں سے احساس نہیں ہوتا۔ یہ بجائے خود ایک بہت بڑی خوبی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہر خاص و عام کتاب کے اس حصے کو یکساں دلچسپی کے ساتھ پڑھ سکتا ہے۔

دوسرے باب کا عنوان "چھان بین" ہے جس کو پڑھ کر سب سے پہلا تاثر یہ ہوتا ہے کہ لکھنے والا وسیع مطالعہ اور وسیع نظر کا مالک ہے اور خود اپنی رائے میں کھویا ہوا آدمی نہیں ہے۔ اس باب میں مصنف نے بڑے شعور کے ساتھ انتخاب کر کے وہ تمام رائیں مختصراً دے دی ہیں جو شروع سے اب تک آتش اور اُن کے کلام پر لوگ دیتے آئے ہیں۔ یہ بھی ایک تحقیقی قسم کی کوشش ہے لیکن تحقیق کی گرانباری کہیں محسوس نہیں ہونے پاتی۔

تیسرا باب "آتش کا فن" ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یہی ساری کتاب کی روح ہے اس لئے کہ اس میں خلیل الرحمن اعظمی نے آتش کے شخصی مزاج اور ان کے ماحول پر نظر رکھتے ہوئے آتش کے کلام کا تجزیہ کیا ہے اور ہمیں اس راز سے آگاہ کیا ہے کہ شاعری بالخصوص غزل کی شاعری میں وہ کون سے عناصر اور علامات ہیں جو ہم کو اُردو کے کسی دوسرے غزل گو شاعر میں نہیں ملتے اور جو آتش کی شاعری کی ترکیب میں اجزائے خاص کی حیثیت رکھتے ہیں۔ آتش کے کلام میں فقر و درویشی، قناعت و عبرت کے مضامین کے باوجود ابتہاج اور ولولہ انگیزی کا جو عنصر ملتا ہے اور جو عام پڑھنے والے کے لئے کچھ گم کردہ جاتا ہے، اعظمی نے تجزیہ کر کے اس کو

شاہد بمبئی

بڑے ہنر کے ساتھ اُجاگر کیا ہے۔ آتش کی وہ اُردو غزل کہ دراصل یہی ہے جس پر مصنف نے غائر اور ہمہ گیر نظر ڈالی ہے۔ اسی کے ساتھ ساتھ زمانے کے عام رنگ سے ہٹ کر آتش کا اپنا جو اسلوب ہے اس کو اعظمی نے بڑی ہوشمندی کے ساتھ نمایاں کیا ہے اور جو کچھ کہا ہے اس کو مبہم نہیں ہونے دیا ہے۔

آتش دراصل عشق اور رندی و سرمستی کے شاعر تھے۔ اور اس باب میں اُردو شاعری نے آج تک ان کا کوئی حریف نہیں پیدا کیا۔ ان کے یہاں عشق زندگی کے جذبہ کا نام تھا جس کی ہجر و وصال میں تقسیم نہیں ہو سکتی تھی۔ وہ عشق کو زندگی کا ہمزاد سمجھتے تھے اور ان کا پیغام یہ تھا کہ ہجر ہو یا وصال ہر حال میں مستی و ہمت مردانہ سے کام لو۔ کاشف الحقائق کے مصنف نے آتش کے کلام کی خصوصیات میں ایک اہم خصوصیت مردانگی اسی سبب سے بتائی ہے اعظمی نے اس باب میں آتش کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے ان کے عشق کے تصور کو جس طرح واضح کیا ہے اور ان کی انفرادیت کو جس اعتماد کے ساتھ ابھارا ہے وہ قابلِ رشک ہے۔ آتش کے یہاں عشق عاشق کے انفعالی سوز و گداز معشوق کے حسن کی خارجی کیفیات کے ساتھ مل کر ایک نئی فضا بن گیا ہے جس کی سب سے بڑی خصوصیت نشاط و مستی ہے۔ آتش کی عشقیہ شاعری ہم کو خود سپردگی کا درس دیتی ہے۔ اعظمی نے آتش کے معاصرین کے عام فکری میلان اور اسلوب بیان سے آتش کی اپنی خصوصیات کو بڑی خوبصورتی کے ساتھ الگ کر کے ذہن نشین کرایا ہے۔

کتاب میں پانچواں عنوان "خمریات" ہے۔ میرے خیال میں آتش کی شاعری پر لکھتے ہوئے اس کو الگ سے عنوان بنانے کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ سچ ہے کہ آتش کے دونوں دواوین میں ایسے اشعار کی خاصی تعداد ملتی ہے جن کا تعلق خمریات اور متعلقاتِ شراب سے ہے اور یہ بھی سچ ہے کہ ان اشعار میں وہی بانکپن اور وہی مردانہ رندی پائی جاتی ہے جس کو ہم آتش کے سوا کسی دوسرے اُردو شاعر سے منسوب نہیں کر سکتے لیکن ان میں بیشتر اشعار ایسے ہیں جن کو پڑھ کر احساس ہوتا ہے کہ وہ اپنے دور میں اپنی شاعرانہ ساکھ قائم کرنے کے لئے کہے گئے ہیں۔ اُن کے خمریات کا بہت مختصر انتخاب یقیناً ایک انفرادی انداز رکھتا ہے جس کو شاعر کے عام تصورِ زندگی سے ساتھ ایک استعاری تعلق ہے لیکن ان کے خمریات کا بیشتر حصہ رسمی شاعری کی اچھی مثال ہے۔ آتش کی زندگی اور شاعری میں شراب کوئی اہم حیثیت نہیں رکھتی تھی اور اُن کے تصورِ حیات کے لئے شاید تشبیہ و استعارہ کے طور پر بھی شراب، ساغر اور جام و سبو کی ضرورت نہیں تھی۔ اعظمی نے اس کا الگ عنوان دیا ہے۔ اس کا ایک [illegible] پہلو ہے۔ اگر ہم یہ جانتا

چاہیں کہ آتش نے اردو اور فارسی شاعری کے اس قدیم موضوع کو کس طرح برتا ہے تو ہم کو اس باب سے یقیناً مدد ملے گی یہاں بھی انتخاب اشعار میں بڑے قرینے سے کام لیا گیا ہے۔

اس کے بعد تصوف سے متعلق باب ہے۔ یہی وہ عنوان ہے جہاں فارسی اور اردو شاعروں پر کچھ لکھنے یا کہتے ہوئے بڑی دقت اور قباحت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اردو اور فارسی کا شاید ہی کوئی شاعر ہو جس نے تصوف کے موضوع پر کچھ شعر نہ کہے ہوں اور جس کے کلام کے معتد بہ حصے کی صوفیانہ تاویل نہ کی جاسکتی ہو۔ نقادوں کے لئے ہماری شاعری کا یہ میلان بڑا خطرہ ہے۔ آتش نہ ان معنوں میں صوفی تھے جن معنوں میں لوگ یہ اصطلاح استعمال کرتے ہیں اور نہ ان کا کلام اس لحاظ سے صوفیانہ تھا جس لحاظ سے اقبال نے حافظ کے کلام کو ایک طرح کی افیون کہا ہے۔ آتش کے اشعار چاہے وہ بے ثباتی دنیا سے متعلق ہوں چاہے رندی و قلندری سے چاہے اخلاق و موعظت سے ہم کو سلاتے نہیں بیدار کرتے ہیں۔ ان کے ہاں کافی تعداد میں ایسے اشعار ملتے ہیں جن میں زندگی کی صحیح اور سچی معرفت ملتی ہے اور وہ ہم کو یہ تعلیم دیتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں کہ دنیا کے جاہلانہ رسوم و قیود سے بے نیاز ہو، دنیوی جاہ و حشمت اور دولت و ثروت کے آگے سر نہ جھکاؤ بلکہ ہمت مردانہ اور قلندرانہ بے نیازی کے ساتھ سب کو ہیچ سمجھو اور منہ پھیر کر گزر جاؤ۔ اعظمی نے آتش کے اس پہلو پر بڑی بصیرت کے ساتھ بحث کی ہے اور ان کی رائے اس باب میں بغیر کسی راسخ خیالات والا کو صدمہ پہنچائے ہوئے نئی اور صائب ہے۔ آتش کا تصوف دراصل الگ کوئی چیز نہیں ہے بلکہ ان کے سارے نظام فکر کا اندرونی ترکیبی جزو ہے اس لئے میرا خیال ہے کہ کتاب کے اس باب کو اس کے بعد والے باب کے ساتھ جذب کر دینا چاہئے تھا جس کا عنوان "مسائل حیات" ہے اور جو آخری باب ہے۔

غزل کے شاعر کا کوئی مستقل فکری نظام یا نظریۂ حیات متعین کرنا خطرے سے خالی نہیں ہے لیکن فارسی اور اردو دونوں میں چند غزل کے شاعر ایسے گزرے ہیں جو زندگی اور اس کے اسباب و نتائج اور حادثات و علامات کے بارے میں خاص زاویۂ نگاہ رکھتے ہیں اور جن کے اشعار سے ان کے زاویۂ نگاہ کا پتہ چلتا ہے آتش بھی ان چند شاعروں میں سے ہیں۔ فلسفی کا جو عام مفہوم ہے اس اعتبار سے تو آتش فلسفی یا مفکر نہیں تھے لیکن چونکہ ان کو زندگی کی معرفت حاصل تھی اس لئے وہ اس کے مظاہر و حوادث اس کے مختلف آثار چڑھاؤ اور اس کے آغاز و انجام کا بہت بالغ ادراک رکھتے تھے اور غیر شعوری طور پر ان کے اشعار میں اس ادراک کا اظہار ہو جاتا تھا۔

اعظمی نے آتش کے اس پہلو کو اچھی طرح جان پہچان کر اس پر روشنی ڈالی ہے۔ کتاب کی ابواب کے اعتبار سے جو تقسیم ہے وہ کچھ زیادہ قابل اعتراض بھی نہیں ہے۔ ان تمام عنوانات کے اشعار آتش کے کلام میں ملتے ہیں اور ان سے الگ الگ بحث کی جا سکتی ہے۔ بڑی بات یہ ہے کہ اعظمی نے آتش کی شخصیت اور ان کے شاعرانہ مزاج کا اصلی [illegible] لیا ہے اور اس کو بڑے حسن اسلوب کے ساتھ سمجھایا ہے۔ انہوں نے جو اشعار منتخب کئے ہیں وہ گویا کلام آتش کا نچوڑ ہیں ان کا انداز بیان بڑا متوازن اور سلجھا ہوا ہے۔ اگر ان کو کسی رائے سے اختلاف ہے تو اس میں کوئی شدت نہیں اور نہ اپنی رائے پیش کرتے ہوئے ان کو غلو کے ساتھ کوئی اصرار ہے یہ انداز بیان تنقید کے لئے نہایت ضروری ہے۔ ○○

ساقی کراچی جولائی ۱۹۶۲ء

ڈاکٹر وحید قریشی

مقدمۂ کلامِ آتش

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی نے کتاب کو ۹ ابواب پر تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں آتش کے حالاتِ زندگی ترتیب دیے گئے ہیں۔ دوسرے باب میں آتش کے بارے میں نقادوں نے جو کچھ کہا ہے اس کا خلاصہ درج کیا گیا ہے۔ تین ابواب میں آتش کے فن کا بھرپور جائزہ لیا گیا ہے۔ چھٹے باب میں آتش کی عشقیہ شاعری، ساتویں میں خمریات، آٹھویں میں تصوف اور نویں میں مسائلِ حیات کو موضوع بنایا گیا ہے ——— کتاب کا سب سے اچھا حصہ وہ ہے جو پہلے دو ابواب پر مشتمل ہے۔ ڈاکٹر اعظمی نے آتش پر یہ مونوگراف لکھ کر اردو ادب میں علمی کام کا اچھا نمونہ پیش کیا ہے۔ وہ اُن ترقی پسند نقادوں میں سے نہیں ہیں جو محض رسے رٹائے نظریوں کی مدد سے شاعر کو اپنے ذاتی عقائد کی تبلیغ کا ذریعہ بناتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کلام کا جائزہ لینے سے پہلے شاعر کے احوال اور اس کے حالاتِ زندگی کو بھی تفصیل سے دیکھتے ہیں۔ آتش کی زندگی، اس کی شخصیت اور اس کے فن کے درمیان ڈاکٹر صاحب کو ایک بنیادی ربط دکھائی دیتا ہے۔ انہوں نے آتش پر کتاب کی تالیف کے زمانے تک رسائل و کتب میں جو کچھ شائع ہوا تھا اس کو سامنے رکھ کر بعض بنیادی علمی مباحث تک رسائی حاصل کی ہے۔ اس لئے آتش کے حالاتِ زندگی اور شخصیت پر ڈاکٹر صاحب کی گرفت مضبوط ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان سے معمولی فروگذاشتیں بھی ہوئی ہیں۔ مثلاً صفحہ ۱۹ پر وہ آتش کی پیدائش کے سنہ کا تعین کرتے ہوئے فرماتے ہیں :

> آتش کی پیدائش فیض آباد میں ہوئی سنہ پیدائش کی صحیح تحقیق نہ ہو سکی۔ مصحفی نے ریاض الفصحا (تذکرۂ شعرائے ہندی) میں انکی عمر ۲۹ سال بتائی ہے۔ مصحفی نے یہ تذکرہ ۱۲۲۱ھ میں لکھنا شروع کیا تھا اور ۱۲۳۶ھ میں اس کی تکمیل کی۔ کیونکہ آتش کے حالات تذکرے کے شروع میں ہی درج ہیں اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ آتش ۱۱۹۲ھ میں پیدا ہوئے۔ خواجہ عبدالرؤف عشرت کے ایک بیان سے اس کی تصدیق ہوتی ہے...
>
> ..... اس اثنا میں نواب شجاع الدولہ بہادر نے اپنے فرزند نواب آصف الدولہ بہادر کی شادی نواب خان خاناں کی پوتی سے کی جس میں ۲۴ لاکھ روپیہ صرف ہوا۔ یہ واقعہ ۱۷۶۷ء/۱۱۸۸ھ کا ہے۔ یہ چہل پہل ہو رہی تھی کہ خواجہ علی بخش کے گھر میں خواجہ علی حیدر آتش پیدا ہوئے۔ یعنی نواب آصف الدولہ کی شادی سے تین سال بعد آتش کی پیدائش ہوئی۔ کیونکہ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے ہوئی تھی اس لئے اس کی چہل پہل اور رنگ رلیاں کئی سال تک باقی رہی ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں۔"

ڈاکٹر صاحب کا یہ بیان بعض اعتبارات سے محلِ نظر ہے۔ مثلاً ان کا یہ اصول کہ جس شاعر کا حال تذکرے کے شروع میں ہو اس کے حالات ابتدائی سال ہی میں لکھے گئے ہوں گے، کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح عشرت کا بیان جو انہوں نے اپنے قیاس کی تائید میں استعمال کیا ہے وہ بھی کچھ ایسا درست نہیں۔ عشرت نے آصف الدولہ کی شادی کا تذکرہ کیا ہے جو ۱۱۸۸ھ کا نہیں بلکہ ۱۱۸۵ھ کا واقعہ ہے۔ اس طرح ان کے مجوزہ

پیدائش اور آصف الدولہ کی شادی کے درمیان سات برس کا فرق ہو جاتا ہے۔ اس شادی کے بارے میں یہ خیال کرنا کہ اس کی چہل پہل اور رنگ رلیاں کئی سال تک باقی رہی ہونگی" حقیقت کے بالکل خلاف ہے۔ صفحہ ۲۰ پر ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں :-

"فیض آباد میں آتش کی شاعرانہ صلاحیت اور سپاہیانہ بانکپن نے نواب محمد تقی خاں ترقی کو متاثر کیا جو شعر اور سپہ گری دونوں کے دلدادہ تھے۔ آتش اور ناسخ دونوں نے نواب صاحب کی ملازمت اختیار کی۔ جب نواب صاحب غازی الدین حیدر کے عہد میں فیض آباد سے ترکِ سکونت کر کے لکھنؤ آ گئے تو آتش نے بھی لکھنؤ ہی کو اپنا مسکن بنایا۔۔ اسی زمانے میں آتش مصحفی کے شاگرد ہوئے۔"

نواب محمد تقی خاں ترقی کے حالات قیصر التواریخ (جلد اول صفحہ نمبر ۱۸۵، ۱۹۱، ۱۹۴)، تاریخ اودھ نجم الغنی (جلد چہارم صفحہ نمبر ۲۲۴) اور تاریخ فرح بخش میں پائے جاتے ہیں۔ تاریخ فرح بخش (انگریزی ترجمہ، جلد دوم صفحہ نمبر ۲۶۶، ۲۹۳، ۳۰۲) میں محمد تقی کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ ۱۲۳۰ھ میں فیض آباد چھوڑ کر لکھنؤ میں آ بسے۔ گویا ڈاکٹر صاحب کے نزدیک یہی وہ زمانہ ہے جب آتش مصحفی کے شاگرد ہوئے۔ لیکن صفحہ ۱۹ پر ڈاکٹر صاحب نے خود لکھا ہے کہ مصحفی نے آغازِ تذکرہ کے وقت ۱۲۲۱ھ کے لگ بھگ آتش کا ذکر کیا ہے۔ مصحفی نے آتش کے حال میں اسے اپنا شاگرد بیان کیا ہے۔ لیکن ۱۲۲۱ھ غازی الدین حیدر کا زمانہ نہیں ہے۔ غازی الدین حیدر کی تخت نشینی ۱۲۲۹ھ میں ہوئی۔ اس لئے ڈاکٹر صاحب کا پہلا استدلال غلط ہے۔ ہمارے خیال میں مصحفی نے آتش کا حال ۱۲۲۰ھ سے ۱۲۳۶ھ کے درمیان داخلِ تذکرہ کیا ہوگا۔ اگر ۱۲۲۳ھ ہی میں داخلِ تذکرہ کیا ہو تو پیدائش ۱۲۰۱ھ ہوئی ورنہ محتاط طریقِ بیان یہ ہے کہ آتش کی پیدائش ۱۲۰۱ھ اور ۱۲۰۷ھ کے مابین ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب صفحہ ۲۲ پر تحریر فرماتے ہیں :

"لکھنؤ پہنچنے کے کچھ ہی دنوں بعد نواب محمد تقی خاں ترقی کا انتقال ہو گیا۔"

"کچھ ہی دنوں بعد" کا ٹکڑا سمجھ میں نہیں آتا۔ محمد تقی خان ترقی ۱۲۳۰ھ میں لکھنؤ آ گئے اور ۱۲۳۴ھ تک یقیناً زندہ تھے (تفصیل کے لئے دیکھئے تاریخ اودھ جلد چہارم صفحہ ۱۲۵، ۱۴۶، ۱۶۷)۔

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی تنقید میں اپنا ایک منفرد اسلوب رکھتے ہیں۔ وہ فراق گورکھپوری کے تاثراتی انداز سے بھی متاثر ہیں۔ لیکن فراق صاحب کے مقابلے میں ایک زیادہ واضح نقطۂ نظر رکھتے ہیں۔ لکھنؤ کی شاعری اور کلامِ آتش پر اس کے اثرات کو انہوں نے بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے، فرماتے ہیں :

"آتش کے کلام میں زائد عناصر کا سبب لکھنؤ کا وہ شاعرانہ ماحول ہے جہاں دو غزلے، سہ غزلے لکھنا، ایک غزل میں تعداد کے اعتبار سے زیادہ شعر نکالنا، ایک قافیہ کو پانچ پانچ چھ چھ بار باندھنا اور اس سے نئے نئے مفہوم پیدا کرنا، لفظی رعایت اور مناسبت کا خیال رکھنا کمالِ فن سمجھا جاتا تھا۔ آتش بھی لکھنؤ میں استادی کے مرتبے پر فائز تھے۔ اور سینکڑوں شاگردوں کی رہنمائی اور اصلاح کے علاوہ انہیں اپنے حریف ناسخ کو نیچا دکھانے کی بھی پڑی رہتی تھی اس لئے اس طرز کی غزل گوئی سے انہیں مفر نہ تھا۔ لیکن آتش اور ناسخ دونوں کی شخصیتوں میں فرق تھا۔ ناسخ کے پاس صرف کرتب تھا، استادی اور زبان دانی کا دعویٰ تھا، لیکن آتش اس کے علاوہ بھی بہت کچھ تھے۔ اور ان کے حواسِ خمسہ پورے طور پر بیدار تھے۔ زندگی کے گوناگوں تجربات سے متاثر ہونا اور انہیں ہضم کر کے اپنی تخلیقات میں آب و رنگ دینا بھی انہیں آتا تھا۔ اس لئے جب بھی انہیں کے اندر کا شاعر بیدار رہتا تھا۔ اور جذبۂ تخلیق ان کا ساتھ دیتا تھا وہ حقیقی شاعری کا دامن نہیں چھوڑتے تھے۔ چونکہ ان کا بہترین کلام سچے انسانی جذبات و احساسات سے معمور ہے اس لئے وہ موثر ہے۔ لیکن فنی تکمیل میں وہ ناسخ کے بھی مرہونِ منت ہیں۔ یہ اس طور پر کہ اصلاحِ زبان کی تحریک

شاعر بھی

کے اثر سے اس وقت لکھنؤ کی زبان میں جو تراش
خراش ہو رہی تھی، جو سلاست و روانی جو چستی و صفائی
اور جو نکھار پیدا ہو رہا تھا اس سے آتش نے خاطر خواہ
فائدہ اٹھایا۔"

اس اقتباس کے پہلے حصہ میں جو کچھ بیان ہوا ہے اس سے
ادب کا ہر طالب علم واقف ہے لیکن دوسرے حصہ میں ڈاکٹر صاحب
نے اس کی کڑیاں آتش کی شخصیت اور اسکے فن کے ساتھ ملاکر
لکھنوی شاعری کے اثرات کو جس انوکھے زاویے سے پیش کیا ہے۔
وہ انکی تنقیدی بصیرت کو ظاہر کرتا ہے۔ عام نقاد تنقید میں بات
کو جہاں لاکر ختم کرتے ہیں ڈاکٹر صاحب اپنے استدلال کا آغاز
وہاں سے کرکے شاعر کی شخصیت کو سمجھنے کیلئے ایک نیا زاویہ
اختیار کرتے ہیں۔ یوں نیا زاویہ دریافت کرنا کوئی بڑی بات نہیں
ہے لیکن اگر وہ نیا زاویہ شاعر کے کلام کی مدد سے پوری
طرح سے ثابت بھی کر دیا جائے اور قاری کو یہ یقین ہو جائے کہ
جس نظر سے وہ شاعر کو پہلے دیکھ رہا تھا وہ کچھ ایسی صحیح نہیں تھی
اور جس زاویے سے اب دیکھ رہا ہے وہ شاعر کو سمجھنے کے لئے
بہترین نقطۂ آغاز ہے تو پھر ڈاکٹر صاحب کے نتائج کی صحت پر ایمان
لانا ہی پڑتا ہے۔ آتش کے فن کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب
لکھتے ہیں:

"فن شعر میں تشبیہ و استعارہ جہاں شعر کے حسن میں
اضافہ کرتا ہے وہاں کبھی کبھی فنکار کے عجز کو بھی ظاہر
کرتا ہے۔ تشبیہ و استعارہ زندگی کے ٹھوس مادی
حقائق اور تلخ ترین تجربات کو جمالیاتی پیکر میں ڈھالنے
کا موزوں ترین وسیلہ ہے۔ لیکن جب شاعر کے یہاں
یہی شے مقصود بالذات بن جائے تو اس کے
اشعار تاثیر سے دور جا پڑتے ہیں۔ اور شعر محض
بازی گری کا نمونہ ہوکر رہ جاتا ہے۔ آتش نے اپنے
تجربات و احساسات کے اظہار کیلئے جہاں بھی اس
وسیلے کی تلاش کی ہے وہاں اپنی شخصیت کے وجدانی
اور جمالیاتی عناصر کی مدد سے ان تشبیہات و استعارات
میں نئی جان ڈال دی ہے:" (ص ۔ ۹۹)

آتش کی عشقیہ شاعری کا تجزیہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب
نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ بھی خاص طور پر قابل ذکر ہیں:

"اگر ہم آتش کی عشقیہ شاعری کا مطالعہ کریں تو اس
کی انفرادیت کئی اعتبار سے ہمارے سامنے ابھر
کر آتی ہے۔ ایک طرف تو یہ شاعری بازاری محبت
اور ہوسناکی کی ڈگر سے علاحدہ ہے اور پرخلوص
محبت اور لطیف ترین انسانی تعلق کی بنیاد پر ہے
دوسری طرف یہ اس پرخلوص عشقیہ شاعری سے
ایک علاحدہ فضا رکھتی ہے جہاں صرف ناکامی و
نامرادی، یاس، حسرت اور ہڈیوں کو پگھلا دینے
والے غم سے واسطہ پڑتا ہے اور باوجود صداقت
شعری کے کبھی کبھی اس سے طبیعت دب جاتی ہے۔
کیونکہ یہ عشقیہ شاعری تمام کیفیات کو صرف ایک
مرکز پر لاکر کھڑا کر دیتی ہے اور وہ ہے عاشق کے دل
کا درد اور اس کا داخلی سوز و گداز۔ یہاں ہم کو
محبوب کے جمال سے کم از کم واسطہ پڑتا ہے اور نہ ہی
اس کی شخصیت کی رنگا رنگ جھلکیاں ہم دیکھ
سکتے ہیں اس لئے یہ شاعری بعض اوقات ہماری
بہت سی جذباتی اور جمالیاتی کیفیت کا ساتھ دینے
میں ناکام رہتی ہے اور ہمیں پورے طور پر تسکین
نہیں ہوتی۔ آتش نے لکھنؤ کے نشاطیہ ماحول
اپنی شخصیت کے کس بل کو آمیز کرکے اپنی عشقیہ
شاعری میں کچھ ایسی فضا دی ہے جہاں شعرائے دلی
کے برخلاف ہمیں محض نامرادی و یاس انگیزی سے
واسطہ نہیں پڑتا بلکہ اس میں محبوب بھی اپنی مکمل
جلوہ سامانیوں کے ساتھ آتا ہے۔ جہاں عاشق
اور معشوق دونوں اپنی نفسیات کے ساتھ ملتے
اور اس طور پر ایک بھرپور عشق کا احساس ہونے
لگتا ہے۔ آتش کی شاعری میں عاشق بھی بانکپن
رکھتا ہے اور محبوب بھی اس کی دلجوئی اور وفاداری
میں بہت کچھ اس کا ساتھ دیتا ہے۔ یہ محبوب

بازاری نہیں ہے بلکہ عصمت و حیا اور عفت و پاکیزگی کے ان تمام زیوروں سے آراستہ ہے جس کی محبت کی قسم کھائی جا سکتی ہے۔ یہ فضا آتش کی عشقیہ شاعری کو رنگا رنگ اور وسیع بناتی ہے۔ اور اس میں نشاط و سرمستی، لطافت و نزاکت، جاں سپاری و دلنوازی کے ایسے ایسے پہلو ہمارے سامنے پیش کرتی ہے جس سے ہم پر ایک خوشگوار صحت مند اثر ہوتا ہے۔" (ص ۱۰۹-۱۱۰)

اسی طرح آتش کی شاعری کے صوفیانہ پہلو کا جائزہ لیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے بڑے پتے کی بات کہی ہے۔ فرماتے ہیں:

"آتش کی صوفیانہ شاعری کو فارسی کی صوفیانہ شاعری کے اعلیٰ معیار سے دیکھا جائے تو شاید یہ حصہ اپنی شہرت اور تاثیر کے لحاظ سے کمزور نظر آئے گا۔ کیونکہ صوفیانہ شاعری میں کیفیت پیدا کرنے کے لئے جس سوز و گداز، سپردگی و محویت اور رقیق القلبی کی ضرورت ہے وہ آتش کی شخصیت اور مزاج کا عنصر نہیں ہے۔ لیکن جب ہم لکھنؤ کے تاریخی پس منظر میں اس کا جائزہ لیتے ہیں تو اس کی قدر و قیمت بہت بڑھ جاتی ہے۔ آتش نے اپنی افتادِ طبع اور رجائی نقطۂ نظر کی بنا پر تصوف کے بعض مروجہ نظریات کو اس زاویے سے استعمال کیا کہ اس سے مثبت نتائج نکل آئے ہیں۔ اور بجائے یاسیت و قنوطیت یا زندگی سے گریز کے ایک طرح کی قوت نمو ملتی ہے۔"

(ص ۱۲۴-۱۴۴)

ان اقتباسات سے تنقید میں ڈاکٹر صاحب کے عام رجحانات کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ نہ ماحول کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے پیشہ ور ترقی پسندوں کی طرح اصل شاعر کو نظرانداز کر دیتے ہیں، نہ تاثراتی نقادوں کی طرح انفرادی خصوصیات پر زور دیکر دنیا بھر دریافت کرتے ہیں۔ شاعر کے کلام کے مطالعے سے انہوں نے بعض بنیادی رجحانات شاعر سبھی

دریافت کئے ہیں اور انہیں شاعر کے ماحول اور اسکی شخصیت کے پس منظر میں رکھ کر دیکھا ہے۔ اردو شاعروں کا اس نوعیت کا مطالعہ ابھی ہمارے یہاں رواج پذیر نہیں ہوا ہے۔ اردو ادب کو یا تو ایسے نقاد ملے ہیں جو محض تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات نکالنے کے ماہر تھے یا پھر ایسے نقادوں سے پالا پڑا جو اردو شاعری کے پس منظر سے کچھ واقفیت نہیں رکھتے، محض اٹکل اور اندازے سے تنقید کرتے ہیں۔ اعظمی ان چند نقادوں میں سے ہیں جن پر ان میں سے کوئی لیبل بھی نہیں چپکایا جا سکتا۔ وہ تنقیدی بصیرت بھی رکھتے ہیں، قدیم ادب پہ انہیں نگاہ بھی ہے اور اس ماحول کو بھی سمجھتے ہیں جس میں ہمارے شاعر زندگی بسر کرتے تھے۔ انہیں موازنے کا وہ شوق بھی نہیں ہے جو غالب کو گوئٹے اور نظیر اکبر آبادی کو شیکسپیئر سے ٹکرا دیتا ہے۔ اس لئے ان کے نتائج بڑی حد تک صحیح ہیں۔ تنقیدی اصولوں کے بارے میں بھی ان کا ذہن بہت سے نقادوں کے مقابلے میں صاف ہے۔ "مقدمہ کلام آتش" اعظمی صاحب کی کتابوں میں ایک اہم کتاب ہے اور اردو ادب کے طالب علموں کو اس سے کلامِ آتش کو سمجھنے میں بڑی مدد ملے گی۔

ڈاکٹر [illegible]

مقدمۂ کلامِ آتشؔ

ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی کی تازہ تصنیف "مقدمۂ کلامِ آتش" اس لحاظ سے قطعاً منفرد ہے کہ اس میں مصنف نے آتش کے کلام کا جائزہ لیتے ہوئے اس کی شخصیت کے خد و خال دریافت کرنے کی کوشش کی ہے اور "انفرادیت" کی اُس چھاپ کو الگ کر کے دکھایا ہے جو شاعر کے کلام پر ثبت ہے۔ اردو تنقید میں ایسی کوششیں اگر نایاب نہیں تو کم یاب ضرور ہیں جن کا مدعا شاعر کی انفرادیت کو واضح کرنا اور شاعر کے کلام میں اس کی شخصیت کا پَرتو دکھانا ہے۔ ڈاکٹر اعظمی نے "مقدمۂ کلامِ آتش" میں تنقید کی عام روش سے ہٹ کر اردو شاعری میں آتش کا مقام متعین کرنے کی جو کوشش کی ہے نہ صرف اس لحاظ سے قابلِ قدر ہے کہ آتش کو "دریافت" کرنے کی پہلی بھرپور کوشش ہے، بلکہ اس لئے بھی کہ ڈاکٹر صاحب نے دریافت کے اس عمل میں ایک اجتہادی اندازِ نظر کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اُن کی یہ تصنیف اردو تنقید کے انبار سے واضح طور پر اُبھرتی ہوئی دکھائی دیتی ہے۔

"پیشِ لفظ" اور "احوال واقعی" کے علاوہ زیرِ نظر کتاب سات واضح حصوں میں منقسم ہے اور اس تقسیم میں مصنف نے دقتِ نظر کا ثبوت بہم پہنچایا ہے مثلاً شروع کے ایک باب کا عنوان ہے ——— "تذکرہ" اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے آتش کے حالاتِ زندگی بڑی محنت اور جستجو سے اکٹھے کئے ہیں اور آتش بحیثیت انسان واضح طور پر اُبھر کر ہمارے سامنے آ گئے ہیں۔ یہ باب اس لحاظ سے اہم ہے کہ اس میں آتش کی شخصیت کے خد و خال کی نقاب کشائی ہوئی ہے۔ چنانچہ بعد کے ابواب میں جب مصنف شاعر کے کلام پر اس کی شخصیت کی چھاپ دکھاتا ہے تو قاری کے لئے نقاد کے مطالب کو گرفت میں لینا بہت آسان ہو جاتا ہے۔ اس سے اگلے باب کا عنوان ہے ———

"چھان بین"۔ اس باب میں اعظمی صاحب نے آتش کے بارے میں اُن تمام تنقیدی آرا کو یکجا کر دیا ہے، جو اب تک آتش کے کلام اور شخصیت کے ضمن میں قائم کی گئی تھیں۔ یہ باب نہ صرف اس بات کا ثبوت ہے کہ مصنف نے آتش کے کلام کا مطالعہ کرنے اور اپنے نتائج اخذ کرنے سے پہلے اس سارے لٹریچر کا بنظرِ غائر مطالعہ کیا ہے جو آتش کے سلسلے میں معرضِ وجود میں آیا ہے، بلکہ یہ باب اُس طریقِ کار پر بھی روشنی ڈالتا ہے جسے ڈاکٹر صاحب نے اپنی اس تصنیف میں رائج کیا ہے، اور جس کے تحت انھوں نے اپنی جستجو اور تحقیق کے عمل کو دوسروں کی آرا سے بوجھل نہیں ہونے دیا۔ پھر اگرچہ یہ باب بظاہر ایک طالب علمانہ انداز کا غماز ہے کیونکہ یہ زیادہ تر دوسروں کی آرا پر مشتمل ہے تاہم اس کا فائدہ یہ ہے کہ قاری کو اُن تمام نظریات کا علم ہو جاتا ہے جو ڈاکٹر اعظمی کے نتائج سے پہلے قائم ہوئے تھے اور وہ آسانی کے ساتھ اُس تحقیقی کام کی قدر و قیمت کا اندازہ کر سکتا ہے جو ان نظریات سے ہٹ کر وجود میں آیا ہے اور جو دراصل ڈاکٹر صاحب کا ایک تخلیقی کارنامہ ہے۔

کتاب کا تیسرا باب آتش کے فن سے متعلق ہے۔ اس باب میں ڈاکٹر صاحب نے آتش کی شاعری کے ضمن میں اہم ترین اور مرکزی نکتہ یہ پیش کیا ہے کہ آتش کے کلام میں ایک اندازِ سرکشی ہے۔ مصنف کے الفاظ میں ——— "یہ اندازِ سرکشی اردو شعرا میں سب سے پہلے آتش کو نصیب ہوا۔ یہ نعرہ، یہ کس بل، یہ آن، یہ کج کلہی اور یہ شجاعت اور مردانگی نہ تو محض ایک شاعر کی آواز ہے نہ رند کی نہ صوفی کی ——— یہ ایک البیلے سپاہی کی آواز ہے۔" آتش کی شاعری کے بنیادی مزاج کے بارے میں ڈاکٹر اعظمی سے قبل کسی نے بھی یہ نکتہ اتنی وضاحت سے پیش نہیں کیا تھا۔ اس نکتے کی صداقت اور اہمیت کچھ اور واضح ہوتی ہے، جب ہم آتش کے حالاتِ زندگی کو سامنے رکھ کر سوچتے ہیں۔ آتش کی داستانِ حیات ایک سپاہی کی کہانی ہے وہ بڑھاپے تک تلوار باندھ کر سپاہیانہ بانکپن کا مظاہرہ کرتے رہے تھے۔ یہی سپاہیانہ روش ان کے کلام میں سرکشی، شجاعت اور مردانگی کے روپ میں ظاہر ہوئی اور اس نے کلام کو ایک انوکھا بانکپن عطا کر دیا۔ مصنف نے آتش کے

شاعر۔ بمبئی

کی اس شخصیت کو اس کے کلام میں تلاش کیا ہے۔ اسی باب میں ڈاکٹر صاحب نے آتش کے بارے میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ وہ اردو غزل کے پہلے شاعر ہیں جن کے ہاں زندگی کے بارے میں ایک اثباتی نقطۂ نظر موجود ہے۔ اس بات کو انھوں نے مثالوں سے پوری طرح ثابت کیا ہے۔ ان کا یہ خیال کہ آتش سکوت و جمود کے خلاف صف آرا تھے' بالکل صحیح ہے۔ چنانچہ ان کے کلام میں حرکت' تڑپ اور تلاش کی فراوانی ہے۔ یہاں تک کہ بقول مصنف وہ غم میں بھی کوئی نہ کوئی متحرک پہلو تلاش کر لیتے ہیں۔ یہ تمام باتیں ان کی اپنی زندگی اور شخصیت کے بعض بنیادی رجحانات کا نتیجہ ہیں اور اس سپاہی کے وجود پر دلالت کرتی ہیں جو شاعر کے جسم بلکہ روح میں چھپا بیٹھا تھا۔

چوتھے باب کا عنوان ہے ——— "عشقیہ شاعری"! اس باب میں مصنف نے آتش کی عشقیہ شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ آتش کی عشقیہ شاعری "ایک طرف بازاری محبت اور ہوسناکی کی ڈگر سے علیحدہ سچی اور پُرخلوص محبت اور لطیف ترین انسانی تعلق کی بنیاد پر ہے' دوسری طرف یہ اس پُرخلوص عشقیہ شاعری سے ایک علیحدہ فضا رکھتی ہے' جہاں صرف ناکامی و نامرادی' یاس و حسرت اور ہڈیوں کو پگھلا دینے والے غم سے واسطہ پڑتا ہے۔" ذرا آگے چل کر لکھتے ہیں "عام طور پر ہماری شاعری میں عشق و محبت کو ایک روگ اور بیماری بتایا گیا ہے اور اس سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے۔ لیکن آتش اسے صحت مندی کی علامت سمجھتے ہیں" ——— اور یہاں بھی آتش کی سپاہیانہ روش رنگ لائی ہے اس طور کہ اس کی محبت میں سچائی اور خلوص کے علاوہ صحت مندی اور خودداری کے شواہد بھی ملتے ہیں اور اس جوانمرد اور صحت مند سپاہی کی نشاندہی کرتے ہیں جو آتش کے سراپا میں چھپا بیٹھا تھا۔

کتاب کا پانچواں باب آتش کے کلام میں خمریات کے عناصر سے متعلق ہے' مصنف کا خیال ہے کہ اس ضمن میں بھی آتش کا رنگ اردو شعراء سے بالکل مختلف ہے اور یہاں بھی آتش کی انفرادیت کی چھاپ بالکل واضح ہے ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی لکھتے ہیں۔ "خمریاتی شاعری سے صحیح معنوں میں وہی شخص عہدہ برآ ہو سکتا ہے جو محض شراب کا ذکر کرنے کی بجائے اپنی شخصیت میں رندانہ کیفیت اور بے پناہ سرمستی رکھتا ہو۔ آتش کی شاعری کا لب و لہجہ عام طور پر بھی بانکپن اور رندی کا ہے' اور سپردگی اور نیازمندی کی بجائے اس کے یہاں ایک طرح کی سرکشی اور توانائی ملتی ہے اور چونکہ زندگی کے بارے میں ان کا نقطۂ نظر بڑا امید اور رجائی ہے' اس لئے اس کی شاعری کا

شاعر بمبئی

یہ عقدہ بے حد مستانہ ہے: ڈاکٹر اعظمی کا یہ نظریہ بے حد خیال انگیز اور قابل قدر ہے اور سپاہی کے کردار کے اس پہلو کو اجاگر کرتا ہے جو تصنع اور ریاکاری سے دور خلوص و صداقت اور ذہنی اور جسمانی صحت کا پہلو ہے، زندگی سے مسرت کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینے کی روش ایک مسلسل قنوطیت کی پیداوار بھی ہو سکتی ہے اور ایک صحت مند جسم اور روح کی مظہر بھی۔ آتش کے یہاں تحصیل مسرت کی روش ایک صحت مند میلان کی غماز ہے اور سپاہی شاعر کی ذہنی صحت کا ثبوت ہے' ڈاکٹر صاحب نے یہ نکتہ پیش کر کے آتش کے کلام کو سمجھنے کے بہت سے راستے منور کر دیئے ہیں۔

کتاب کے آخری اہم باب میں آتش کے ہاں تصوف کے عناصر سے بحث کی گئی ہے' مصنف کا خیال ہے کہ صوفیانہ شاعری میں کیفیت پیدا کرنے کے لئے جس سوز و گداز' سپردگی' محویت اور رقیق القلبی کی ضرورت ہوتی ہے آتش کے یہاں مفقود ہے۔ اس لئے ان کی صوفیانہ شاعری کا پہلو ذرا کمزور ہی نظر آتا ہے۔ تاہم دوسری طرف ایک سپاہی نقطۂ نظر کے تحت آتش نے تصوف کے بعض مروجہ نظریات سے مثبت نتائج اخذ کئے ہیں۔ بقول مصنف ان کے یہاں "بجائے یاسیت و قنوطیت یا زندگی سے گریز کے ایک طرح کی قوت ملتی ہے۔"

آگے چل کر لکھتے ہیں۔ "آتش نے فقیری اور درویشی اس لئے نہیں اختیار کی تھی کہ ان کے قوائے عمل شل ہو گئے تھے بلکہ اس راہ کو اختیار کرنے میں ان کی سرکشی کو دخل ہے۔ چنانچہ یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ تصوف کے میدان میں بھی ان کی سپاہیانہ روش نے ایک انوکھے ردِ عمل کو تحریک دی' اور ان کے لہجے میں عزم اور ان کی آواز میں "گاڑھاپن" پیدا کر دیا۔ OO

(ادبی دنیا۔ کراچی پاکستان)

بقیہ کاغذی پیرہن صفحہ ۱۷۵

جان سکوں کہ اُردو کی بلند شاعری میں وہ کہاں کھڑے ہیں۔

اسی جذبے سے میں یہ کہتا ہوں کہ اعظمی کا جگر کاوی کو کاغذی پیراہن تک محدود نہیں رہنا چاہئیے۔ ایسا ان کے جذباتی نقوش کو لعد کو فریادی بننے کی مرقد ہے۔ OO

ماہنامہ "نئی قدریں" شاعر نمبر ۱۹۵۶ء

ڈاکٹر سید عبداللہ

کاغذی پیرہن

خلیل اعظمی کا کاغذی پیرہن تو خیر سال کر اب آیا ہے کہ میں تو اس سے بہت پہلے اعظمی کو ان کی چند ایسی نظموں اور غزلوں کی وجہ سے جانتا تھا جن کی دو باتیں مجھے اکثر متوجہ کرتی رہیں۔ اول میر کے انداز؛ دوم بعض نظموں کی نئی نئی اجنبی سی مگر متوجہ کر دینے والی آواز جو یہ بتلاتی تھی کہ یہ کوئی ایسا شاعر نمودار ہو رہا ہے جو کچھ نئی نئی باتیں کہنا چاہتا ہے اور اس کے لئے نئے انداز تلاش کر رہا ہے یہ انداز ایسا تھا جو نئے دور کے مشہور شاعروں کے انداز سے کچھ کچھ الگ الگ سا معلوم ہوتا تھا۔ بعض جگہ آواز بھیٹی بھیٹی تھی۔ مگر اس میں بھی کچھ لہریں ایسی معلوم ہوتی تھیں جو جذبے کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی نظر آتی تھیں۔

اعظمی کی وہ نظم جس نے مجھے خاص طور سے متوجہ کیا وہ تھی جس کا عنوان ہے۔ کنج محبت؛ میں اس نظم کے آخری شعر کو مدتوں گنگناتا رہا۔ بلکہ جذباتی حوادث کے پرشور لمحات میں اب تک گنگناتا ہوں۔

جو کنج محبت میں پیڑوں کی چھنتی ہوئی چاندنی کی زباں سے ہے کہنا
کہو آج کی رات کیسے گذاری؟ کوئی آج کی رات ملنے بھی آیا!

تنقید کی معلوم نہیں کیا رائے ہے۔ مگر میرے تاثر کو یہ شعر ہمیشہ اچھا لگا۔ جانے اس شعر میں کس کی آواز سنائی دیتی ہے کہ میرے دل کے کان اس کو سن کر بے اختیار متوجہ ہو جاتے ہیں۔ بہر صورت یہی وہ نظم ہے جس نے اعظمی کے مضامین کے بعد خاص طور سے مجھے ان کے شعر سے شناس کیا اور میں نے انہیں اپنے شاعروں کی فہرست میں شامل کر لیا۔

یہ تو خیر ہوئی بات میرے تاثر کی؛ مگر نقد و نظر کا مطالبہ یہ ہے کہ کنج محبت کی خلوتوں میں چھپی ہوئی لطافتوں کی کچھ تشریح بھی ضرور ہے ورنہ یہ تمام حکایت ایک ذاتی تاثر کی حد پر پہونچ کر ختم ہو جائے گی۔

نظم کے متعلق میرا اپنا نظریہ یہ ہے کہ اس میں بنیادی طور پر تین چار چیزیں ضرور ہونی چاہئیں۔ اول یہ کہ بہ حیثیت مجموعی نظم میں سے کوئی واحد مرکزی تجربہ یا جذبہ پڑھنے والا ہر شعر سے یا مصرعہ سے الگ الگ لطف نہ بھی اٹھا سکے تب بھی پوری نظم پڑھنے کے بعد تجربے کی شکل اس کے سامنے پوری طرح آ جائے دوسری چیز نظم میں یا غزل کے برعکس ایسی امیجری ہے جو تجربے کی فضا کو زیادہ سے زیادہ محسوس پیکروں کے ذریعے خیال کیلئے متشکل کر سکے جو نظم پیکر محسوس نہیں ابھارتی اور جذبے کی مجرد صورتوں کو ابھارتی رہتی ہے یا ذہنیات تک اپنے آپ کو محدود رکھتی ہے۔ یہ خود کلامی کے استدلالی تار و پود تک منحصر رہتی ہے وہ موثر ثابت نہیں ہوتی۔

از بسکہ نظم غزل یا ایمائی شاعری سے مختلف حدود و فرائض رکھتی ہے اس سے ایما اور اشارات کی بجائے نظم میں ماحول کے جزئیات کا مرقع ضرور آنا چاہئے ورنہ تجربہ و تجرد خیال کی قیود میں بند ہو کر رہ جاتا ہے۔

کنج محبت ایک مقفی نظم ہے اس میں بعض خاص لمحات سے پیدا شدہ تاثرات کی تصویر کشی کی گئی ہے اور محسوس پیکروں سے ایسی فضا تیار کی گئی ہے جس نے شاعر کے تجربے کو زندہ پائندہ بنا دیا ہے اور ایک ایسی دنیا سے قاری کو روشناس کر دیا ہے جو قاری کے ذاتی تجربے سے متعلق نہ ہونے کے باوجود گویا اس کا ذاتی تجربہ ہی بن گیا ہے۔

یہ سنسان راتیں۔ یہ ٹھنڈی ہوائیں۔ ان میں چپ چاپ پیڑ —— یہ تم کے سائے —— ان میں کسی کی یادوں کی پھیلی ہوئی خوشبو —— ان میں محبت کی کسک اور محبت کے جادو ——۔

اس تمہید کی باتیں خیالی پیکروں کا ایک سلسلہ ہے جو ہر ایک شعر میں ایک نیا تماشا چشم خیال کو دکھاتا جاتا ہے۔ اس نظم میں شاعر کے تجربے کی گہرائی ہے مگر اسی قدر اس کو امیجری کی رنگین صنعت گری بھی جلوے بکھیر رہی ہے —— اور آخر میں ان ہی پر اسرار فضاؤں سے ایک ایسی آواز بھی اٹھتی ہے جو شوق کی بیکراں وسعتوں میں یوں پھیل جاتی ہے گویا یہ ہر جذبے والے کی ترجمان ہے!

اعظمی کی نظم "نذرانے" ــ "اور میرے اُداس دل نہ رو" ۔ "آدمیوں کے میلے اور آپ بیتی" بھی شاعر کے گہرے احساساتِ کرب کی آئینہ دار ہے مگر ان نظموں میں ذہنی استدلال اور خودکلامی کا رنگ پیدا ہو گیا ہے جو ڈرامائی نظموں میں کرداروں کے نقوشِ باطنی تیار کرنے کیلئے مفید ہوتا ہے۔ مگر شخصی تجربات کی عکاسی میں نظم کو بے مزہ بنا دیتا ہے اور فضا پھیکی پڑ جاتی ہے۔

میں شروع میں کہہ چکا ہوں کہ اعظمی کی بعض نظموں میں شاعر کی "آواز" بیٹھی ہے شاعر اپنے تجربے سے دست و گریباں ہے۔ ذہنی احساس کی محض بیانیہ نگاری کر رہا ہے ــ خیال کا بے ربط یا غیر مربوط سلسلہ ہے جو ہوا کی لہروں پر کبھی نظم و ربط سے کبھی بے نظم و نظام ہر سو تیرتا نظر آتا ہے ــ ان نظموں میں شعری مُرصّع جلوہ گر نہیں ہوتی ــ منظوم بیانیہ نگاری معلوم ہوتی ہے۔ یہ نظمی کہانی ٹہلو کر شاعر ہے اس کی مسافرت کی وجہ سے ہمدردی ضرور پیدا ہوتی ہے مگر شاعر کے تجربے میں قاری بے اختیار ہو کر شریک ہو جانا نہیں چاہتا۔ "اپنی تصویر سے"۔ "کاغذ کا پیرہن اور نندری کو پڑھ کر کچھ ایسا لگتا ہے کہ شاعر نے ان کو نظم کرنے سے پہلے کوئی سخت کربناک جذباتی حادثہ دیکھا ہے۔ ان کی تکلیف ان نظموں کے رخانہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ ان لفظوں کی پوری آگ قاری تک نہیں پہنچی۔ قاری کے نزدیک احساس کے یہ دعوے بے دلیل ہی رہ جاتے ہیں کیونکہ آگ کے شعلوں کی پکار نہ زیادہ ہے مگر قاری کو معمولی دھوئیں سے زیادہ کچھ نظر نہیں آتا۔

ان نظموں میں اعظمی کی نارسائی کے اسباب پر میں نے بہت غور کیا۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے کہ اعظمی اپنے تجربات کے اظہار میں بعض اوقات عجلت سے کام لیتے ہیں۔ ہر تجربہ نہ اظہار کا متقاضی ہوتا ہے نہ اظہار کا متحمل ہوتا ہے۔ تجربات بھی بعض اور چیزوں کی طرح پختگی چاہتے ہیں۔ وہ جو ورڈزورتھ نے CONSIDE-RED IN TRANQUILLITY کی شرط لگائی تھی۔ وہ بے معنی نہ تھی ــ تجربہ جب تک صبر و تحمل اور انتظار و سکون کی بھٹی میں پختہ نہ ہو جائے اس میں آب و تاب اور رنگ و روغن نمودار نہیں ہوتا ــ تجربات کی بیانیہ نگاری شاعری کا ایک حصہ ہے۔ پوری شاعری تجربات کی پختگی اور تحلیل کا نام ہے جو دل کی گہرائیوں میں مدتوں تک تخلیق کیلئے خیال کو آمادہ اور تیار کرتی رہتی ہے۔ اسی لئے اعظمی کے تجربات ان نظموں میں جذبے سے پیدا شدہ ذہنی استدلالات کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے۔ اس کی عمدہ مثال "نیا جنم" ہے۔

مگر ایک خاص بات ان نظموں میں یہ بھی ہے کہ شاعر کسی نئے دیس کی فضاؤں میں پرواز کرنے کے لئے گویا پر پھڑپھڑا رہا ہے ــ وہ نئے راستوں اور نئے اصولوں کی تلاش ... ہے ان کی اس آویزش پر ... دل ... رہا ہے۔ شاعر کبھی

اس کے خاص خلوص کے لئے شاعری کی روح بھی اس کی طرف کھنچتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اور یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ شاعر شاعری کے نئے پھول اگانے کیلئے کچھ ایسے خاکے تیار کر رہا ہے جن میں نئے شعر کے پھول چمن در چمن اگیں گے۔

اعظمی کی شاعری کا دوسرا رُخ میر کے دیوان کی طرف ہے ـ! غزل یا نظم؟ کیونکہ میں خواب کچھ اس خیال کا ہوتا جاتا ہوں کہ میر کا تجربۂ شاعری کچھ ایسا تھا کہ اسکی غزل نظم سے اور نظم غزل سے ہم رشتہ معلوم ہوتی ہے۔ اس دور میں میر کے تتبع کی جتنی کوششیں ہو رہی ہیں ان میں شاید ابن انشا اور اعظمی ہی وہ دو آدمی ہیں جو میر کے لہجے کا کچھ حصہ اپنے اشعار میں جذب کر سکے ہیں اور بعض اوقات تو مجھے یہ خیال آتا ہے کہ یہ ابن انشا اور یہ خلیل اعظمی ہر طرف ہاتھ پاؤں مار کر ـ اور محلّے نئے شاعر بننے کی سعی لاحاصل کر کے اپنا بڑا نقصان کر رہے ہیں۔ یہ دونوں صاحب سیدھے میر ہی کیوں نہیں بن جاتے۔ کیونکہ ان کے مزاج میں میر کی طبیعت کی کچھ خصلتیں مجھے ضرور نظر آتی ہیں ــ

خوار ہوئے بے حال ہوئے بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق تھا گر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے

تجھ سے کم کم واقف تھے تو روز کا ملنا ہوتا تھا
تجھ کو جانا تجھ کو چاہا وقفِ شب دیجور ہوئے

گلی گلی کی ٹھوکر کھائی کب سے خوار و پریشاں ہیں
یاں اپنا ہی ہوش نہیں کس کو چاہ کے ارماں ہیں

یہ ساری غزل میر کے عکس کی حامل ہے مگر معاملہ پھر وہی آ پہنچتا ہے۔ یعنی یہ کہ میر کا تلمذ یہ ہے جو دستبرد بلکہ یلغار سی ہو رہی ہے اس کے لئے میر کا ساحل بھی تو چاہیے۔ محبت تو ہر معاملہ میں بری ہے اور شعری تجربے میں تو عجلت بڑی ہی خطرناک شے ہے اعظمی دھو کے ... نقادوں میں شامل ہیں (اگرچہ ان کی اپنی رائے یہ ہے۔ کوئی تنقید کے آدمی نہیں شاعری کے آدمی ہیں) سو اگر ان کی رائے ہی ہے تو میاں کو مشورہ یہ ہے کہ وہ بس میر کے ہو رہیں۔ کیونکہ یہ راستہ وہ ہے جو میرے اپنے خیال میں ان کی اصل منزل کی رہنمائی کرتا ہے اور یہ ان کی نظم نگاری کے لئے مفید بھی ہے اصلاح کے عیوب کو ڈھانپنے والا بھی۔!

میں نے اس مطالعہ میں مروجہ تنقیدی رنگ دانستہ اختیار نہیں کیا یعنی ان کے شخصی تجربات اور سماجی محرکات کی بحث عرفانِ نفس اور احتسابِ نفس ہمہ گیر انسانی اقدار ـ یہ اور وہ ـ غرض اونچی اونچی باتیں ـ ان سے اس سے احتراز کیا ہے کیونکہ مجھے اعظمی کی شاعری کی طرح اس کی ذات ... بھی دلچسپی ہے اس لئے میں نے اس تبصرہ میں بے تکلف سا رنگ اختیار کیا ہے۔ میں نے ان کی شاعری کو اردو کی اعلیٰ شاعری کے نقطۂ نظر سے ناپنے کی کوشش کی ہے تاکہ میں یہ

(باقی صفحہ ۲۷۴ پر دیکھئے)

ممتاز حسین

کاغذی پیرہن

اگر شاعر واقعی تلمیذ الرحمٰن ہے تو اس کی کتاب یقیناً ایک نیم مقدس صحیفہ ہے چنانچہ یہی سبب ہے کہ جب کسی شاعر کا دیوان یا مجموعۂ کلام چھپتا ہے تو اس کے خریدار کم ہوتے ہیں لیکن عزت و حرمت بہت کی جاتی ہے۔ ایک ایسا ہی نیم مقدس صحیفہ خلیل الرحمٰن اعظمی کا آیا ہے اُس کا نام "کاغذی پیرہن" یا "نقشِ فریادی" ہے اسے آپ ملفوظ مکتوب بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ یہ عنوان بے معنی نہیں ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ ہندوستان میں میرے ایک دوست نے فیض کی مقبولیت کا سبب راولپنڈی کیس کو ٹھہرایا ہے۔ اُن کے لئے یہ کلام خاص معنی رکھتا ہے۔ مگر "کاغذی پیرہن" کا شاعر راولپنڈی کیس والے فیض سے اتنا متاثر نہیں ہے جتنا کہ "نقشِ فریادی" کے فیض سے ہے۔

کیا کہوں تجھ کو کہاں لائی مری عمرِ رواں
آنکھ کھولی تو ہر اک سمت اندھیرے کا سماں
رنگنی اور نگھتی مغموم سی اک راہ گزار
گردِ آلام میں کھویا ہوا منزل کا نشاں
گیسوئے شام سے لپٹی ہوئی غم کی زنجیر
سینۂ شب سے نکلتی ہوئی فریاد و فغاں
ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہواؤں میں وہ غربت کی تھکن
در و دیوار پہ تاریک سے سائے لرزاں
کتنی کھوئی ہوئی بیمار فسردہ آنکھیں
ٹمٹماتے سے دیئے چار طرف نوحہ کناں
مضمحل جیسے مصائب کی گرانباری سے
دلِ مجروح سے اُٹھتا ہوا غمناک دھواں
یہی تاریکیٔ غم تو مرا گہوارہ ہے
میں اسی کوکھ میں تھا نورِ سحر کی مانند
ہر طرف سوگ میں ڈوبا ہوا میرا ماحول
میرا اُجڑا ہوا گھر میر کے گھر کے مانند

اور تاثر پذیری کا یہ سلسلہ فیض کے دارورسن کے موسم تک قائم ہے۔

مرے سازِ غم پہ چھیڑو نہ یہ نغمۂ بہاراں

اس زمین کو فیض ہی نے بلند کیا ہے، لیکن یہ تو خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کا ایک رنگ ہوا جس سے اپنے دور کے ایک اہم ترین شاعر کی نقالی نہیں بلکہ تحسین مراد ہے۔ خلیل الرحمٰن کی شاعری میں کچھ اور رنگوں کی بھی آمیزش ہے ان میں میر زیادہ اور فراق کم کم نظر آتے ہیں۔ اس زمانے میں میر کے تغزل کا احیاء غزل کے احیاء اور لب و لہجہ پرسوز و گداز کی اہمیت کو ماننے کے سبب سے پیدا ہوا، ایسی صورت میں میر ایک ہم عصر رجحان بن گئے ہیں بشرطیکہ ہم چند حروف و الفاظ سے اپنی میریت کو ظاہر کرنا نہ چاہیں۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے یہاں میر کی تقلید میریت ظاہر کرنے کے لئے نہیں بلکہ ایک ہمعصر رجحان کی صورت میں نمودار ہوئی ہے۔

خوار ہوئے بدنام ہوئے بے حال ہوئے رنجور ہوئے
تجھ سے عشق جتا کر ہم بھی نگر نگر مشہور ہوئے
ترکِ محبت بھی کر دیکھیں حال ہمارا کیا ہوگا
اس کی ایک جدائی پر تو رگ رگ میں ناسور ہوئے!

مگر جس حد تک کہ وہ کلاسیکی ادب کے مزاج سے غیر متعلق ہیں اور دورِ حاضر کے سینہ کی ایک نوا ہیں ان کی میریت بھی بارِ خاطر گذرنے لگتی ہے بات یہ ہے کہ میر کے بُت کو وہ پُوجے جو میر کی زبان کی نزاکت اور مزاج سے واقف ہو اور جسے اس سے کم آگہی ہو اُسے میر کو بھولے ہی رکھنا چاہیئے۔

کب تک آخر اس کی زلفوں سے ملاؤں سلسلہ
اے شبِ ہجراں تری بڑھتی ہوئی لمبائیاں

قطع نظر "لمبائیاں" کے یہ بتایئے کہ سلسلہ کا حرفِ ربط کہاں گیا۔ اس غزل کا ایک دوسرا شعر ہے۔

دل کی ہر ہر چوٹ اُبھری ہے نئے انداز سے
کس کی یاد آئی ہے یہ کیسی چلیں پُروائیاں

 پہلے مصرعہ میں "ہر ہر" کی تکرار صوتی اعتبار سے کوئی حسن پیدا نہیں کر پائی ہے۔

اگر بیریت صرف لفظوں کی تکرار ہی کا نام ہے تو پھر تو اُسے کہیں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے جیسا کہ اعظمی نے جائز کیا ہے۔

تجھ سے کم کم واقف تھے تو ربط کا ملنا ہوتا تھا

واقفیت تنہا طور سے مقدار کی شے نہیں ہے بلکہ کیفیت کی شے بھی ہے۔ "کم کم کھلتے" اور "کم کم ابر و بادلا" میں جو بات ہے وہ "کم کم واقف ہونے" میں نہیں ہے۔ اب یہ دیکھئے اس قسم کی تکرار کا بے محل استعمال کیونکر ان کے بعض اشعار کے حسنِ معنی کو داغدار کر دیتا ہے۔

پہلے بھی سہے ہیں رنج بہت پر ایسی گھڑی کب آئی ہے
کتنی کالی کالی راتیں، کتنی کڑی تنہائی ہے

شعر کا مصرعہ ثانی "ایسی گھڑی کب آئی ہے" کی صفت ہے، یعنی شاعر ایک مخصوص گھڑی کے کرب اور تنہائی کو پیش کر رہا ہے مگر "کتنی کالی کالی راتیں" کہہ کر اس ایک گھڑی کی گرانباری سے ہماری توجہ ہٹا دیتا ہے اور ہمارا ذہن شبِ ہجر کی بیشمار راتوں کی طرف بھٹک جاتا ہے جس کی طرف کہ شاعر اشارہ کرنا نہیں چاہتا ہے۔

پہلے بھی سہے ہیں رنج بہت پر ایسی گھڑی کب آئی ہے

یہاں اس ایک گھڑی کے کرب اور تنہائی کے بالمقابل گذشتہ گھڑیوں کے کرب اور تنہائی کی تردید کی گئی ہے۔

یہ چند شکوے تکرار کے میں نے اس لئے نکالے ہیں کہ اکثر ہو قات الفاظ کی تکرار سے بھی ہمارے نئے شعراء اپنی میر پسندی کو ظاہر کرنا چاہتے ہیں ہر چند کہ اعظمی کے یہاں یہ رُجحان کمزور ہے، تاہم موجود ہے ــــ مگر ان چند خامیوں سے ان کی اس کوشش پر حرف نہیں آتا ہے کہ انھوں نے میر کے سوز و گداز سے فیض حاصل کیا ہے اور اسے ایک جدید رُجحان کی حیثیت سے قبول کرنے کی کوشش کی ہے، وہ جدید رجحان اپنے ماحول کے غم کو اپنی ذات میں سمونے کا ہے اس سے قنوطیت پیدا نہیں ہوتی ہے بلکہ کلام میں تاثیر پیدا ہوتی ہے اور اپنا غم ایک یونیورسل جذبے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اس طرح خلیل الرحمٰن اعظمی کا سارا کلام دورِ حاضر کی زندگی کا غماز ہے مگر ایک بڑی بے بسی اس بات کی پائی جاتی ہے کہ وہ دورِ حاضر کی شخصیتوں سے نیچے دبے ہوئے سے ہیں۔ اپنے لئے کوئی راہ متعین کرنا چاہتے ہیں لیکن ابھی تک متعین نہیں کر پائے۔ اُن کی آواز بہت سی آوازوں میں کھو کر رہ گئی ہے ہر چند کہ اس آواز میں بڑا درد اور سوز و گداز ہے، ایک جوان سال شاعر کے لئے یہ کوئی المناک بات نہیں ہے، بالخصوص اس دور میں جبکہ مختلف روایات بن بن کر بگڑ رہی ہیں

شاعر، بمبئی

اور سیال صورت میں ہیں۔

کچھ دنوں تک تو ہم خطابت اور شاعری کے فرق کو نہیں سمجھ پائے تھے اور جبکہ ان دونوں کا فرق محسوس کیا جانے لگا ہے، اس کی امید کی جاسکتی ہے کہ اس جہد کی بھی کوئی نہ کوئی واضح روایت سامنے آئے گی اور اسے کسی نام سے منسوب کیا جائیگا۔ بہرحال جیسی کہ اس وقت صورتحال ہے اسے مدنظر رکھتے ہوئے مجھے خلیل الرحمٰن کی نظم "نیا جنم" بڑی منفرد سی معلوم ہوئی، سیدھی سادی نثر کے ذریعہ جذبات کو اُبھارنے کی کوشش کی گئی ہے اور یہ انفرادیت ان بعض غزلوں کے اشعار میں بھی ملتی ہے۔

بارہا تیرے نامرادوں کو
موت آواز دے کے پچھتائی

شامِ فراق صبحِ قیامت سے مل گئی
اب غم کی سرزمیں پہ کوئی آسماں نہیں

ماہنامہ "تخلیق" کراچی نومبر ۱۹۵۶ء

بقیہ ترقی پسند ادبی تحریک صفحہ ۱۸۸

بقیہ ترقی پسند ادبی تحریک صفحہ ۱۸۸

سجاد ظہیر ترقی پسند تحریک کے بانیوں میں ہیں۔ اشتراکیت کو اُنھوں نے بطور ایک عقیدے کے تسلیم کیا ہے..... مارکسی نظریات کا اُنھوں نے سوچ سمجھ کر مطالعہ کیا ہے اور اس سلسلے میں اُنکے یہاں کسی قسم کی ادعائیت نہیں ہے۔ اور نہ وہ جذباتی اندازِ فکر کو پسند کرتے ہیں ادبی شہ پاروں سے لطف و مسرت حاصل کرنے کیلئے ان کے یہاں بڑی لچک اور گنجائش ہے۔ ان کے ذہنی رویے نے ادبی معاملات میں انہیں ان تنقیدی کج رویوں اور فکری خامیوں سے بچا لیا جن کے متعدد ترقی پسند نقاد اور ادیب شکار ہیں۔"

یہ بہت ہی متوازن اور منصفانہ رائے ہے جس سے کوئی ترقی پسند ادیب بھی مشکل سے ہی اختلاف کر سکے گا۔ اسی طرح دوسرے ممتاز ترقی پسند ادیبوں کا مطالعہ بھی ڈاکٹر اعظمی کے ذہنی ضبط و نظم اور تحقیقی معروضیت کا مظہر ہے۔ جدید ادب کے طلبا کیلئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہے۔ (ریڈیائی تبصرہ)

نظیر صدیقی

کاغذی پیرہن

خلیل اپنی ساری ترقی پسندی کے باوجود داخلی موضوعات اور داخلی احساسات کے شاعر ہیں۔ بلکہ اگر ان کو صرف اپنی ذات کا شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ اُن کے مجموعۂ کلام "کاغذی پیرہن" میں جتنی نظمیں ہیں ان میں سے دو کو چھوڑ کر (۱) تذکرہ دہلی مرحوم کا۔ (۲) ہجو کی تحریر) باقی تمام نظموں کا موضوع یا ہر نظم کے محور کا محمد خلیل کی ذات ہے۔ ان نظموں کے سرسری مطالعہ میں بھی جو بات سب سے پہلے محسوس ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ یہ نظمیں شاعر کی سوانح عمری کے مختلف ٹکڑے ہیں۔ ان ٹکڑوں میں نہ تسلسل ہے نہ تفصیل۔ پھر بھی وہ شاعر کے حالات سے زیادہ اس کی نفسیات کی غمازی کرتے نظر آتے ہیں خلیل کی نظموں میں یہ تو کہیں بھی نہ ملے گا کہ وہ کب پیدا ہوئے اور کہاں پیدا ہوئے۔ لیکن ان میں ان حالات اور اس ماحول کی مصوری ضرور ملتی ہے جس میں انھوں نے آنکھ کھولی اور پرورش پائی۔ اُن کی نظم "آپ بیتی" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

کیا کہوں تجھکو کہاں لائی مری عمر رواں — آنکھ کھولی تو ہر اک سمت اندھیرے کا سماں
ٹھنڈی ٹھنڈی سی ہواؤں میں وہ غربت کی گھٹی — در و دیوار پہ تاریک سے سائے لرزاں
مضمحل چہرے مصائب کی گرانباری سے — دلِ مجروح سے اٹھتا ہوا غمناک دھواں
اک طرف عظمتِ اسلاف کا ایقتے پہ غرور — اک طرف مت وہ افلاس کے پھیلے ہوئے جال
ناتواں باپ مرا جرمِ غریبی کا شکار — ماں کی آنکھوں سے ٹپکتا ہوا اندوہِ ملال
بھوک کی آگ میں جھلسے ہوئے سارے ارماں — قرض کے بوجھ سے جینے کی امنگیں پامال
بھائی بھائی کی محبت میں زمانے سے شکوک — نگہِ غیر میں جس طرح اک کھلا سوال
ایک ہنگامے پہ موقوف تھی گھر کی رونق — مفلسی ساتھ لئے آتی تھی اک جنگ و جدال

فاقہ مستی میں بکھرتے ہوئے سارے رشتے
تنگ دستی کے سبب ساری فضائیں بے حال

——— غربت اور غریبوں پر اُردو میں بہت سی نظمیں لکھی گئی ہیں۔ لیکن میرا خیال ہے کہ غربت کے جن نتائج کی طرف خلیل نے اشارے کئے ہیں اُن کا بیان دوسروں کے یہاں شاید ہی ملے۔
اسی نظم میں خلیل آگے چل کر کہتے ہیں کہ ؏

مجھ کو اس گھر سے محبت تو بھلا کیا ہوتی!

چنانچہ ایک وقت آتا ہے کہ وہ اپنی تقدیر بدلنے کے لئے اس گھر کو خیرباد کہتے ہیں۔ "آپ بیتی" جو خلیل کی ایک ناتمام نظم ہے اُردو کے اس مشہور شعر پر تمام ہوتی ہے کہ ؎

میں نے جب وادیٔ غربت میں قدم رکھا تھا
دور تک یادِ وطن آئی تھی سمجھانے کو

خلیل کو اپنے گھر سے تو محبت نہ تھی لیکن اپنا وطن (یعنی گاؤں) ضرور عزیز تھا۔ اُن کی شاعری میں وطن کی یاد ایک تخلیقی قوت کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس یاد کی پرچھائیاں اُن کی کئی نظموں میں نظر آتی ہیں۔ اُنھوں نے "یاد" کے عنوان سے یادِ وطن کے موضوع پر ایک نظم بھی لکھی ہے۔ جس میں خیال کی تازگی اور بیان کی دلکشی دونوں موجود ہیں۔ اس نظم کے آخری شعر یہ ہیں ؎

اے وطن! تیرے مرغزاروں میں
میرے بچپن کے خواب رقصاں ہیں
مجھ سے چھٹ کر بھی وادیاں تیری
کیا اُسی طرح سے غزل خواں ہیں

لیکن خلیل کو اپنا وطن صرف اس لئے عزیز نہیں کہ اُس کے مرغزاروں میں اُن کے بچپن کے خواب رقصاں ہیں۔ یا جیسا کہ اُن کی نظم "آپ بیتی" سے ظاہر ہوتا ہے اُنھیں اپنے گاؤں کے قدرتی مناظر اور بچپن کے ہمجولی بہت محبوب ہیں۔ اُن کی نظم "کہانیاں" یادِ وطن کے ایک اور سبب کی طرف غمازی کرتا ہے جو نسبتاً زیادہ قوی ہے۔ وہ سبب خلیل کے الفاظ میں یہ ہے کہ ؎

نہیں یہ ایک ماہ وش کے چاہنے کی آرزو
مرے لئے حیاتِ نو کا جام لے کے آئی تھی

خلیل نے اس نظم (کہانیاں) میں محبت کی شادمانیوں تلخ کامیوں اور حیرانیوں کی بڑی اچھی مصوری کی ہے۔ اپنی پہلی محبت کا ردِ عمل بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کسی کی دل نواز مسکراہٹوں کے سائے میں
مری نگاہ کو ملا وہ ذوقِ جستجو جسے
جہاں کی بے پناہ وسعتیں بھی راس آ گئی تھیں
شفق کے رنگ میں نہا کے میرا چاند آیا تھا
فضا میں بس گئی تھیں جیسے سنبلوں کی نرمیاں
ہوا کے دوش پر رواں تھا نکہتوں کا کارواں
نکھر گئی تھی یہ زمیں سنور گیا تھا آسماں

محبت کا جو ردِ عمل ان اشعار میں ظاہر کیا گیا ہے وہ ہماری عشقیہ شاعری کے روایتی ردِ عمل سے یقیناً مختلف ہے۔ محبت انسان کی شخصیت میں جو وسعت پیدا کرتی ہے اور انسان کو حیات و کائنات سے ہم آہنگ ہونے میں جس طرح مدد دیتی ہے اس کی طرف ان اشعار میں بڑے خوبصورت اشارے ملتے ہیں جیسا کہ خلیل کی اس نظم سے ظاہر ہوتا ہے۔ ان کی پہلی محبت تکمیل کی راہیں طے کرنے سے پہلے ہی خاندانی روایتوں اور مشرقی پابندیوں کا شکار ہو کر رہ گئی۔ اپنی اس ناکامی کے تاثرات کو بہت ہی سادہ مگر موثر انداز میں بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

میں جیسے تلملا اٹھا
قسم یہ کھائی اب نہ پھر کسی سے دل لگاؤں گا
میں اس جہاں کو چھوڑ دوں گا سب سے روٹھ جاؤں گا
یہ سوچ کر میں ظلمتوں کے ساتھ ساتھ چل پڑا
یہ جی میں آئی آج میں زہر کھا کے سو رہوں

غالباً ہر نامراد عاشق ایسا ہی محسوس کرتا ہے مگر زندگی اپنے آپ سے روٹھوں کو منانا جانتی ہے اور وہ آدمی کو سخت سے سخت ناکامی کے صدمے سہہ لینے اور سہار لے جانے پر آمادہ کر لیتی ہے۔ چنانچہ خلیل بھی زہر کھا کے سو رہنے کی بجائے اپنے گاؤں سے کسی شہر میں آ گئے وہاں کی دلچسپیوں اور دل آویزیوں کو دیکھ کر وہ

یہ سوچنے لگا کہ مجھ کو موت کی ہوس ہے کیوں
ابھی نہ جانے کتنی اور منزلیں ہیں سامنے
ابھی حیات کے نہ جانے کتنے اور روپ ہیں

لیکن شہر کی رعنائیوں اور رونقوں کی طرف کشش محسوس کرنے کے باوجود وہ

میں رُک کے سوچنے لگا
یہاں میں ایک اجنبی ہوں اک غریبِ شہر ہوں
یہاں وہ کون ہے جو میرے دل کے داغ دیکھے گا
مری زبان کون سمجھے اس دیارِ غیر میں

لیکن خلاف توقع شاعر کو اس "دیارِ غیر" میں ایک اور اجنبی مل جاتا ہے، جس کی وجہ سے ؎

اندھیری رات آنکھ مَل کے مجھ کو دیکھنے لگی
ہزار شمعیں جیسے میرے دل میں جھلملا اٹھیں
ہم ایک ساتھ چل پڑے
یہ آرزو ہوئی کہ اب زمین و آسمان کا رنگ
ابد تلک یہی رہے

لیکن خلیل کی زندگی کا یہ خواب بھی بکھر گیا اور وہ ایک سرگشتۂ محبت کی حیثیت سے یہ سوچنے لگا کہ ؎

اُس اجنبی نے کیا کیا
میں کیوں نہ اس کے ساتھ رہ سکا

اس تنہائی کے عالم میں اُنھیں پھر اپنا وطن یاد آنے لگا ؎

مرا دیار میرا شہر جو مجھے عزیز تھا
جہاں گلی گلی کو میری چاہ تھی مجھی سے پیار تھا
میں کیوں وہاں سے بھاگ کر چلا گیا
میں کیسے اپنے دوستوں کو، ساتھیوں کو بھول کر
وطن سے دور آ بسا

خلیل کی نظم "بن لکھی کہانی" میں وطن کی یاد کا ایک اور سبب سامنے آتا ہے انھیں وطن کی یاد صرف اس لئے نہیں ستاتی کہ وطن سے اُن کے بچپن یا لڑکپن کی خوشگوار یادیں وابستہ ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ وطن میں ان کی زندگی کا جو عرصہ گذرا اس عرصہ کے آئینے میں انھیں اپنا وہ چہرہ نظر آتا ہے جو کنول کے پھول کی مانند تازہ تھا، لیکن ؎

جسے اب کوئی میرا ہم وطن دیکھے
تو کہہ دے یہ تو کوئی اور ہے
اس شخص کا اس کھیت اور باغوں کی بستی سے ہے کیا رشتہ؟

شاعر کے چہرے کی یہ زبردست تبدیلی اس شہر میں آنے کا نتیجہ ہے جہاں وہ "علم وفن کی ایک پری کا تذکرہ سن کر" آیا تھا، مگر جب

یہاں آگیا تو شہرِ علم و فن کے دیوتاؤں نے
غمِ دوراں سے سازش کر کے کچھ کا کچھ بنا ڈالا
میں اپنے گھر کو اب کیا منہ دکھاؤں گا ؟

"بن لکھی کہانی" اس آخری مصرعہ پر ختم ہوتی ہے۔ میرا خیال ہے کہ اگر خلیل اس نظم کو آخری مصرعہ سے پہلے والے مصرعہ پر ختم کر دیتے تو بہتر ہوتا کیونکہ آخری مصرعہ میں ایک ناخوشگوار تصنع کا احساس ہوتا ہے۔

خیر بات کہاں سے کہاں چلی گئی، میں دکھا یہ رہا تھا کہ خلیل کی نظمیں زندگی کے کن حالات اور تجربات کی آئینہ دار ہیں۔ اگر آپ ان نظموں کو غور سے پڑھیں تو میری طرح شاید آپ کو بھی یہ بات محسوس ہو کہ ان کی نظمیں اپنے حالات اور تجربات کے اظہار سے زیادہ اپنے آپ کو سمجھنے اور سنبھالنے کی کوشش کا نتیجہ ہیں۔ یہ کوشش کہیں خفی ہے اور کہیں جلی۔ اس کوشش کی سب سے اچھی مثال خلیل کی وہ نظم ہے جس کا عنوان ہے "میرے اداس دل نہ رو"۔ اس نظم کے دو بند ملاحظہ ہوں ؎

میرے اداس دل نہ رو
[illegible]
کھلتا ہے مجھ غریب سا
خود میں بُرا کہاں ہوا ؟
گر ہوں بُرا نصیب سا
اب بھی جو مجھ میں رہ گئی وہ [illegible] نہ کھو

میرے اداس دل نہ رو
سچ ہے کہ مجھ میں کیا رہا
ڈھیر ہوں جیسے خاک سا
پھر بھی کرید کر تو دیکھ
اس میں ہے کچھ چھپا ہوا !
جو مرے ساتھ کھو گیا یہ وہی آدمی نہ ہو

دوسرے بند کے آخری تین مصرعے خلیل کی شخصیت کے ایک [illegible] اہم پہلو کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ اپنے آپ کو کریدنا اور اس آدمی [illegible] جو ان کے ساتھ کھو گیا خلیل کے لئے شخصی عادت ہی نہیں بلکہ شاعرانہ عمل بھی ہے ان کی نظم "سفرنامہ" اسی عادت اور عمل کا نتیجہ ہے۔ چونکہ اس نظم کی داد اسے شروع سے آخر تک پڑھنے کے بعد ہی دی جا سکتی ہے اس لئے یہاں اس کے چند اشعار کا اقتباس بے سود ہے لیکن اتنا کہہ دینے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ یہ نظم خود شناسی اور خود جوئی کا ایک دل پذیر نمونہ ہے اور اس لحاظ سے ایک نادر فن پارہ بھی۔

شاعر، بمبئی

شاعری عموماً زندگی کے شدید لمحات یا heightened moments کی ترجمان ہوتی ہے لیکن خلیل کی کئی نظمیں ایسی ہیں جو زندگی کے شدید لمحات کی بجائے عام لمحات کی ترجمان ہیں۔ "کاغذی پیرہن"، "بن لکھی کہانی"، "گیتا نجلی"، "بہار کی واپسی"، "اپنی تصویر سے"، یہ سب خلیل کی وہ نظمیں ہیں جو کسی خاص تجربے یا تاثر کی بجائے ذہن کی اضطراری رَو کا عکس پیش کرتی ہیں۔ روزمرہ زندگی میں کئی چیزوں کو دیکھ کر ذہن میں کتنی ہی باتیں آتی ہیں اور اپنا اپنا نقش چھوڑ تی چلی جاتی ہیں۔ خلیل نے ان اضطراری نقوش کو نظم کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ چونکہ عام لمحات میں انسان کے رویے اور ردِ عمل میں کوئی شدت یا intensity نہیں ہوتی۔ اسی لئے خلیل کی ان نظموں میں بھی کوئی شدت نہیں ملتی۔ ان میں زندگی کے سادہ لمحات سادہ اسلوب بلکہ ایک حد تک سپاٹ اسلوب میں پیش کئے گئے ہیں جس کی وجہ سے ان نظموں میں وہ چیز پیدا ہو گئی ہے جسے psychological immediacy کہتے ہیں۔ میرے نزدیک خلیل کی ایسی نظموں میں "کاغذی پیرہن" اور "گیتا نجلی" بڑی کامیاب کوششیں ہیں۔

خلیل کی نظموں پر جو فضا غالب اور حاوی ہے وہ افسردگی، اضمحلال اور تھکن سے عبارت ہے۔ پھر بھی اُن کے یہاں کلبیت اور قنوطیت کو راہ نہ مل سکی۔ زندگی کی پریشانیوں اور ناکامیوں کے باوصف خلیل نہ اپنے آپ سے مایوس نظر آتے ہیں، نہ دنیا سے بیزار۔ وہ اپنی ساری زہر نوشیوں اور تلخ کامیوں کے باوجود زندگی کی نئی وادیوں سے گزرنے کے ولولے اور اپنے خوابوں کی سرزمین تک پہنچنے کے حوصلے کو مرنے نہیں دیتے۔ "نیا جنم"، "میرے خوابوں کی سرزمیں"، "ہنگامِ وصل"، "متھوا دیس"، ان نظموں میں ان کی شخصیت کے اس پہلو کی بڑی اچھی ترجمانی ملتی ہے۔ یہی نظمیں حسنِ فطرت سے خلیل کے گہرے لگاؤ کی بھی آئینہ دار ہیں۔ اُن کے یہاں نشاط و انبساط کا تصور ہر جگہ فطری مناظر سے وابستہ نظر آتا ہے مثلاً ان کی نظم "نیا جنم" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

بسنت آیا تو یوں آیا کہ میں بھی جیسے اُٹھ بیٹھا
سویرا ہوتے ہی ہر سمت سے جھونکے ہواؤں کے
نئی خوشبو لئے مجھ کو جگانے کے لئے آئے
بدھر بھی آنکھ اٹھاتا ہوں شفق کی مسکراہٹ ہے
وہی سورج ہے لیکن اور ہی کچھ جگمگاہٹ ہے
نہ جانے کیسے کیسے پھول اب مجھ کو بلاتے ہیں
نہ جانے کتنے کتنے رنگ سے دل کو بھاتے ہیں

فضا میں دور تک پھیلے ہوئے وہ کھیت سرسوں کے
یہ کہتے ہیں کہ اب ارمان نکالوں برسوں کے
تمہارے سامنے پھیلا ہوا میدان سارا ہے
تمہارے چاہنے والوں نے پھر تم کو پکارا ہے

"میرے خوابوں کی سرزمین" کے یہ اشعار بھی دیکھتے چلئے ؎

مگر جب آنکھیں کھلیں تو دیکھا کہ میرے خوابوں کی کوئی دلہن
مجھے جگاتی ہے موت کی نیند سے مجھے پیار کر رہی ہے
یہ کہہ رہی ہے کہ چھوڑ کر مجھ کو کیا کہیں اور جا رہے ہو
ابھی اجازت نہ دیں گے تم کو تمہارے یہ رشتہ دار سارے
تمہارے یہ کھیت جن میں سونا بچھا ہے فصلیں کھڑی ہوئی ہیں
ہر ایک گوشے میں بس رہی ہے حسین دلآویز مست خوشبو
پکے ہوئے تازہ میووں سے ڈالی ڈالی لدی ہوئی ہے
تمام چڑیاں تمہارا ہی نام لے کے اک گیت گا رہی ہیں
ندی کے پانی میں اپنے چہروں کو دیکھتے ہیں تمہارے بچے
تمہارے مدھوبن میں شیام کی بنسری پہ رادھا کی ساری سکھیاں
ملن کی آشا لئے ہوئے اپنے اپنے گھنگھرو سنبھالتی ہیں
ابھی نہ جاؤ تمہاری بستی میں لوگ ہنستے ہیں بولتے ہیں
ابھی نہ جاؤ تمہارے اس دیس پر کوئی بم نہیں گرا ہے

"منتظر دیس" کے یہ اشعار بھی فطری مناظر سے خلیل کی جذباتی ہم آہنگی کا ثبوت دے رہے ہیں ؎

میرے سر کی دھوپ کے اوپر آج کدم کے سائے ہیں
میری راہ میں جیسے کسی نے پیار کے پھول بچھائے ہیں
میرے بھرے جنگل کی وسعت ان آنکھوں میں سمائی ہے
میرے سپنوں کے آنگن میں اودی اودی گھٹا چھائی ہے
میرا تصور جیسے ندی کا دھیما دھیما بہتا پانی
میرے خیالوں کی آہٹ میں جیسے جل پریوں کی کہانی

ان اشعار کے پیش نظر شاید یہ کہنا غلط نہ ہو کہ خلیل فطری مناظر ہی کے شیفتہ نہیں بلکہ دیہاتی اور صحرائی زندگی کے بھی دلدادہ ہیں جس کی وجہ اقبال کے لفظوں میں یہ ہے کہ حسن بے پروا کو اپنی بے نقابی کے لئے شہروں سے زیادہ بن پیارے ہیں۔

خلیل کی شاعری میں خوشی کا تصور نہ رومانی ہے نہ عینی۔ اُن کی خوشی نہ محبوب کے ملنے پر منحصر ہے نہ نظام حیات کے بدل دینے پر۔ ان کے یہاں خوشی سفید زندگی کی چھوٹی چھوٹی باتوں پر مبنی نظر آتی ہے۔ "نیا جنم" میں وہ اپنی زندگی کے مسرت بخش لمحوں کو یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

وہ سارے دوستوں کا جمع ہونا میرے کمرے میں
وہ گپ شپ قہقہے وہ اپنے اپنے عشق کے قصے
وہ میری سادگی کی باتیں وہ چرچے خوبرویوں کے
کبھی آوارہ گردی میں وہی ان ویران سڑکوں کی
کبھی باغوں میں رات کا سنسان جاڑوں کی
کبھی وہ ساحلوں میں اپنا یونہی گھومتے رہنا
کبھی وہ چائے کی میزوں پہ گھنٹوں بیٹھنا سب کا
وہ باتیں علم و حکمت کی کبھی شکوہ شکایت کی
تمہیں تو یاد ہوگا ان میں ہی اک دوست شاعر تھا
ذرا دیکھو تو مجھ کو غور سے شاید وہ میں ہی تھا

آج بھی خلیل کی خوشی ان ہی باتوں میں پوشیدہ ہے چنانچہ وہ اپنے دوست سے کہتے ہیں ؎

بہت دن میں ملے ہیں ہم تو آؤ آج جی بھر کر
ہنسیں بولیں کہیں آوارہ گردی کے لئے نکلیں
چلیں اور چل کے سارے دوستوں کو پھر بلا لائیں
سجائیں آج پھر محفل کہیں پینے پلانے کی
میں تم کو آج اپنی کچھ نئی باتیں بتاؤں گا

خلیل دیہاتی زندگی سے جتنا جس قدر بھی مانوس ہوں مگر ان کے ذہن میں وہ سادگی اور معصومیت نہیں جو خالص دیہاتی فضا کے پروردوں میں پائی جاتی ہے چونکہ ان کے ذہن کی تعمیر و تہذیب میں شہر کی آب و ہوا کو بھی دخل رہا ہے اس لئے اس میں بیسویں صدی کے پیچ و خم بھی آ گئے ہیں۔ اس پیچ و خم کی کارفرمائی ان کی نظموں سے لے کر غزلوں تک میں دیکھی جا سکتی ہے۔ ان کی ایک نظم ہے "برہ کی ریکھا" اُس کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تیری یادوں سے اس گھر کو یوں تو سجا کے رکھوں گا
تیرے خیالوں کی خوشبو سے دل کو بسا کے رکھوں گا
تیرے پیار کو سارے جگ سے یوں تو بچا کے رکھوں گا
پھر بھی کانپ اٹھتا ہوں پیاری جیسے آئیگا طوفان
ڈر ہے کہیں وہ رات نہ آئے جب پاگل ہو جاؤں میں
تجھ کو ڈھونڈنے نکلوں لیکن اور کہیں کھو جاؤں میں

تھک کر اور کسی آنچل کے سائے میں سو جاؤں میں

اپنے پیار کا ہوگا بیماری اس میں بہت ایمان

آخری بند کے دوسرے اور تیسرے مصرعوں میں جن "اندیشہ ہائے دور دراز" کا اظہار کیا گیا ہے۔ وہ دیہاتی تہذیب میں پرورش پائے ہوئے ذہن کے بس کی بات نہیں۔ اسی طرح خلیل کی غزل کا یہ شعر بھی کسی سیدھے سادے ذہن کی تخلیق نہیں ہو سکتا ؎

وہی دنیا میں اک حسین نہیں   پھر بھی مت پوچھ اُسکی زیبائی

پیچیدہ ذہن شعر و ادب میں سو سو طرح سے ظاہر ہوتا ہے۔ خلیل کی ذہنی پیچ و خم ان کی شاعری میں کس کس طرح رونما ہوئے ہیں یہ تفصیل طوالت کا باعث ہوگی۔ بہرحال اس میں شک نہیں کہ اُن کی شاعری فکر و فن دونوں کے اعتبار سے جدید modern کہلانے کی مستحق ہے۔ فن کے اعتبار سے جدید یوں کہ انھوں نے نظم آزاد اور نظم معرا۔ دونوں سانچوں سے کام لیا ہے۔ ہیئت کے کچھ تجربے بھی کئے ہیں۔ زبان کے لحاظ سے شاعری کو عام بول چال کے قریب لے آئے ہیں۔ جذبات و کیفیات کے اظہار میں جذبات و کیفیات کے خارجی مظاہر سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے' اُن کے یہاں اشاریت ـــــــــ تو کہیں بھی نہیں پائی جاتی۔ لیکن تلازم خیالات کا عمل دخل خاصا ہے۔ یہ ساری چیزیں خلیل کی شاعری کو فنّی اعتبار سے جدید بناتی ہیں۔ ساتھ ہی نامانوس بھی۔ نامانوس اس لئے کہ اُردو کے بیشتر قارئین آج تک اُردو کی جدید شاعری سے بے تکلف نہ ہو سکے۔ اُنھیں تو نظم کی شاعری میں وہی چیزیں مرغوب و محبوب ہیں جو تغزل سے قریب ہیں۔ چونکہ خلیل کی نظموں میں تغزل سے قریب کوئی چیز نہیں اس لئے مجھے اندیشہ ہے کہ اُن کے قارئین کی تعداد بہت محدود رہے گی۔

خلیل کی عشقیہ نظموں میں "برہ کی ریکھا"۔ "دوری"۔ "جن راتوں میں نیند نہ آئے"۔ "نذرانے"۔ "کنج محبت"۔ اور "سورج مکھی کا پھول" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ "برہ کی ریکھا" کا موضوع وہی اندیشہ ہائے دور دراز ہیں' جن کی طرف ابھی اشارہ کیا گیا۔ "دوری" کا موضوع وہ دوری ہے جو محبوب کی قربت کے باوجود قائم رہتی ہے۔ خلیل نے اپنے "فراق اندر وصال" کو اپنی نظم "سورج مکھی کا پھول" میں بھی بڑی خوش اسلوبی سے ظاہر کیا ہے' اس پھول کو دیکھ کر شاعر کو محسوس ہوتا ہے کہ ؎

میری طرح سے یہ بھی من کی گھڑیاں گنتا رہتا ہے

میری طرح سے یہ بھی مل کر کچھ بیکل سا رہتا ہے

میری طرح سے اس کی چاہت میں بھی کوئی مجبوری ہے

میری طرح سے اسکے وصل میں اک دردِ مہجوری ہے

جیسا کہ اسلوب احمد انصاری نے "کاغذی پیرہن" کے اختصاریہ میں کہا ہے یہ نظم "سورج مکھی کا پھول" ـــــــــ بہت ہی کامیاب اور موثر کوشش ہے۔ "جن راتوں میں نیند نہ آئے"۔ کا موضوع اگرچہ وہی دور فرقت ہے جس پر بے شمار نظمیں بھی لکھی گئی ہیں اور غزلیں بھی کہی گئی ہیں مگر خلیل کا طریق پیشکش دوسروں سے قطعاً الگ اور اچھوتا ہے۔ اس نظم میں اُردو شاعری کے روایتی عاشق پر ایک ہلکا سا طنز بھی ملتا ہے۔ "نذرانے" میں اگرچہ مرکزی خیال تو محض اتنا ہی ہے کہ شاعر کے پاس کسی کی نذر کرنے کے لئے صرف وہ آنسو رہ گئے ہیں جو اب تک بہہ نہ سکے۔ لیکن اس نظم سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ شاعر نے عشق میں کیا کچھ کھویا اور کیا کچھ پایا۔ جو کچھ کھویا ہے اسکے بیان میں تو کئی شعر کہے گئے ہیں لیکن جو کچھ پایا ہے اس کا اظہار صرف اس شعر میں ہوا ہے ؎

کتنے کچوکے کھا کھا کر بھی چپ رہنے کی عادت ڈالی

ہنستے ہنستے پی ڈالی ہے غم کے زہر کی ہر ہر پیالی

یعنی عشق میں اور کچھ ملا ہو یا نہیں لیکن زندگی کے آلام و مصائب سے نباہ کرنے کا سلیقہ ضرور ہاتھ آگیا ہے۔ "کنج محبت" میں کسی گزشتہ چمن کے متعلق ایک فرقت زدہ عاشق کے تاثرات پیش کئے گئے ہیں۔ ان تاثرات کی لطافت اور لرزش کو قاری تک پہنچانے میں خلیل بڑی حد تک کامیاب رہے ہیں۔ دو تین شعر ملاحظہ ہوں ؎

یہ سنسان رتیں' یہ ٹھنڈی ہوائیں' یہ پھیلی ہوئی تیری یادوں کی خوشبو

یہ چپ چاپ سے پیڑ' یہ غم کے سائے' یہ دل کی کسک' یہ محبت کا جادو

یہ سب جاگتے ہیں' یہ سب سوچتے ہیں' یہ سب کروٹیں لے کے ہیں آہ بھرتے

نئی منزلیں ہیں' نئے راستے ہیں' نئے موڑ سے سب کے سب ہیں گزرتے

ہر اک موڑ پر جیسے کوئی کھڑا ہو اشاروں اشاروں میں کچھ کہہ رہا ہو

سمجھ میں نہ آئے کوئی بات اسکی' مگر جیسے چشمہ سا اک بہہ رہا ہو

اس نظم میں کل آٹھ شعر ہیں۔ پہلے تین شعروں میں چمن کے متعلق عاشق کے تاثرات پیش کئے گئے ہیں۔ چوتھے شعر سے عاشق اپنے خیالات میں گم ہوتا نظر آتا ہے وہاں سے آخری شعر تک کا باہمی ربط بھی واضح نہیں اور بیان میں کسی قدر اُلجھاؤ بھی پیدا ہو گیا ہے۔ بیان کی یہی کمزوری خلیل کی ایک اور اچھی نظم "آدمیوں کے میلے میں" میں بھی پائی جاتی ہے۔ اس نظم کا آغاز اور خاتمہ دونوں بہت ہی خوبصورت ہیں لیکن درمیان میں یعنی آخری دو شعروں سے پہلے بیان کے اُلجھاؤ کی بنا پر نظم کا مرکزی خیال مبہم ہو جاتا ہے لیکن یہ دونوں نظمیں اپنی خامیوں

کے باوجود لطف و لذت سے خالی نہیں۔ خلیل کے یہاں زبان و بیان کے معاملے میں بے راہ روی تو نہیں پائی جاتی لیکن اس باب میں انھیں اور محتاط ہونے کی کوشش ضرور کرنی چاہئے۔

"کاغذی پیرہن" کی سب سے پہلی نظم "میرا گھر میرا ویرانہ" خلیل کی کامیاب ترین نظموں میں سے ہے۔ یہ نظم ذاتی محرومیوں کا ایک ایسا مرثیہ ہے جو بالکل اچھوتے انداز سے کہا گیا ہے۔ اس میں شاعر نے کنایتاً اپنے آپ کو ایک ایسا مقبرہ قرار دیا ہے جو تاج محل کی طرح صدیوں میں نہیں بلکہ ہر روز بنا کرتا ہے۔ اس مقبرے میں کسی ممتاز محل کی بجائے آرزوؤں اور تمناؤں کی ایک دنیا دفن ہوتی ہے۔ اس مقبرے سے متعلق سب سے اذیت ناک بات یہ ہے کہ تاج محل کو دیکھنے کے لئے تو ہزاروں سیاح آتے ہیں۔ لیکن اس چلتے پھرتے مقبرے کو دیکھنے کیلئے کوئی نہیں آتا۔ اسی بنا پر شاعر ایک سیاح کو اپنے گھر یعنی اپنے ویرانے میں کچھ دیر ٹھہرنے کی دعوت دیتے ہوئے کہتا ہے کہ ؎

یوں میں اُجڑی ہوئی، ٹوٹی ہوئی سی ہے دیوار
پر اسی کھنڈر میں دھرتی کی ہے سرمایہ مرا
میں جو اس وقت نظر آتا ہوں، یہ میں نہیں ہوں
میری تصویر ہے، دُھندلا سا ہے یہ سایہ مرا

اس میں ہیں میری محبت کے وہ سارے ارماں
جن سے محروم رہا میرا یہ بیدار شباب
یادِ محبوب میں بے گائے ہوئے گیت اس میں
اس میں ہیں میرے وہ اشعار نہیں جن کا جواب

ہاں یہیں دفن ہیں وہ ساری کتابیں جن کو
زندگی دیتی جو فرصت تو میں لکھ سکتا تھا
اسی مٹی میں ہیں وہ نظمیں، وہ غزلیں میری
جن کو کہنے کوئی دیتا تو میں کہہ سکتا تھا

اگرچہ یہ نظم خلیل کی ذاتی محرومیوں کا اظہار ہے لیکن ان محرومیوں میں ایک آفاقی عنصر بھی پوشیدہ ہے۔ یہ حسرتیں یا اس قسم کی حسرتیں ہر انسان کے دل میں پائی جاتی ہیں۔ ان حسرتوں سے یہ بات برآمد ہوتی ہے کہ آدمی صرف اپنے اعمال کا مجموعہ نہیں ہوتا بلکہ ان امکانات کا بھی مجموعہ ہوتا ہے جو ناسازگار حالات کی بنا پر عمل میں نہ آ سکے۔ یہ اور بات کہ عملی طور پر یا فلسفۂ زیست کے ماننے والوں کے نزدیک نظری طور پر بھی آدمی اپنے اعمال یا اکتسابات سے علاوہ کوئی چیز نہیں۔

شاہد، بمبئی

"تذکرہ دہلی مرحوم کا" اور "ہو کی تحریر" اپنے موضوع اور مزاج کے اعتبار سے خلیل کی باقی نظموں سے قطعاً مختلف ہیں۔ اگر یہ نظمیں "کاغذی پیرہن" میں شامل نہ کی جاتیں تو بہتر ہوتا۔ نہ صرف اس لئے کہ یہ نظمیں باقی نظموں کی فضا سے ہم آہنگ نہیں بلکہ اس لئے بھی کہ یہ نظمیں اتنی موثر نہیں جتنا ان کا موضوع اندوہناک ہے۔ اسلوب انصاری نے "شام اودھ" کو خلیل کی سیاسی نظموں میں شمار کیا ہے، اس نظم میں خلیل کے بعض سیاسی تصورات ضرور ملتے ہیں۔ لیکن یہ نظم خلیل کے سیاسی تصورات سے زیادہ اس ہنگامی افسردگی کی ترجمان ہے جو اس کی تحریک کا محرک بنی۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم اُن کی باقی نظموں سے ہم آہنگ بے جوڑ نہیں معلوم ہوتی۔

اسلوب انصاری ایک جگہ لکھتے ہیں کہ خلیل کے یہاں "آراستگیٔ بیان کو وہ دخل نہیں جو بعض فن کاروں کے پاؤں کی بیڑی بن جاتا ہے۔ اور ذہن کو نئے راستوں پر پڑنے سے روکتا ہے۔"

مجھے خلیل کی اس خوبی سے انکار نہیں لیکن اس بات کی طرف اشارہ ضروری ہے کہ اُن کی اسی خوبی کی بدولت اُن کی شاعری (میری مراد نظموں سے ہے) کہیں کہیں غیر شاعرانہ ہو کر رہ گئی ہے ____ یوں تو یہ نقص انشاء کے یہاں بھی ہے لیکن مجھے کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ خلیل کے یہاں غیر شاعرانہ ٹکڑے انشاء سے زیادہ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ خلیل اور انشاء جس قسم کی نظم کہنے کا تجربہ کر رہے ہیں اس میں زبان و بیان کو پھیکے پن سے بچانا آسان نہیں۔ پھر بھی انہیں ٹی، ایس، ایلیٹ کا یہ قول نہیں بھولنا چاہئے کہ شاعری کا بدترین عیب اس کا بے مزہ Dull ہونا ہے۔

خلیل کی غزلیں صرف اُن کی نظموں ہی کے مقابلہ میں نہیں بلکہ انشاء کی غزلوں کے مقابلہ میں بھی زیادہ شگفتہ و شاداب ہیں۔ غزل میں اپنی بات کو دل پذیر و دل نشیں بنانے کے لئے جس قدر پیچتے ہوئے انداز بیان کی ضرورت ہوتی ہے اس پر خلیل کافی حد تک قابو پا چکے ہیں۔ مثلاً اُن کے یہ اشعار دیکھئے ؎

تری محفل میں ہیں بیٹھے یہ شرف کیا کم ہے
ہم پہ اب کوئی عنایت کی نظر ہو کہ نہ ہو

ہم تو برباد تھے برباد ہی ہونا تھا ہمیں
کیوں تری چشم عنایت پہ یہ الزام آیا

ہی لئے ہونٹ کہ اندیشۂ رسوائی تھا
پھر بھی ہر سانس میں چپکے سے ترا نام آیا

OO

سردار جعفری

نیا عہد نامہ

بمبئی کے ہندی ہفتے وار "دھرم یگ" میں لکھتے ہوئے راہی معصوم رضا نے خلیل الرحمٰن کے مجموعے کے نام پر اعتراض کیا ہے۔ یہ انجیل مقدس کے دوسرے حصے کا نام ہے جو حضرت عیسیٰ کی زندگی اور تعلیمات سے متعلق ہے اس کا اعتراف خلیل نے خود اس طرح کیا ہے

اے غم دنیا ہمیں اس وقت تنہا چھوڑ دے
ایسے عالم میں کہ جب ہم پر اترتی ہے کتاب

زبان و بیان کی خامیوں سے قطع نظر ایسے آسمانی نام میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں ہے جب کہ شاعری کو پیغمبری اور صریر خامہ کو نوائے سروش کہا جاتا رہا ہے۔ لیکن اس کے بعد شاعر کی ذمہ داری بڑھ جاتی ہے پھر اس کی تخلیق کو کم سے کم "بال جبریل" (در [illegible] نامہ) ہونا چاہیے "این کتاب از آسمانی دیگر است"

لیکن میرا خیال ہے کہ شاعر نے "عہد نامہ" کو پیمان وفا کے معنوں میں بھی استعمال کیا ہے۔ اس عنوان کی نظم پڑھ کر یہی اثر پڑتا ہے چونکہ دنیا میں انہوں نے اپنے پرانے مسلک [illegible] سے برأت کا اعلان کیا ہے اس لئے قیاس کہتا ہے کہ نئے عہد نامے کا مطلب نیا پیمان وفا بھی ہے۔ اگر یہ صحیح ہے تو فطری سوال پیدا ہوتا ہے کہ نیا پیمان وفا کس کے ساتھ ہے

بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ خلیل الرحمٰن نے اپنے پہلے مجموعے "کاغذی پیرہن" سے "نیا عہد نامہ" تک [illegible] کیا ہے [illegible] فکر اور خارجی کسی [illegible] کے بجائے صرف یقین کی کمی کا سفر ہے مگر بے یقینی [illegible] ممکن نہیں ہے۔

[illegible] عہد نامہ [illegible] اوراق پر عہد نامہ [illegible]
[illegible] خلیل کے پاس کسی [illegible]
[illegible]

تصور نہیں ہے (ان کی بیلی کھو گئی ہے) لیکن فردا کی آرزو موجود ہے اور یہ بڑا قیمتی جذبہ ہے۔ اس آرزو سے کسی شاعر کا دل خالی نہیں رہ سکتا۔ ہر شاعر پر غالب کا یہ مصرعہ صادق آتا ہے کہ "میں عندلیب گلشن ناآفریدہ ہوں" اب وہ گلشن کیسا ہوگا اس پر منحصر ہے کہ شاعر کے "نشاط تصور" میں کتنی گرمی ہے۔ اسی سے شاعر کی نغمہ سنجی کا مرتبہ متعین ہوتا ہے۔

خلیل الرحمٰن میرے نزدیک جدید شاعر نہیں ہیں (اس سے ان کی شاعری پر حرف نہیں آتا) وہ صرف جدید عہد کے شاعر ہیں۔ انہوں نے اپنا سارا انداز کلاسیکی شاعری اور خاص طور سے غزل سے لیا ہے۔ اس میں جو کچھ بھی جدت ہے وہ ترقی پسند مدرسۂ فکر کی دین ہے اور یہ خلیل کی اپنی شاعری کا ماضی ہے۔

ان کی ذہنی تربیت اس دور میں ہوئی ہے جب مسلم یونیورسٹی علیگڑھ کا اردو ڈپارٹمنٹ اپنے صدر پروفیسر رشید احمد صدیقی صاحب کے ذوق لطیف کے احترام میں صرف غزل کی سرپرستی کر رہا تھا اور آل احمد سرور "ذوق جنوں" کی غزلیں کہہ رہے تھے۔ خلیل الرحمٰن کے جذبہ آزادی اور حب الوطنی نے ان کے شاعرانہ خلوص کو ترقی پسند تحریک کے حلقے میں پہونچا دیا لیکن وہ اس کے ساتھ تھوڑی ہی دور چل سکتے تھے اگر تحریک میں انتہا پسندی نہ آئی ہوتی اس پر حکومت کا عتاب نہ نازل ہوا ہوتا اور وہ پاش پاش نہ ہوئی ہوتی تو خلیل الرحمٰن کا شاعرانہ مزاج انہیں اس تحریک سے الگ لے جاتا اور یہ کوئی بری بات نہ ہوتی۔ حسرت، یگانہ اور جگر نے بھی آخر تحریک سے الگ رہ کر اچھی شاعری کی ہے۔

آج بھی خلیل الرحمٰن نے اپنا رشتہ ایک ایسے رجحان سے جوڑ رکھا ہے جس سے ان کا مزاج ہم آہنگ نہیں ہے۔ جسے آج نئی شاعری کہا جا رہا ہے اس میں پرانے تغزل اور حسن کاری کی گنجائش نہیں ہے۔ عمیق حنفی کے الفاظ

یہ بھٹی اور نقالی ، کا دوسرا نام ہے اور خلیل کے یہاں پرانے تغزل اور حسن کاری کے چھینٹے جا بجا مل جائیں گے ۔ میر ، آتش اور فراق کے شعروں کی صحیح داد دینے والا اس سے بچ کے جا بھی کہاں سکتا ہے ۔ آل احمد سرور کے اس بیان پر خلیل کی شاعری پوری نہیں اترتی کہ آج کا "نیا" شاعر" اندرا پاؤنڈ اور ٹی ایس ایلیٹ اور میرا جی سے متاثر ہے ۔ خلیل کے یہاں ان میں سے کسی کی پرچھائیں بھی نہیں ملے گی ۔ ڈاکٹر وزیر آغا کے نزدیک ایک "نئی شاعری" کی خصوصیات میرا جی کی دین ہیں ۔ اور یہ خصوصیات ہیں اقبال ، اختر شیرانی اور فیض کے برعکس میرا جی کے یہاں بات میں تکمیل کی کمی زبان کا نظم و ضبط سے عاری ہونا ۔ زبان کی شکست و ریخت ، تصورات کی فراوانی اور افکار کی مبہم پرچھائیں اور الفاظ کا چمک دمک اور آہنگ و فکر کی ایک خاص تیکنیک سے محروم ہونا (اوراق سالنامہ ۱۹۶۷ء)

اس اعتبار سے خلیل میرا جی سے اور شاعری کے نئے پن سے کوسوں دور ہیں ۔ اور اقبال اور فیض کے قریب ہیں ۔ اور ان کی وساطت سے ترقی پسند خاندان میں واپس آجاتے ہیں ۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی افتاد طبع کی وجہ سے اس میں شامل نہیں ہونا چاہتے ۔

دراصل خلیل کو اپنی شاعرانہ شخصیت کی دریافت از سرِ نو کرنا ہے ان کی غزلیں تڑپ تڑپ کر کہہ رہی ہیں کہ شاعر کی اصل شاعرانہ شخصیت بے نقاب ہونے کے لئے بیتاب ہے اگر بیس برس کی مشقِ سخن کے بعد بھی انہوں نے اس نقاب کو نہ اتارا تو قاری ان کی شاعری کے ... دل سے محروم رہ جائیں گے ۔

خلیل کی غزلیں پڑھ کر یہ احساس بڑی شدت کے ساتھ ہوتا ہے کہ وہ ماضی اور حال کی کشمکش میں مبتلا ہیں ۔ وہ جس ماضی سے رشتہ توڑ آئے ہیں یا رشتہ توڑ لینے پر مجبور کر دیئے گئے ہیں وہ انہیں بری طرح یاد آتا ہے اور انہیں بار بار آواز دیتا ہے انہیں خود اپنے کھو جانے کا احساس ہے آج کے آئینے میں وہ اپنی شکل تک نہیں پہچان سکتے ۔ نام تک بھولے جا رہے ہیں ۔ ۳۷ غزلوں اور چند نظموں کے اس مختصر سے مجموعے میں ایک ہی خیال ایک ہی جذبے کی تکرار ہے ؎

وہ دن کب کے بیت گئے جب دل سپنوں سے بہلتا تھا
گھر میں کوئی آئے کہ نہ آئے ایک دیا سا جلتا تھا
نہیں اب کوئی خواب ایسا تری صورت جو دکھلائے
بچھڑ کر تجھ سے کس منزل پہ ہم تنہا چلے آئے
شاعر ۔ بمبئی

تیری گلی سے چھٹ کے نہ جائے اماں ملی !
اب کے تو میرا گھر بھی مرا گھر نہ ہو سکا !
تیرے نہ ہو سکے تو کسی کے نہ ہو سکے
یہ کاروبار شوق مکرر نہ ہو سکا
یہ بھی ہم بھول گئے نام ہمارا کیا تھا
پوچھ کر گردشِ دوراں سے تباہ ہم کو
یا ہمیں قید کرو محبسِ تنہائی ..... میں
یا اسی دشمنِ جانی سے ملا دو ہم کو
ہم بھولتے جاتے ہیں اس چہرۂ زیبا کو
اے خواب ذرا اس کی صورت تو دکھا جانا

غرض آدھی سے زیادہ غزلیں ایسے اشعار سے بھری ہوئی ہیں ۔ ان میں یکساں جذبے اور خیال کے باوجود حسن اور تاثیر ہے ۔ ان کے نیچے میں شاعر کا دل دھڑکتا ہے اور پرانی آوازوں کی تہوں کے اندر اس کی اپنی آواز کی تہیں آہستہ آہستہ کھلتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں ۔ یہ خلوص اور صداقت کے بغیر ممکن نہیں ۔

ٹیکنیک کے اعتبار سے ان اشعار میں میر اور فراق کی سی پرکار سادگی ہے ۔ یہ بیجا تشبیہوں اور استعاروں کی مارواڑی عورتوں کی طرح آراستہ نہیں ہیں ۔ اور نہ ان میں فکر اور جذبے کی کوئی پیچیدگی ہے ۔ زبان کو بھی نیا انداز دینے کی کوئی کوشش نظر نہیں آتی ۔ یہ کلاسکیت کے رچے ہوئے مذاق کی غمازی کرتی ہیں ۔ یہ حسن اور سادگی " نئی شاعری " کے مدرسۂ فکر میں بار نہیں پا سکتی ۔ ان میں وہ ٹوٹی ہوئی شخصیت بھی نہیں ہے جسے " نئی شاعری " آج کا انسان کہہ کر ابھارنا چاہتی ہے ۔ صرف زخم خوردہ شخصیت ہے جو اپنی لیلیٰ کے کھو جانے کا ماتم کر رہی ہے آج وہ ایسا شعر کہنے پر قادر نہیں ؎

چاہے اب نجد کا ہر ذرہ مخالف ہو جائے
قیس ہیں ہم تو ہر حال میں لیلیٰ کی طرف !

اور یہاں رومانی لیلیٰ اور سماجی لیلیٰ کی تفریق ممکن نہیں ہے ۔ کوئی شاعر آدرش کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ۔ اس سے مراد نہ تو سیاسی پارٹیوں کی پالیسی ہے اور نہ کوئی منظم فلسفہ ۔ صرف حسن و خیر کی تلاش اور وہ بھی آج کے حالات میں ۔ مخصوص ماحول میں جو گذشتہ ماحول اور حالات سے مختلف ہے شاعر کو اس کے تصور کی لیلیٰ کے قریب لے جا سکتی ہے ۔ پرانی کھوئی

(باقی صفحہ ۱۸۷ پر دیکھئے)

علی جواد زیدی

ترقی پسند ادبی تحریک

"اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" خلیل الرحمن اعظمی کی تازہ ترین تصنیف ہے۔ مصنف ایک دور میں خود ترقی پسندی کی تحریک سے وابستہ رہ چکے ہیں اس لئے ان کی یہ تصنیف قابلِ اعتماد مواد پر مبنی ہے۔ بعد میں وہ اس تحریک سے کچھ علاحدہ سے ہو گئے ہیں اس لئے وہ اس تحریک پر معروضی انداز میں سوچنے اور اس کا معروضی جائزہ لینے میں کامیاب ہوئے ہیں۔

ترقی پسندی پر یہ پہلی کتاب نہیں ہے۔ اختر حسین رائے پوری، عزیز احمد اور علی سردار جعفری اس موضوع پر پہلے بھی قلم اٹھا چکے ہیں۔ اور پھر مضامین و مقالات کے انبار ہیں۔ خود سجاد ظہیر کی "روشنائی" تحریک کی ایک اہم دستاویز ہے۔ خلیل الرحمن نے ان سارے مواد سے استفادہ کیا ہے اور پھر اپنی بے لاگ رائے دی ہے۔ یہ کتاب ترقی پسند ادب کی تنقید تو کرتی ہے لیکن کہیں پر یہ احساس نہیں ہونے پاتا کہ مصنف کا رویہ مخالفانہ اور معاندانہ ہے۔ خلیل الرحمن نے اس تحریک کے اکتسابات کا جائزہ لینے سے کوتاہی نہیں کی ہے۔ اور ترقی پسند ادب کے کارناموں اور انفرادی طور پر شاعروں اور ادیبوں کے اکتسابات پر ژرف نگاہی اور ناقدانہ بصیرت و دیانت کے ساتھ اظہار رائے کیا ہے۔ انہوں نے ادب پر بحیثیت مجموعی بحث کی ہے اور صرف شاعری ہی کے مجموعے پر ہی نظر نہیں ڈالی ہے، افسانہ، ناول، ڈرامہ، تنقید سب کچھ اس کی گرفت میں آ چکی ہے۔ تنقیدیں بے لوث ہیں۔ اور ستھرے ذوق، جمالیاتی احساس اور عصری میلانات کے گہرے تجزیے کا پتہ دیتی ہیں۔ انہوں نے خصوصیت سے اس دور کے اہم شاعروں اور ادیبوں پر علاحدہ علاحدہ بھی اظہارِ خیال شاعر بھی

کیا ہے۔ اور رجحانات کے ذیل میں بھی جا بجا اُن کا ذکر آ گیا ہے۔ یہ سب خوش سلیقگی، توازن اور ایجاز کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اور اس کامیاب کوشش پر خلیل الرحمن اعظمی ہمارے شکریے کے مستحق ہیں۔

ترقی پسندی کی بعض بے راہ رویوں کا بیان کچھ ضرورت سے زیادہ طویل ہو گیا ہے۔ اس لئے اور بھی کہ جس خامی کو فرد یا تحریک خود تسلیم کرے اسے کم از کم اس توبہ کا درجہ تو ملنا ہی چاہیئے جو مذہب نے گناہ وغیرہ کے ساتھ ہی روا رکھا ہے۔ مثلاً وہ خطیبانہ اور متشددانہ انداز جو بعض شعراء نے ابتدا میں اپنایا تھا۔ مخصوص ذہنی اور جماعتی محرکات کا آئینہ دار ہے۔ اسے خود انہیں شعراء نے عملی اور نظریاتی اعتبار سے رد کر دیا ہے۔ اس لئے اس کو تمام تحریک پر تھوپنا اس لئے جائز نہیں کہ تاریخ کے ارتقائی عمل میں اس کی حیثیت پلک کی جھپک سے زیادہ نہیں ہے۔

خلیل الرحمن اعظمی نے جوش، ساغر، روش کو ترقی پسندوں کی صف میں اس لئے شامل نہیں کیا ہے کہ وہ اس کے پہلے قوم پروری کی روایت کی آغوش میں پلے تھے۔ یہی حال پریم چند اور ان کے ساتھیوں یعنی سدرشن، علی عباس حسینی اور اعظم کریوی وغیرہ کا ہے۔ یہ لوگ قومی روایت اور ترقی پسند روایت کے درمیان پل کی ہی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ یہ وہ افراد ہیں جن کی مساعی سے بہت سی راہیں نکلی ہیں اور بہت سے ترقی پسند طرزِ اظہار وغیرہ کے اعتبار سے انکی روایت کو آگے لیکر بڑھے ہیں۔ میرے خیال میں یہ پہلو کچھ تشنہ رہ گیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے ان اندرونی تضادات پر بھی تفصیلی بحث نہیں کی ہے جو محض تحریک کے بطن سے اُبھرے ہیں اور جن کے باعث تحریک نے اپنے اکتسابات و مرقومات کا محض جائزہ لینا شروع کیا۔ یہ سلسلہ ۱۹۴۱ء سے شروع ہوچکا تھا۔ کچھ انفرادی انحرافات پہلے بھی مل جائینگے۔

پروفیسر احتشام حسین کی تنقید کے بارے میں خلیل سے بعض بنیادی اشارات سے اتفاق رائے رکھتے ہوئے بھی میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ یہ تنقید تعزئیلی کی شکار ہوگئی ہے۔ احتشام کے اس مقولے سے تو خلیل الرحمٰن بھی متفق ہیں کہ مواد اور ہیئت کے میل ہی سے خوبصورت ادبی مرقع تیار ہوسکتے ہیں۔ لیکن یہاں سے وہ مواد کی تعریف میں اُلجھ گئے اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ تخلیقی ادب میں ادیب کا ذہنی اور حسی تجربہ ہی مواد ہے جبکہ غیر تخلیقی ادب میں موضوع کو مواد کہا جاسکتا ہے۔ گیا دونوں کے نقطہ ہائے نظر میں بہت کم فرق نہیں ہے۔ احتشام تین عناصر کو مانتے ہیں۔ مواد، ہیئت اور ان دونوں کا میل یا امتزاج۔ اس امتزاج کی بنیاد شاعر یا ادیب کے ذہنی اور حسی تجربے پر ہے اور وہ اس سے کس طرح عہدہ برآ ہوتا ہے۔ اسی پر اس کے تخلیقی کردار کا دار و مدار ہے۔ اگر ایسا ہے تو بحث صرف لفظی رہ جاتی ہے۔ رہا یہ امر کہ احتشام صاحب نے ادب پاروں کی پرکھ زیادہ تر تاریخی عوامل کے پس منظر میں کی ہے۔ جس سے فنی اور تخلیقی عمل کے دوسرے پہلو جا بجا دب گئے ہیں۔ اس کا احساس ہونا لازمی ہے۔

خلیل کی تنقید جمالیاتی اقدار کی حامل ہے۔ اُن کے طرزِ گفتار میں سادگی اور پرکاری ہے اور تحقیق کے معاملے میں وہ تلاش، جستجو، تجزیہ کسی سے پہلو تہی نہیں کرتے۔ ان کی موجودہ تصنیف ہمارے تنقیدی ادب میں ایک گراں قدر اضافے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس نے حقائق کے چہرے سے بہت حد تک گرد و غبار صاف کر دیا ہے اور بہت ہی مفید مواد یکجا کر دیا ہے۔

(ریڈیائی تبصرہ) OO

بقیہ ۱۸۵ ۔ نیا عہد نامہ

ہوئی لیلیٰ تو کبھی نہیں ملے گی لیکن نئی لیلیٰ کی تلاش کے لئے نجد کے ہر ذرے سے دست و گریباں ہونا پڑے گا۔

اس نئے آدرش کی تلاش خلیل صرف اپنی شخصیت کی بازیافت سے کرسکتے ہیں۔ اور اس میں ماحول کی بازیافت شامل ہے یہی عمل فرد کی جستجو ہے جو آدرش کا تعین کرتا ہے اور یہ آدرش خلیل کی شاعری میں کہیں کہیں جھلکنے لگتا ہے ؎

وادیٔ غم میں مجھے دیر تک آواز نہ دے
وادیٔ غم کے سوا میرے پتے اور بھی ہیں

مرے لہو سے معطر ترے لبوں کے گلاب
تری وفا سے کنول میرے دل میں کھلتے ہیں

دھڑک رہا ہے مسرت سے کائنات کا دل
کبھی کے بچھڑے ہوئے دوست آج ملتے ہیں

آج ڈوبا ہوا خوشبو میں ہے پیراہنِ جاں
اے صبا کس نے یہ پوچھا ہے مرا نام و نشاں

آتے ہوں ملن کی گھڑیاں
سورج کہیں غم کا ڈوبتا ہو

مہکی مہکی ہو شب کی دلہن
کچنار کہیں پہ کھل رہا ہو
ہر موڑ پہ اک نیا خدا ہو

وہ ذوقِ فردا جو ان خوبصورت جھروکوں سے جھانک رہا ہے اس کو ایک پیکر دینے کی کاوش خلیل کی شاعری کا مستقبل ہے اس کے لئے میر کی فرہاد کی لے کافی نہ ہوگی۔ اس انانیت اور بے دماغی کو بھی حاصل کرنا پڑے گا جس نے میر کو ٹیڑھا بانکا بنا دیا ہے۔

ہاتھ دامن میں ترے مارتے جھنجھلا کے نہ ہم
اپنے جامے میں اگر آج گریباں ہوتا

آخر میں چند الفاظ خلیل کی ہجویات کے بارے میں وہ بہت ہی بے کار ہیں اور ٹاٹ کا پیوند معلوم ہوتی ہیں۔ ترقی پسند شعرا نے جو ایجی ٹیشن نظمیں کہیں ان میں کم سے کم آزادی کا جذبہ تھا اور ظفر علی خاں اور شبلی کی روایت تھی۔ خلیل کی ہجویات ان نظموں سے بھی زیادہ کم صورت ہیں۔ اگر یہ بات کہنا ہی تھی تو اس کے لئے دیباچے میں جگہ نکالنی چاہیے تھی۔ OO

(گفتگو سہ ماہی بمبئی ۱۹۶۷ء)

ڈاکٹر قمر رئیس

ترقی پسند ادبی تحریک

خلیل الرحمٰن اعظمی کی تصنیف "ترقی پسند ادبی تحریک" دراصل اعظمی صاحب کا ڈاکٹریٹ کا وہ مقالہ ہے جس پر انہیں ۱۹۵۷ء میں علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے یہ ڈگری تفویض کی تھی۔ لیکن بعض حالات کی بنا پر یہ مقالہ پندرہ سال بعد یعنی ۱۹۷۲ء میں شائع ہوا۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ گذشتہ پندرہ سال کی مدت میں ڈاکٹر اعظمی نے ترقی پسند تحریک اور اس کے بعض نمائندہ ادیبوں کے بارے میں "ہماری زبان" کے کالموں اور بعض دوسرے رسائل میں متعدد مضامین لکھے۔ اس کتاب کا مطالعہ کرتے ہوئے مجھے احساس ہوا کہ بعض مسائل کے بارے میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار اپنے مضامین میں کیا ہے اس مقالہ میں انہیں مسائل کے بارے میں ان کا طرزِ فکر دوسرا ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان کی کس رائے یا رویّے کو آخری اور مستند مانا جائے۔ اس کتاب کا اختتامیہ "پس لفظ" کے عنوان سے انہوں نے جون ۱۹۷۱ء میں لکھا ہے۔ اس میں بھی انہوں نے ترقی پسند ادب یا تحریک کے بارے میں اپنے نقطۂ نگاہ یا خیالات کی تبدیلی کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ اس مقالہ میں انہوں نے جن خیالات کا اظہار کیا ہے اس پر آج بھی وہ قائم ہیں۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ اس مقالہ میں انہوں نے حقائق کے تحلیل و تجزیہ کے بعد جو نتائج اخذ کئے ہیں ان کا موازنہ اُن تاثراتی مضامین اور تبصروں سے نہیں کرنا چاہیئے، جو بعض معاصرانہ چشمکوں یا ہنگامی ادبی مناقشوں کی تحریک پر لکھے گئے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ان چند باصلاحیت ادیبوں کی صف سے تعلق رکھتے ہیں جن کی ادبی سرگرمیوں کا آغاز اور ابتدائی نشوونما ترقی پسند تحریک کے زیر اثر ہوا۔ اور ایسے دقت شاعر بھی میں ہوا جب اس میں انتشار، گروہ بندی اور انتہا پسندی کے عناصر زور پکڑ رہے تھے۔ اس لئے وہ کچھ قدم اس کے ساتھ چلے اور پھر بیزار ہو کر ایک نئی راہ کی تلاش میں نکل پڑے۔ ایک تخلیقی فنکار کی حیثیت سے انہیں جو مقبولیت حاصل ہوئی اُس سے قطع نظر ایک دانشور ناقد اور محقق کی حیثیت سے بھی ان کو ایک اہم مقام حاصل ہے۔ اور ترقی پسند ادبی تحریک کا یہ مطالعہ انکی اعلیٰ تنقیدی صلاحیتوں کا مظہر ہے۔ اس کا سب سے نمایاں وصف معقول اور مستند مواد کی فراہمی، اس کی ترتیب و توضیح اور علمی طرزِ استدلال ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس تحریک کی کوتاہیوں، اس کے پیچ و خم اور اس کے بعض رہنماؤں کے فکری تضادات کی طرف انہوں نے جو اشارے کئے ہیں ان کی تعبیر سے اختلاف ممکن ہے لیکن انکی حقیقت سے انکار کی جرأت نہیں ہو سکتی۔ ابتدا سے آخر تک ان کا افہام و تفہیم کا طریقہ معاندانہ نہیں ہمدردانہ ہے۔ اس لحاظ سے یہ مقالہ ترقی پسند تحریک کے بارے میں سب سے مستند دستاویز کا درجہ رکھتا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنے مطالعہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّہ میں تاریخی طور پر اس تحریک کے آغاز و ارتقاء کا جائزہ لیا گیا ہے اور دوسرے حصّہ میں ترقی پسند ادبی سرمایہ کا مطالعہ ہے۔ یہ مطالعہ شاعری، افسانہ، ناول، ڈرامہ، رپورتاژ، طنز و مزاح، تراجم اور تنقید پر محیط ہے۔ اور ان تمام اصناف میں ترقی پسند ادیبوں کے کارناموں کا جائزہ ضبط و توازن سے لیا گیا ہے۔ اختر انصاری، مجاز لکھنوی، کرشن چندر، بیدی، سجاد ظہیر اور مجنوں گورکھپوری کے بارے میں ان کی بیشتر رائیں جچی تلی اور متوازن ہیں۔ مثلاً سجاد ظہیر کے بارے میں انکی یہ رائے ہے:

(باقی صفحہ ۱۷۷ پر دیکھیے)

مرتبہ: افتخار امام صدیقی

پردۂ دل پر ابھی باقی ہے تو

شمیم حنفی ○ افتخار امام صدیقی

افتخار۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کے سلسلے میں کچھ نام ایسے لئے جاتے ہیں جو ان سے بہت زیادہ قریب رہے ہیں ان قریبوں کے لئے آپ کا نام بھی لیا جاتا ہے۔ لہٰذا مرحوم کی شخصیت کے وہ گوشے جو عام لوگوں کی نگاہ میں نہیں ہیں اور جن سے ان کی شاعری پر ان کے فن پر اثر پڑ سکتا ہے یا پڑا ہے، ایسے گوشوں اور ایسی باتوں کے متعلق میں آپ سے کچھ معلوم کرنا چاہوں گا۔ دراصل ہر فرد کی زندگی کئی ٹکڑوں میں منقسم ہوتی ہے فن کاروں کے ساتھ تو عموماً ایسا ہی ہوتا ہے کہ وہ اپنی تحریروں میں کچھ ہوتے ہیں خطوط میں کچھ اور گفتگو میں کچھ اور ـــ

شمیم۔ یہ تو بڑا مشکل ہے کہ میں جو باتیں عرض کروں ان کے بارے میں یہ سوچوں کہ شاید یہ ایسی باتیں ہیں جن کا تعلق ان کی شخصیت کے ایسے گوشوں سے ہے جن پر کسی اور کی نظر نہیں پڑی۔ یہ ضرور ہے کہ خلیل صاحب سے میرے مراسم خاصے پرانے ہو چکے ہیں یعنی ۱۹۶۹ء میں میں علی گڑھ پہنچا تو شعبے میں ان کے رفیقِ کار کی حیثیت سے کام کرتا رہا، یہ تو براہِ راست ایک تعلق ان سے ہوا لیکن اس سے پہلے کہ جس زمانے میں میں اندور میں تھا خلیل صاحب سے گاہے گاہے خط و کتابت ہوا کرتی تھی اور خلیل صاحب کا دوسرا مجموعہ نیا عہد نامہ شائع ہوا تھا ایک کاپی مجھے بھی تحفتاً بھجوائی تھی اور وہیں سے دراصل ہمارے تعلقات کا آغاز ہوتا ہے اور باقاعدہ طور پر خلیل صاحب سے خط و کتابت ہوتی ہے اور جب بھی میں علی گڑھ گیا ہوں ان سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ خلیل صاحب بظاہر اتنے عام اور سیدھے سادھے قسم کے آدمی تھے کہ میں نہیں سمجھتا کہ ان کی شخصیت میں کوئی بہت ہی پراسرار یا پیچیدہ کوئی گوشہ ہو سکتا تھا خاص طور پر جن لوگوں سے وہ قریب تھے جن لوگوں سے وہ بے تکلف تھے ان کی نظر میں خلیل صاحب کی پوری شخصیت، ایک عام قسم کا محاورہ اگر استعمال کروں تو ایک کھلی کتاب کی طرح تھی یعنی وہ اپنے دوستوں سے ذاتی باتیں بھی کیا کرتے تھے اپنے نجی مسائل پر بھی گفتگو کیا کرتے تھے، اپنی ذاتی آراء کا اظہار بھی کرتے تھے، اشخاص کے بارے میں، کتابوں کے بارے میں، رویوں کے بارے میں ــ مجھے جو بات خلیل صاحب کی سب سے اچھی لگی وہ یہ تھی کہ خلیل صاحب کا بنیادی تعلق ادب تھا یعنی ادب سے ایسا گہرا اور سچا رشتہ میں نے اپنے زمانے میں بہت کم لوگوں میں دیکھا ہے۔ زبان سے کہنے کی بات اور ہے لیکن خلیل صاحب کا معاملہ یہ تھا کہ ادب گویا ان کا واقعی اوڑھنا بچھونا تھا وہ بے حد پڑھتے تھے ایک زمانے تو معمول یہ تھا علی گڑھ میں کہ شام کو میں اور وہ کم و بیش روزانہ چہل قدمی کے لئے ساتھ نکلا کرتے تھے اور راستے میں گفتگو ہوا کرتی تھی پھر ہم لوگوں کی مستقل بیٹھک خواجہ مسعود علی ذوقی کا گھر تھی، ہم لوگ ان کے یہاں بیٹھتے تھے اور باتیں ہوا کرتی تھیں اور دن بھر شعبے میں ملاقات رہتی تھی۔

خلیل صاحب کی گفتگو کا بیشتر، اسی فی صد حصہ جو تھا وہ ادب سے متعلق ہوا کرتا تھا اس میں بھی دلچسپ بات یہ تھی کہ خلیل صاحب کی گفتگو ادب پر حلقوں' یا خانوں میں بٹی ہوئی نہیں ہوا کرتی تھی، ایک بڑی اچھی بات میں نے ان میں محسوس کی، اور وہ یہ کہ خلیل صاحب معلم بہت اعلیٰ درجے کے تھے کہ ان کو ہر چند کہ اپنے زمانے کی ادب کی رفتار سے دلچسپی بھی تھی اور وہ اس میں شریک بھی تھے بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے زمانے میں بہت سی بحثیں خلیل صاحب ہی نے شروع کیں ـــــ وہ جو ایک آدمی ہوتا ہے اس کے ارد گرد جو تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ذہنی تبدیلیاں، فکری تبدیلیاں، جذباتی تبدیلیاں اور ادب پر ان کا اثر [illegible] سب سے متاثر تھے لیکن اسی کے ساتھ ساتھ خلیل صاحب ادب کا ایک انتہائی مربوط اور جامع تصور رکھتے تھے۔ میں نے انہیں بہت ہی گمنام یا کم جانے پہچانے شعراء کے بعض اوقات بڑے اچھے شعر پڑھتے ہوئے اکثر گفتگو میں سنا بات چیت کے دوران میں شعر ایسا سنا دیتے تھے کہ آپ چونک اٹھیں اور وہ بھی مشاہیر شعرا کے کہ آپ کی نظر سے بالکل نہ گزرے ہوں یا کم گزرے

ہوں کیوں کہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ ہم انتخاب پڑھ لیتے ہیں اور سمجھ لیتے ہیں کہ یہ کافی ہے۔ میر تقی میر کے ایک جیسے شعر سبھوں کو یاد ہیں۔ دراصل خلیل صاحب کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ ادب کو بڑی گہری نظر سے پڑھنے کے عادی تھے چیزوں کو بڑی دلچسپی سے پڑھتے تھے اور میں ان کی شخصیت کے اس پہلو سے خاص طور پر متاثر ہوں۔

حافظہ ان کا بہت اچھا تھا۔ اکثر یہ ہوا کہ میں جس زمانے میں علی گڑھ میں تھا اس زمانے کے مضامین جو میں نے لکھے ان میں کبھی کبھار مجھے کسی حوالے کی ضرورت پڑی یا کسی خاص چیز کی ضرورت پڑی اور خلیل صاحب سے اس کا ذکر آیا تو وہ کہتے کہ بھئی یہ بھی دیکھ لیجئے وہ بھی دیکھ لیجئے یہ چیز چھپی تھی، وہ چیز شائع ہوئی تھی۔ ایمانداری کی بات یہ ہے کہ میں نے اپنے زمانے میں ایسا حافظہ اردو کے کسی معلم اور استاد کا یا کسی ادیب کا نہیں پایا، یہ معلوم ہوتا تھا کہ نوک زبان پر ساری معلومات رکھی ہوئی ہیں ادب کی۔ کسی بھی موضوع پر بات کر لیجئے وہ مثالوں اور حوالوں کے ساتھ گفتگو کریں گے، رسائل پر ان کی نظر بہت گہری تھی۔ کتابیں جو چھپتی ہیں ان سے ہم اور آپ سبھی واقف ہوتے ہیں۔ لیکن گمنام رسائل تک سے ان کی واقفیت ہوتی تھی۔ ان کی تحقیقی و تنقیدی کتاب ترقی پسند ادبی تحریک کے لئے انہوں نے رسائل سے جتنا فائدہ اٹھایا بہت کم لوگ ایسا کر پاتے ہیں۔ تو یہ چند خاص باتیں تھیں خلیل صاحب کی۔ اب جہاں تک شخصی باتوں کا تعلق ہے تو میں نے عرض کیا کہ ان کی شخصیت بڑی ہی مانوس اور جانی پہچانی اور سیدھی سادھی تھی بات چیت جب کرتے تھے تو یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ کسی قسم کا حجاب ہے یا کچھ چھپانا چاہتے ہیں۔ بہت ہی گھریلو انداز ان کی بات چیت کا تھا، دوستوں سے اتنی دلچسپی ہوتی تھی کہ ان کے ذاتی مسائل میں دخل رکھتے تھے۔ میں خود جب علی گڑھ پہنچا تو میری رہائش کے سلسلے میں مجھ سے کہیں زیادہ وہ فکرمند تھے اور اس کا انتظام بھی انہوں نے ہی کیا تھا۔ ان میں بہرحال اس طرح کی خوبیاں بہت تھیں اور یہ ساری باتیں خلیل صاحب کے یہاں پیدا ہوئی تھیں بچپن کی تربیت سے، ان کی تربیت خالص مشرقی ماحول میں ہوئی تھی ان اقدار کا ان روایات کا انہیں بہت پاس تھا، ہمارے زمانے میں بہت سے لوگ ان باتوں کا ظاہر ہے کہ مذاق اڑاتے ہیں لیکن میں یہ سمجھتا ہوں کہ جب تک آپ کی زندگی ایک بہت ہی مربوط اور واضح نظام اقدار سے کوئی نہ کوئی رشتہ نہ رکھتی ہو تو نہ آپ اپنے لئے اچھے ہو سکتے ہیں اور نہ دوسروں کے لئے باعث راحت ہو سکتے ہیں۔ خلیل صاحب میں ایثار، تعلق کی پاسداری وضع داری کا لحاظ وغیرہ بہت تھا۔ اپنے بچپن کے دوستوں کو بہت یاد کیا کرتے تھے وہ دوست جو کہ کسی وجہ سے زندگی میں سماجی سطح پر کوئی ممتاز حیثیت نہیں پا سکے اور تعلیم نہیں حاصل کر سکے لیکن ان سب کی طرف میں نے خلیل صاحب کو کسی نہ کسی طرح جڑے ہوئے دیکھا۔

افتخار۔ خلیل صاحب کی شخصیت کے جن پہلوؤں کی طرف آپ نے اشارے کئے ہیں عموماً یہی تاثرات و خیالات دوسروں کے بھی ہیں لیکن اگر ان کا تجزیہ کیا جائے تو میرے نزدیک وہ جگہ جگہ سے ٹوٹے ہوئے، بکھرے ہوئے سے نظر آتے ہیں اور ایسا دراصل اس وجہ سے ہے کہ وہ ان رشتوں کی قربت سے محروم رہے جن کا تعلق گھر سے ہے، اپنوں سے ہے، شفقت اور محبت سے ہے ایسے افراد جب خارجی دنیا سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں تو ہمیشہ خلوص اور توجہ کے متلاشی رہتے ہیں، پیار بانٹتے ہیں اور یہی سمیٹنے کی خواہش بھی رکھتے ہیں۔ اعتبار و اعتماد، دوسروں کے لئے سوچنا، کرنا، بے چین رہنا یہ سب ایسے لوگوں کا خاصہ ہوتا ہے، بہرحال جیسا آپ نے کہا کہ آپ ان کی شاعری پر لکھ چکے ہیں اور یقیناً آپ کی گہری نظر ہے، یوں بھی جب آپ کسی موضوع کا انتخاب کرتے ہیں تو اس کا پورا حق ادا کر دیتے ہیں۔ آپ خلیل صاحب کے قریب بھی رہے اور ان کی شاعری پر گہری نظر بھی ہے تو آپ مختصراً ہی سہی مگر وہ خاص خاص باتیں جو آپ نے خلیل صاحب کی شاعری میں دیکھیں اور محسوس کیں وہ بتلایئے۔

شمیم۔ خلیل صاحب پر میں نے جو مضمون لکھا تھا اور جس کا آپ نے ذکر کیا وہ ان کی غزل گوئی پر تھا۔ یہ مضمون اس زمانے کا ہے جب میں خلیل صاحب کو ذاتی طور پر بہت زیادہ نہیں جانتا تھا اور شاید یہی وجہ ہے کہ میں نے جو باتیں ان کی شاعری کے سلسلے میں اپنے مضمون میں لکھی تھیں خاص طور پر ان کے دوسرے شعری مجموعے نیا عہد نامہ کے پیش نظر، تو جو کچھ اس وقت میں نے لکھا تھا میں سمجھتا ہوں کہ خلیل صاحب سے کوئی ذاتی تعلق نہیں تھا اس لئے اس میں کسی قسم کی جانبداری وغیرہ کو کوئی دخل نہیں اور واقعہ یہ ہے کہ خلیل صاحب کی شاعری کی بعض خوبیوں نے مجھے اس وقت متاثر کیا ہے۔ یہاں بھی یہ عرض کر دوں کہ نہ مجھے حرف آخر کہنے کا کوئی خبط ہے اور نہ یہ خیال کہ میں نے کوئی ایسی چیز دریافت کر لی ہے جس پر کسی اور کی نظر نہیں پڑی لیکن جب آپ نے سوال ہی کیا ہے تو پھر میں سوچ رہا ہوں اور میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ ان کی شاعری یاد کی جائے یا ان کے اشعار یاد آئیں ان کو پڑھا جائے

کہ ایک بنیادی سچائی جو کہ اچھے شاعر کے لئے ضروری ہوتی ہے مجھے خلیل صاحب کے یہاں محسوس ہوتی ہے۔ شاید اسی سچائی سے ان کے تعلق کا یہ ثبوت ہے کہ انہوں نے اپنے آپ کو کسی ایک مخصوص رنگ یا کسی ایک مخصوص طرزِ فکر یا یہ کہ تجربات کے کسی معیّنہ دائرے تک اپنے آپ کو محدود نہیں رکھا بلکہ جیسے جیسے ان کی شخصیت میں تبدیلیاں ہوتی رہیں ویسے ویسے انہوں نے اس کا اظہار کرنا شروع کیا۔ ابھی حال میں ایک تبصرے میں میں نے دیکھا کہ تبصرہ نگار نے اس بات کا بڑا مذاق اڑایا کہ خلیل صاحب عمر کے آخری دنوں میں مذہبی ہو گئے تھے۔ اب میری سمجھ میں نہیں آتا کہ شاعر ہونے سے اس بات کا کیا تعلق ہے۔ اگر وہ نعتیں سننے لگے تھے یا اگر وہ مذہبی ہو گئے تھے اور شعر بھی کہتے تھے تو سچی بات یہ ہے کہ زندگی میں جو کچھ تھا اس کا انہوں نے اظہار کیا یہ بات ایسی تو نہیں تھی جو آپ کے سماج میں یا امن میں کوئی خلل ڈالنے والی رہی ہو۔ ان کا نمازیں پڑھنا یا ان کا عبادت گزار ہونا تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ خلیل صاحب کے یہاں یہ بہت بڑی خوبی کی بات نظر آتی ہے ان کی شاعری میں ایک تو یہ کہ ان کا روایت کا شعور جو تھا وہ بڑا مضبوط تھا، اپنے زمانے کے اثرات تو انہوں نے قبول کئے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ہندوستان میں خلیل صاحب ہی کی غزل میں نئی غزل کے نشانات آپ کو سب سے پہلے دکھائی دیتے ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی ہے کہ انہوں نے اپنا رشتہ اپنی روایت سے ہمیشہ قائم رکھا اور اس رشتے کو انہوں نے توسیع دینے کی کوشش کی یعنی اسی رشتے کی توسیع کا عمل ہمیں ان کی شاعری میں ملتا ہے یہی وجہ ہے کہ خلیل صاحب کے یہاں اس قسم کی تجربہ پسندی ہمیں نظر نہیں آتی۔ مثال کے طور پر جو ہمارے زمانے کے بہت سے نئے شعرا کے یہاں ہے یعنی جن کے یہاں میں سمجھتا ہوں کہ روایت سے رشتہ نسبتاً کمزور ہے یا یہ کہ جو تبدیلیاں کا ایک ایسا شعور رکھتے تھے کہ ماضی کو کسی سطح پر قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہوتے تھے مگر خلیل صاحب کا معاملہ مختلف ہے۔ آتش پر انہوں نے بڑا اچھا کام کیا، میر سے انہیں بڑی گہری دلچسپی تھی تو ان سب باتوں کا اثر انہوں نے شخصی سطح پر جذب کیا تھا اور وہ ہمیں ان کی شاعری میں بھی نظر آتا ہے۔ اپنے زمانے میں غزل میں جو عام ڈھرا یہ چلا ہے کہ نئی غزل عبارت ہے ان موضوعات سے، تنہائی ہے، یہ ہے، وہ ہے، شہر کے مسائل ہوں، صنعتی تمدن کا ذکر ہو لیکن خلیل صاحب کے یہاں کوئی تجربہ مجھے مستعار نہیں معلوم ہوتا، میں یہ دعویٰ تو نہیں کر سکتا کہ ان کے جتنے تجربے ہیں وہ سارے ہی ان کے ذاتی تجربے ہی رہے ہوں گے لیکن کم از کم ان کی شاعری میں آنے کے بعد ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ ان کے سچے تجربے تھے۔ یہ بالکل ممکن ہے شاعری میں کہ کوئی تجربہ آپ کا ذاتی تجربہ نہ ہو کسی اور کے تجربے سے آپ نے اثر قبول کیا ہو اس کو آپ نے بیان کیا ہو لیکن خلیل صاحب کی خوبی یہ ہے کہ کم از کم اس تجربے کو اپنے شعور کی سطح پر جب اسے دیکھتے ہیں تو وہ تجربہ ان کا تجربہ بن جاتا ہے۔ میں تھوڑا سا روایت پسند آدمی بھی ہوں چنانچہ مجھے یہ بات بھی اچھی لگتی ہے کہ ان کے یہاں تبدیلیوں کا ایک بہت ہی خاموش عمل ملتا ہے کوئی شور نہیں مچاتے وہ، کسی قسم کی کوئی اتھل پتھل کوئی بہت بڑی تبدیلی، کوئی بڑا انقلاب آفریں عمل یہ سب نہیں دکھائی دیتا آپ کو۔ بہت خاموش تبدیلیاں مگر واضح طور پر ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اپنے زمانے کی جمالیات جو ترتیب پا رہی تھی اس زمانے میں یا ہمارے زمانے میں جو طرزِ فکر معاشرے کی طرف، زندگی کی طرف انسان کے اپنے ذاتی رویوں کے سلسلے میں جو تبدیلیاں بھی ہو رہی تھیں ان سب کے نشانات ہمیں خلیل صاحب کی غزل میں ملتے ہیں وہ بھی اس صورت میں کہ روایت سے ان کا رشتہ اس وقت بھی ہمیں معلوم ہوتا ہے چنانچہ میرا خیال یہ ہے کہ خلیل صاحب ہمارے ان شعرا میں سے ہیں جنھوں نے ادب کی بنیادی وحدت کو ہمیشہ اپنے پیشِ نظر رکھا اور اس کی تصدیق ان کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔

افتخار۔ آپ نے خلیل صاحب کی شاعری کا بہت اچھا تجزیہ کیا، روایت، ترقی پسندی اور پھر جدت کے امتزاج سے جنم لینے والی شاعری نے انہیں اہم بنا دیا مگر اس سے اختلاف ہو سکتا ہے اور عموماً یہ کہا بھی جاتا ہے کہ جدید غزل کے پیش روؤں میں خلیل صاحب کا نام نمایاں ہے یا یہ کہ جدید غزل کی ابتدا خلیل صاحب سے ہوتی ہے۔ دوسرا گروہ جس نے خلیل صاحب کو محض اس لئے یکسر نظر انداز کرنا شروع کر دیا کہ انہوں نے ترقی پسند تحریک اور اس کے زیر اثر تخلیق ہونے والے ادب کا نہایت ہی معروضی انداز میں جائزہ لیا تھا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ کسی ایک شاعر یا ادیب کو جذباتی ہو کر نہایت ہی جانبدارانہ انداز میں سارا کریڈٹ دے دینا اور دوسروں کو بھول جانا یا محض سرسری انداز میں ذکر کر دینا ادبی دیانت داری نہیں۔ ہماری پوری ادبی تاریخ میں قدم قدم پر ایسی کتنی ہی مثالیں بکھری پڑی ہیں۔ نظریہ، رجحان، روایت، عقائد، ترقی پسندی، جدیدیت کی باتیں کرنے والے جب انتہا پسندانہ روش اپناتے ہیں تو ایسی ایسی باتیں کرتے ہیں کہ حلق سے نیچے ہی نہیں اترتیں۔ ان مباحث سے قطع نظر آپ ترقی پسند تحریک سے خلیل صاحب کے انحراف، جدیدیت کے رجحان اور ان کے ادبی رویوں کے متعلق بتایئے۔

میں آپ سے عرض کردوں افتخار صاحب کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیل صاحب نے ترقی پسند تحریک کا جائزہ بہت ہی معروضیت کے ساتھ لیا ہے اور کہیں کہیں ان کی بعض آرا خاصی سخت معلوم ہوتی ہیں۔ پڑھنے والوں کو لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ان کا سبب بھی خلیل صاحب کی دیانت داری ہے اور یہ بھی میں عرض کردوں کہ خلیل صاحب کے انتقال کے بعد ان سے کوئی بات منسوب کرنا بغیر کسی بنیاد کے اچھی بات نہیں جیسے بہت سے لوگوں کی عادت ہے اور میں اس بات کو پسند نہیں کرتا جبکہ خلیل صاحب نے اکثر بعض جدید رویوں کی اتنی ہی شدت کے ساتھ مذمت بھی کی ہے یہ ہوتا تھا کہ انہوں نے کوئی نظم پڑھی یا غزل پڑھی اور ظاہر ہے کہ وہ اپنا ایک خاص ذوق رکھتے تھے، وہ اچھا رہا ہو یا برا بہرحال وہ ان کا اپنا ذوق تھا، اپنی ذہنی تربیت تھی تو اکثر میں نے دیکھا کہ اپنے معاصرین میں ایسا نہیں تھا کہ ہر جدید شاعر کو اہم سمجھتے ہوں یا یہ کہ جو جدیدیت کے نام پر کہی جا رہی ہے سب کی سب اچھی ہے۔ خلیل صاحب اس کے بالکل قائل نہیں تھے۔ ہم سب اپنی عمر کی کسی نہ کسی منزل پر ظاہر ہے کہ ترقی پسند تحریک سے متاثر ہوئے ہیں اور خلیل صاحب کا رشتہ ترقی پسند تحریک سے بہت گہرا اور سچا تھا۔ یہاں ذاتی گفتگو کا موقع نہیں لیکن میں آپ سے یہ عرض کردوں کہ عام سطح پر، سماجی سطح پر میں خود یہ محسوس کرتا ہوں کہ شاید ہمارے معاشرے کے دکھوں کا کوئی علاج سوائے سوشلزم کے اور کوئی نہیں لیکن ادب کا معاملہ یہ ہے کہ ادب کی الگ ڈسپلن ہوتی ہے، ظاہر ہے کہ کسی ایسی دکان پر جہاں مان لیجئے کہ غلہ بکتا ہے وہاں آپ جا کر پھولوں کا ہار خریدنے کی کوشش کریں تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرح کی معصومیت ہے۔ ادب سے یہ توقع کرنا کہ زندگی کی ایسی پیچیدگیاں یا زندگی کے ایسے مسائل جن کے حل کرنے کے لئے دوسری نوعیت کی سرگرمیاں ضروری ہوتی ہیں اس میں ادب کسی طرح سے ہماری معاونت کرے گا یہ میرے خیال میں ایک طرح کی سادہ لوحی ہے اور ادب کے عمل سے تھوڑی سی بے خبری کا بھی نتیجہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خلیل صاحب ادب کا ایک ستھرا ذوق رکھتے تھے اور اسے آلودہ کرنے پر تیار نہیں تھے۔ ابتدائی زمانے میں جب انہوں نے شعر کہنا شروع کیا تھا تو ترقی پسند تحریک کے عروج کا زمانہ تھا اور یہ ہمارے ادب کی روایت کی ایک غیر معمولی تحریک تھی اور اسی تحریک کا عمل فن میں بھی تھا اور اس کا جو رول رہا ہے اس سے انکار کرنا بھی ایک طرح کی جہالت ہے لیکن خلیل صاحب نے اپنے آپ کو اس دائرے کا قیدی نہیں بنایا۔ میری گفتگو بعض اوقات جعفری صاحب سے بھی ہوئی اور میں نے محسوس یہ کیا کہ سردار جعفری کے اپنے جو پرانے خیالات تھے بعض چیزوں کے سلسلے میں تو میں نے ان میں بھی بہت واضح تبدیلی محسوس کی۔ آپ کو یاد ہوگا کہ اقبال کے سلسلے میں ترقی پسندوں کا جو رویہ تھا بعد میں سب نے اس میں ترمیم کی اور بعض لوگوں کا رویہ ہی بالکل بدل گیا۔ خلیل صاحب کے یہاں بھی رفتہ رفتہ، جوں جوں شعور پختہ ہوتا چلا گیا، ان کی انفرادیت نکھرتی گئی۔ ظاہر ہے کہ خلیل صاحب ایک سوچنے والے آدمی تھے اور ہمیشہ سوچتے رہتے تھے۔ اپنے زمانے میں جو تبدیلیاں ہو رہی تھیں اور دنیا بھر کے ادب میں ہو رہی تھیں وہ تو ہندستان تک محدود نہ تھیں، ان سب سے وہ باخبر تھے۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اس قسم کی باتیں کس قدر احمقانہ ہوتی ہیں کہ جو تبدیلیاں یورپ میں ہو رہی ہیں۔ ہمارے معاشرے میں بھی ہوں۔ بھئی ظاہر ہے کہ یورپ میں جو کچھ آج ہو رہا ہے وہ ہمارے یہاں کل ہو سکتا ہے۔ ایک چیز کو دوسری جگہ پہنچنے میں بہت زیادہ وقت نہیں لگتا ہے تو خلیل صاحب کے یہاں جو تبدیلی آئی ہے وہ ایک طریقے کا ارتقا ہے۔ یہ ترقی پسند تحریک سے کسی قسم کی کوئی ان کی مخاصمت یا ترقی پسند تحریک کی عظمت سے انکار پر مبنی نہیں ہے اور جدیدیت کے سلسلے میں بھی خلیل صاحب کا رویہ نو مسلموں کے جوش کی طرح نہیں تھا کہ صاحب ہر چیز اچھی ہے۔

افتخار۔ اردو ادب کی تاریخ دراصل روایت، ترقی پسندی اور جدیدیت سے عبارت ہے اور ارتقا کی بھرپور علامتیں ہی اس کے مظاہر ہیں۔ ہر فنکار کا ذہنی سفر ان ہی مدارج پر مبنی ہے۔ تغیّر اور تبدّل ہر فنکار کیلئے ضروری ہے۔ کسی ایک نظریئے یا عقیدے سے وابستہ ہو کر اسی کے دائرے میں قید ہو جانا کسی بھی فن کار کو بہت دیر تک زندہ نہیں رکھ سکتا۔ خلیل صاحب نے اس نکتہ کی حقیقت کو پالیا تھا اور جن لوگوں نے اس حقیقت کو سمجھا وہ ادب میں نمایاں ہو گئے۔ آپ نے خلیل صاحب کے ذہنی سفر اور فنی ارتقا کے تجزیئے میں جو کچھ کہا وہ دوسروں کے لئے بھی مفید ہو سکتا ہے ایک بات اور وہ یہ کہ خلیل صاحب جہاں ایک اچھے شاعر تھے وہیں ایک اچھے ناقد بھی تھے بلکہ کچھ لوگوں کا کہنا یہ ہے کہ وہ نقاد کی حیثیت سے زیادہ اہم تھے اور یوں بھی ان کے تنقیدی مضامین چونکا دینے والے اور عام روش سے ہٹے ہوئے تھے یہی وجہ ہے کہ انہیں بہت زیادہ سراہا بھی گیا اس کے باوجود خلیل صاحب کو وہ درجہ نہیں دیا گیا جس کے وہ مستحق تھے۔

شمیم۔ دیکھئے صاحب! ادب میں شہرتیں انتہائی جھوٹی بھی ہوتی ہیں اور سچی بھی ہوتی ہیں۔ دونوں صورتیں ہو سکتی ہیں اشخاص کے ساتھ۔ مثال کے طور پر ایک نقاد کا میرے ذہن میں خیال آتا ہے۔ محمد حسن عسکری، تنقیدی مضامین کے دو مجموعے ان کے شائع ہوئے، بہت سے ہمارے جغادری نقاد ہیں ان کی کتابوں کی فہرستیں پچیس اور چھبیس، تیس اور پینتیس تک پہنچتی ہیں بلکہ اب تو یہ ڈھب چل نکلا ہے کہ آپ کتابیں لکھنے کی زحمت سے بھی بچنا چاہتے ہیں تو کتابیں ترتیب ہی دیتے رہئے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ آخری فیصلہ جو ہوتا ہے ادب میں کسی شخص کی نظر کا اور اس کی قدر و قیمت کا تو اس بنیاد پر نہیں ہوتا کہ اس نے کتنا لکھا۔ ہے یا یہ کہ اس کا ذکر کتنا ہوا ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ آج ذکر نہیں ہوا ہے تو کل ہوگا۔ خلیل صاحب کا جہاں تک تعلق ہے تو میرا خیال ہے کہ وہ اپنے زمانے کے بہت سے کمتی نقادوں اور یہ کہ جنھوں نے بڑی کتابیں لکھیں یا بڑی کتابیں ترتیب دیں اور آئے دن اسی طرح کی کتابیں لکھتے ہی رہتے ہیں ان سے بہت مختلف تھے۔ ظاہر ہے کہ خلیل صاحب شہرت حاصل کرنے کے ان گروں سے ناواقف بھی تھے اور ان سے نفرت بھی کرتے تھے، ایک شریف آدمی میں جو نفرت قائم رہتی ہے اور جس کی طرف وہ اپنی انفرادیت کا تحفظ بھی کرتا ہے یہ بھی خلیل صاحب کے یہاں بات تھی کہ وہ سستے طریقے اور دوسرے تمام اوچھے طریقے شہرت حاصل کرنے سے وہ ہمیشہ متنفر رہے۔ تنقید کا معاملہ یہ ہے کہ جس طرح ان کی شاعری میں ہمیں تھوڑی سی خاموش تبدیلی دکھائی دیتی ہے اور یہ تبدیلیاں بہت پر شور نہیں ہیں اسی طریقے سے ان کی تنقید میں بھی ہمیں یہ نظر آتا ہے کہ ان کی تنقید کوئی ایسا جمالیاتی نظام نہیں وضع کرتی جو لوگوں کے لئے خبرنامے کی حیثیت رکھتا رہا ہو۔ یہ خوبی مجھے اپنے زمانے میں خلیل صاحب کے علاوہ سب سے زیادہ جس نقاد میں نظر آتی ہے ہندوستان میں وہ ہیں شمس الرحمٰن فاروقی، فاروقی کی خوبی یہ ہے کہ ان کی کلاسیکی بنیادیں بڑی مضبوط ہیں یعنی روایت سے باخبری کے بغیر کوئی اچھا نقاد کبھی نہیں ہو سکتا۔ فاروقی کی قوت بھی یہی ہے کہ وہ اپنی پوری روایت کے محاسن کا بہت ہی وسیع شعور رکھتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اپنے زمانے کی تبدیلیوں پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ خلیل صاحب کے یہاں بھی، یہی خوبی نظر آتی ہے۔ شبلی پر جو مضمون ہے یا فکر و فن جو ان کی تنقیدی کتاب ہے اس میں جوش کی شاعری پر جو مضمون ہے، میرا خیال ہے کہ جوش پر اپنی قسم کی یہ پہلی تنقید ہے۔ ان سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ خلیل صاحب کے یہاں ادب کا نہایت ہی لمبا اور مربوط تصور تھا۔ ادب کو خانوں میں رکھنے کے وہ قائل نہیں تھے چنانچہ وہ ادب کو ایک بڑے PROSPECTIVE میں دیکھنے کے عادی تھے۔ ظاہر ہے کہ اس PROSPECTIVE میں جب چیزوں کو دیکھتے تھے تو وہ ہمیں اتنی نئی اور اتنی انوکھی نظر نہیں آتیں جیسے ہمارے زمانے میں بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں یا یہ کہ ہمارے زمانے میں یہ ہوا کہ بہت سے لوگوں نے مغرب کے بعض نظریات کو اپنے سامنے رکھا اور یہ سمجھا کہ وہاں کے ادبیات میں اسی چیز کی تلاش فلاں صاحب نے کی تھی چنانچہ ہم اپنے یہاں فلاں کی نظم پڑھتے وقت یہ تلاش کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ اسی میں آپ کو قدم قدم پر دھوکے ہوتے ہیں اسی لئے کہ ادب کی روایت جو بنتی ہے وہ خالی زبان سے تو نہیں بنتی' زبان کا رشتہ ایک خاص کلچر سے ہوتا ہے ایک خاص سائکی سے ہوتا ہے، افراد کے ایک خاص گروہ سے ہوتا ہے' جب تک وہ سارا شعور آپ کے ذہن میں واضح نہ ہو تنقید میں کام چلتا نہیں یا یہ کہ آپ تند باتیں کہیں گے تو یہ ہوگا کہ لوگوں کو چونکائیں گی مشتعل کریں گی یعنی آپ تماشہ تو کر سکتے ہیں لیکن اس کی کوئی بڑی قدر و قیمت کبھی نہیں ہو سکتی۔ خلیل صاحب کے یہاں خوبی یہی ہے کہ ان کے یہاں جس طرح شاعری میں کسی قسم کا کوئی تماشہ نظر نہیں آتا حالانکہ تھوڑا بہت تخلیقی ادب میں ہونا چاہئے اور اس کے بغیر بہت سے مسائل حل ہونے سے رہ جاتے ہیں لیکن خلیل صاحب کے یہاں شاعری میں جس طرح کوئی غوغا نہیں ملتا اسی طرح آپ دیکھیں گے کہ تنقید میں بھی ان کا کلاسیکی نظم و ضبط اور اس کی بنیادیں بڑی مضبوط ملتی ہیں۔ اپنے زمانے کے ادب پر جو انہوں نے تنقیدیں لکھی ہیں اس تنقید میں بھی ہر چند وہ نشانات ملیں گے جو معلموں کی تنقید میں ہوتے ہیں یعنی جسے تھوڑا سا اکاڈیمک تنقید کہہ لیجئے جو بعض اوقات طنز و ملامت کا ہدف بھی بنتی ہے لیکن خلیل صاحب نے ان حدود میں رہنے کے باوجود اپنی بصیرت کا اظہار کیا اس سے پتہ یہ چلتا ہے کہ وہ ادب کا جو تصور رکھتے تھے وہ فیشن یا یہ کہ مستعار قسم کے جو خیالات ہوتے ہیں ان سب چیزوں سے بہت دور تھے خلیل صاحب کی تنقید پائداری کی ایک صفت رکھتی ہے۔ انہوں نے مختلف شعراء کے جو تجزیے کئے ہیں وہ ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھے جائیں گے۔ اب رہی یہ بات کہ بہت سے لوگوں نے اعتراف نہیں کیا، نہیں کیا اس سے خلیل صاحب کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ہے۔ ویسے ایک اچھا خاصہ حلقہ ہے جو خلیل صاحب کی ان خوبیوں کا معترف ہے اور یہ بھی جانتا ہے کہ ہماری ادب کی پوری تحریک میں خلیل صاحب کا جو رول رہا ہے وہ بہت ہی زیادہ POSITIVE ہے۔ انہوں نے ایک انتہائی سرگرم ادیب کی زندگی گزاری ہے، شروع سے آپ دیکھئے کہ کلاسیکی ادبیات سے ان جوان کا رشتہ تھا اور کلاسیکی ادب پر مضامین وہ لکھتے

رہے اور اپنے زمانے کا جو بھی واقعہ یا جو بھی کتاب شائع ہوئی خلیل صاحب کہیں نہ کہیں کسی نہ کسی طرح اس سے اپنا رشتہ ضرور جوڑتے تھے۔ کوئی بحث کر لی گفتگو۔ ادھر وہ اپنی خرابیٔ صحت کی وجہ سے بہت سی چیزیں نہیں لکھ سکے جو وہ لکھنا چاہتے تھے۔ لیکن یہ کہ خلیل صاحب نے ایک فعال اور سرگرم ادیب کی زندگی گزاری ہے اور سب سے بڑی خوبی کی بات یہ ہے کہ مدرسے میں رہتے تھے اور میرا خیال یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں جو ماحول ہے ادب کا وہ ادب کشی کا ماحول ہے اور ایسے ماحول میں اپنے ادبی ذوق کی طہارت کو بچائے رکھنا یا یہ کہ اپنے آپ کو بغیر کسی جبر یا ترغیب کے اپنی دلچسپیوں کو قائم رکھنا یہ بھی خلیل صاحب کی شخصیت کی زبردست خوبی تھی۔

بہرحال اب تو خلیل صاحب نہیں رہے اور میں کبھی کبھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ اتنے عزیز اور ساتھی، دوست کے بچھڑ جانے کے بعد حالانکہ خلیل صاحب کی اور میری عمر میں خاصا فرق تھا اور ان سے میری کوئی بے تکلفی نہیں تھی لیکن یہ کہ خلیل صاحب سے جو قربت اور جو تعلق تھا تو ان کی موت کے بعد میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ خود میری ذات کا ایک حصہ خلیل صاحب کے ساتھ ساتھ ختم اور منہدم ہو گیا ●

ڈاکٹر گوپی چند نارنگ ○ محمود ہاشمی ○ افتخار امام صدیقی

افتخار۔ خلیل صاحب کے متعلق گفتگو کرتے ہوئے میں یہ چاہوں گا کہ شخصیت کو علیحدہ رکھتے ہوئے پہلے ان کی شاعری اور اس کے بعد ان کی تنقید نگاری پر آپ دونوں حضرات اس طرح گفتگو کریں کہ ان کی شاعری کے وہ گوشے اور تنقید نگاری کی وہ خصوصیات جو ان کے فن کا تعین کرتی ہیں، ان کی اہمیت کو نمایاں کرتی ہیں اس طرح کہ خلیل صاحب کو پڑھنے والے اور ان پر تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والوں کو آسانیاں بہم کر سکیں۔ سب سے پہلے ہم اپنی گفتگو کا آغاز خلیل صاحب کی شاعری سے کریں گے۔

خلیل مرحوم نے شاعری میں نظم و غزل دونوں ہی میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے شعری لہجے میں میر کی شاعری کا عکس پایا جاتا ہے۔ مگر جب یہ کہا جاتا ہے کہ خلیل نے غزل سے کہیں بہتر نظمیں کہی ہیں؟ اس خیال کو لیتے ہوئے ہم ان کی پوری شاعری پر مختصراً گفتگو کریں گے۔

ہاشمی۔ افتخار صاحب! ہمارے ساتھ ڈاکٹر نارنگ موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ اس زمانے میں جس ادب اور نسل کا تعلق خلیل صاحب سے ہے، سب سے بہتر یہ کہہ ہیں، اپنے خیالات کا اظہار بہتر ڈھنگ سے کریں گے میں صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ ان کا پہلا مجموعہ کاغذی پیرہن اس وقت شائع ہوا جب میرے ان کے تعلقات اور دوستی کو تقریباً تین چار سال ہوئے تھے اور اس وقت تک وہ باقاعدہ علی گڈھ مسلم یونیورسٹی میں لکچرار نہیں ہوئے تھے۔ اس سے پہلے ان کے مضامین کا ایک مجموعہ شائع ہوا تھا۔ فکر و فن کے نام سے اور اتفاق سے میں ہی اس کی کچھ کاپیاں دلی سے علی گڈھ لے گیا تھا اس لئے کہ خلیل صاحب کا انٹرویو ہونے والا تھا اور وہ انٹرویو میں پیش ہونے والے تھے۔ خلیل صاحب ایک ناقد کی حیثیت سے اور ایک بہت بے باک، جرأت مند، حوصلہ مند کی حیثیت سے پہچانے گئے اور خود آپ کو یاد ہوگا کہ جوش صاحب پر خلیل صاحب نے ایک مضمون لکھا تھا اس کے جواب میں شائع ہونے والے مضامین میں ایک "رد" شاعر میں بھی شائع ہوئے تھے۔ اسی طرح ان کے اور دیگر مضامین کی ایک دھاک چونکہ بیٹھی ہوئی تھی اس لئے جب ان کا شعری مجموعہ آیا تو لوگوں نے اسی توقع کے ساتھ پڑھا کہ ایک ایسے ناقد کا شعری مجموعہ ہے جس نے اپنے زمانے میں خاصے بڑے بتوں کے خلاف آواز بلند کی ہے اور یہ کہ کم از کم کلاسیکی ادب کو نئے انداز میں پرکھنا چاہا ہے اس لئے کہ ان کا آتش والا مضمون شائع ہو چکا تھا۔

کاغذی پیرہن کی شاعری دراصل اس دور کے محاذ ہے جب ترقی پسند تحریک سے ٹوٹ کر کچھ شعرا اپنی انفرادی فکر کو اور اپنے احساس کو اپنے اشعار میں بیان کرنا چاہتے تھے چونکہ یہ زمانہ جسے ایک عبوری عہد کہا جا سکتا ہے، بہت سی تبدیلیاں واقع ہو رہی تھیں اور کئی آوازیں بہ یک وقت سامنے آئی تھیں جس میں ناصر کاظمی، خلیل الرحمن اعظمی اور ابن انشا وغیرہ کا نام خاص طور پر میں لے سکتا ہوں جو ابھر کر سامنے آئے تھے اور انھیں دنوں ان حضرات کے شعری مجموعے بھی شائع ہوئے تھے، پڑھنے والوں نے خلیل صاحب کو بالکل مختلف انداز سے پڑھنا چاہا اور ان کی توقعات بھی اس سے پوری ہوئیں

اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ نظم جس میں الفاظ کا گرم جوشانہ رویہ بہت زیادہ حاوی ہو چکا تھا۔ ترقی پسند تحریک کے اثرات سے وہ خلیل کے یہاں بہت کم تھا اور ان کی لفظیات میں مفاہیم کی تہہ داری بہت نمایاں تھی۔ دوسری بات یہ کہ انہوں نے اس ہجوم میں جو ترقی پسند تحریک کا تھا اپنی بات کہنے کی کوشش کی جو اس زمانے میں بہت کم لوگ اپنی بات کہتے تھے۔ اس اعتبار سے مجموعہ اور ان کی نظمیں بہت مقبول ہوئیں اور ان کی غزلوں کے بارے میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ اس میں میر کی بازیافت یا میر کے لب و لہجہ کی تجدید کی کوشش ہے تو میں ان تمام لوگوں کو یاد دلانا چاہوں گا وہ مضمون جو ناصر کاظمی نے لکھا تھا میر کے بارے میں اور جس میں انہوں نے بتایا تھا کہ میر ہمیں اپنے قریب کیوں محسوس ہوتا ہے اور ایک بڑا مشہور جملہ تھا ان کا کہ میر کے زمانے کی رات ہمارے زمانے کی رات سے آملی ہے۔ ایک عجیب عبوری کا عہد ہے جس میں ہم لوگ زندہ ہیں اسے ایک خاص قسم کی شکست تو میں نہیں کہوں گا۔ خستگی کہنا چاہئے اسے اضطراب کہنا چاہئے اسے وہ تھا جو اپنے دھیمے لہجہ کی وجہ سے ایک سوز کی کیفیت میں، ایک افسردگی میں ڈھل گیا تھا۔ خلیل صاحب کی کچھ غزلوں میں یقیناً ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ میر کے لب و لہجہ کی بازیافت ہے لیکن زیادہ تر غزلیں ان کی ایسی نہیں تھیں اس کے بعد ان کا دوسرا شعری مجموعہ آتا ہے جو نیا عہد نامہ ہے۔ خلیل صاحب کی شاعری دراصل اس عہد سے گزرنے کے بعد بالکل ایک نئے دور میں داخل ہوتی ہے۔ اور وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ ہمارا زمانہ ایسا زمانہ ہے جب NORMAL ATTITUDE جو ادب میں رواج پا چکے تھے مثلاً یہ کہ وہ تمام لوگ جو خود کو اپنے گھروں سے نکال کر شاعری کرتے تھے، خود کو ترقی پسند یا کمیونسٹ کہلوانا پسند کرتے تھے اور بال بڑھا کر یہ سمجھتے تھے کہ ABNORMAL جو ہے وہی زندگی کا شاعرانہ رویہ ہے، اس کے برخلاف ایک ABNORMAL ATTITUDE ایک ایسی وابستگی جو انہیں اپنے گھر سے تھی، اپنے ماحول سے تھی اپنی بیوی سے تھی، اپنے بچے سے تھی، اسی دور کی زیادہ تر نظمیں نیا عہد نامہ میں شامل ہیں۔ اور یہ نظم خاص طور سے یعنی نیا عہد نامہ دراصل ان کے پہلے بچے کامران کے نام ہے اور چونکہ زندگی کا ایک بڑا مثبت رویہ انہیں میسر تھا۔ ایک تو مطالعہ کی آسودگی، زندگی کی آسودگی اور زندگی کو ایک نئے انداز سے نئے معنی تلاش کرنے کی جستجو تھی۔ یہ تمام کیفیات ان کی نظموں میں جو نیا عہد نامہ میں شامل ہیں۔ موجود ہیں۔ اس مجموعے میں کچھ نظمیں ایسی بھی ہیں جن کو بہت عرصے تک ہمارے کئی دوستوں نے یاد رکھا۔ مثلاً ایک نظم ان کی اپنے گھر کی زندگی پر تھی جس میں پہلی مرتبہ اردو شاعری نے گھر کے آنگن میں بچھا ہوا پلنگ اور گھر کے باورچی خانے سے اٹھنے والے دھوئیں سے رومانی اور شاعرانہ کیفیت کا احساس دلایا، چونکہ یہ کیفیات بالکل معدوم ہو چکی تھیں۔ انسان بھیڑ میں اپنے آپ کو گم دیکھ کر یا اس بھیڑ کے خلاف نعرہ لگا کر خوش ہوتا تھا اس لئے خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنی نظموں میں ایک نئے آدمی کا تصور دیا جسے اپنی دھرتی سے، اپنے ماحول سے، اپنی زندگی سے اور اپنی زندگی کی مثبت اقدار سے وابستگی ہے۔ ان سب سے پوری طرح کسبِ لذت حاصل کرنے کی تمنا اس میں موجود ہے، جذبہ موجود ہے۔ یہ تمام خصوصیات خلیل صاحب کے دوسرے شعری مجموعے میں شامل تھیں۔

نارنگ صاحب میں آپ سے بھی پوچھنا چاہوں گا کہ افتخار صاحب نے جو یہ کہا اور عام طور پر کہا جاتا ہے کہ خلیل نے اپنی شاعری میں میر کے لہجہ کی تجدید کی ہے یا بازیافت کی ہے تو یہ کہاں تک درست ہے؟ نارنگ: بڑی حد تک یہ بات صحیح ہے لیکن اس کا کریڈٹ صرف ایک شاعر کو غالباً ہم دے نہیں سکتے کیوں کہ اس کا تعلق پورے عہد کے مزاج سے ہے۔ یہ زمانہ خوابوں کی شکست کا دور ہے اور ایک یاسیت کا دور ہے، تقسیم کے المیے سے دوچار ہونے کا دور ہے تو اس سب میں ایک داخلی شئے پوری شاعری میں ابھرتی ہوئی نظر آتی ہے اور اس میں نمایاں آوازیں بلاشبہ ناصر کاظمی کی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ابن انشا کی ہیں۔ خلیل کی شاعری کے بارے میں ہاشمی صاحب جو کچھ آپ نے کہا ہے ان میں سے بیشتر باتوں سے میں متفق ہوں اور مزید کچھ کہنے سے پہلے اس بات کی وضاحت ضروری سمجھتا ہوں کہ خلیل صاحب اپنی نسل کے بہت ہی معدودے چند ایسے لوگوں میں سے تھے جن کو ہم جامع حیثیت کہہ سکتے ہیں۔ اس زمانے کے یا ان کے ساتھ کے جو لوگ اور نام ان کے ساتھ ساتھ ابھرے ان میں بہت کم ایسے ہیں جو تنقید میں بھی، تحقیق میں بھی اور غزل و نظم اور ادب سے شناسائی اتنی گہری اور مکمل رکھتے ہوں جو خلیل صاحب کی تھی۔

شعر میں ان کے بڑھتا رہا اور ان کی طرف دل بھی کھنچتا تھا لیکن سب سے پہلے جس چیز پر میں نے وجد کیا، وہ تھے ان کے مضامین، رسالہ نگار میں سلسلے وار شائع ہونے والا مضمون آتش پر۔ اپنے زمانے میں یا کالج کے میگزین میں انہوں نے لکھا ہوگا کبھی نہ کبھی، میں نہیں جانتا لیکن سب سے پہلے جب ان کا نام ابھرا ہے تو ناقد کی حیثیت سے ابھرا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا تھا کہ یہ شخص اپنے ذہن سے سوچ سکتا ہے اور پوری اردو شاعری کی کلاسیکی روایات

کا عرفان رکھتا ہے۔ جس زمانے میں خلیل صاحب یہ مضامین لکھ رہے تھے اس عمر میں یہ بہت بڑی بات تھی چنانچہ اس کی انہیں داد بھی ملی۔ میرے نزدیک خلیل صاحب کی جو پہلی حیثیت ہے اور جسے ابھی پوری طرح سے پہچانا نہیں گیا ہے وہ ایک محقق کی ہے۔ دراصل میں یوں بھی قائل ہوں کہ اچھی تنقید نہایت ہی گہری تحقیقی آگہی کے بغیر وجود میں نہیں آتی جو بھی اچھا ناقد ہوگا اس کا حقائق کا علم نہایت ہی راسخ اور نہایت ہی صحیح ہوتا ہے اور یہ ایک فطری بات ہے لیکن جب ہم تنقید پر اصرار کرتے ہیں تو ہم یہ سمجھتے ہیں کہ اس کا تحقیق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تحقیق بنیادی چیز ہے اگرچہ ہمارے عہد میں تحقیق سے مراد بس یہ لی جاتی ہے کہ فلاں وہ گیری عیب جوئی اور متن کی تصحیح یا بعض سنین کی اصلاح کی طرح کی چیزیں جبکہ یہ سب ملا کر بھی ادبی تحقیق نہیں ہیں۔ تحقیق صحیح معنوں میں وہ ہے جسے انگریزی میں LITERARY SCHOLARSHIP کہتے ہیں۔ خلیل صاحب میں لٹریری اسکالرشپ کا پورا مادہ اور پورے جوہر موجود تھے یہی وجہ ہے کہ آتش پر جو ان کا کام ہے اس میں انہوں نے آتش کی شاعری کے ان گوشوں پر نظر ڈالی جس کا تعلق تنقید اور تحقیق دونوں سے ہے۔ آتش کو ہماری ادبی تاریخ نے نظر انداز کر دیا تھا خلیل صاحب نے آتش اور آتش کی شاعری کی طرف پوری اردو دنیا کو منعطف کروایا اور یہ کارنامہ ہماری ادبی اور تنقیدی تاریخ میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

ترقی پسند ادبی تحریک پر جو کچھ انہوں نے اپنی کتاب میں لکھا وہ بھی اپنی جگہ پر بے حد مکمل اور وقیع ہے اور کوئی بھی ایسا شخص جو تحقیق کا صحیح عرفان اور تحقیق کے تقاضوں کا صحیح احساس نہ رکھتا ہو اتنا شاندار کام نہیں کر سکتا جو خلیل صاحب نے کیا ہے، یہ بہت بڑا کام ہے۔ ان کارناموں کی وجہ سے بھی ان کی شاعری کچھ دب سی جاتی ہے کیونکہ ان کے جو تنقیدی مضامین ہیں وہاں اتنی ORIGINAL POSITION لیتے ہیں اور ایسی باتیں کرتے ہیں جیسا کہ محمود ہاشمی صاحب نے کہا ہے کہ انہوں نے بہت سے بڑے بڑے بت پاش پاش کئے" تو وہاں جو ان کے تنقیدی نظریات ہیں وہ بہت ہی CHALLENGING ہیں۔ مگر شعر میں وہ اتنے باغی نہیں ہیں اگرچہ باغی ہیں، اگرچہ ان کا ذہن جدید ہے اور وہ آدرش سے انحراف کرتے ہیں ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۵ء کے بعد پوری اردو شاعری کا جو مزاج بدلا ہے اور یہ بات بھی عرض کر دوں کہ شعر کا مزاج یا پوری ادبی روایات کا مزاج روز روز نہیں بدلا کرتا ایسا کہیں صدیوں میں ہوتا ہے اور غالباً حالی اور آزاد کے بعد خاص طور پر ۱۸۵۷ء کے بعد جس طرح سے شعر و ادب کا مزاج ہند و پاک میں بدلا ہے اور ایک تاریخی دور سے جس طرح ہم گذرے ہیں اس پورے عہد کی وہ تمام خصوصیات خلیل صاحب کی شاعری میں موجود ہیں لیکن اپنے عہد کی تمام خصوصیات کے انجذاب سے کوئی شاعر بڑا شاعر نہیں بنتا جبکہ خلیل صاحب اپنی شاعری سے کہیں زیادہ باغیانہ اور کہیں زیادہ CHALLENGING POSITION اپنی تنقید میں لیتے ہیں اور میری اپنی رائے یہ ہے اور میں غلط بھی ہو سکتا ہوں کہ اپنی تنقید کی وجہ سے، اپنی تحقیقی آگہی کی وجہ سے خلیل صاحب کا نام ہماری ادبی تاریخ میں بہت آگے تک جائے گا۔ جہاں تک شعر کا معاملہ ہے ظاہر ہے کہ انہوں نے پوری SPRIT کو پورے زمانے کے مزاج کو IMBIBED کیا۔ میرے نزدیک ان کی شاعری کی جو سب سے بڑی خوبیاں ہیں وہ ایک طرح کی ذہنی کشادگی ہے، ذہنی آزادی کا اظہار اور اس پر اصرار، دنیا کی نیت ... ایک ریلو فضا جس کی طرف ہاشمی صاحب نے اشارہ کیا۔ ساتھ ہی ساتھ اسلوب اتنا سادہ اتنا دلنشین ہے کہ دھیان میر کی پراکرائی روایت سے قریب تر دیتا ہے لیکن یہ بھی اس زمانے کی، اس عہد کی پوری شاعری کا مزاج ہے اور یہ ردعمل ایک طرح سے فطری بھی تھا کیونکہ فارسیت کی لے لئے ہوئے جو اسلوب چلا آرہا تھا تقریباً ایک صدی سے اس کا REACTION کسی نہ کسی تاریخی موڑ پر ہونا ناگزیر تھا۔ اردو میں شعر اور نثر میں اسلوب کی دو بڑی روایتیں ہیں کیونکہ اردو، پراکرائی اور فارسی، عربی عناصر کے درمیان ایک خوشگوار عناصر کے امتزاج کا نام ہے اور یہ خوشگوار امتزاج ایک IDIAL ہے ایک ABSTRACTION ہے، ایک لسانی آدرش ہے۔ کوئی بھی شخص اس لسانی آدرش کو سو فی صدی اپنا لے تو یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے ورنہ آدرش تو آدرش ہوتا ہے، کوئی شخص ایک حد تک اسے پائے گا کوئی دوسری حد تک پائے گا اور پھر اس BROAD SPECTROM. میں کوئی فن کار ہمیں اس کنارے پر ملے گا تو کوئی اس کنارے پر لیکن جب جب ہماری تاریخ میں اس روایت کے کسی ایک رنگ پر اصرار ہوا ہے اس کا ردعمل دوسرے رنگ پر اصرار کی صورت میں ہوا ہے چنانچہ خلیل صاحب ہوں یا ناصر کاظمی ہوں یا ابن انشاء یا اس عہد کے بہت سے دوسرے شاعر، ان کے یہاں ایک پراکرائی لے، ایک احساس، دھرتی سے چپک کے چلنے کی خواہش اور اس کے ساتھ ساتھ یوں کہئے کہ ارضیت یعنی دھرتی پن، آسمانی کیفیات، یا شکوہ یا گونج یا جس کو

کہنا چاہئے کہ آرائشِ لفظی کی کوشش یہ ساری کوششیں ترقی پسند تحریک کے جنون میں اپنے آپ کو EXHAUST کر چکی تھیں ان میں نئے تخلیقی امکانات کی کوشش تقریباً تقریباً ناممکن تھی چنانچہ ان لوگوں نے ایک نیا احساس، ایک نیا مزاج اردو شاعری کو دیا لیکن ہمیں تو دیکھنا ہو گا کہ خود خلیل صاحب کے اپنے انفرادی اور امتیازی نقوش کیا ہیں؟ کیا ان کی شاعری اپنے عہد کے بعض دوسرے اچھے اور ممتاز شاعروں سے آگے جاتی ہے؟ وہاں میں یہ عرض کروں گا کہ......

ہاشمی — قطع کلام ہو تا ہے ڈاکٹر صاحب، آپ نے ایک خوبصورت اشارہ کیا ہے، خلیل صاحب کی شاعری میں ارضی وابستگی، وہ جو رویہ ان کی شاعری میں ہمیں نظر آتا ہے، POETICS کی بات تو میں نہیں کر رہا لیکن ان کے شعری رویئے کے بارے میں ضرور کچھ کہوں گا۔ فوری طور پر ان کا ایک شعر مجھے یاد آ رہا ہے۔ آپ کی گفتگو سے وہ میں سنا دوں شاید اس کی مزید وضاحت ہو جائے۔

میں اپنے گھر کی بلندی سے چڑھ کے کیوں دیکھوں
عروجِ فن مری دہلیز پر اُتار مجھے

تو یہ پورا رویّہ وہی ہے جس کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔

نارنگ — اپنے عہد میں مزاج شاعری کے بدلنے والے PROCESS میں شریک ہونا بجائے خود بڑی سعادت ہے اور یہ ہر شاعر کو نصیب نہیں ہوتی لیکن جب ہم خلیل صاحب کے شعری امتیازات کو دیکھتے ہیں کہ ان کا سر کہاں کہاں اپنے عہد کے دوسرے ممتاز شاعروں سے نکلتا ہوا نظر آتا ہے تو میری اپنی رائے یہ ہے اور بالکل ذاتی رائے ہے کہ وہ نظم کے اتنے کامیاب شاعر نہیں ہیں جتنے وہ غزل کے کامیاب شاعر ہیں مجھے ان کی غزل اور ان کی غزل کے بعض اشعار زیادہ HAUNT کرتے ہیں اگرچہ ان کی بعض نظمیں بھی مجھے پسند ہیں جن میں سے بعض کا حوالہ ہاشمی صاحب نے دیا ہو۔ ایک نظم ہے میں گوتم نہیں ہوں بہت اچھی نظم ہے، اسی طرح ملاقات بھی ایک اچھی نظم ہے اور پوری اصناف کو انہوں نے REVIVE کرنے کی کوشش کی، ہجو کو شہر آشوب کو REVIVE کرنے کی کوشش کی پھر بھی میں سمجھتا ہوں کہ نظم کے اندر جو زبردست COMPOSITION اس عہد کے بعض دوسرے نظم گو شعرا کے یہاں ہے جیسے میرا جی کے یہاں جو چیز ہمیں ملتی ہے نظم میں خلیل صاحب کا سر اتنا آگے نکلتا ہوا مجھے نظر نہیں آتا، غزل میں البتہ اگر صرف دو یا تین بڑے نام لئے جائیں گے ۱۹۵۰ء کے بعد کی غزلیہ شاعری میں تو ان میں خلیل صاحب کا نام یقیناً آئے گا۔

خلیل صاحب اپنے نرم لہجے، اپنے پراکرتی احساس، اپنے گھریلوپن، عرفانِ ذات کی خواہش اور دل آسا، اور ایک تبسم آسا کیفیت جو ان کی غزل میں ملتی ہے ان تمام خصوصیات کی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ اس عہد کی شاعری میں جب وہ مقام پاتے ہیں تو اپنی غزل کی وجہ سے زیادہ اور اپنی نظم کی وجہ سے کم ہو سکتا ہے کہ آپ کی اور ہاشمی صاحب کی رائے مجھ سے مختلف ہو۔

ہاشمی — ڈاکٹر صاحب ایسا ہے کہ اصل میں اس عہد کے لکھنے والے بیشتر شعرا مثلاً ابن انشا جنھوں نے نظمیں بھی لکھی ہیں لیکن بالآخر وہ غزل کے شاعر کے طور پر جانے گئے۔ ناصر کاظمی جنھوں نے نظمیں بھی لکھیں اور خلیل صاحب کے معاصرین میں نام لے سکتا ہوں مصطفیٰ زیدی کا۔ اس طرح کے بہت سے نام سامنے آتے ہیں جنھوں نے اسی نوعیت کی نظمیں لکھیں ہیں، منیر نیازی وغیرہ کے مسئلہ بالکل مختلف ہے چونکہ ان کا آغاز ہوتا ہے خلیل صاحب سے پہلے گو خلیل صاحب کے معاصرین میں سے ہیں لیکن ان کی شاعری ہیئتی تبدیلیوں کی طرف زیادہ مائل تھی اور وہ ذہن جو خلیل صاحب کا تھا اس کی وابستگی اپنے کلاسیکی ادب سے بہت گہری تھی ان میں فوری طور پر اتنا بڑا DEPARTURE تو نہیں تھا لیکن ان نظموں میں ایک تاثر ایک نیاپن مجھے محسوس ہوتا ہے۔

نارنگ — ایک اور بات جو مجھے خلیل صاحب کے یہاں ملتی ہے اور میرے خیال میں جس کا ذکر بہت ضروری ہے کہ خلیل صاحب نے جو نثر میں صرف یہ کہ تخلیقی کام کیا ہے اسکے ذریعے انہوں نے نئے مزاج کی شناسائی کو اسکے عرفان کو عام کرنے اور اس کے ابہام و تفہیم میں بہت تاریخی رول ادا کیا ہے مثال کے طور پر رفتار کے عنوان سے جو کالم وہ ہماری زبان میں لکھتے رہے، مختلف رسائل میں جن بحثوں میں وہ شریک رہے اس میں ان کی تحریروں کی وجہ سے جدید ذہن کے بننے میں، جدیدیت کے عام ہونے میں کم، مدد ملی۔ انھوں نے یقیناً بہت سی غلط فہمیوں کو دور کیا اور بہت سی غلط باتیں جو مسلّمات کی حیثیت سے راہ

پاگئیں تھیں۔ اور جہاں بنیادی رویئے غیر ادبی تھے وہاں ذہنی صحت خلیل صاحب کے خلیل قلم کے ذریعہ ہوئی اور اس عہد کے ادبی سالاروں کا جب نام لیا جائے گا خلیل صاحب کی اس تاریخی خدمت کا ذکر ضرور کیا جائے گا۔

افتخار۔ آپ دونوں حضرات نے خلیل مرحوم کی شاعری اور تنقید نگاری کا بہت عمدہ اور عمیق تجزیہ کیا مگر ایک سوال میرے ذہن میں بنا ہوا ہے، یہ سوال ہر تخلیق کار کیلئے ہے، ہر فن کار کے لئے ہے یعنی شعراء اور ادیبوں کی خانوں میں تقسیم، عقائد و نظریات کی رو سے۔ یہ تقسیم بھی ہماری پرکھ کیوں ہے، یہی ہماری کسوٹی کیوں ہے؟ آج خلیل الرحمٰن اعظمی اپنے ان دوستوں کی نظروں میں معتوب ہیں جو کل تک ان کے ساتھ تھے، ترقی پسند گروپ میں تھے، آج جدیدیت پسندوں نے خلیل کو اپنی صف میں شامل کر لیا۔

نارنگ۔ افتخار صاحب میں یہ عرض کروں کہ ہم ادب میں کسی بھی طرح کے گروہ بندی کی شدید مخالفت کرتے ہیں۔ جو بھی شخص ادبی اقدار پر اصرار کرتا ہے وہ ذہنی صالح رکھتا ہے اور وہی ادیب صالح ہے اور اسی کی قدر کر لی جانی چاہئے۔ خواہ اس کا تعلق کسی نظریئے یا کسی آئیڈیالوجی سے ہو۔ خلیل صاحب کو جس طرح سے اپنی ذاتی اور داخلی زندگی میں کسی صدمے سے دوچار ہونا پڑا ہوگا اس کی معلومات تو ہاشمی صاحب کو ہوگی لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ اگر آپ پہرہ بٹھائیں گے ذہنی آزادی پر، اگر آپ REGIMETATION کریں گے، اگر آپ حکم صادر فرمائیں گے اور اگر آپ ادب سے وہ کام لیں گے جو کسی معاشی یا سیاسی فلسفے سے لیا جاتا ہے یا لیا جانا چاہئے تو وہاں جواز پیدا ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ انسان کی فلاح کے لیے اس کی بہبود کے لئے معاشرے میں تبدیلیوں کے لئے، ان سب چیزوں کے لئے اس میں کوئی شک نہیں کہ تمام علوم کا وجود انسان کے ارتقاء اور اس کی ترقی کے لئے ہے یا اس بات کو سمجھنے کے لئے کہ ہم کیا ہیں، ہماری زندگی کیا ہے؟ اس کی معنویت کیا ہے؟ ہم کہاں جا رہے ہیں؟ ہمیں اپنے جینے کو بہتر یا بامعنی جینا بنانے کے لئے کیا کرنا چاہئے۔ ادب چونکہ انسان کی انہیں کوششوں کا اظہار ہے۔ ادبی طور پر اسی لئے ادب میں ادبی تقاضے اہمیت رکھتے ہیں۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ادب اپنے احکام یا فن کار یا تخلیق اپنے احکام کہیں سے بھی لیتے ہیں۔ یہ وہ پودا ہے جو باطن کی روشنی میں نشو و نما پاتا ہے اس کا فروغ ہمیشہ ذہن کی داخلی فضا میں ہوتا ہے یہیں اس کی پرورش ہوتی ہے۔ اگر آپ خارجی تقاضے، ایک طرح کے سماجی احکام نافذ کرنا شروع کریں گے تو جو بھی جینوئن ادیب ہے یا شاعر ہے جیسے خلیل صاحب یا بیسیوں دوسرے، بیسیوں کیا سیکڑوں اگر آپ کسی طرح کی REGIMENTATION کا شکار رہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ آپ جس طرح کا ادب تخلیق کرنا چاہتے ہیں یا جیسا ادب ہونا چاہئے، شعر کو جیسا شعر ہونا چاہئے۔ اس پر کوئی پابندی عائد کی جا رہی ہے تو ظاہر ہے کہ کوئی بھی سچا فن کار اس کے خلاف اپنے ردّ عمل کا اظہار کریگا کہیں نہ کہیں جا کر اور ایسا ہی خلیل صاحب کے یہاں ہوا ہوگا لیکن اس کے باوجود ان کی لگن میں، ان کی سچائی میں، ان کے کھرے پن میں اور ادب میں جو چیز دیکھنی چاہئے وہ ادبی کھرا پن، لٹریری جینوئنیا اور اس اعتبار سے اگر آپ صرف یہی دیکھتے ہیں کہ صاحب آپ کس بات کو یوں کہتے ہیں ہاں آپ ادب کیسا ہی تخلیق کریں کیوں نہ کریں آپ بہت بڑے ادیب ہیں۔ یہیں پر بنیادی اختلاف شروع ہوتا ہے کہ ادب میں حیثیت اور مقام و مرتبہ کا تعین کسی طرح کی پاسداری یعنی نظریئے کی پاسداری یا انسانی تعلقات کی پاسداری یا کسی گروہ کی پاسداری یا کسی تحریک کی پاسداری کی بنا پر نہیں ہوگا۔ اِدھر یا اُدھر وہ فیصلہ ہوگا، محض ادبی اقدار یعنی ادب کی ادبیت پر۔ خلیل صاحب پر جب اس بات کا انکشاف اپنے ذہنی ارتقاء کے دوران ہوا ہوگا تو ظاہر ہے انہوں نے ایک آزاد اور لبرل فضا میں سانس لی ہوگی۔ اب اسے بعض لوگ پسند کرتے ہیں اور بہت لوگ پسند کرتے ہیں چونکہ اسی کی وجہ سے وہ، وہ بن سکے جو وہ ہیں اور جس کی وجہ سے آج زمانہ ان کی قدر کرتا ہے یا ہماری ادبی تاریخ میں ان کا مقام و مرتبہ ہے اور اگر وہ محض ایک نقارچی رہتے کسی طرح کی اشتہاریت کا یا کسی طرح کی خطابت کا یا کسی کی دی ہوئی کا یا پھر کسی فارمولے کا ادب تخلیق کرتے رہتے تو جہاں ہم دوسرے سیکڑوں نام لیں گے فارمولا ادب تخلیق کرنے والوں کے تو معاف کیجئے گا ایسے لوگوں کے نام غالباً تاریخ میں جگہ نہیں پایا کرتے۔

ہاشمی۔ ایک مثال میں آپ کو اس کی دیتا ہوں، شاید آپ کو یاد ہو ڈاکٹر صاحب کہ خلیل صاحب کی ایک بہت طویل نظم تھی "آئینہ خانے میں" جو الگ سے کتابی شکل میں شائع ہوئی تھی اور جس کا تذکرہ انہوں نے اپنے ایک مضمون میں بھی کیا ہے۔ وہ نظم الگ سے جب چھپی تو اس پر ایک بہت طویل دیباچہ تھا، اس میں ترقی پسند تحریک سے ان کی وابستگی کا ذکر تھا۔ نیاز حیدر اور سردار جعفری کی رفاقت اور رہنمائی کا تذکرہ تھا لیکن خلیل صاحب نے

بعد میں اس نظم کو کسی مجموعے میں شامل کرنا نہیں چاہا۔ دوسری بات یہ کہ جب یہ بحثیں شروع ہوئیں اور رسالوں کے فائل دیکھے جائیں تو جس وقت خلیل صاحب، وحید اختر، باقر مہدی اور خود میں اپنا نام لے سکتا ہوں، ان بحثوں میں ہم لوگوں نے کبھی یہ نہیں کہا کہ ہم لوگ ترقی پسند نقطۂ نظر کے خلاف ہیں بلکہ خلیل صاحب کا رفتار کے تمام کالموں میں اور اس وقت کے دیگر خاص رسائل جو تھے ان میں ہمارا نقطۂ نظر یہ تھا کہ ترقی پسندی اگر کوئی زندگی کا رویّہ ہے تو وہ ہم لوگوں کے ذہنوں میں موجود ہے لیکن اس کے لئے کوئی ضروری نہیں کہ باہر سے آپ پابندیاں عائد کریں۔ ہم لوگ مارکسزم کے خلاف نہیں ہیں، ہم لوگ کسی ایسے مثبت نقطۂ نظر کے خلاف نہیں ہیں جو انسان کی فلاح چاہتا ہو۔ اور یہ باتیں تو بہت واضح تھیں اُس وقت REGIMENTATION کا PROCESS ان لوگوں کے یہاں زیادہ تھا کہ اگر کوئی آدمی ان سے وابستہ تھا اور اس کے بعد کچھ دیر تک بات کرنا چاہتا تو اسے سننا پسند نہیں کرتے تھے اور یہی خلیل صاحب کے ساتھ ہوا بعد میں وہ تبدیل ہوئے اور اپنا آزادانہ اظہار ضروری سمجھا۔ ●

مخمور سعیدی ○ عزیز اندوری ○ افتخار امام صدیقی

افتخار۔ مخمور سعیدی صاحب اور عزیز اندوری صاحب ہم لوگ آج خلیل الرحمٰن اعظمی کی شخصیت، شاعری اور تنقید نگاری پر گفتگو کریں گے اور ان خصوصیات کو زیر بحث لائیں گے جو انہیں اپنے دوسرے ہم عصر شعراء سے ممتاز کرتی ہیں (اگر ایسی خصوصیات ہیں تو) جو ان کے ساتھ ساتھ ابھر کر آئے۔ تو سب سے پہلے مخمور صاحب آپ خلیل صاحب کی شخصیت پر گفتگو کریں گے یا ان کے فن پر؟ آپ کی گفتگو کو عزیز صاحب آگے لے جائیں گے۔

مخمور۔ افتخار امام صاحب میں یہ سمجھتا ہوں کہ شخصیت اور شاعری کو دو بالکل الگ الگ خانوں میں رکھ کر دیکھ نہیں سکتے، میری ایسی رائے ہے تو اس لئے کہ جب ہم خلیل صاحب کے بارے میں گفتگو کریں گے تو ظاہر ہے کہ ان کی شخصیت زیر بحث آئے گی ضرور، ان کی شاعری کے ساتھ ساتھ جو ہماری بات ہے اور اگر ان کی شاعری کا ذکر کریں گے تو ان کی شخصیت کے کچھ پہلو بھی جو ان کی شاعری پر اثر انداز ہوئے ہیں، ان کی طرف بھی ہمارا ذہن جائے گا۔

خلیل صاحب کے بارے میں میرا تاثر یہ ہے کہ وہ اپنی ذات سے ایک انجمن تھے، ایسے لوگ بہت کم ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ انہوں نے جو شاعری کی ہے، جو تنقیدیں لکھی ہیں وہ آپ کے سامنے ہیں اور اس پر بھی ہم بحث کریں گے لیکن یہ کہ انہوں نے قدیم ادب سے لے کر جدید ادب تک کا جتنا عائر اور گہرا مطالعہ کیا تھا ایسا بہت کم لوگوں میں دیکھنے میں آتا ہے۔ خلیل صاحب پر نئے رجحان سے، نئے میلان سے متعلق کے نئے نام تک سے واقف ہوتے تھے اور مجھے کئی بار کا تجربہ ہے کہ میں جب کبھی علی گڑھ جاتا تھا تو وہ بہت ہی محبت سے پیش آتے تھے حالانکہ وہ میرے بزرگ تھے، شاعری میں مجھ سے سینئر تھے مجھے یہ بھی فخر حاصل رہا ہے کہ جب بھی علی گڑھ جاتا تھا تو ان ہی کا مہمان ہوتا تھا۔ کھانے کی میز پر ہوں یا چائے پی رہے ہوں، بیٹھے ہوں، یا گپ شپ ہو رہی ہو وہ دس بیس شعر ضرور ایسے سنا دیا کرتے تھے جن سے ہم لوگ بے خبر ہوا کرتے تھے، ان اشعار میں بیشتر بعض نئے شعراء کے اشعار ہوا کرتے تھے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ خلیل صاحب شاعری کی طرف، ادب کی طرف کتنا سنجیدہ رویہ گویا رکھتے تھے اور کس قدر باخبر رہا کرتے تھے ہر چیز سے۔ اسی کے ساتھ ساتھ یہ بھی تھا کہ کہیں انہیں کسی میں تھوڑی سی بھی صلاحیت نظر آتی تھی تو اس کی حوصلہ افزائی میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ اور یہ بے حد خاص بات تھی۔

ان کی شاعری آپ پڑھیں تو افتخار صاحب میرا اندازہ یہ ہے کہ ان کی شاعری کے بارے میں کہ انہوں نے زندگی کی بہت سی معمولی معمولی حقیقتوں کو جنہیں بہت سے لوگ یہ سمجھنے میں شاید تکلف کرتے تھے کہ یہ بھی شاعری کا موضوع بن سکتی ہیں یعنی زندگی کی چھوٹی چھوٹی مسرتیں، چھوٹے چھوٹے غم، چھوٹے چھوٹے واقعات جن سے صحیح معنوں میں ایک آدمی کی زندگی عبارت ہوتی ہے لیکن ہمارے یہاں اکثر یہ رویہ رہا شعراء کا کہ یہ معمولی معمولی چیزیں اچھی نہیں ہیں کہ ہماری شاعری کا یا ہمارے فن کا موضوع قرار پا سکیں۔ خلیل صاحب کی شاعری اس کی بہت اچھی مثال پیش کرتی ہے کہ زندگی کی معمولی

حقیقتیں بھی ایک فن کار کی نظر میں جب آتی ہیں تو غیر معمولی اہمیت کی حامل ہو جاتی ہیں۔

خلیل صاحب کی شخصیت میں ایک طرح کی سادگی تھی وہ ان کی شاعری میں بھی آپ کو ملے گی اور اسی لئے میں نے آپ سے کہا کہ خلیل صاحب کی شاعری اور شخصیت کو الگ الگ کر کے نہیں دیکھنا چاہئے۔ اس کے علاوہ ان کی شاعری کا ایک خاص پہلو جس کی طرف ظاہر ہے کہ دوسرے لوگوں کی بھی توجہ ہوئی ہوگی اور مجھے بھی اکثر محسوس ہوا، زیادہ یہ تھا کہ نئی سے نئی بات کہتے ہوئے بھی اس رچاؤ کو برقرار رکھتے تھے جو ہمیں کلاسیکی ادب تک لے جاتا ہے۔ یعنی ان کے یہاں کسی قسم کا کوئی ابہام شاعری میں نہیں تھا۔

عزیز۔ لیکن اسی کے ساتھ ساتھ خلیل صاحب نے اپنے آپ کو اس وقت تک جب تک کہ ان کا شعور بالغ ہو رہا تھا، ترقی پسندوں سے یا ترقی پسند نظریئے سے اپنے آپ کو منسلک رکھا اور وہ رویّہ جیسا کہ آپ نے فرمایا زندگی کا باریک سے باریک پہلو یا بہت چھوٹے چھوٹے پہلوؤں پر بھی ان کی شاعری کا تعین کر سکتے ہیں۔ تو میں سمجھتا ہوں کہ ایک طرف خلیل صاحب کا کلاسیکی ادب سے لگاؤ اور دوسری طرف بڑی حد تک اس زمانے کا اس عہد کا اہم تقاضہ جو ترقی پسندی کی شکل میں ہمارے سامنے آرہا تھا اس کا اثر بھی ان پر بہت زیادہ غالب رہا۔

مخمور۔ اثر کی بات نہیں عزیز صاحب وہ تو باقاعدہ اس تحریک سے وابستہ رہے ایک عرصہ دید تک۔

عزیز۔ میں اصل میں اسی طرف آرہا تھا کہ خلیل صاحب جب تک ترقی پسند تحریک کے اثرات کو قبول کرنے کے بعد وہ بات علیحدہ ہے کہ اس سے ہلکا سا گریز جو کے وہاں ہمیں نظر آتا ہے وہ ممکن ہے کہ کوئی ذاتی گریز بھی اس میں ہو جیسا کہ اس زمانے کے مسائل میں جس طرح کی بحثوں کا سلسلہ شروع کیا گیا تھا اور اس میں خاص طور پر کچھ لوگوں نے خلیل صاحب کو INVOLVE کیا تھا کہ خلیل صاحب ترقی پسندی سے گریز کیوں کر رہے ہیں۔ اس گریز کا کوئی بھی مفہوم ہو سکتا ہے۔ سیاسی یا ادبی سیاست پر مبنی وہ باتیں ہو سکتی ہیں۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خلیل صاحب نے اس گریز کے باوجود بھی ایک نئی روش، ایک نیا راستہ اپنے لئے اختیار کرنا چاہا تھا وہ بعد میں چند لوگوں کے لئے بھی مفید ہوا۔ میں جہاں تک سمجھ پایا ہوں کہ خلیل صاحب ہی پہلے آدمی ایسے مجھے نظر آتے ہیں۔ ہمارے اس سلسلے کے ہندوستان میں کم از کم جن کے یہاں ترقی پسندی کے فوراً بعد ایک نئے لہجے اور ایک نئے آہنگ کا تصور ملتا ہے اور اس کو بعد میں سنوارنے والے بہت سے افراد سامنے آئے۔ نقاد بھی اچھے ملے اور ترقی پسند لہجے سے ہم ذرا سا اوب رہے تھے اس میں جو شگفتگی یا مسائل کو نعرے بازی کے لہجے کے بجائے نہایت ہی نرم لہجے نرمیت کے ساتھ پیش کرنے کا سہرا کم از کم خلیل صاحب ہی کے سر جانا چاہیئے اور ظاہر ہے کہ خلیل صاحب کی شخصیت ہمیں وہاں سے نظر آتی ہے جب وہ آتش پر مسلسل مضمون لکھتے ہیں اور ان کی ذہانت کا اعتراف اس عہد کے وہ نقاد جو ذرا مشکل ہی سے کسی کی تعریف کرتے تھے انہوں نے کیا اور یہ بہت بڑی بات ہے۔

جہاں تک ان کی شخصیت کا سوال ہے خلیل صاحب بے پناہ مخلص، اپنے چھوٹوں سے محبت کرنے والے یعنی ہم سے عزیز جو تھے ان میں سے بہت لوگ ایسے ملے جنہوں نے اپنے جونیرز کو پوری محبت اور خلوص سے اپنے قریب بٹھایا باوجود اس کے کہ ایسے لوگوں میں اتنی صلاحیتیں نہ پیدا ہو پائیں یا جن کا ذہن اتنا مضبوط نہیں تھا ایسے لوگ بھی ان کے قریب رہے، خلیل صاحب کبھی کسی کو نروس نہیں کرتے تھے یعنی اگر اس کے ذہن کی تربیت نہیں کر سکتے تھے تو کم از کم اس کی حوصلہ افزائی ضرور کرتے تھے۔ کوئی ایسی بات، کوئی واقعہ، گفتگو یا تحریر ایسی نہیں ملتی جس سے یہ ظاہر ہوتا ہو کہ انہوں نے کسی کے حوصلے کو پست کیا ہو۔ میں یہ نہیں کہنا چاہتا کہ وہ ہر ایک کو اپنے گلے بھی لگا لیتے تھے یا بہت ہی غیر ذمہ دارانہ قسم کی شاعری جو ہمارے یہاں ہوئی آپ بھی کرتے تھے لیکن خلیل صاحب نے یہ ضرور کیا کہ اور جیسا مخمور صاحب نے بتایا کہ وہ بہت غیر معروف قسم کے لوگوں کو جنہیں ہمارا بڑا نقاد کبھی APPRECIATE نہیں کر پایا اتفاق سے خلیل صاحب ان کی شاعری پر کسی حد تک نظر رکھتے تھے۔ ایسے لوگوں کی شاعری پر گفتگو کرتے تھے اور سوچتے تھے۔ یہی سبب ہے کہ آپ دیکھیئے کہ علی گڑھ میں چاہے ان کی تربیت کے تحت نہ ہوا ہو لیکن ان کے بعد کی نسل نے خلیل صاحب کی اسی حوصلہ افزائی سے چند قدم آگے بڑھائے۔ ان میں سے بیشتر نام ہمارے سامنے آتے ہیں، ان کے فوراً بعد ہی شمیم حنفی وغیرہ لوگ ہیں جنہیں خلیل صاحب نے باقاعدہ اپنے قریب رکھ کر اور ظاہر ہے کہ شمیم حنفی صاحب سے جب بھی گفتگو ہوئی ہے خلیل صاحب کا ذکر انہوں نے بے حد ادب سے کیا اور اس انداز سے کیا کہ خلیل صاحب کے قرب سے کافی کچھ شعور کو اپنے DEVELOPE کیا۔ آخر میں جب وہ ایک بار دہلی

تشریف لائے تھے تو صغیر احمد صوفی صاحب کے مکان پر گفتگو کے دوران انہوں نے کہا تھا کہ سلام پر کچھ کر رہے ہو یا نہیں، سلام کا اچانک ان کو یاد آجانا بھی ان کی وسعت نظر اور اپنے ہمعصروں کا پورا احساس اور ان سے تعلق کی دلیل ہے۔ کہنے لگے "سلام بہت اچھی شاعری کر سکتا تھا"۔ میں نے ان سے یہ سوال کیا کہ کیا انہوں نے اچھی شاعری نہیں کی تو بولے کہ اچھی شاعری بھی انہوں نے کی مگر اس سے زیادہ وہ خراب شاعری کر گئے یہی وجہ ہے کہ میں سلام پر لکھنے کی ہمت کرتا ہوں لیکن میں کہیں کہیں اٹک جاتا ہوں۔ سلام پر میں لکھوں گا تو ممکن ہے کہ اس کی وہ جو کمزوریاں ہیں اگر ان کو میں نے نظر انداز کیا تو مجھ پر BLAME آئے گا لیکن میری خواہش ہے کہ میں سلام پر لکھوں اور بھرپور انداز میں لکھوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے زمانے کے ایک ایسے شاعر جس کے یہاں بہتر صلاحیتیں تھیں اور میں اگر یہ کہوں بے صفائی سے کہ سلام کے انتقال کے بعد شاید کسی نے اتنی تیزی سے توجہ نہیں کی لیکن خلیل صاحب کے ذہن میں یہ بات ضرور تھی کہ سلام صاحب پر کچھ نہ کچھ ضرور لکھنا چاہئے، کچھ نہ کچھ ہونا چاہئے تو یہ ان کی شخصیت کا بہت بڑا پہلو تھا۔ ان میں جو قصباتی اخلاق تھا جو شہر میں آنے کے بعد تباہ نہیں ہوا پورے طور پر تھا۔

محمود۔ یہ صرف اخلاق کا معاملہ نہیں تھا بلکہ میرا خیال یہ ہے کہ اخلاق کے ساتھ ساتھ ادب اور شاعری کی طرف ان کی ایمانداری اور دیانت داری کو بھی دخل تھا۔

عزیز۔ ظاہر ہے لیکن ان کو اس عہد کے جو اساتذہ ملے انہوں نے بھی ان روایتوں کا صاف ستھرا شعور دیا چونکہ ہم تو بہت بنی ہوئی قدروں میں زندہ ہیں اور گذشتہ قدروں کو سوائے کتابوں میں پڑھنے کے ہمارے پاس ذریعہ ایسا نہیں رہا کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ سکیں۔ خلیل صاحب کو اس وقت جو قدریں ملیں ان میں قصباتی معصومیت پورے طور پر تھی چاہے رشید احمد صدیقی صاحب کی حد تک ہم دیکھیں تو کبھی بھی یہ نہیں ہوتا تھا کہ آج کے عہد میں جو کچھ ہم ادب میں دیکھ رہے ہیں کہ اختلاف کیا جاتا ہے تو ڈنڈا مار کر اور رشید صاحب والے عہد میں اختلاف کا ایسا تصور ہی نہیں تھا یہی سبب ہے کہ خلیل صاحب اخیر وقت تک انہی صالح اقدار کا اظہار ہی رہے وہ جو سنبھلا ہوا انداز ان کی شاعری میں ہے یہ سب ان ہی اقدار اور ذہنی تربیت کی دین ہے اب تو ظاہر ہے کہ ہم فیصلہ نہیں کر پاتے ہیں کہ نئی سمتوں اور نئی تحریکوں کا کس طرح تعین کریں لیکن خلیل صاحب کے یہاں محسوس ہوتا ہے کہ ایک سوچا ہوا انداز تھا ان کے یہاں اور زندگی کو بہت سوچ سمجھ کر اختیار کرنے اور برتنے کے قائل تھے۔

محمود۔ جیسا آپ نے کہا کہ ان کے یہاں جو انحراف آیا کہ ترقی پسندی سے جدیدیت کی طرف آئے تو اس کے بارے میں کہا جا سکتا ہے کہ ذاتی وجوہ بھی ہو سکتی ہیں لیکن میرا خیال ہے کہ ہمیں اس طرح نہیں سوچنا چاہئے اور میں یہ ماننے کے لئے خود کو آمادہ نہیں کر پاتا کہ خلیل صاحب نے کسی سیاسی مصلحت کی وجہ سے یا ادبی مصلحت کی وجہ سے یا جدیدیت کے خیال سے یا کسی اور وجہ سے ان کے رویے میں تبدیلی آئی ہوگی۔ اصل میں یہ تھا کہ اور آپ جانتے ہی ہیں کہ وہ زمانہ ایسا تھا کہ کوئی بھی تحریک ہو اپنا رول ادا کرتی ہے، ختم ہو جاتی ہے، اس کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ تحریک غیر اہم تھی یا اس تحریک کو ہم رد کر دیں یہ بات نہیں تھی لیکن یہ ہے کہ بہرحال ایک رول ادا کرتی ہے اور اس کے بعد ختم ہو جاتی ہے۔ اب ترقی پسند تحریک کے ساتھ چونکہ سیاسی معاملات بھی تھے اور وہ نئے حالات میں بالکل تبدیل ہو گئے تھے تو اس کے وہ پہلو جو سیاست سے متعلق تھے اپنا کھوکھلا پن ظاہر کر رہے تھے اور ظاہر ہے کہ خلیل صاحب جیسا آدمی جو باخبر اور ذی علم تھا اور ادب کے تمام پہلوؤں پر ان کی نظر تھی تو وہ ان پر قانع رہ ہی نہیں سکتے تھے اور ۵۵ء سے بعض لوگ جدیدیت کا آغاز مانتے ہیں یا ۱۹۶۰ء کے بعد لیکن آزادی کے بعد بعض شاعروں کے یہاں یہ تبدیلی نظر آنے لگی تھی اور ۵۵ء تک پہنچتے پہنچتے تو یہ تبدیلیاں بہت نمایاں ہو گئی تھیں ان میں سے بعض لوگ آج کل خاموش ہیں جیسے شہاب جعفری ہیں۔

عزیز۔ شہاب جعفری یقیناً خلیل صاحب کے بعد ابھرنے والوں میں سے ہیں، میرا مقصد محمود صاحب یہ تھا کہ گریز نے ترقی پسند تحریک......

محمود۔ ترقی پسند تحریک سے گریز واضح طور پر خلیل صاحب کے یہاں بھی نہیں تھا اس وقت، لیکن یہ ضرور تھا کہ نئی تبدیلیوں کو وہ محسوس ضرور کر رہے تھے ویسے یہ ظاہر ہے کہ شمس الرحمٰن فاروقی نے بھی لکھا ہے کہ ہندوستان میں جدید غزل کا آغاز اگر کسی آدمی سے ہوتا ہے تو وہ خلیل الرحمٰن اعظمی ہیں لیکن میں آپ سے یہ عرض کروں کہ اس زمانے میں تنہا خلیل صاحب ہی ایسا نہیں سوچ رہے تھے بلکہ کچھ اور لوگ بھی تھے جو نئی سمتوں میں سوچ رہے تھے ہاں خلیل صاحب ان لوگوں میں سے ہیں جو MATURE ہو گئے تھے اور انہوں نے واقعی نئی جہت کا نئی سمتوں کا باقاعدہ ساتھ دیا اور کھل کر ساتھ دیا اور اسے مروج و مقبول بنانے میں ان کے تنقیدی مضامین نے بھی بڑا اہم رول ادا کیا۔ جس زمانے میں یہ سب کچھ ہو رہا تھا اس میں خلیل

صاحب لتنے سینئر نہیں تھے جیسے ہمارے آل احمد سرور صاحب ہیں اور ان کے یہاں بھی [illegible] آیا جبکہ سرور صاحب وہ آدمی ہیں کہ ترقی پسند تحریک کے معماروں میں آپ انکا نام لے سکتے ہیں لیکن بعد میں انہوں نے اپنے سابقات وغیرہ پر نظر ثانی کی اور اب جو ان کا تنقیدی موقف ہے وہ ظاہر ہے کہ بالکل الگ ہے۔

عزیز۔ لیکن جس عہد میں خلیل صاحب کے گریز کی میں بات کر رہا تھا . . . .

محمور۔ میں بھی آپ سے یہی عرض کر رہا تھا کہ خلیل صاحب کا گریز تو ہمیں زیادہ واجبی نظر آتا ہے۔

عزیز۔ میں اس گریز سے انکار کب کر رہا ہوں میں تو اسے بڑا مبارک اور مستحسن قدم قرار دیتا ہوں کہ انہوں نے گریز کیا تو کم از کم سمت کا تعین تو ہو سکا جی ہاں ہم ان کوششوں کو نظر انداز کر ہی نہیں سکتے اور پھر انہوں نے بہت سے لوگوں کی ذہنی تربیت بھی کی۔ علی گڑھ یونیورسٹی میں رہتے ہوئے آپ نے شمیم حنفی صاحب کا نام لیا، شاعروں میں شہریار ہیں اور انہیں خود بھی اس کا اعتراف ہے بہت لوگ بھی جانتے ہیں کہ شہریار صاحب کی شخصیت اور شاعری میں خلیل صاحب کا بڑا دخل رہا۔

افتخار۔ میرے ذہن میں ایک بات آتی ہے محمور صاحب اور وہ یہ کہ اگر ہم اپنے ادب کو ترقی پسندی اور جدیدیت کے خانوں میں تقسیم کرتے ہیں تو پھر خلیل الرحمٰن اعظمی کو ترقی پسند اور جدیدیت کے درمیان کی ایک اہم کڑی تصور کر لیتے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ ترقی پسند ادب کو اتنا غیر اہم نہیں کہہ سکتے کیونکہ اس تحریک کے ذریعہ جو ادب تخلیق ہوتا رہا اسے نظر انداز بھی نہیں کیا جا سکتا۔

محمور۔ بیشتر حصہ اس کا ایسا ہے جو زندہ رہے گا۔

افتخار۔ یقیناً زندہ رہے گا مگر میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ترقی پسندوں کو خلیل صاحب سے اس لئے برگشتہ نہیں ہونا چاہئے کہ انہوں نے ترقی پسند ادب اور تحریک کا معروضی جائزہ لیا تھا اب ایسا ہونے کے محرکات یا عوامل کچھ بھی رہے ہوں لیکن ان حقائق کو نظر انداز نہیں کرنا چاہئے تھا جو اس تحریک کی تباہی کا سبب ہے کوئی بھی تحریک سیاسی رنگ اختیار کر لے یہ علیحدہ بات ہے لیکن کوئی سیاسی تحریک ادب بھی اپنے مقاصد ہی کے لئے تخلیق کرے تو یہ نظریہ کبھی بھی قابل قبول نہیں ہو سکتا۔ ترقی پسند تحریک کے ذریعہ سے جو ادب ماضی میں تخلیق ہو رہا تھا اس میں رفتہ رفتہ یکسانیت آتی جا رہی تھی، ایک جمود تھا جو بڑھتا ہی جا رہا تھا ویسے یہ ہر دور میں ہوا ہے کہ ادبی میلانات، تحریکیں وغیرہ ایک مدت تک اپنا اثر یا تاثر پھیلاتی ہیں اور اس کے بعد اس میں سکڑن پیدا ہونی شروع ہو جاتی ہے۔ ماضی میں کتنی ہی ادبی تحریکیں وجود میں آئیں یا سیاسی تحریکیں پروان چڑھیں اور کچھ دور جا کر ختم ہو گئیں اور آج بھی جدیدیت کے نام سے جس طرح کا ادب تخلیق ہو رہا ہے رفتہ رفتہ اپنی معنویت ختم کرتا جا رہا ہے، کچھ اور آوازیں، نظریئے اپنا اپنا سر ابھار رہے ہیں تو جس وقت ترقی پسند ادب میں جمود پیدا ہو رہا تھا اور خلیل صاحب چونکہ باخبر اور ذی علم شخص تھے لہٰذا انہوں نے سوچا اور چاہا کہ وہ ادب تخلیق کیا جائے جو واقعی ادب ہو لہٰذا کوئی ایسی راہ تلاش کرنی چاہئے جو اس بوجھل پن یا جامد رویوں کو زائل کر سکے، خلیل صاحب کے ساتھ ساتھ اس دور میں اور بھی لوگ تھے جو اس طرح کے احساسات لئے ہوئے تھے ہمارے یہاں ہوتا یہ ہے کہ ہم خانوں میں تقسیم ہونے والا ادب تخلیق کرتے ہیں چاہے ہم اس کا شعور رکھتے ہوں یا نہ رکھتے ہوں اور میں اسے فیشن زدہ ادب زیادہ کہوں گا کلاسیکی دور میں بھی ایسا ہوا ہے۔ ترقی پسند ادب میں بھی آپ کو فیشن زدہ زیادہ ملیں گے اور جدیدیت کے رجحان نے بھی بے شمار نام نہاد فیشن زدہ شعرا و ادبا کی کھیپ کی کھیپ کتب اور رسائل کی زینت بنا دی۔ خلیل صاحب کے ساتھ یہ معاملہ ہوا کہ جس طرح ترقی پسندوں کو کچھ ذہین افراد میسر آ گئے تھے اسی طرح جدیدیوں نے انہیں اپنے لئے غنیمت جانا۔

محمور۔ میں آپ کی بہت سی باتوں سے متفق ہوں افتخار صاحب اس خود بھی اس کا قائل نہیں ہوں کہ ادب کو خانوں میں تقسیم کیا جائے میرا ایک شعری مجموعہ ابھی حال ہی میں شائع ہوا ہے "واحد متکلم" اس کے دیباچے میں جدیدیت کے تعلق سے میں نے ایک بات لکھی ہے اور اس سے خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب بھی متفق تھے اور انہوں نے کہیں یہ بات لکھی بھی ہے۔ میں نے لکھا ہے کہ جدیدیت جو ہے وہ فنکار کی یا شاعر کی تخلیقی آزادی کے حصول کی خواہش کی ایک صورت ہے یعنی یہ کہ وہ کسی فارمولا بندی کو قبول نہیں کرتی، ادب کی تخلیق اسی نظریئے کے تحت ہونی چاہیئے۔ اب اگر کچھ لوگ فنکار کی آزادی یا غیر فارمولائی ادب کی تخلیق کو کچھ نام دیتے ہیں یا اسے نظریوں کے خانے میں رکھتے ہیں تو اس سے خود ان کا اپنا نقصان ہے اور خلیل صاحب ایسے ہی لوگوں کے خلاف تھے۔

عزیز۔ جب کبھی فن کار کی آزادی سلب کی گئی یا مخصوص قسم کا ادب تخلیق ہوا ہے کچھ باشعور اور حساس لوگ اس کے احتجاج کے لئے آگے بڑھے ہیں۔ خلیل صاحب تو تھے ہی اور بھی لوگ تھے جنہوں نے ترقی پسند تحریک سے گریز کا عمل تیز کر دیا تھا لیکن کیا سبب ہے کہ .....

مخمور۔ قطع کلام عزیز صاحب میرا خیال ہے کہ ترقی پسند تحریک سے بدظنی کا آغاز ۱۹۴۹ء سے شروع ہوا یعنی بھیمڑی کانفرنس کے بعد۔ اس سے پہلے تو مختلف نظریئے رکھنے والے اس تحریک میں شامل تھے لیکن بھیمڑی کانفرنس میں اس تحریک کے ذمہ داروں نے اتنی قطعیت اور وضاحت سے اپنا سیاسی موقف سامنے رکھا کہ بہت سے ذہین لوگوں نے یہ سوچنا شروع کیا کہ کیا ادب کا یہی منصب ہے۔ ایسے ہی سوچنے والوں میں خلیل صاحب بھی تھے حالانکہ وہ نہایت ہی سرگرم اور پرجوش ترقی پسند تھے۔ وہ بہت سے لوگوں سے زیادہ اس تحریک کے قریب رہے تھے اس تحریک کا ایک فعال حصہ رہے تھے لہٰذا تمام پہلو ان کی نظر میں تھے، ان کی کتاب "ترقی پسند ادبی تحریک" سے بھی اس کا اظہار ہوتا ہے۔

عزیز۔ خلیل صاحب کے دور میں بھی بعض ایسے لوگ تھے جو ترقی پسند تحریک سے ذہنی طور وابستہ تھے۔ چاہے عملی طور پر نہ رہے ہوں انہوں نے بھی گریز کیا لیکن ہم ان کی شاعری کو اور خلیل صاحب کی شاعری کو سامنے رکھتے ہیں اور ایک ایماندار ناقد یا قاری ہونے کے ناطے جب ہم پرکھتے ہیں تو ہمیں خلیل صاحب کی شاعری میں زیادہ لطف آتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ اس کا سبب یہ ہے کہ خلیل صاحب نے ان روایتوں کو جو ہماری شعری روایتیں ہیں جو شگفتہ شعری روایتیں ہیں ان کو نہیں چھوڑا جبکہ دوسرے حضرات مثال کے طور پر میں عمیق حنفی کا نام لوں گا جو ترقی پسندی سے ہوتے ہوئے یہاں تک آئے تھے یا باقر مہدی وغیرہ جو بڑے پرجوش ترقی پسند ایک زمانے میں رہے ہیں یہ ہو سکتا ہے کہ عمیق حنفی اور باقر مہدی کی شاعری کو فکر و نظر کی گہرائی سے تول سکیں لیکن جو شعری شگفتگی ہے وہ ہمیں فوراً متوجہ کرتی ہے خلیل صاحب کے آہنگ، ان کے لہجے اور شعری فکر کی طرف۔ میں سمجھتا ہوں کہ خلیل صاحب کا CONTRIBUTION بہت بڑا ہے جس نے بہت سے راستوں کو عبور کیا۔ اب یہ تو بہت طویل سلسلے ہیں، جدیدیت کی سمتیں یا فیشن زدہ ادب وغیرہ جیسا کہ افتخار صاحب نے ذکر کیا تو اگر ہم ان حالات کا یا ایسے لوگوں کا ذکر کریں تو یہ خلیل صاحب سے علیحدہ ایک گفتگو ہو جائے گی۔ بس اس حد تک خلیل صاحب کے گریز کو مستحسن سمجھیں جہاں ہمیں بھیمڑی کانفرنس کے بعد سے ایک کرب سا محسوس ہونے لگا تھا کہ آخر ترقی پسند تحریک کیا محض ایک سیاسی آلۂ کار بن گئی ہے اور یہ کہ کیا ہمیں صرف وہی ادب تخلیق کرنا ہوگا جو اس تحریک کے مینی فیسٹو میں ظاہر کیا گیا ہے۔ فن کار کی آزادی کے مجروح ہونے کا کرب اور ایک طرح کی نفرت کا احساس پیدا ہونے لگا تھا جو نعرے بازی والے ادب کے لئے تھا کہ جیسے ہم بیس ہزار مزدوروں کے مجمع میں پڑھ سکیں۔ جیسے کیفی صاحب کی بعض نظمیں ایسی تھیں جو صرف مزدوروں کے جلسے میں پڑھی جا سکتی تھیں یا نیاز حیدر کی شاعری جس طرح کی تھی وہ جو شعری شعور رکھتے تھے اور ادب میں آزادئ اظہار کے خواہاں تھے انہوں نے اس گھٹن سے اس یکسانیت سے نکل جانا چاہا اور خلیل صاحب ایسے ہی لوگوں میں سے ایک تھے۔

مخمور۔ کیفی صاحب نے یا نیاز حیدر صاحب نے سانچوں میں تو کوئی توڑ پھوڑ نہیں کی تھی۔

عزیز۔ توڑ پھوڑ نہیں کی تھی لیکن ان کے یہاں جو خطیبانہ انداز آگیا تھا۔ بیداری کے سلسلے میں جو نظمیں سامنے آئیں انہوں نے ادب میں کوئی خاطر خواہ اضافہ نہیں کیا۔ یہ سلسلے جو تھے بہت ہی براہ راست تھے۔ ہم یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ان نظموں میں وزن بھی تھا، ردیف، قافیے بھی تھے، شعری ہیئت ان کی موجود تھی لیکن وہ تاثر وہ شگفتگی نہیں تھی جس کو ہم شعری قالب کی بہت اہم، اعلیٰ اور ارفع صورت میں پیش کر سکیں یا ہم اس ادب پر ناز کر سکیں۔

افتخار۔ اردو شعر و ادب کی تاریخ میں کئی موڑ ایسے آئے ہیں جہاں جمود، یکسانیت، فارمولا بندی، نعرے بازی اور فیشن زدہ ادب بھی تخلیق ہوا ہے اس طرح کے رویوں کے خلاف احتجاج بھی ہوا، حلقوں اور خانوں میں بھی ادب تخلیق ہوا، اہم اور غیر اہم غلط ملط بھی ہوئے۔ آپ ایک خلیل صاحب کا نام لے رہے ہیں جبکہ ہر دور میں ایسے نہ جانے کتنے خلیل ہوئے ہیں لیکن ان کی اہمیت کو کسی نے تسلیم نہیں کیا تو یہ تو ایک بے حد طویل بحث ہے۔ ادب میں سچائی کا اظہار کتنے لوگ کرتے ہیں اور سچ بولتے ہیں ان کا حشر کیا ہوتا ہے ہاں شخصیت سازی کا عمل ہر دور میں ہوتا رہا ہے اور آج کچھ زیادہ ہی ہے۔ بہر حال گفتگو خلیل صاحب پر ہو رہی تھی اور چونکہ خلیل صاحب ایک شاعر، ایک بہت اچھے نقاد بھی تھے۔ مختلف ادبی مباحث کے محرک بھی رہے لہٰذا ان سے اختلاف بھی ممکن تھا۔

مخمور۔ جی ہاں بعض موقعے ایسے بھی آئے کہ مجھے بھی اختلاف کرنا پڑا۔ تحریری بھی اور گفتگو میں بھی، اور بہت سے لوگوں کو اختلاف رہا ہوگا ان سے لیکن

دو، تین باتیں ایسی ہیں جو شبیہ سے بالاتر ہیں ایک یہ کہ وہ ادب کے ساتھ بہت ہی مخلصانہ رشتہ رکھتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ وہ بہت ہی باخبر اور بالغ نظر نقاد تھے۔ ادب کے اور خاص طور پر شاعری کے۔ تیسرے یہ کہ خلیل صاحب ادب کے بہت اچھے استاد بھی تھے، یہ تو میں نے نہیں دیکھا کہ وہ کلاس میں کس طرح پڑھاتے تھے لیکن دوستوں کی محفل میں وہ ادبی مسائل پر، ادبی معاملات پر، ادبی امور پر جس ڈھنگ سے گفتگو کرتے تھے تو معلوم ہوتا تھا کہ انھیں بہت اچھا سلیقہ آتا تھا کسی بھی بات کو سمجھانے کا اور اسے ذہن نشیں کرانے کا وہ چاہے اشعار کی تفصیل یا تشریح ہو یا کسی ادبی نکتہ پر کوئی اظہار خیال ہو۔ آپ ان سے کسی ادبی مسئلے پر گفتگو کر رہے ہوں تو سو مثالیں کہیں نہ کہیں سے ان کے ذہن میں ضرور آجاتی تھیں۔

عزیز۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے اساتذہ کی بہتر تربیت کا اثر تھا۔

محمود۔ بھئی دیکھئے ان سے دوسرے لوگوں نے بھی پڑھا صرف خلیل صاحب ہی نے تو نہیں پڑھا۔

عزیز۔ ہاں ذاتی لگن، ایک جذبہ بھی ضروری ہوتا ہے۔

محمود۔ خلیل صاحب خاصے معروف آدمی ہو گئے تھے لیکن اپنے سے چھوٹوں سے محبت کرتے تھے ویسے ہی اپنوں سے بڑوں کا احترام بھی کرتے تھے۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ ایک بار یہ ہوا کہ میں اور کمار پاشی علیگڈھ گئے اور خلیل صاحب کے یہاں ٹھہرے، صبح چائے پی اور سرور صاحب سے ملنے کے لئے گئے۔ سرور صاحب اس زمانے میں علی گڈھ یونیورسٹی میں اردو کے HEAD OF THE DEPARTMENT تھے۔ سرور صاحب بہت شفقت سے محبت سے ملے اور گفتگو ہوتی رہی، گفتگو کے دوران سرور صاحب نے ایک لطیفہ سنایا، میں ہنس پڑا اور خاصہ بلند قہقہہ لگا گیا، کمار پاشی بھی ہنسے، میں نے فوراً ہی محسوس کیا کہ خلیل صاحب صرف مسکرائے اور خاموش بیٹھے رہے۔ یہ وہ چیزیں ہیں جن کے متعلق عزیز صاحب نے کہا تھا کہ قصباتی اخلاق وغیرہ کہ اپنے بڑوں کے سامنے بولنا نہیں ہے، ان کا ادب واحترام کرنا ہے اور ذاتی زندگی میں یہ باتیں خلیل صاحب کے یہاں بہت نمایاں تھیں ان کی یہ عادت تھی کہ جب وہ کسی سے ملتے چاہے دو دن میں ملے ہوں یا دو مہینے میں تو علیک سلیک کے بعد ہی فوراً کوئی ادبی و علمی مسئلہ شروع کر دیتے تھے اور پھر وہی موضوع گفتگو رہتا تھا۔

افتخار۔ خلیل صاحب پر ہماری یہ گفتگو ان کی شخصیت، شاعری اور تنقید نگاری کے کئی اہم گوشوں کو بہتر ڈھنگ سے ابھار سکی کہ نہ صرف قارئین بلکہ ان لوگوں کے لئے بھی مفید ثابت ہوگی جو خلیل مرحوم پر تحقیقی کام کر رہے ہیں یا کریں گے۔ ●

مظفر حنفی ○ حنیف کیفی ○ خالد محمود ○ افتخار امام صدیقی

افتخار۔ آج کی ہماری یہ گفتگو خلیل الرحمٰن اعظمی پر ہوگی جس میں ہم ان کی شخصیت اور فن کے متعلق بات چیت کریں گے کہ ہم ذاتی طور پر انہیں اور ان کی شاعری یا تنقید نگاری کے متعلق کیا خیالات و تاثرات رکھتے ہیں۔ مظفر حنفی صاحب آپ تو خلیل صاحب سے نہ صرف ملے ہیں بلکہ خط وکتابت بھی رہی ہے لہٰذا سب سے پہلے آپ ان کی شخصیت کے متعلق کچھ بتائیے۔

مظفر۔ افتخار صاحب! اصل میں ہمارے یہاں اردو میں تنقید کی روش کچھ عجیب سی رہی ہے، ہم لوگ غیر جذباتی انداز میں، معروضی انداز میں گفتگو کرنے کے بہت زیادہ عادی نہیں ہیں۔ عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ کسی بھی شاعر یا نقاد کے انتقال کے فوراً بعد جب اس کے فن پر یا اس کی شخصیت پر بات ہوتی ہے تو اس میں جذباتیت اور عقیدت مندی کا جذبہ غالب ہوتا ہے، یا تو ہم سراسر اس کی توصیف میں قصیدہ سرائی اختیار کرتے ہیں یا پھر ہم تنقیصی رد یہ اختیار کرتے ہیں تو اس کی شخصیت کو بالکل منہدم کر دیتے ہیں۔ جو توازن ہے اس کی ہمارے یہاں بڑی کمی رہی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے سلسلے میں صورت حال تھوڑی سی مختلف ہے۔ خلیل صاحب اچھے شاعر بھی تھے اچھے نقاد بھی تھے اور جن حالات میں خلیل صاحب کا انتقال ہوا تھا ان کا علم آپ کو بھی ہے اور ہم لوگ بھی جانتے ہیں ان باتوں کو، اس کی وجہ سے تھوڑی سی جذباتیت لوگوں کے ذہن میں اور مزاج میں در آنا ضروری تھی لیکن سارا کچھ خلیل صاحب کے

بارے میں جو بھی کہا گیا ہے ان کے انتقال کے بعد سے لے کر اب تک اس میں توازن بہرحال کارفرما رہا ہے۔ اردو کی جو عام تنقیدی روش رہی ہے اسے اگر مد نظر رکھیں تو دیکھیں گے کہ یہ جذباتیت خلیل صاحب کے سلسلے میں نہیں ہے، ان کے فن کے بارے میں جہاں تک کہا گیا ہے کہ وہ جدید شاعری کے پیش روؤں میں شمار کئے جاتے ہیں جیسے ناصر کاظمی، خورشید احمد جامعی وغیرہ۔ اس فہرست سے اختلافات ہو سکتے ہیں۔ مختلف لوگوں کے کچھ لوگ ایسے لوگوں کو بھی جوڑنا پسند کریں گے جو ان کے پسندیدہ ہیں۔ میرے خیال میں یہ فہرست بہت مخصوص ہے۔ ۱۹۵۰ء اور ۱۹۵۵ء کے درمیان میں ترقی پسند شاعری کرنے والے جونیئر شعرا میں سے بہت سے لوگوں نے ترقی پسندی کا ایک خاص قسم کے انتہا پسندانہ رد عمل اور نعرے بازی سے پیدا ہونے والی کیفیت کے ساتھ ساتھ اپنے سے جونیئر کو نظر انداز کرنے والی روش کے خلاف ایک باغیانہ آواز اٹھائی تھی اس میں وحید اختر، باقر مہدی، خلیل الرحمٰن اعظمی اور ناصر کاظمی وغیرہ تھے ـــــ۔ اب ان میں سے جو بہت زیادہ معتدل انداز کے لوگ تھے، جو ذاتیات کو بہت زیادہ ملحوظ رکھ کر گفتگو نہیں کر رہے تھے بلکہ پوری تحریک کی بنیادی خامیوں پر ناقدانہ نگاہ تھی، ان میں غالباً خلیل الرحمٰن اعظمی کی سب سے اہم شخصیت تھی اور اس لحاظ سے انہوں نے ترقی پسندی کی خوبیوں کو اپنے فن میں آمیز کر کے اس کی جو نعرہ بازی، وقتی اور موضوعاتی پہلو جو تھے ان سے گریز کر کے ان کو نظر انداز کر کے انہوں نے اصل فن پر زور دے کر جو جدید رجحان پیدا کیا ادب میں یہ ان کی بہت بڑی دین تھی۔ اگر اس کا اعتراف کیا جاتا ہے اس میں کسی قسم کی جذباتیت کو دخل نہیں ہے، وہ ہر طرح سے مستحق ہیں کہ انہیں ایک اچھا شاعر اور نقاد تسلیم کیا جائے۔

حنیف۔ ایک بات میں بھی اس سلسلے میں عرض کر دوں کہ جہاں تک خلیل صاحب کی شخصیت کا تعلق ہے کہ وہ ایک شاعر اچھے تھے، نقاد اچھے تھے، یہ بعد کی باتیں ہیں۔ میری نظر میں سب سے پہلے بات یہ ہے کہ وہ ایک اچھے انسان تھے اور وہ جو جذباتی تعلق اصل میں پیدا ہو رہا ہے ایسے لوگوں کو جو ان کے قریب اتنے نہیں تھے۔ دور سے دیکھا تھا یا سننے کا موقع ملا تھا یا ان کی تحریروں کے نظم و ضبط سے واقف ہوتے تھے اور ان کے انتقال سے قبل اور بعد میں جس طرح کے حالات پیدا ہوئے تھے اور جو باتیں سامنے آئی تھیں وہ ایک پس منظر ایسا فراہم کر دیتا ہے کہ خود بہ خود جذباتیت پیدا ہو ہی جاتی ہے

مظفر۔ نہیں کیفی صاحب اس میں ہمیں تھوڑا سا یہ ملحوظ رکھنا پڑے گا کہ اور اس ضمن میں ہماری گفتگو اس سے پیشتر بھی ہوتی رہی ہے کہ جب ہم فنکاروں کے سلسلے میں گفتگو کرتے ہیں تو اچھے فن کار کے لئے میرا خیال ہے کہ یہ قطعی ضروری نہیں ہے کہ وہ ایک اچھا انسان بھی ہو، اچھا انسان ہو اور اچھا فن کار ہو تو میرے نزدیک یقیناً وہ ایک محترم شخصیت ہوگی۔ لیکن عام طور پر یہ ہوتا ہے کہ بڑا فن کار بہت اچھا انسان نہیں ہوا کرتا۔ خلیل صاحب کے یہاں یہ معاملہ نہیں تھا۔ میرے اپنے ذاتی تعلقات بھی رہے ہیں ان سے تو میں جانتا ہوں کہ خلیل صاحب ایک منظم زندگی، با اصول زندگی اور اخلاقی اقدار کی پاسداری کرنے والے انسان تھے۔ پوری زندگی جس بانکپن کے ساتھ انہوں نے گذاری ہے اور جو بے غرضی ان کے یہاں تھی یہ بڑا مستحکم پہلو ہے اور یہ سب کچھ انہیں خوبیوں کی دین ہے جس کا ذکر ابھی میں نے کیا۔ مثال کے طور پر پروفیسر شپ والا معاملہ، اس سے پیشتر جس زمانے میں وہاں پروفیسر شپ آئی تھی انہوں نے اپنے سینئرز کے مقابلے میں خود کو جس طرح سے پس منظر میں رکھا بلکہ میرے خیال میں انہوں نے اسی زمانے میں درخواست تک نہیں گذاری تھی اور جب وہ خود سینئر ہوئے تو اتفاق سے شکار کار ایسے تھے جنہوں نے ان کی اس پرانی روش کا پاس و وضعداری کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ اب ظاہر ہے کہ خلیل صاحب سیاست کے آدمی نہیں تھے اس لئے ایسے لوگوں کو COMPETE نہیں کر پائے۔

حنیف۔ میرا مقصد بھی اصل میں کہنے کا یہی تھا کہ ایسے لوگ جو خلیل صاحب سے جذباتی تعلق نہیں بھی رکھتے ہیں جب اس طرح کے التفات کو دیکھتے یا سنتے ہیں تو ان کا غم اور بھی دوبالا ہو جاتا ہے، جذباتیت اپنے آپ ہی جاتی ہے۔ خلیل صاحب کا ایک اچھا انسان ہونا ان تمام باتوں پر حاوی ہو جاتا ہے۔ ویسے جیسا آپ نے کہا کہ اور یہ بات صحیح بھی ہے کہ ان کے مضامین میں ایک ایسا ٹھہراؤ ملتا ہے، تنقید کی ایسی شان ملتی ہے کہ بالکل صاف صاف الفاظ میں اپنے نظریئے کو واضح طور پر بیان کر دینا اور پوری پختگی اور استقامت کے ساتھ بیان کر دینا۔ ورنہ تمام ترشتانت و معروضیت باقی رکھنا یہ بہت کم فن کاروں کے یہاں ملے گا۔ بے باکانہ انداز ان کی تحریروں میں شروع سے رہا ہے۔ مجھے یاد آرہا ہے کہ "نگار" میں احسن فاروقی کا ایک مضمون ترقی پسند تحریک اور ادب پر شائع ہوا تھا۔ اور آپ تو جانتے ہی ہیں کہ محمد احسن فاروقی اس وقت کتنے AGGRESSIVE

قسم کے لکھنے والے تھے کہ انہوں نے کلیم الدین احمد تک کو نہیں بخشا۔ خلیل صاحب نے فاروقی صاحب کے مضمون کا جواب دیا تھا اور ایک ایک پوائنٹ کو اتنی وضاحت اور دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا کہ دوسرا کوئی اس قسم کی جرات کر ہی نہیں سکتا تھا۔

مظفر۔ میں آپ کی اس بات سے اتفاق تو کرتا ہوں کہ ان کے یہاں بے باکی کا اور جرأت مندی کا بڑا اچھا مظاہرہ ہوا ہے۔ ادبی موضوعات پر ایسے مسائل پر جنہیں وہ سمجھتے تھے کہ لوگوں سے اتفاق کرنا مناسب نہیں ہے، کھل کر بات کرتے تھے لیکن جہاں ان کی جارحیت کی بات ہوتی ہے تو میرے خیال میں ان کے مزاج میں ایک خاص قسم کی نرمی اور لطافت ضرور تھی جسے غلط قسم کی صلح جوئی سے تو نہیں جوڑا جاسکتا اور جارحیت سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بااصل میں اتنی متوازن بات کہتے تھے لغیر یہ دیکھے ہوئے کہ ادب کے میدان میں یا زندگی کے جو دوسرے مختلف پہلو ہیں ان میں ان کی بات کی ہمنوائی کتنے لوگ کریں گے کتنے نہیں کریں گے۔

افتخار۔ جس بے باکانہ رجحانات کا ذکر حنیف صاحب نے کیا ہے وہ تو شروع ہی سے ان کی تحریروں میں موجود ہے۔ ان کے مضامین میں موجود ہے اور ان کی گفتگو، ان کے خطوط اس کے غماز ہیں۔ جس کتاب نے ان کے دوستوں اور ہم عصروں کو وہ جو ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے برگشتہ کیا وہ بھی ایسے ہی، دلوں کی کڑی ہے۔ یہ کتاب جو کہ بہت بعد میں شائع ہوتی ۱۹۷۲ء، ۱۹۵۵ء ۱۹۵۶ء ہی میں لکھ لی گئی تھی یعنی خلیل صاحب کا ذہن شروع ہی سے صاف گو اور بے باکانہ رہا ہے۔

مظفر۔ ترقی پسند ادبی تحریک والا مقالہ ۱۹۵۶ء کے آس پاس ہی مکمل ہوگیا تھا جیسا کہ ابھی آپ نے کہا، یہ مقالہ کتابی شکل میں شائع ہونے کیلئے انجمن ترقی اردو والوں کے پاس پڑا رہا اور شاید وہ ۱۹۷۲ء میں کہیں شائع ہوا، اتنے طویل عرصے تک کتاب کے شائع نہ ہونے سے ان کے نظریے پوشیدہ رہے ایسا نہیں ہے، درمیان میں ان کے دوسرے مضامین میں جیسے زاویۂ نگاہ وغیرہ اس میں ترقی پسندی کے غلط پہلوؤں کی تنقیص اور تنقید کے ساتھ ساتھ اس کے جو مستحسن پہلو تھے اس پر انہوں نے کھل کر لکھا ہے، فیض وغیرہ کی دین کا اعتراف انہوں نے بھرپور کیا۔ ترقی پسند ادبی تحریک، کتاب میں بھی آپ دیکھیئے کہ بڑے سے بڑے فنکار پر لکھتے ہوئے انہوں نے اس کے نقائص کی طرف اشارہ کیا ساتھ ہی ساتھ اس کی خوبیوں کا اعتراف بھی کیا۔ مثلاً کیفی اعظمی کو، سردار جعفری کے مقابلے میں زیادہ بہتر شاعر پایا، جذبی کے یہاں جو ایک خاص قسم کی نرمی ہے اور غزل کے مزاج سے جو مطابقت پیدا ہوتی ہے اس کا انہوں نے کھل کر اعتراف کیا حالانکہ اس زمانے میں جتنے بھی ترقی پسند ناقدین تھے وہ مجروح کی غزل کو جذبی کی غزل پر فوقیت دیتے تھے اور میں ذاتی طور پر جانتا ہوں، افتخار صاحب کہ جذبی صاحب سے خلیل صاحب کے تعلقات اس وقت اچھے نہیں تھے۔ شاد عارفی کے سلسلے میں دو تین مضامین میں نے لکھوائے تھے اس سلسلے میں مجھے علم ہے کہ جذبی صاحب سے ان کے تعلقات بہت اچھے نہیں تھے۔ بڑے نقاد کی یہ پہچان ہے کہ ذاتی تعلقات کو انہوں نے آڑے آنے نہیں دیا اور ان کی اہمیت کو، فوقیت کو تسلیم کیا حالانکہ مجروح کے معاملے میں جیسے عام نقاد انہیں سب سے بڑا ترقی پسند غزل گو کہتے تھے، اعظمی صاحب بھی کہتے تھے یہ جذبی صاحب کے ساتھ بے انصافی نہیں ہوتی لیکن یہ ان کی حق پسندی تھی جس میں اپنے مخالف کے بہتر اور اچھے پہلوؤں کا اعتراف کرنے کی صفت تھی۔

حنیف۔ یہاں بھی یہی بات آتی ہے کہ بہ حیثیت انسان کے .....

خالد۔ اس ساری گفتگو سے یہ معلوم ہوا کہ ایک اچھے انسان پر ایک اچھا نقاد غالب ہے

حنیف۔ میرے خیال میں ایک اچھا انسان ہر وقت ان کے ساتھ رہتا ہے، وہی پشت پناہی کرتا ہے اور اعلیٰ ظرفی کا ثبوت قدم قدم پر فراہم کرتا ہے وغیرہ

خالد۔ دیکھیئے صاحب اگر وہ ایک اچھے انسان نہیں ہوتے ـــــ لیکن ان کی تمام تصانیف وغیرہ سے یہ لگتا ہے کہ وہ ایک اچھے شاعر اور نقاد ضرور ہیں اور میں مظفر صاحب کی رائے سے اتفاق کرتا ہوں کہ اچھے شاعر کے لئے اچھا انسان ہونا بہرحال ضروری نہیں۔

حنیف۔ اچھائی اور برائی کے اظہار معیار الگ الگ ہوتے ہیں، اضافی چیزیں ہیں یہ بہت سی جگہ وہی چیزیں اچھی ہیں جو دوسری جگہ بری ہیں، کوئی کسی چیز کو پسند کرتا ہے، کوئی کسی سوسائٹی میں رہتا ہے۔

مظفر۔ جب ہم ادب پر، تنقید پر، فنون لطیفہ پر گفتگو کرتے ہیں تو اس کو ہم اخلاقی اقدار کی روشنی میں نہیں دیکھتے ہیں بلکہ ہم اس کو ادب کے معیارات

اور ادب کی اقدار کے پیشِ نظر اس کو جانچتے ہیں خواہ وہ فن کار شخصی طور پر کیسا ہی ہو . . . .

افتخار۔ جناب! یہ بحث تھوڑی الگ ہو جاتی ہے کیونکہ اس کے متعلق قطعی متضاد رائیں ہیں، لیکن میرے نزدیک فن اور شخصیت کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ میں اس بحث کو یہیں ختم کرتے ہوئے خلیل صاحب کی شاعری کے متعلق کچھ اور گفتگو کرنا چاہتا ہوں جس میں میر سے ان کا متاثر ہونا، اسلوب اور ہیئت کی تبدیلیاں، ترقی پسند شاعری سے جدید لہجے تک کا شعری سفر، وغیرہ شامل ہیں۔

مظفر۔ افتخار صاحب مجھے ایک خاص پہلو کی طرف آپ کی توجہ مبذول کرانی ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی کے متعلق غالباً کم لوگ جانتے ہیں کہ وہ شاد عارفی کے شاگرد تھے، شاد عارفی مرحوم میرے استاد تھے اب یہ دوسری بات ہے کہ روایتی قسم کے جو شاگرد ہوا کرتے تھے ان کی طرح گردن ڈال کر وہ ہر اصلاح کو قبول نہیں کیا کرتے تھے بلکہ جتنی بھی غزلوں پر اصلاح ہو کر آتی تھی تو باقاعدہ ان سے بحث کرتے تھے، کہیں قبول کرنے کی چیز ہوتی تھی تو قبول کرتے تھے اور کہیں نہیں۔ شاد عارفی بھی بڑے جدید قسم کے استاد تھے، بہت ساری ایسی باتیں جن پر خلیل صاحب کو اعتراض ہوتا تھا اور اگر وہ شاد صاحب کو قائل کر لیتے تھے تو شاد صاحب اس اصلاح کو واپس بھی لے لیتے تھے۔ اس قسم کی شاگردی اور استادی کا سلسلہ تھا۔ اب شاد عارفی کے مزاج کی شاعری ظاہر ہے اپنے مزاج کی منفرد شاعری تھی، پاک، صاف، ستھری، دھلی ہوئی، شدید قسم کی۔ ان کی غزل و نظم میں طنز کا جو پہلو تھا اس سے آپ اگر خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی شاعری کا رشتہ جوڑنا چاہیں تو بڑی دور، دور تک کہیں ان کے یہاں شاد عارفی کی شاعری کے اثرات نظر نہیں آئیں گے۔ شاد عارفی کا شاگرد ہونے کے باوجود اور ان کی شاعری کا اس حد تک اعتراف کرنے کے باوجود کہ ترقی پسند ادبی تحریک کا جائزہ لیتے ہوئے شعری ادب کا جہاں تجزیہ کیا ہے خلیل صاحب نے وہاں بہت سارے شعرا کے مقابلے میں شاد عارفی اور ایک دو اور شعرا جن کی طرف اس زمانے کے ناقدین توجہ نہیں دیتے تھے ان پر خلیل صاحب نے بھرپور توجہ دی اور کہا کہ اصل ترقی پسند شاعر تو یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ فیض کو ہم بڑا شاعر سمجھیں یا سردار جعفری کو بڑا شاعر سمجھیں جن کے یہاں فن کم ہے۔ اس حد تک قائل ہونے کے باوجود اور شاد سے اصلاح لینے کے باوجود ان کے کلام میں جو نرمی ہے، لوچ ہے اپنی عصری حسیت کے باوجود جو کسک ہے اور جو سوز و گداز ہے اس کا رشتہ یقیناً میر سے جڑتا ہے اب یہ کہ میر کے زمانے میں اور خلیل الرحمٰن اعظمی کے زمانے میں تقریباً دو سو، ڈھائی سو سال کا فرق ہے اس لحاظ سے لہجے میں کسی نہ کسی حد تک نیاپن ہونا ہی چاہئے۔ عصری تقاضوں کی جھلکیاں بھی ان کی شاعری میں ملنی چاہئے تھیں لیکن وہ بنیادی جذبہ محزونی کا سوز و گداز کا اور گھلاوٹ کا اور رچاؤ کا جو لہجہ ہے وہ ان کی شاعری میں ملے گا، اپنے طور پر وہ زندگی کی آفاقی قدروں کو اپنا موضوع بناتے ہیں۔ ترقی پسند شاعری کا دائرہ کار جو تھا وہ وقتی موضوعات اور مسائلی شاعری کا تھا مگر خلیل صاحب ان سے ہٹ کر کائناتی شاعری سے اپنا رشتہ جوڑتے ہیں۔ میر کے لہجے میں شاعری کرنے والوں میں ناصر کاظمی اور ابن انشا کا نام بھی لیا جاتا ہے جبکہ میں ابن انشا کو اس صف میں نہیں رکھتا۔ انشا اتنے اہم شاعر نہیں ہیں جتنے اہم شاعر ناصر کاظمی یا خورشید احمد جامی ہیں۔

افتخار۔ لہجے کے اعتبار سے تو ابن انشا کا نام لے سکتے ہیں اور اسلوب کے ذیل میں بھی آپ انشا کا نام لے سکتے ہیں، اہم یا غیر اہم والا تجزیہ یہاں مقصود نہیں

مظفر۔ انشا کا نام جو اس سلسلے میں آ جاتا ہے تو وجہ یہی ہے کہ انشا نے میر کے اسلوب میں شاعری کرنے کی زیادہ کوشش کی، میر کی طویل بحروں کا شعوری استعمال ان کے یہاں ہے۔ موضوعات کے اعتبار سے اور مزاج کا جو فرق ہے وہ اپنی جگہ ہے یعنی میر کے مزاج سے ناصر کاظمی اور خلیل الرحمٰن اعظمی کا مزاج ملتا ہے اسلوب البتہ انشا کے یہاں زیادہ ہے۔ خلیل صاحب کے یہاں مختصر مختصر سی نظمیں ہیں، ایسی بحروں میں ناصر کاظمی نے اور خلیل الرحمٰن اعظمی نے غزلیں کہی ہیں جن میں میر کی غزلیں نہیں ہیں جبکہ ابن انشا کی زیادہ تر غزلیں میر کی بحروں میں ہیں لیکن میر کی شاعری کا بنیادی مزاج ناصر کاظمی اور خلیل صاحب کی شاعری میں زیادہ ہے۔ یہ مزاج ان کے پیش رو فراق گورکھپوری میں زیادہ تھا۔ آپ کے علم میں یہ بات ہوگی کہ شاہکار الٰہ آباد نے جب فراق نمبر شائع کیا اس میں فراق کے کلام کا انتخاب خلیل صاحب نے کیا تھا۔ اس میں بڑی معنویت ہے یعنی میر کے سلسلے کی جو کڑیاں آگے بڑھی ہیں وہ فراق اور پھر فراق کے بعد ناصر کاظمی، خلیل، ابن انشا وغیرہ آتے ہیں۔ فراق کے شعری انتخاب کی ذمہ داری واقعتاً خلیل صاحب ہی قبول کر سکتے تھے، یہ الگ بات ہے کہ بہت ساری ایسی چیزیں انہیں فراق صاحب کی فرمائشوں پر شامل کرنا پڑیں جو وہ اپنے طور پر اس انتخاب کے لائق نہیں سمجھتے تھے

حنیف۔ ایک پہلو سے اور بھی غور کیا جا سکتا ہے کہ خلیل صاحب کا اپنا جو مطالعہ تھا اور پورے کلاسیکی ادب سے ان کی پوری واقفیت باوجود اس کے

کر وہ نئے موضوعات پر لکھ رہے تھے۔ ان کا اپنا مزاج اور مطالعہ یہ دونوں چیزیں ان کی شخصیت میں سماتی چلی گئیں، ان کی شاعری کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ شروع سے آخر تک ... جدید ہوتے ہوئے بھی اپنی کلاسیکی شاعری سے جڑے ہوئے نظر آتے ہیں اور یہی مزاج انہیں میر کے قریب بھی رکھتا ہے میر کا سا لہجہ اور وہ خصوصیات ظاہر بات ہے کہ نہیں آ سکتیں لیکن خلیل صاحب کی شاعری کی جو کیفیت ہے وہ انہیں میر کے قریب لے جاتی ہے۔

مظفر۔ لیکن قطعی طور پر سراسر ایسا ہو کہ میر ہی کے رنگ کی شاعری کرتے رہے ہوں ایسا نہیں ہے۔ مثال کے طور پر ان کا جو پہلا مجموعہ تھا کاغذی پیرہن اس میں آپ کو شہر آشوب ملے گا، طنزیہ قسم کی کچھ نظمیں ملیں گی، دوسرے شعری مجموعے نیا عہد نامہ میں مرثیہ ہے اور کچھ دوسری چیزیں ہیں۔ آخری عمر میں انہوں نے کتنے لکھے، کتنے خوبصورت لکھے ہیں۔ اس میں آپ کو میر کے مزاج سے ہٹ کر ایک خاص قسم کے طنز کی زیریں لہریں ملیں گی۔

حنیف۔ اور اپنے دور کا کرب ابھر کر آتا ہے ان میں۔

مظفر۔ تھوڑی سی تلخی زیادہ ہے میر کے مقابلے میں۔

افتخار۔ برادر خلیل الرحمٰن کی شاعری کا تقابلی مطالعہ اور تجزیہ تو ہوا۔ ساتھ ہی خلیل صاحب کی شعری کاوشوں کا اعتراف بھی۔ مگر کیا خلیل صاحب کی شاعری کو ہمارے نقادوں نے پرکھتے ہوئے اس کا کوئی ادبی تعین کیا؟

مظفر۔ ہوتا یہ ہے کہ شاعر کو یا کسی بھی فن کار کو خانوں میں بانٹ کر دیکھا جاتا ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کے سلسلے میں اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا انہوں نے اپنے معاصروں کے ساتھ انصاف کیا؟ بہت سارے لوگوں کا جواب ہوگا کہ انصاف نہیں کیا انہوں نے، فلاں کا ذکر نہیں، فلاں کو نظر انداز کر گئے وغیرہ وغیرہ۔ میرا خیال یہ ہے کہ انہوں نے جس موضوع پر قلم اٹھایا انصاف کیا۔ خلیل صاحب کی تو خوبی یہ تھی کہ وہ جس موضوع پر بات کرتے تھے ڈوب کر بات کرتے تھے۔ ہمارے یہاں کے ناقدین میں خصوصاً خلیل صاحب کی نسل کے جو ناقدین ہیں ان میں سب سے بڑی خامی یہ رہی کہ یا تو وہ کلاسیکی ادب کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد کلاسیکی ادب سے الگ ہٹ کر بات ہی نہیں کرتے تھے، مغربی ادب پر ان کی نگاہ نہیں ہوا کرتی تھی یا پھر ایسے نقاد ان کے دور میں تھے تو صرف مغربی ادب کے پیمانوں کو منطبق کرتے تھے اور ہمارے کلاسیکی ادب کو رد کرتے تھے۔ خلیل صاحب قوی حافظے کے مالک تھے، کسی موضوع پر گفتگو کرتے ہوتے مجھے حیرت ہوتی تھی کہ پچاس، پچاس سال پہلے کس رسالے میں، کس مہینے کے پرچے میں کس CONTEST میں کوئی بحث چھڑی تھی اس سلسلے میں وہ بحرِ ذخار تھے۔ مسلسل حوالے دیتے چلے جاتے تھے۔ جہاں ان کا حافظہ بہت اچھا تھا وہیں مغربی ادب پر اچھی نگاہ رکھنے کے ساتھ ساتھ وہ اپنے کلاسیکی ادب سے بھی بخوبی واقف تھے اور ان کے آمیزے سے اپنی جرأت مندی، اپنی ناقدانہ بصیرت اور ان سب کی کارفرمائی سے وہ ایسی خوبصورت قسم کی باتیں کہتے تھے جو بالکل ORIGINAL لگتی تھیں، جچی تلی ہوئی منصفانہ باتیں کہتے تھے جس کی وجہ سے ان کی تنقید کی قدر و قیمت ان کے معاصر نقادوں کے مقابلے میں زیادہ ہے۔ اب رہی ان کی اپنی شاعری کی بات تو ایک بات اور اس ضمن میں عرض کروں کہ عام طور پر یہ سمجھا گیا کہ انہوں نے ترقی پسندی سے بغاوت کر کے جدید رجحان کو فروغ دیا اور پھر اسی کی ہمنوائی کرتے رہے ایسا نہیں ہے۔ ترقی پسندی کی عام خامیوں کی طرف انہوں نے ضرور اشارے کئے۔ لیکن ترقی پسندوں کی دین سے انہوں نے کبھی انکار نہیں کیا۔ ساتھ ہی ساتھ انہوں نے جدیدیت کے نئے رویّے، تازہ جھونکوں کی اہمیت اور نئے خیالات کی افادیت کا احساس دلایا، شاعری میں جدت، ندرت اور تازگی کی جو کارفرمائی ہوا کرتی ہے اس کا انہوں نے اعتراف کیا۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ جدید شاعری کے جو عام پہلو تھے۔ فیشن کی باڑھ میں آ کر جن لوگوں نے اپنے اوپر جدیدیت کو اوڑھ لیا تھا اور یکسانیت ایک طرح کا سپاٹ پن شاعری میں آ گیا تھا اس کا خلیل صاحب کو بھرپور احساس تھا اور مختلف جگہوں پر انہوں نے اس سلسلے میں باتیں کی ہیں۔ پندرہ، سولہ سال سے مسلسل میری ان کی خط و کتابت رہی ہے۔ ان میں مختلف ایسے خطوط ہیں جس میں انہوں نے ایسی شاعری جس میں ابہام، اہمال تک جا پہنچا ہے اور اتنی شخصی اور ذاتی علامتیں لوگوں نے اپنی شاعری میں استعمال کی ہیں کہ بس وہ ہی سمجھ سکتے ہیں یا جو لوگ ان واقعات سے واقف ہیں جو ان نظموں اور غزلوں کے محرک ہیں وہ سمجھ سکتے ہیں۔ باقی دوسرے لوگوں کے لئے تا وقتیکہ آپ شاعر سے براہ راست استفسار کریں تو آپ کو معلوم ہو اس طرح کے متعدد خیالات مدنا موں اور حوالوں کے ان خطوط میں موجود ہیں۔ ان تمام باتوں کی یکجائی نے ناقدین کو ان کی شاعری کے ادبی تعین کو مقرر کرنے میں الجھنیں پیدا کی ہیں۔

خالد۔ اردو شعر و ادب میں بعض چھوٹے چھوٹے اور غیر اہم قد محض وسائل اور نقاد دوستوں کی وجہ سے

اس قدر بلند ہو گئے ہیں کہ دوسرے اہم اور صحیح معنوں میں اردو زبان و ادب کی خدمت کرنے والے ادبا اور شعرا گمنام ہو کر رہ گئے ہیں۔ خلیل صاحب خواہ کیسے ہی شاعر رہے ہوں لیکن ایک جراحی نقاد کی حیثیت سے ان کی ابھی ضرورت تھی ——— تاکہ ادب میں خود ساختہ ادبا اور شعرا کی چھٹائی ہو سکتی۔

افتخار۔ مجھے آپ کی بات سے اختلاف نہیں ہے لیکن ہمارے وہ نقاد جو خلیل مرحوم کی ناقدانہ بصیرت، بے باکی اور صالح تنقیدی شعور کا اعتراف کرتے ہیں خود کیوں اس طرح کی روش اختیار نہیں کرتے۔ ذاتی اور شخصی تحریروں کو تنقیدی معیار کیوں بنائے ہوئے ہیں، احباب نوازی پر کیوں تلے ہوئے ہیں، شعر و ادب کو انتہا پسندانہ نظریوں کے خانوں میں کیوں تقسیم کر رہے ہیں کہ ادب ابھی اسی طرح کا تخلیق ہو۔ اگر خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید کا کوئی معیار ہے تو اسے رواج دینا چاہیئے اور اگر نہیں تو اس کا اعتراف سراسر فریب ہے۔ ●

کمال احمد صدیقی ○ افتخار امام صدیقی

خلیل الرحمٰن اعظمی کے سلسلے میں جو گفتگو کمال احمد صدیقی صاحب سے ہوئی تھی وہ بے حد طویل اور حقائق و انکشافات لئے ہوئی تھی، اس گفتگو کا حرف حرف قابل تحریر ہے تاہم کمال صاحب کے بیحد اصرار پر اسے شامل نہیں کیا جا رہا ہے۔ لیکن وہ تمام باتیں میرے ذہن میں محفوظ ہیں اور کسی مناسب موقع پر دوسری بہت سی اہم باتوں کے ساتھ انہیں بھی کاغذ پر لایا جائے گا۔ اردو ادب اور اس کے فروغ میں شریک فن کاروں کے ساتھ مصلحتوں کے پیش نظر جو کچھ ہوتا ہے اور ہو رہا ہے اور ہماری ادبی تاریخ مرتب کرنے والوں نے، خود ساختہ نقادوں نے، سستی شہرت کے حصول کے لئے گذشتہ چالیس پچاس برسوں میں جو دھاندلیاں، غلط فہمیاں اور غلط بیانیوں کا چکر چلایا ہے اس کا محاکمہ بے حد ضروری ہے جس کے لئے شخصیتوں کے وہ خطوط، بیانات، تحریریں اور حوالے عام کرنے کی ضرورت ہے جو عموماً ذاتیات کے ذیل محفوظ ہو جاتے ہیں ذیل کی گفتگو میں جگہ جگہ حقائق و اعترافات کی جھلک نظر آئے گی

کمال۔ دیکھئے ٹیلیفون آیا تو خیالوں اور باتوں کا سلسلہ ٹوٹ گیا.....

افتخار۔ ہماری گفتگو اردو زبان و ادب کی تاریخ، مسخ شدہ تنقیدی و تحقیقی رویوں سے ہوتی ہوئی خلیل صاحب کی حق گوئی، اردو شعر و ادب میں ہونے والے تسامحات اور خلیل صاحب کے محسوسات و انکشافات سے ہوتی ہوئی ان کے خاندانی پس منظر اور ان کا مذہبی ماحول اور اسی ماحول کے پروردہ خلیل صاحب۔ مگر وہ اس ماحول کی پرورش کے باوجود انھوں نے اپنا راستہ الگ تلاش کیا۔ اور اپنی انفرادیت قائم کی۔

کمال۔ جی ہاں یہ تو شاید کہنا مشکل ہو گا کہ انفرادیت بنائی لیکن یہ میں نے محسوس کیا کہ وہ اپنے ورثہ سے مطمئن نہیں ہیں جو مذہبی تعلیم انہوں نے حاصل کی اس میں کمی انہیں محسوس ہوئی چنانچہ وہ پڑھائی کے لئے علی گڑھ آئے اور پھر ترقی پسند تحریک سے وابستہ ہو گئے ترقی پسند ادبی تحریک ان کا پی، ایچ، ڈی کا موضوع بھی بنا، بعض جگہ مجھے ان سے اختلاف ہے لیکن ان کے بارے میں اگر بحث کی جائے تو صرف وہی ایک موضوع ہو جائے گا۔ اور وہ تمام نزاکتیں جن کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا صرف وہیں رہ جائیں گی۔ یہ تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ جب ملک کی تقسیم ہوئی اس وقت خلیل صاحب وابستہ تھے ترقی پسند ادبی تحریک کے ساتھ اور بہت ہی سرگرم رکن تھے۔ علی گڑھ کی شاخ کے، اسی زمانے میں ایک سفر کے دوران ٹرین سے پھینک دیئے گئے اس حادثہ کے متعلق تمام لوگوں کو علم ہے اس کی وجہ بھی سب کو معلوم ہے۔ جس شخص پر یہ کچھ بیتے قاعدے سے اگر وہ بدترین فرقہ پرست ہو جاتے تب بھی اس کے لئے کچھ جواز ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوا کیوں کہ وہ ایک نظریئے سے وابستہ تھے یعنی ترقی پسند تحریک سے اور یہی ان کے کام بھی آئی۔ اس تحریک نے ان کو سہارا دیا، یہ سہارا میں اس لئے کہہ رہا ہوں کہ وہ غلط راستے پر نہیں پڑے۔ میں سمجھتا ہوں کہ زندگی کا ایک نیا موڑ اس حادثہ کے بعد شروع ہوتا ہے۔

وہ صحیح راستے پر رہے، انسانی قدروں کا احترام ان کے دل میں باقی رہا بلکہ اس میں دو چند اضافہ ہوا۔

افتخار۔ ترقی پسند ادبی تحریک سے ان کی وابستگی اور وہ بھی شدید کہ اس خاطر جیل بھی گئے، اس نظریئے کے فروغ میں انہوں نے جو فضا ہموار کی اور زمین بنائی وہ بھی ایک اہم کارنامہ ہے لیکن ادب کے طالب علم کو یا ان لوگوں کو جو خلیل صاحب پر تحقیقی کام کریں گے ایک مشکل ضرور پیش آئے گی۔ ان وجوہ کی تلاش میں کہ کیوں وہ ترقی پسند تحریک سے برگشتہ ہوئے۔

کمال۔ افتخار امام صاحب اگر آپ مجھ پر یہ ذمہ داری نہ ڈالیں کہ اس دکھتی ہوئی رگ کو چھیڑوں تو یہ آپ کی بڑی عنایت ہوگی لیکن اگر آپ کا اصرار ہو تو اس میں مجھے کہنے میں کوئی تکلف نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ہم زمانے میں ایک دوسرے سے اتنے قریب ہیں کہ شاید بعض ذہنوں کو اس سے دھچکا لگے اور بعض دلوں کو ٹھیس پہنچے۔

افتخار۔ کمال صاحب دیکھئے جو حقائق ہیں ان سے اگر دلوں کو ٹھیس اور ذہنوں کو دھچکا لگتا ہے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس طرح کے ذہنی جھٹکے اور دھچکے لگنے چاہئیں کیوں کہ یہ زبان کے لئے، ادب کے لئے اور ان فنکاروں کے لئے بے حد ضروری ہے جنہوں نے شعر و ادب کی بے لوث خدمت کی ہے اپنی عمریں وقف کی ہیں لیکن علاقائی تعصبات نے نزاکتوں اور مصلحتوں نے موقع پرست احباب پروروں نے ایسے نہ جانے کتنے ہی ادیبوں، شاعروں اور فن کاروں کو وقت کی گہری دھند میں روپوش کر دیا۔ فن اور فنکاروں کا صحیح تعین ہوتا نہیں اور ان پر غلط فہمیوں کی رنجشوں کی گرد میں پڑتی چلی جاتی ہیں اور صحیح معنوں میں جو ادب کا طالب علم ہے اسے شعر و ادب کی تفہیم و تحقیق اور فن کاروں کی تلاش اس کے فنی تعین میں بڑی دشواریاں پیش آتی ہیں۔ یہ سلسلہ برابر جاری ہے جس کا سدباب بے حد ضروری ہے۔

کمال۔ مجھے آپ کے خیالات سے مکمل اتفاق ہے اور میں خود بھی زبان و ادب کی اس بے راہ روی سے نالاں ہوں۔ میں حقائق کے اظہار سے چوکتا ہیں میں نے بہت سی ایسی باتیں شروع میں آپ کو بتائیں کہ جن کا اظہار فی الحال بے محل ہے، بس چونکہ ہم ایسے ہی انکشافات اور نزاکتوں کے طویل سلسلوں میں الجھ جائیں گے اور ہماری گفتگو خلیل صاحب پر ہوتی ہوئی کہیں اور نکل جائے گی لہٰذا اس وقت تو معاف فرمائیے ..... ہاں دو باتیں اس ضمن میں ضرور عرض کر دوں۔ ترقی پسند ادبی تحریک میں جو لوگ شامل تھے کچھ سے خلیل مرحوم کو شکایتیں تھیں، جذبی کو بھی شکایتیں ہیں، اب بھی ہیں خود مجاز کو شکایتیں تھیں مگر چہ انہوں نے اس کا ذکر صرف دوستوں سے کیا اور زیادہ باتیں نہیں کیں۔ یہ سب کچھ لوگوں کی رویئے کی وجہ سے تھا۔ ان رویوں کی وجہ سے کچھ لوگوں میں تبدیلیاں نہیں آئیں لیکن جو حساس ذہن تھے ان میں تبدیلیاں آئیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ ذاتی وجوہات ہیں۔ اصول کی وجہ نہیں ہے وہ اس وقت نوجوان تھے اور زندگی میں کئی موڑ ایسے آچکے تھے جہاں جذباتی اور روحانی ٹوٹ پھوٹ نے انہیں بے حد متاثر کیا تھا لہٰذا جن نظریوں نے انہیں دوبارہ سنبھالا دیا تھا ان سے کسی بھی طرح کی اذیت اور تکلیف ایک نوجوان کے دل کو پہنچ سکتی ہے وہ پہنچی کچھ توقعات انہیں تھیں یا جس ردّعمل کی ان کو توقع تھی کسی سے وہ ردّعمل نہیں ہوا، اب چونکہ وہ لوگ ابھی موجود ہیں، ہمارے دوست ہیں اس وجہ سے ہمیں معلوم ہے۔ خلیل رفتہ رفتہ الگ ہوتے گئے اور انہوں نے محسوس کیا کہ اصولی طور پر سب غلط ہے لیکن آپ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کو دیکھیں تو آپ کو یہ محسوس ہوگا کہ فن کا پیمانہ اور فن کا جو معیار ہے ان کے نزدیک اور وہ جو ترقی پسند اور جدیدیت کی بحث چلی بعد میں اور سب سبب سمجھتے ہیں کہ اس طرح کی بحثیں قطعی بے معنی سی چیزیں ہیں خلیل نے انہیں ہمیشہ بے معنی ہی سمجھا لیکن بعض لوگوں سے انہیں جو جذباتی ٹھیس پہنچی تھی ذاتی طور پر اس نے اور دوسرے کئی محرکات تھے جو ترقی پسند ادبی تحریک سے علیحدگی کا سبب ہوئے اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ یہ اختلاف اصولی نہیں بلکہ ذاتی نوعیت کا تھا۔ اصول تو ہر چیز کے لئے مرتب ہو جاتے ہیں۔ آپ دیکھئے ہیں کہ تین ملکوں میں جب جھگڑا ہوتا ہے تو ان میں سے جب بھی دو ملک آپس میں ملتے ہیں اس کے باوجود کہ تینوں کے نظام مختلف ہیں، قدریں مختلف ہیں لیکن آپس میں ملنے پر کہتے ہیں کہ ہم میں اور آپ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اس طرح دوسرے دو ملک ایک دوسرے سے ملتے ہیں تب کہتے ہیں کہ ہم میں اور آپ میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ دوسرے دو ملک ممالک آپس میں ملتے ہیں تو یہی کہتے ہیں۔ جب ہر چیز مشترک ہے تو پھر یہ جھگڑا کیا ہے۔ جو سفارتی سطح پر ملکوں میں آپس میں ہوتا ہے وہی نجی زندگی میں بھی ہوتا ہے۔ بعض اوقات دشمنوں کے دشمن دوست ہو جاتے ہیں بعض اوقات دوستوں کے دوست دشمن ہو جاتے ہیں۔ دشمن ہوتے ہوئے بھی دوستوں کے دوست

ہیں تو یہ بڑا عجیب سا COMPLEX ہے۔ ایک وقت وہ بھی تھا جب وہ اچھی یا بری بات ہی سمجھتے کے قائل نہیں تھے۔ بعد میں وہ اس بات کے قائل ہوئے "نہیں بھی ہر چیز کو سفید اور سیاہ میں نہیں بانٹا جا سکتا ہے۔ ایسا بھی ہے کہ نیکی اور بدی کی ایک سرحد بھی ہوتی ہے جو اقلیدس کے نقطے کی طرح اور خط کی طرح جس کا وجود یا تو صرف ادراک میں ہے یا وہم میں ہے۔ سطح پر نہیں ہوتا کیوں کہ اگر ہو تو وہ نقطے کی تعریف میں ہے خط کی تعریف میں ہے وہ SPACE میں بالکل ہی کوئی جگہ گھیرتے ہی نہیں اگر جگہ نہیں گھیرتا تو وہ مقام ہے کیوں کہ تعین جو مقام کا ہوتا وہ بالکل ہی IMAGINERY ہو گیا کہ نہیں یعنی صرف تصور میں اس کا تعین ہو گیا تو اس بات کو بھی خلیل صاحب جانتے تھے اور میرا خیال ہے کہ یہی بات فراق گورکھپوری نے کہی اور خلیل صاحب نے اپنی آخری عمر کے مضامین میں بھی اس کا حوالہ دیا ہے۔ یہ ایک تبدیلی ان میں آئی تھی وہ شاید اس وجہ سے کہ وہ جس چیز کو چھوڑ کے آئے تھے اور طبقے والے سماج سے صرف انسانی قدروں کی بات کرنا میں سمجھتا ہوں کہ یہ ان کے یہاں ایک DEPARTURE آیا تھا۔ ہمارا سماج طبقوں میں بٹا ہوا ہے خود خلیل صاحب ایک آسودہ UPPER MIDDLE کلاس گھرانے سے آئے تھے اچھے متوسط طبقے سے آئے تھے لیکن اس کے باوجود جن قدروں پر ان کا ایمان تھا انہیں یقین تھا وہ اس طبقے کی قدریں نہیں تھیں وہ سماجی انصاف چاہتے تھے اور مارکس نے جن قدروں کا تصور پیش کیا تھا۔ اس میں یقین رکھتے تھے مگر پھر اس سے قدرے وہ ہٹے اور انسانی قدروں کی بات ہونے لگی، یہیں اس میں ایک SHIFT نظر آتا ہے شاید اس وجہ سے کہ قدروں کو ہم نے صحیح طریقے سے سمجھا نہیں ہے۔ بنیادی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ جو SUPPER STRUCTURE ہے یہ دو اور دو چار کے طریقے سے نہیں سمجھا جا سکتا جس طرح سے علم ہندسہ ہی ہم سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارا سوشیل سسٹم جو ہے، ہماری سوسائٹی جو ہے، ور جو اس کی نزاکتیں ہیں، اچھی اور بری باتیں ہیں اور بہت سی روایات ہیں جن کا احترام ضروری ہے وہ روایات جو زندگی کو اور سماج کو لے کے آگے بڑھ سکتی ہیں اور وہ وہی ہیں جو ظلم اور جبر کے خلاف ہیں ان کے خلاف لڑنا ہے اس پر ان کا یقین اور اعتماد رہا کہ ظلم اور جبر کے خلاف لڑنا ہے یہی وجہ ہے کہ انہوں نے کسی بھی ظلم اور جبر کے نظام کا ساتھ نہیں دیا لیکن اس کے باوجود ان میں جو ایک تبدیلی آئی تھی، وہ اسی طبقے والے سماج کی قدروں کے سہارے سے آئی تھی یہ سہارا انہوں نے کیوں لیا یہ میں نہیں کہہ سکتا اس پر بہت زیادہ کام کرنے کی ضرورت ہے لیکن یہ بالکل یقینی بات ہے کہ وہ اس بھیڑ کے ساتھ نہیں تھے جو ہمارے ادب میں پیدا ہوتی رہتی ہے اور یہ ہر زمانے میں ہوتا ہے کہ شاعروں کی تعداد کم ہوتی ہے اور متشاعروں کی تعداد زیادہ ہوتی ہے اس کا احساس انہیں تھا شاید اس کے بارے میں کہیں لکھا بھی ہو گا مجھے معلوم نہیں، کیوں کہ بعد کی تحریریں میں نے نہیں دیکھیں لیکن اکثر گفتگو میں وہ اس بات کا شدت سے اظہار کیا کرتے تھے اور اس کے قائل تھے کہ بڑا ادب زیادہ مادی کیا ہے اور زیادہ لکھا جا رہا ہے، وہ ادب نہیں ہے۔

افتخار۔ آپ نے جس عمدگی سے خلیل صاحب کی شخصیت، فن اور مزاج کا تجزیہ کیا ہے اس سے ذہن میں کئی سوال ابھرتے ہیں مگر جن کا جواب آپ شاید نہیں دے سکیں گے کیوں کہ پھر وہی نزاکتیں اور مصلحتیں سامنے آ جائیں گی پھر بھی آپ یہ ضرور بتائیے کہ خلیل صاحب سے ہونے والی گفتگو میں حقائق اور سچائیاں کیا کیا سامنے آئیں دراصل ہم اپنی گفتگو میں جس قدر کھرے اور صاف گو ہوتے ہیں اپنی تحریروں میں نہیں ہوتے۔ کئی طرح کے خدشات، اندیشے خوف اور طرح طرح کے احساسات گھیرے رہتے ہیں اردو شعر و ادب کی تاریخ کا ساٹھ فی صد حصہ اسی طرح کے تحریروں سے مزین ہے۔

کمال۔ بے شک ایسا ہی ہے اور ایسا ہوتا بھی ہے۔ خلیل صاحب ایک بہت اچھے انسان تھے۔ زندگی کا DETACHED VIEW لینا یعنی ناوابستگی والا رجحان، میرے خیال میں وہ اس کے بارے میں یقین تو رکھتے تھے لیکن یہ ذہن کی اوپری سطح پر تھا، وہ بہت ہی تھے زندگی سے اور آخر وقت تک رہے اور زندگی کے مسائل سے۔ اور وہ DETATCHMENT والا VIEW جو نعرے کے طور پر ادب میں استعمال کیا گیا اور مجھے افسوس ہے کہ ادب میں جن لوگوں کا نام لیا جاتا ہے اس زمانے میں کہ ان لوگوں نے ادب کے فروغ میں حصہ لیا ہے اور جن تکلیف دہ رویوں کی طرف آپ نے اشارے کئے، خلیل صاحب ایسے لوگوں اور اس طرح کے رویوں کے ساتھ تھے نہیں۔ جو زندگی کی نزاکتوں کو سمجھتا ہو، جس نے ایک بار سمجھ لیا ہو کہ سماج طبقوں میں بٹا ہوا ہے اور تمام برائیاں اسی کی وجہ سے ہیں۔ وہ دو وجوہ سے دوسری طرف جا سکتا ہے یا تو وہ بے ایمان ہو اور پیسے کی لالچ میں جائے یا اس کے کوئی اور مفادات ہوں، یہ دونوں مفادات خلیل کے سامنے نہیں تھے۔ جو باتیں ان سے ہوتی تھیں اس سے بھی

یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ محسوس کرتے ہیں کہ ظلم ہو رہا ہے۔ اگر ایک مسلمان کسی ہندو پر ظلم کر رہا ہے تو وہ اس وجہ سے ظلم نہیں کر رہا ہے کہ جس پر ظلم کیا جا رہا ہے وہ ہندو ہے اور جو ظلم کر رہا ہے وہ مسلمان ہے یا ایک ہندو مسلمان پر ظلم کرتا ہے دونوں صورتوں میں ہو سکتا ہے کہ ایسے افراد کے ذہنوں میں فرقہ واریت کے جراثیم ہوں۔ ظلم تو مسلمان، مسلمان پر بھی کرتا ہے۔ اور ظلم تو ہندو، ہندو پر بھی کرتا ہے اور ظلم تو ہریجنوں پر بھی ہوتا ہے۔ یہ طبقے کی بنیاد پر عام طور سے ہوتا ہے۔ انفرادی واقعات میں کمیونزم اور فرقہ پرستی ہو سکتی ہے لیکن عام طور پر ایسا طبقاتی بنیادوں پر ہوتا ہے۔ ادب کا طبقاتی نظام خلیل کی نظروں سے اوجھل نہیں تھا ــــ اس کے باوجود کبھی کبھی وہ اس سے الگ ہٹ کے بھی سوچتے تھے یہ بات ان کے یہاں آ گئی تھی، کیوں آ گئی تھی یہ میں نہیں جانتا۔ شاید ذاتی وجوہ کی بنا پر ایسا ہو اور ذاتی وجوہ کی بنا پر آدمی جو سوچتا ہے اس کے لئے منطق بھی موجود ہے، اصول بھی ہیں اصول اگر نہیں ہوتے ہیں تو تراش لئے جاتے ہیں لیکن تراشنے کی ضرورت نہیں ہوتی کیوں کہ اصولوں کی بھرمار ہے۔

ایک بات اور میں کہنا چاہتا ہوں کہ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا، اچھے ادب پر ان کی بڑی گہری نظر تھی اور اس سے انہوں نے استفادہ کیا۔ بہت سی تبدیلیاں اسی وسیع تر مطالعے کی دین ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ میری ناقص رائے بالکل غلط ہو لیکن میں سمجھتا ہوں کہ خلیل الرحمن اعظمی نے اچھی نظموں اور اچھے شعروں کی صورت میں جو کچھ دیا ہے وہ ایک قابل قدر اضافہ ہے اور وہ باقی رہے گا۔ ●

باقر مہدی ○ افتخار امام صدّیقی

افتخار۔ باقر صاحب خلیل الرحمن اعظمی کے سلسلے میں آپ کا نام اور آپ کا ذکر برابر ہوتا ہے کیوں کہ آپ دونوں ایک دوسرے کے بے حد قریب رہے اور ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہا بھی پھر علیحدہ ہوئے تو فاصلوں میں بھی شدت آ گئی تھی۔ ٹرین کا وہ حادثہ جہاں فسادیوں نے آپ دونوں پر حملہ کیا تھا اور خلیل صاحب کو زخمی کر کے ٹرین سے پھینک دیا تھا۔ آپ نے انھیں محفوظ مقام تک پہنچایا تھا۔ زندگی کے کئی اہم موڑ ایسے آئے جہاں آپ نے انہیں بھرپور تعاون بھی دیا۔

باقر۔ بھرپور تعاون دینا یا مدد دینا تو بہت معمولی بات ہے یہ اور لوگوں نے بھی کیا ہوگا۔ کسی دوست کے لئے قربانی دینا یا کچھ کرنا اتنی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ اب اس عمر میں پہنچ کر میں نے لکھا ہے کہ اپنے پہلے دوست کو کھونے کا احساس مجھے ہے اور دل کو بھی ہوگا میں تو اب بھی خلیل الرحمن اعظمی کو خواب میں دیکھتا ہوں ابھی چھ سات روز پہلے ہی خواب میں دیکھا تھا۔ موت کے بعد وہ مجھے حد سے زیادہ یاد آتے ہیں جتنا کہ مجھے وہ اپنی زندگی میں یاد نہیں آتے تھے، وہ مجھے بار بار یاد آتے ہیں اور ان میں جو ذہانت تھی وہ مجھ میں بہت کم ہے، میں انہیں اپنے سے بہت زیادہ ذہین آدمی سمجھتا ہوں اور بہت اچھا شاعر، ادیب مانتا ہوں یہ اور بات ہے کہ میرا نقطۂ نظر ادب میں بالکل الگ ہے ان کا الگ تھا اسکا میں نے اظہار کیا ہے۔ وہ ایک نہایت مہذب نقاد تھے ان کے یہاں وہ بے راہ روی نہیں پائی جاتی جو اوروں کے یہاں پائی جاتی ہے۔ ادب کا تو غضب کا مطالعہ تھا۔ یادداشت کے سلسلے میں تو یہ ہے کہ انہیں یہ تک یاد تھا کہ فلاں کتابوں کی قیمت ۱۹۳۸ء میں اتنی تھی اور ۱۹۴۶ء میں اتنی ہے۔ ۱۹۴۹ء کے بہترین ادب میں ان کا مضمون لیا گیا تھا جو آتش پر ہے۔ بہت کم نوجوان ادیب اور شاعر ایسے ہوں گے۔ یہ کتاب میرے پاس ہے جو انہوں نے عنایت کی تھی۔ خلیل صاحب کے سوچنے کے طریقے بہت الگ تھے، ان کا دائرۂ فکر کافی وسیع تھا، مگر ایک لحاظ سے محدود تھا کہ وہ اردو ادب کے رسیا تھے اور اس کے ماہر تھے، اردو ادب کے فنکار تھے دنیا کے ادب کا مطالعہ انہوں نے شاید اس لئے نہیں کیا تھا کہ انہیں پڑھنا پڑتا تھا اور جسکو پڑھانا پڑھتا ہے اور اچھا معلم بننا پڑتا ہے، اچھا استاد بننا پڑتا ہے وہ سب چیزیں نہیں پڑھ سکتا اسے اپنے مطالعے کو مخصوص کرنا پڑتا ہے۔ اگر انہوں نے افریقی ناول نہیں پڑھے تو یہ ان کے کام کے نہیں تھے۔ میرے کام کے نہیں ہیں۔ لیکن میری ہابی ہے میں کسی بھی شاعر، ادیب کو پڑھوں گا، مجھے کوئی مخصوص کام نہیں کرنا ہے۔ میں کچھ بھی پڑھوں گا۔ میرا مطالعہ آوارہ مطالعہ ہے، خلیل کا مطالعہ آوارہ نہیں تھا مخصوص تھا جس سے وہ کام لیتے تھے۔ وہ مجھ سے بہت جیسے انگریزی میں کہتے ہیں

FAR HEAD UP تھے۔ میں آج بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ خلیل صاحب ہوتے تو ان سے بہت کچھ سیکھتا اس کے باوجود کہ میری ان کی دوستی سنہ ۱۹۵۰ء میں ختم ہو چکی تھی جس کا مجھے بے حد افسوس رہا۔

آپ دونوں کی یہ مثالی دوستی کب سے کب تک رہی اور کس نوعیت کی تھی؟ پھر تعلقات اور دوستی ختم کیوں ہو گئی؟

خلیل سے میری دوستی شدید، گہری اور چند برسوں پر مشتمل تھی یعنی ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء تک ان چار برسوں میں ہم نے ایک دوسرے کو بے اختیار چاہا تھا اور پھر میں لکھنؤ چلا گیا تھا اور خلیل علیگڈھ میں رچ بس گئے تھے۔ خلیل سے میری پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی مجھے یاد نہیں۔ "نیا عہد نامہ" میں خلیل نے جان بوجھ کر میرا ذکر نہیں کیا ہے۔ مگر میرا قیاس کہتا ہے کہ ان کی پہلی آزاد نظم "نقش ناتمام" سب سے پہلے میں نے ہی پڑھی تھی خلیل نے یہ نظم اپنے مجموعے میں شامل نہیں کی مگر جہاں تک مجھے یاد آتا ہے کہ ہماری ملاقاتوں اور دوستی کا سلسلہ شاید یہیں سے شروع ہوا تھا۔ یہ سنہ ۴۶ء کا زمانہ تھا۔

اصل میں ہماری طالب علمی کی دوستی ہماری تعلیم کے بعد باقی نہ رہ سکی آج اس کا تجزیہ کرتا ہوں تو مجھے اپنا قصور زیادہ نظر آتا ہے۔ خلیل کی شخصیت کے پروان چڑھنے کے لئے میری دوستی کا خاتمہ ضروری تھا اس لئے کہ میں جب تک ان کے ساتھ تھا وہ میری بیشتر باتیں مانتے تھے اور ہم یاجوج ماجوج کی طرح مست ہو رہتے تھے ہم نے ایک ہی مضامین لئے تھے۔ اکثر ایک ہی طرح کے کپڑے پہنتے تھے ایک ہی کمرے میں رہتے تھے جیب خرچ بھی ایک تھا۔ اس طرح کی دوستی زیادہ دنوں تک نہیں چلتی۔ اور ختم ہو گئی۔ خلیل کو اور مجھے بہت افسوس ہوا تھا مگر آج اپنے تعلقات کا تجزیہ کرتا ہوں تو پتہ چلتا ہے کہ ہمیں ایک دوسرے سے الگ ہونا ضروری تھا۔ ہماری دوستی کم عمری کے کچے پن کا شکار ہو گئی مگر برا ہو ہماری جذباتیت کا کہ ہم ایک مختصر عرصے تک ایک دوسرے کے شدید مخالف بھی رہے تھے۔ میں نفرت کا لفظ استعمال کرنا نہیں چاہتا اس لئے کہ اس عمر میں ہم اس لفظ کی معنویت سے اچھی طرح واقف نہ تھے بس دوست تھے، مخالف ہو گئے اور پھر وقت نے اپنا کام کیا اور ہم ایک دوسرے سے سالہا سال تک بے خبر رہے تھے۔

خلیل صاحب اردو زبان کے رسیا تھے اور اس کے کلاسیکی ادب کا بڑا گہرا شعور رکھتے تھے مطالعہ وسیع تھا۔ جو ادب کل تخلیق ہوا اور جو تخلیق ہو رہا تھا ان سب پر ان کی نظر رہتی تھی اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صرف اردو زبان، اردو ادب اور اردو شاعری ہی تک محدود رہے۔ اس سے کیا کسی نقاد پر، یا کسی شاعر پر اس کا اثر پڑ سکتا ہے؟

اس میں ایک قسم کی محدودیت آ جاتی ہے یعنی صرف اردو پڑھتے رہیں آپ۔ اگر میں صرف اردو پڑھتا رہوں یا صرف انگریزی پڑھتا رہوں آپ دیکھئے کہ انگریزی ادیبوں پر کیا اعتراض کیا جاتا ہے ایک معنی میں فرانسیسیوں کو انگریزوں پر کیوں ترجیح دی جاتی ہے یہ نہیں کہ انگریزی ادیبوں کو کمتر سمجھا جاتا ہے بلکہ فرانسیسی جو ہیں وہ یورپ کی مختلف زبانیں جانتے ہیں جیسے اطالوی ہے، جرمن زبان ہے۔ انگریزی ادیب بھی جانتے ہیں لیکن ان کو انگلش چینل الگ کرتا ہے اس طرح ایک دائرہ بن جاتا ہے اس لئے یہ زیادہ دقیانوسی ہے بہ نسبت فرانسیسی ادیبوں کے اس کے یہ ہرگز معنی نہیں ہیں کہ فرانسیسی بڑے انقلابی ہیں فرانس میں انقلابی لوگوں کی تعداد برائے نام ہے، دو تین فی صدی بھی نہیں لیکن ان کا اثر ادب پر بہت ہے ویسے مجموعی طور سے فرانسیسی انگلستان سے زیادہ دقیانوسی ہیں کیوں کہ وہ کیتھولک ہیں اور یہ لوگ پروٹسٹنٹ ہیں۔ آپ حکومتیں دیکھ لیں، فرانس کی حکومت انگلستان کے مقابلے میں دقیانوسی ہوتی ہے ہمیشہ یہ الگ بات ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اگر آپ صرف اردو شعر کہیں تو اچھے شعر نہیں کہہ سکتے ہیں بلکہ کہہ سکتے ہیں اور میں اس سے انکار نہیں کرتا کہ آدمی صرف اپنی زبان جانے اور اچھے شعر نہیں کہہ سکتا اردو کے کلاسیکی شعرا گذرے ہیں جو صرف اردو جانتے تھے یا فارسی جانتے تھے یا پھر کسی حد تک عربی جانتے تھے لیکن عربی پر اتنے حاوی نہیں تھے غالب وغیرہ اتنی عربی نہیں جانتے تھے کہ عربی کے شعر پڑھ سکیں جیسا کہ وہ فارسی شعرا کو پڑھتے تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں فارسی شعرا کا اثر ملتا ہے۔ ناصر علی کا، شہرت بخاری کا یا بیدل کا سب سے زیادہ اثر ملتا ہے مگر فارسی شعرا کے مقابلے میں عربی شعرا کا اثر نہیں ملتا ہے۔ عربی کے ایک شاعر ہیں جن کے متعلق میں نے طہٰ حسین کی کتاب میں پڑھا، "طرفہ" جو سترہ سال کی عمر میں مر گیا تھا۔ میں نے اس لئے پڑھا کہ وہ اتنی کم عمری میں مر گیا تھا تو کیسے شعر کہتا تھا۔ طرفہ کو میں نے اردو میں پڑھا۔ ترکی کے شاعروں کو کون کیوں پڑھے گا۔ میں تو صرف اس لئے پڑھتا ہوں کہ آج ان کی زبان میں کیا ہو رہا ہے۔

بمبئی

ان کے لئے علامہ اقبال نے "طلوع اسلام" لکھا تھا۔ طلوع اسلام ہوا یا نہیں ہوا لیکن وہاں کی شاعری کیا ہوئی تو میرا دائرہ بالکل بدل جائے گا۔ خلیل صاحب کے یہاں یہ نہیں تھا۔ خلیل صاحب کو چھ، سات طلبا کو پی۔ ایچ۔ ڈی کروانا ہوتا تھا پھر انہیں بی اے اور ایم اے کے تمام طلباء کو پڑھانا پڑتا تھا لہٰذا ان کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ راتے کہاں چلا جائے۔

افتخار۔ آپ نے خلیل صاحب کے اور اپنے نظریوں میں فرق کی بات کی تھی۔ ترقی پسند تحریک سے وہ بھی وابستہ تھے اور آپ بھی وابستہ تھے کس نظریئے میں کہاں کونسا فرق تھا۔

باقر۔ میں علی گڑھ سے لکھنو چلا گیا تھا اور جب ترقی پسندوں سے اختلافات ہوئے تو ترقی پسندوں کو میں نے سویت مارکسزم کا ایک حصہ سمجھا مارکسزم کا حصہ نہیں سمجھا کیں کہ چونکہ معاشیات میں ایم اے کیا لہٰذا مجھے وہ کتابیں پڑھنے کو مل گئیں تو مجھے پتہ چلا کہ سویت مارکسزم اصلی مارکسزم سے کتنی الگ ہے۔ اس وقت ایک بہت زبردست کتاب شائع ہوئی تھی ہربرٹ مارکوز کی سویت مارکسزم۔ ہربرٹ مارکوز جرمنی کا مفکر تھا میں شروع ہی سے ذرا سا بدل تھا سویت یونین سے۔ سویت یونین نے شروع سے اس محبوب ادیب کو ۱۹۸۴ء کیا ہوا ہے جس کی تصویر آپ میرے کمرے میں دیکھ رہے ہیں یعنی "دوستو وسکی"۔ میں کمیونسٹ پارٹی کا ممبر بننے والا تھا مگر جب مجھے دوستووسکی سے متعلق معلوم ہوا تو میں نے اپنا ارادہ بدل دیا اس طرح سے میں آہستہ آہستہ الگ ہوتا چلا گیا۔ خلیل صاحب کی لڑائی وہاں کے مقامی لوگوں سے ہو گئی ان لوگوں کی وجہ سے خلیل صاحب نے مطالعہ کی کوشش نہیں کی اور ترقی پسندوں کی وجہ سے وہ مارکسزم کے مخالف ہو گئے، انہیں اندازہ نہیں تھا کہ ترقی پسند الگ ہیں اور مارکسزم الگ ہے۔ وہ فرق نہیں کر پائے پھر میری مخالفت جو تھی وہ اصولی ہو گئی ذاتی نہیں ہو پائی۔ ۱۹۵۰ء کے بعد میرا ان کا مزاج بالکل الگ ہو گیا اور میں الگ راستے پر چلا گیا اور وہ دوسرے راستے پر گامزن ہو گئے۔

افتخار۔ خلیل صاحب کی تنقیدی بصیرت کے سب ہی معترف تھے کہ انہوں نے نہایت ہی معروضی انداز میں تنقیدیں لکھیں۔ جیسے جوش پر ان کا مضمون ہے۔ ظفر کا مطالعہ ہے اور آتش کے مطالعے نے تو ان کی اہمیت کو بہ حیثیت نقاد کے بڑی شہرت دی تو کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ان کی شاعری تنقید کے مقابلے میں کمزور رہی۔

باقر۔ کمزور اور طاقت ور کی اصطلاحیں مجھے پسند نہیں ہیں میں اپنی نظموں کا عنوان رکھتا ہوں۔ کچھ کمزور نظمیں مکزور اور طاقتور جیسی اصطلاحیں ادبی نہیں ہیں آپ یہ کہیئے کہ اس کا رنگ الگ ہے اور اس کا رنگ الگ۔ مجھے ان کی تنقید سے اختلاف ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے تنقیدی مضامین اچھے لکھے ہیں۔ جہاں تک آتش کے مطالعے کا سوال ہے تو میں نے ایک آدھ باب ان سے زبردستی لکھوائے۔ جو کتابی صورت میں شائع ہوا ہے وہ مقدمہ کلام آتش ہے کتاب نہیں ہے جو انہوں نے اپنے طالب علمی کے زمانے میں لکھی تھی۔ اس پر انہوں نے نظر ثانی کی ہے ظاہر ہے جو کچھ انہوں نے طالب علمی کے زمانے میں لکھا تھا اس پر نظر ثانی کرنا ضروری تھا۔ جہاں تک جوش کی شاعری کا سوال ہے تو مجھے بنیادی اختلاف ہے میں نہیں سمجھتا کہ جس خلیل الرحمٰن نے جمیل مظہری کی تعریف میں مضمون لکھا، جذبی اور مجاز کی تعریف میں مضامین لکھے جب ان شعرا کی تعریف کرتے ہیں اور جوش کو ناقابل برداشت سمجھتے ہیں وہ بہت زیادتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ علی گڑھ خاص کر اعظم گڑھ اور لاہور وغیرہ جوش کے بے حد مخالف رہے ہیں کیوں کہ جوش ایک طرح کے مدمقابل تھے علامہ اقبال کے اور یہ لوگ علامہ اقبال کے پرستار تھے اس لئے انہوں نے جوش کی مخالفت کی۔ میں جوش کو ایک اہم شاعر سمجھتا ہوں میں ان کے نقطۂ نظر سے اختلاف کروں لیکن اگر ایک تنقید کے طالب علم کی حیثیت سے دیکھوں تو جس کے یہاں تین شاعروں کے کلام کا سنگم ہو یعنی سودا، نظیر اور انیس کا وہ معمولی شاعر نہیں ہو سکتا ●

کمار پاشی ○ افتخار امام صدیقی

فضا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی ایک اچھے نقاد بھی رہے ہیں اور لوگوں نے ان کی تحریروں کو پسند بھی کیا تھا۔ ایک اچھے انسان کی حیثیت سے مجموعی طور پر ہر دل عزیز بھی رہے۔ شاعری میں بھی خلیل صاحب نے اپنی انفرادیت نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ میں آپ سے خلیل صاحب کی ان ہی خصوصیات پر گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ خلیل صاحب کی شاعری کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ وہ جدید غزل کے پیش روؤں سے ہیں یا کہ جدید غزل کی ابتدا ان ہی سے ہوتی ہے، دوسرا خیال یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ ان کی شاعری اتنی اہم نہیں جتنی کہ ان کی تنقید۔ تیسرے یہ کہ ترقی پسندوں نے باوجود خلیل صاحب کی بھرپور ذات کے انہیں رد کرنا شروع کر دیا تھا۔ جب کتاب ترقی پسند ادبی تحریک شائع ہوئی تو اس کے بعد تو بے رخی اور بے توجہی اپنی انتہا کو پہنچ گئی کہ ترقی پسند نقاد ان کا نام لینا تک پسند نہیں کرنے لگے۔ ان تینوں رویوں کے سلسلے میں مجموعی طور پر آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

شمی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب سے میری ملاقات دہلی میں ہوئی تھی غالباً سنہ ۶۰ء یا سنہ ۶۱ء میں اور اس سے پہلے میں ان کا ایک شعری مجموعہ "کاغذی پیرہن" پڑھ چکا تھا ساتھ ہی تنقیدی مضامین کا مجموعہ "فکر و فن" بھی پڑھ چکا تھا۔ ان دونوں کتابوں کو پڑھنے کے بعد میں نے ایک ایسے شخص کو محسوس کیا جو محتاط ہے یعنی کسی سلسلے میں اپنی رائے کے اظہار میں بھی محتاط ہے اور شاعری کے سلسلے میں بھی خاصے احتیاط سے کام لینے والا ہے۔ خلیل صاحب نے بہت کھل کر اپنی شخصیت کا اظہار اپنی شاعری میں نہیں کیا۔ جب میری ان سے ملاقات ہوئی تو اس قسم کے تاثرات تھے میرے۔ اس کے بعد تو یہ ہوا کہ علی گڑھ میں آنا جانا رہا اور آہستہ آہستہ تعلقات استوار ہوتے گئے۔ پھر وہ زمانہ آتا ہے جب ان کا دوسرا شعری مجموعہ نیا عہد نامہ شائع ہوا۔ اب اگر میں ان دونوں کتابوں کو دیکھتا ہوں تو اس میں کوئی رویے کے اعتبار سے زیادہ CHANGE مجھے محسوس نہیں ہوا یعنی وہی محتاط رویہ جو کاغذی پیرہن میں تھا وہی "نیا عہد نامہ" میں بھی ملا اور آپ تو یہ جانتے ہی ہیں کہ خلیل صاحب کی ذہنی نشو و نما میں ہماری کلاسیکی شاعری کا بہت ہاتھ رہا۔ ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا اور یہ بھی آپ جانتے ہوں گے کہ انہیں اردو ادب کا انسائیکلوپیڈیا بھی کہا جاتا ہے۔ خلیل صاحب نے کلاسک کو جس طور سے پڑھا اور سمجھا اور یہ چیزیں ان کا اوڑھنا بچھونا بن چکی تھیں تو وہ روایت سے الگ نہیں کر سکے اپنے آپ کو یعنی ان کی شاعری روایت سے بہت جڑی ہوئی ہے ———— اور جہاں تک ان لوگوں کا تعلق ہے جو خلیل صاحب کو جدید غزل کا امام کہتے ہیں تو میں اس میں تھوڑا سا اختلاف کروں گا ایسے لوگوں سے۔ خلیل صاحب کی پوری شاعری میں REJECTION کہیں نہیں ہے۔ نفی کا کوئی پہلو مجھے تو نظر نہیں آتا۔ ان کے یہاں ACCEPTENCE تو تھی یعنی اچھی چیزوں کو ACCEPT تو کرتے تھے لیکن REJECTION ان کے یہاں کم ملے گا یعنی ایسی چیزیں جنہیں ان کا مزاج قبول نہیں کرتا تھا تو TOTALY ایسے بھی انہوں نے REJECTION نہیں کیا تھا اس طرح کا اظہار ان کے یہاں نہیں ملتا اور یہ بات ان کے مزاج کا ایک حصہ تھی کہ وہ ہر آدمی کی اچھی باتوں کو قبول کرتے تھے چاہے وہ کتنا ہی نیا کیوں نہ ہو۔ میں نے اس زمانے میں دیکھا کہ بہت سے نئے شاعر جنہوں نے دو دو، تین تین نظمیں یا دو دو، تین تین غزلیں کہیں تھیں تو ایسے شعرا کو بھی بہت کھل کر سراہتے تھے لیکن کسی کے سلسلے میں انہوں نے یہ نہیں کہا کہ فلاں شاعر خراب ہے یا فلاں شاعر کیا کہہ رہا ہے۔ نفی کا رویہ ان کے یہاں نہیں تھا۔ قبول کرنے کی قوت زیادہ تھی، کاغذی پیرہن سے نیا عہد نامہ کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ ہے مگر مجھے اس میں کوئی بنیادی فرق رویے میں نظر نہیں آتا ———— ہاں روایت سے جو چیز انہیں ملی تھی وہ ظاہر ہے کہ غزل تھی جو ان پر حاوی رہی۔ دونوں شعری مجموعے آپ دیکھیے روایتی غزل کی پوری چھاپ ہمیں نظر آتی ہے اس میں کوئی نیا ذہن ہمیں نہیں ملتا جس طرح سے آپ ظفر اقبال کو لے سکتے ہیں یعنی بالکل نئے محسوسات نئے تجربات اور یہ ہمیں خلیل صاحب کے یہاں نظر نہیں آتے، اگر ہم خلیل صاحب کو نئی غزل کا امام کہتے ہیں تو میں سمجھتا ہوں کہ ظفر اقبال کو ہم کس زمرے میں رکھیں گے کیوں کہ ظفر اقبال بالکل مختلف ہیں خلیل صاحب سے۔ ظفر اقبال کا پہلا شعری مجموعہ "آب رواں" اس میں تو آپ روایتی ڈکشن، آتش کے اثرات، یگانہ کے اثرات آپ پاتے ہیں لیکن اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شاعر آگے چل کر اپنی آواز خود پیدا کرے گا، حاصل کرے گا لیکن اس کے بعد "گل آفتاب"۔ ایک رویہ بہت بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ بہت ہی PERIMENTAL لسانی سطح پر بھی تجربے نظر آتے ہیں۔ لیکن اس قسم کی بات ہمیں خلیل صاحب کے یہاں کہیں نظر نہیں آتی۔ لفظوں کے ساتھ انہوں نے کبھی کھلواڑ نہیں کیا۔ الفاظ کو برتنے میں بھی کلاسیکی رچاؤ کو برقرار رکھا تو جو بھی شعر ان کی غزل میں ہے وہ ہمیں روایتی شاعری کی یاد دلاتا ہے۔ یہ کہ جو لوگ انہیں جدید غزل

کا امام کہتے ہیں تو میں ایسا نہیں سمجھتا کہ ان کی شاعری میں کسی نئے تجربے یا کسی نئے محسوسات کا اظہار ہوا ہو۔ ہاں ادھر دو تین برس پہلے جب انھیں یہ احساس ہوا کہ اب وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہیں گے آپ نے بھی دیکھا ہوگا اور ان کی نئی نظمیں اور غزلیں شائع ہوئی ہیں انہیں پڑھنے کے بعد بھی آپ دیکھیں گے یعنی ایک نظم اب بھی مجھے یاد ہے "مٹی کا گیت" جو کہ "شاعر" کے ہم عصر اردو ادب نمبر میں شائع ہوئی تھی، اس نظم کو پڑھ کر آپ اندازہ کریں گے کہ اس نظم پر نظیر کے کتنے اثرات ہیں۔ اس نظم کو پڑھنے کے بعد نظیر کی کئی نظمیں ذہن میں آجاتی ہیں، وہی لب و لہجہ، وہی ڈکشن، وہی باتیں لیکن ایک بات ضرور میں نے محسوس کی کہ موت سے قبل کی جو شاعری ہے ان کا ڈکشن تھوڑا سا بدلا ہوا ہے یعنی وہ جو غزلیہ ڈکشن تھا روایتی وہ نکل گیا، تراکیب جو تھیں گڑھی گڑھائی ہمارے یہاں عام طور پر روایتی شاعروں کے یہاں مل جاتی ہیں وہ نہیں تھیں بلکہ ان سے گریز ملتا ہے اور اظہار پورے FLOW کے ساتھ سامنے آتا ہے جس میں کسی قسم کی کاوش کو دخل نہیں، "مٹی کا گیت" اس کی خوبصورت مثال ہے۔ کاوش کر کے انہوں نے نظم نہیں کہی بلکہ ان کے اندر جو محسوسات تھے، جذبات کا جو دھارا ہے وہ خود بہ خود بہا چلا آتا ہے۔ بعد کی شاعری میں میں نے یہ کیفیت محسوس کی اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر وہ کچھ اور سال زندہ رہتے تو بالکل ایک نیا ڈکشن ہمارے سامنے آجاتا ۔۔۔ اب بھی میں سمجھتا ہوں کہ خلیل صاحب کی شاعری قابل قدر ہے اور میں تو ان کی غزل کا بھی مداح ہوں اور نظموں کا بھی۔ وہ بہت ہی پرخلوص انسان تھے اور یہی خلوص یہی دردمندی ان کی نظموں میں بھی ان کی غزلوں میں بھی جھلکتی ہے۔

افتخار۔ جہاں آپ نے روایت سے مضبوط رشتے کی بات کہی ہے اور لفظیات و تراکیب سے انہوں نے کوئی کھلواڑ نہیں کیا یعنی لسانی سطح پر خلیل صاحب کے یہاں کوئی اختراعی کوششیں نظر نہیں آتیں تو روایت سے جڑے ہونے کے باوجود انہوں نے جو شاعری کی اور نیا عہد نامہ کے بعد جو نظمیں، غزلیں سامنے آئیں اس میں لہجہ، تراکیب، الفاظ کا برتاؤ وغیرہ قطعی مختلف نظر آتے ہیں۔ جب خلیل صاحب ترقی پسند تحریک سے وابستہ تھے تو اسی فضا میں شاعری بھی کرتے رہے، ترقی پسند شاعری کے علائم الفاظ وغیرہ کا استعمال کرتے رہے پھر جب جدیدیت کا رجحان عام ہوا تو انہوں نے اپنے آپ میں تبدیلی پیدا کی دوسرے لفظوں میں ایک علیحدہ فضا میں آئے اور شاعری کی یعنی جدید شاعری کا جو لہجہ اور زبان تھی وہ خلیل صاحب نے اپنائی۔ روایت سے ہوتے ہوئے ترقی پسندی اور پھر جدیدیت تک ذہنی سفر نے روایت سے نہ ٹوٹنے کے باوجود شاعری میں لسانی سطح پر کوئی نیاپن یا نئی بات ضرور دی ہوگی ورنہ جدید غزل کا امام یا پیش رو انہیں یونہی نہیں کہا جاتا۔ آپ کا کیا مقصد ہے کہنے کا کہ خلیل صاحب نے لفظوں سے کھلواڑ نہیں کیا یا روایت سے وہ جڑے رہے تو ذرا اس کو واضح کیجئے کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں اور آپ کے کہنے میں اگر کوئی تضاد ہے یا وہی بات جو آپ نے کہی ہے میں بھی کہہ رہا ہوں۔

ہاشمی۔ تضاد ہے، اس لئے کہ جہاں آپ یہ کہتے ہیں کہ ترقی پسند تحریک سے وہ وابستہ تھے اور اس دور میں جس طرح کی موضوعاتی شاعری ہو رہی تھی خلیل صاحب بھی اس بھیڑ میں شامل ہوئے۔ جدیدیت کا رجحان عام ہوا تو انہوں نے اس طرز کو بھی اپنایا۔ میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ایسی بات ان کے یہاں نہیں ہے ترقی پسند تحریک سے یقیناً وہ وابستہ رہے اور اس زمانے میں انہوں نے اس نوع کی شاعری بھی کی ہوگی۔ ایسی نظمیں لکھی بھی ہونگی لیکن ان کے پہلے شعری مجموعے میں ہمیں اس طرح کی نظمیں نہیں ملتیں اس کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اس دور میں جو نظمیں کہیں تھیں بعد میں انہیں REJECT کر دیا۔ خلیل صاحب اپنے آپ کو ان نظموں سے الگ کر لے گئے اسی طرح جب ان کا دوسرا مجموعہ کلام نیا عہد نامہ شائع ہوا تو جدیدیت ایک رجحان کی شکل میں سامنے آچکی تھی لیکن اس کے اثرات نیا عہد نامہ پر نہیں دیکھے جا سکتے۔ میں یہ بات اس لئے بھی کہہ رہا ہوں آپ سے کہ جب بھی میری گفتگو ہوئی خلیل صاحب سے تو انہوں نے ادب میں فیشن زدہ شاعری کا ہمیشہ مذاق اڑایا ۔۔۔ وہ ترقی پسندوں کا بھی مذاق اڑاتے تھے جو نعرے بازی کی شاعری کرتے تھے کہ یہ لوگ مزدور پر نظم پر نظم لکھنے کے لئے اسٹیشن پر چلے جاتے تھے اور قلیوں کو دیکھتے تھے سامان اٹھاتے ہوئے اور اس کے بعد نظم لکھتے تھے یعنی اس قسم کے لطیفے وہ ہمیں اکثر سنایا کرتے تھے کہ اس طرح کی شاعری نہیں ہوتی۔ شاعری کے لئے اپنے اندر کچھ ہونا چاہئے ۔۔۔ یہ نہیں کہ آپ شعوری سطح پر باہر سے کوئی چیز اپنے اوپر لاد دیں گے اور اظہار خیال کریں گے۔ آپ دیکھ لیجئے کہ ترقی پسندوں کے زمانے میں شاعر کو موضوعات کی تلاش رہتی تھی، انتظار رہتا تھا، ایک ساتھ بہت سے شاعروں کی نظمیں کسی ایک واقعے یا حادثے پر

ہمارے سامنے آجاتی ہیں۔ خلیل صاحب کا رویہ کبھی ایسا نہیں رہا اور اگر انہوں نے اسی رویے کے تحت ممکن ہے کہ کچھ نظمیں کہی ہوں جب وہ انجمن ترقی پسند مصنفین کے سکریٹری رہے ہوں کیوں کہ نیا نیا جوش رہتا ہے، ولولہ ہوتا ہے اور ممکن ہے کہ اثرات رہے ہوں اس سے میں انکار نہیں کرتا

افتخار۔ یہاں آپ محض اثرات کا ذکر کر کے ان رویوں کو نظر انداز نہیں کر سکتے جو ان کی شاعری میں ارتقائی شکل میں آئیں، روایت سے جڑے ہوئے جو شعرا ہیں وہ چمن، گل و بلبل، آشیانہ، برق، نشیمن بجلی جیسے الفاظ ہی کو اپنے اظہار کا وسیلہ بنائیں گے۔ ترقی پسند شعرا کے یہاں الفاظ کا استعمال دوسرے قسم کا تھا اور اب جدیدیوں کے یہاں دوسرے قسم کے الفاظ کا استعمال ہو رہا ہے۔ یوں بھی جہاں ہر پچاس ساٹھ سال میں زبان میں تغیر و تبدل ہوتا ہے وہیں شعر و ادب میں بھی تبدیلیاں آتی ہیں۔ ہیئت کی تبدیلیاں ہوتی ہیں اور خلیل صاحب کی شاعری میں تینوں رویے ملتے ہیں۔ آپ محض روایتی شاعری کے زمرے میں خلیل صاحب کو نہیں رکھ سکتے یا یہ کہہ کر کہ ان کے یہاں ان تینوں رویوں کے نمایاں اثرات نہیں تھے۔

ہاشمی۔ میں ایسا نہیں سمجھتا افتخار صاحب! اس لئے کہ شاید آپ کو یاد ہو کہ خلیل صاحب نے ایک مضمون نئی غزل پر لکھا تھا جو غالباً شب خون میں شائع ہوا تھا پہلی بار اس مضمون میں انہوں نے نئی غزل کے بارے میں لکھتے ہوئے یہ باتیں بھی کہیں کہ اب نئے شاعر جن الفاظ کو برت رہے ہیں یا جو الفاظ آپ کو مشترک ملتے ہیں ان شاعروں کے یہاں یعنی سایہ ہے، دھوپ ہے، دشت ہے، تنہائی ہے ایک پوری فہرست تھی الفاظ کی۔ یہ الفاظ ہیں جن کو لے کر نئے شاعر موجودہ صورت حال کا اظہار کر رہے ہیں۔ ایک ایسا شخص جو یہ جانتا ہے کہ آج کل شاعری میں کونسے الفاظ استعمال ہو رہے ہیں ان الفاظ کا اگر استعمال کیا جائے تو کیا وہ جدید شاعری یا عصر کی شاعری ہو سکتی ہے اور اسے لوگ قبول بھی کر سکتے ہیں۔ تو اس قسم کا ذہن جو یہ سب جانتا ہے اور سمجھتا ہے وہ کسی طور پر بھی اس فیشن کو اختیار نہیں کرے گا اور شعوری سطح پر وہ ان الفاظ کو یا اس ڈکشن کو اس طرح کی تراکیب کو استعمال کرنے سے گریز کرے گا۔ آپ یہ دیکھئے کہ نقادوں نے ہمیشہ تخلیقی فن کاروں کو نقصان بھی پہنچایا ہے جہاں تک میں سمجھتا ہوں کہ نقاد کا رول ہمارے یہاں ادب میں یہ رہا دیکھنا کہ فن کاروں کے یہاں کیا کیا ہمیں ملتا ہے۔ اس کے موضوعات کیا ہیں؛ وہ کن الفاظ کو برتتا ہے۔ کن لفظوں سے اسے عشق ہے اور ان لفظوں کو بار بار کیوں برتتا ہے؟ یعنی ان کی نشاندہی کی۔ پھر جب جدیدیت کا رجحان عام ہوا تو بہت سارے نقادوں نے یہ کوشش کی کہ جدیدیت کو چند موضوعات کے گرد محصور کر دیا اور اس طرح موضوعات کا تعین کر دیا یعنی تنہائی ہے، دشت ہے، جنگل، دھوپ، صحرا وغیرہ یعنی اگر اس طرح کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں تو یہ جدید شاعری کہے تو اس سے نقصان یہ ہوا کہ نیا ذہن رکھنے والے جو فن کار آئے تو انہوں نے فوری طور پر اپنی شاعری میں اس طرح کے الفاظ کو برتنا اور ان کے استعمال سے انہوں نے یہ سوچا کہ ہم نئے ہو جائیں گے، جدید ہو جائیں گے اور ہمیں قبول کر لیا جائے گا۔ جس طور پر ترقی پسندوں کے زمانے میں ابھرنے والے شعرا نے مزدوروں پر، بھوک پر، بے کاری پر نظمیں لکھ کر فوری طور پر اپنے آپ کو ترقی پسندوں کی صف میں شمار کروالیا اس طرح جدید شاعری میں بہت سے ایسے لوگ بھی آگئے جنہوں نے فیشن کے طور پر شاعری اختیار کی اور جو فیشن ایبل موضوعات تھے یا جو فیشن بن چکے تھے ان کو اپنا لیا لیکن خلیل صاحب اس قسم کے شاعر نہیں تھے وہ بہت سمجھ دار پڑھے لکھے اور ذہین شخص تھے اور ان کا مزاج ایسا نہیں تھا کہ وہ ان موضوعات کو فوری طور پر قبول کریں جو عام ہیں۔

افتخار۔ مجھے آپ کے ان خیالات سے تو اتفاق ہے کہ ہر دور میں بڑی تعداد ایسے شعراء کی ہوتی ہے جو فیشن کے طور پر شاعری اختیار کرتے ہیں اپنی ذہانت سے ہنگامہ بھی برپا کرتے ہیں اور اس کے بعد خاموش ہو جاتے ہیں لیکن جہاں آپ نے ہمارے نقادوں نے جدید شاعری کے موضوعات اور الفاظ کی ایک فہرست مرتب کی ہے اور خود خلیل صاحب نے بھی اپنے ایک مضمون میں ان الفاظ کا شمار کیا ہے مگر آپ کا یہ کہنا کہ وہ خود کو ایسے الفاظ یا موضوعات سے بچائے گئے میں اسے نہیں مانتا۔ "نیا عہد نامہ" سے "زندگی اے زندگی" تک کے شعری سفر میں وہ موضوعات اور الفاظ بھی آتے ہیں اور بہ کثرت آئے ہیں جنہیں آپ "عام" کہتے ہیں۔ ●

۔ بمبئی

ڈاکٹر عبدالستار دلوی ○ افتخار امام صدیقی

افتخار۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری، تنقید نگاری اور ان کی شخصیت پر کافی اظہار خیال کیا گیا لہٰذا میں آپ سے صرف یہ جاننا چاہوں گا کہ لسانی سطح پر آپ نے جب ان سے تعاون حاصل کیا تو ماہر لسانیات کی حیثیت سے آپ نے خلیل صاحب میں کیا محسوس کیا؟ آپ ان سے ملے ہیں گفتگو کی ہے اس علم پر ان کی گرفت کیسی تھی؟

دلوی۔ افتخار صاحب! بات دراصل یہ ہے کہ خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا لسانیت سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا تعلق صرف اس حد تک تھا کہ ادب کا جو پروفیسر ہوتا ہے، استاد جو ہوتا ہے اس کا زبان سے تعلق ضرور ہوتا ہے۔ اسے کبھی نہ کبھی بی اے اور ایم اے کے طلبا کو لسانیات پڑھانا پڑتی ہے اس لحاظ سے ان کا لسانیات سے تعلق رہا ہے اور رہا ہوگا لیکن ایک فن کی حیثیت سے ایک علم کی حیثیت سے جہاں تک مجھے معلوم ہے یا میں سمجھتا ہوں لسانیات سے ان کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن لسانیات پر اور لسانی مسائل پر ان کی نظر ضرور تھی۔ میں اعظمی صاحب سے ۱۹۶۰ء میں علی گڈھ میں ملا جب میں اپنے پی ایچ ڈی کے سلسلے میں وہاں گیا ہوا تھا کیوں کہ مجھے مواد جمع کرنا تھا تو اس وقت میں اعظمی صاحب سے ملا اور علی گڈھ میں مجھے سب سے زیادہ تعاون اپنے کام کے سلسلے میں خلیل صاحب ہی سے ملا۔ جوالور ا کے سلسلے میں کتابوں کی فراہمی میں اور دیگر امور میں ان کی دلچسپی میرے لئے بے حد حوصلہ افزا تھی۔ وہ مجھے آزاد لائبریری لے گئے، لائبریرین سے ملوایا۔ "ادبی تحریریں" جو کہ لاہور سے رسالے کی شکل میں شائع ہوتا تھا اور جس کی پانچ جلدیں شائع ہوئی تھیں اس میں ڈاکٹر محمد صادق کے مضامین شائع ہوئے تھے۔ "آزاد معاصرین کی نظر میں"۔ تو یہ سارے حوالے مجھے اعظمی صاحب نے فراہم کیے تھے، اس کے بعد بھی وہ خط وکتابت سے میری رہنمائی کرتے رہے۔

اعظمی صاحب سے کئی بار ملنے کا اتفاق ہوا ہے۔ "شاعر" کے سی سالہ جشن کے موقع پر جو انڈو پاک مشاعرہ ہوا تھا اس میں خلیل صاحب بھی شریک ہوئے تھے۔ اس وقت اور پھر اس کے بعد متعدد بار میری ان سے ملاقاتیں رہی ہیں۔ ہر ملاقات میں میں نے انہیں بے انتہا ہمدرد، مخلص اور معاون پایا، انہیں طلبا کی مدد اور رہنمائی کرتے ہوئے بے انتہا خوشی محسوس ہوتی تھی انہوں نے ہر ممکنہ طریقے سے "آزاد کی تنقید نگاری"، "آزاد کی تحقیق اور آزاد کے اسلوب پر مجھ سے بحث کی اور میری رہنمائی کی۔ گذشتہ بار جب آخری مرتبہ وہ بمبئی تشریف لائے تھے تو مہاتما گاندھی میموریل ریسرچ سنٹر بھی آئے تھے اور گھنٹہ ڈیڑھ گھنٹہ یہاں رہے تھے۔ لائبریری کا معائنہ کیا تھا اور اسے پسند بھی فرمایا تھا۔ گاندھی جی کے لسانی نظریے "ہندوستانی" کو انہوں نے بے حد سراہا اس سلسلے میں میں نے جو کتاب مرتب کی تھی "امرت بانی" اسے بھی بے حد پسند کیا تھا اور انہوں نے مجھے یہ مشورہ دیا تھا کہ اسی انداز سے اور زیادہ انتخابات نثر اور نظم میں ہونے چاہئیں۔

افتخار۔ خلیل صاحب کی تنقید نگاری اور شاعری میں کیا آپ کو لسانی تجربے نظر آتے ہیں لفظیات وتراکیب میں کوئی تبدیلیاں آپ نے محسوس کیں؟

دلوی۔ میں نے خلیل صاحب کی شاعری کا مطالعہ کیا ہے اور ان کا شعری مجموعہ "کاغذی پیرہن" میرا پسندیدہ مجموعہ رہا ہے اس میں خاص طور پر میر کے لہجے میں جو انہوں نے غزلیں کہی ہیں میں انہیں بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھتا تھا اور اسی وقت کبھی میرے ذہن میں یہ خیال آیا تھا کہ میں اس مجموعے پر مضمون لکھوں کہ میر نے ہمارے یہاں کن کن شاعروں کو متاثر کیا ہے اور میر کا اسلوب کن کن شعرا نے اپنانے کی کوشش کی ہے۔ میر کے لہجے کی نرمی زبان کی پرکاری اور سادگی خلیل صاحب کی شاعری میں ملتی ہے خاص کر ان کی غزلوں میں۔ جہاں تک ان کی نظموں کا تعلق ہے تو اس کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ زبان فارسی آمیز نہیں لکھتے تھے۔ یہاں بھی وہی سلاست، روانی اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے تھے۔ جہاں تک ان کی تنقید نگاری کی زبان کا تعلق ہے تو تنقید کی زبان تو علمی ہوتی ہی ہے۔ تنقید ایک علمی فن ہے اور اس کا اپنا ایک الگ درجہ ہے اور زبان موضوع کے اعتبار سے بدل جاتی ہے۔ لہٰذا جو زبان ان کی شاعری میں ہے اسی زبان کو ان کی تنقید میں تلاش کرنا صحیح نہیں ہے۔ اپنے موضوع کے لحاظ سے ان کی زبان

تنقید میں بدلی ہوئی ہے اور ظاہر ہے کہ جس معیاری اور علمی زبان کی توقع ہم تنقید میں کرتے ہیں یا اعلیٰ تنقید میں پاتے ہیں وہی زبان خلیل صاحب کی تنقید میں بھی موجود رہتی ہے۔ نہایت ہی متوازن اور رواں بیان۔ معروضی انداز کی تنقید نگاری اور وہ بھی حقائق لئے ہوئے ہو نہایت ہی کھری ہو اس کے لئے استعمال ہونے والا لہجہ اور لہجے کی ادائیگی کے لئے الفاظ کا استعمال سخت اور کھردرا ہو تو ایک طرح کی اشتعال انگیزی کا دھواں اس پر غالب آسکتا ہے مگر خلیل صاحب نے زبان کو برتنے کے معاملے میں، الفاظ کے انتخاب اور لہجے میں جو زمیت رکھی ہے اور جو اسلوب اپنی تنقید نگاری کے لئے اپنایا تھا وہ دوسرے نقادوں کے یہاں کم ہی نظر آتا ہے۔ لسانی سطح پر شاعری اور تنقید نگاری میں البتہ ان کے یہاں کوئی تبدیلی یا توڑ پھوڑ ہمیں نہیں ملتی۔ ●

ڈاکٹر حامد اللہ ندوی ○ انتظار امام صدیقی

افتخار۔ خلیل صاحب کی شاعری اور تنقید نگاری کے متعلق مختلف آرا رہیں لوگوں کی خاص طور پر ان کی تنقید کے اسلوب کے متعلق جو کچھ اتنا نیا تھا کہ بے حد پسند کیا گیا، وہ مضامین جو نگار میں اور دوسرے رسائل میں شائع ہوئے اس نے پڑھے لکھے لوگوں کو چونکا یا۔ جوش پر ان کے مضمون کو بے حد پسند کیا گیا یہ اور بات ہے کہ اس سے اختلاف ہو سکتا ہو مگر خلیل صاحب کی تنقیدی بصیرت اور معروضی نقطۂ نظر نے انہیں ایک نقاد کی حیثیت سے بہت جلد شہرت دلوادی اور وہ معتبر سمجھے جانے لگے۔ آپ ایک نقاد ہیں اور لسانیات آپ کا موضوع ہے بلکہ آپ خود بھی ایسی تنقیدوں کو پسند کرتے ہیں جو ہر طرح کے تعصب سے پاک ہوں جو قطعی بے لاگ اور معروضی ہوں ——— خلیل صاحب کی تنقید نگاری کے متعلق آپ کے کیا تاثرات ہیں؟

ندوی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی شاعری کے متعلق یہ عرض کر دوں کہ جہاں تک میرے اپنے مزاج کا تعلق ہے شاعری سے کچھ بہت زیادہ مناسبت نہیں رکھتا۔ اس کے باوجود زندگی کے کچھ ایسے دن ہوتے ہیں جس میں آدمی خود بھی شاعری کرتا ہے اور دوسرے شعرا سے بھی دلچسپی رکھتا ہے۔ جس زمانے میں خلیل صاحب علی گڈھ یونیورسٹی میں پڑھتے تھے اور ان کی نظمیں، غزلیں مختلف رسائل میں شائع ہوتی تھیں تو میں بڑی دلچسپی سے انہیں پڑھا کرتا تھا اور شوق سے پڑھتا تھا کیوں کہ ایسا محسوس ہوتا تھا کہ جیسے خلیل صاحب ہمارے ہی جذبات کی احساسات کی ترجمانی اپنی شاعری میں کر رہے ہوں۔ وہ زندگی کا ایسا دور تھا جب وہ بالکل نوجوان تھے لہٰذا وہ عناصر ان کی شاعری پر بری طرح چھائے ہوئے تھے۔ ان کی فکر پر رومانی کیفیت، اور سیاسی جذباتیت یعنی اس وقت جو تحریکیں ملک میں ادب میں ابھر رہی تھیں وہ انہیں نہ صرف محسوس کر رہے تھے بلکہ اپنی شاعری میں برت بھی رہے تھے مثال کے طور پر ترقی پسند ادبی تحریک وہ اس سے نہ صرف متعلق رہے بلکہ اس سے انہوں نے اس قدر زیادہ دلچسپی لی تو ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ مسلم یونیورسٹی کے طالب علموں میں سوائے اس شخص کے کوئی اور ایسا اسٹوڈنٹ نہیں ہے جو ترقی پسند تحریک سے دلچسپی رکھتا ہو۔ ترقی پسند ادبی تحریک کو خلیل صاحب نے گویا اپنی زندگی کا ایک جزو بنالیا تھا۔ یہ تو خیر شاعری کی بات تھی اور جیسا کہ میں نے کہا تھا کہ مجھے شاعری سے کوئی مناسبت نہیں ہے لہٰذا فنی تجزیے میں اجتناب برتوں گا۔

جہاں تک تنقید نگاری کا تعلق ہے تو اس کی اہمیت کا اندازہ آپ اسی بات سے لگا سکتے ہیں کہ جب انہوں نے جوش پر تنقیدی مضمون لکھا تھا تو ادبی حلقوں میں بحث کا موضوع بن گیا تھا، مخالفت اور موافقت میں مضامین کا سلسلہ چل نکلا تھا اس طرح جوش اور خلیل کا نام ایک ساتھ لیا جانے لگا تھا۔ جوش پر ان کی تنقید خواہ کتنی ہی اختلافی ہو لیکن یہ ضرور ہوا کہ خلیل صاحب نے اس رجحان کو ختم کیا جس میں بڑے شعرا اور ادبا کی خامیوں کی طرف یا ان کے فنی تجزیوں کی طرف مرعوبیت کا تھا اور یہ بہت بڑی بات ہے اور

یہی وجہ ہے کہ صاف گوئی، معروضی تجزیے اور منفرد اسلوب نے سب کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ جوش کے علاوہ آتش پر ان کے مسلسل مضامین جو نگار میں شائع ہوئے اور پھر مقدمہ کلام آتش کی شکل میں ہمارے سامنے آئے ان کی تنقیدی بصیرت کی ایک اور زندہ مثال ہے حالانکہ آتش پر عبدالسلام ندوی نے اور گل رعنا میں عبدالحئی نے آتش کی شخصیت کو بہت ابھارنے کی کوشش کی ہے لیکن جو انداز تجزیہ اور پرکھ خلیل صاحب کے یہاں ہے اس نے آتش کو ایک اہم شاعر بنا دیا۔ آج بھی طلبا "آتش" کے مطالعہ کے لئے خلیل صاحب کے مقدمہ کو مکمل سمجھتے ہیں اور استفادہ حاصل کرتے ہیں۔

جوش اور آتش کو چھوڑ کر بھی ان کی تنقید کے زاویے اور تنقیدی پہلوؤں کے مختلف خانے ہیں۔ مثال کے طور پر میں ایک بات آپ کو بتاؤں کہ جس زمانے میں "ہماری زبان" کے ایڈیٹر آل احمد سرور تھے تو ہماری زبان کا آخری صفحہ بالکل آج کے اردو بلٹز کے آخری صفحے کی طرح ہوا کرتا تھا اور جو سرور صاحب نے خلیل الرحمٰن اعظمی کو دے دیا تھا جس میں خلیل صاحب مستقل طور پر رفتار یا رفتارِ ادب کے نام سے اس پندرہ دن کے اندر یا اس ماہ میں جو تازہ ادبی لٹریچر سامنے آتا تھا اس پر اتنی خوبصورت تنقید کیا کرتے تھے کہ ہم بڑے ہی اشتیاق کے ساتھ اسے پڑھتے اور "ہماری زبان" کا بے چینی سے انتظار کرتے تھے کہ کب پرچہ آئے گا اور کب ہم ان کی تنقید وں سے لطف اندوز ہوں گے۔ اس آخری صفحے سے ہمیں معلوم ہو جاتا تھا کہ پورے ہندوستان میں اردو ادب میں کیا کیا ہو رہا ہے، کیا کیا لکھا جا رہا ہے، کون کونسی نئی کتابیں آئی ہیں۔ کیا اہم ہے اور کیا غیر اہم ہے۔ خلیل صاحب کافی عرصے تک یہ کالم لکھتے رہے اور اپنی منفرد تنقیدی بصیرت کا ثبوت دیتے رہے۔ مگر نہ جانے کیا بات ہوئی تھی کہ یہ سلسلہ بند کر دیا گیا بہت ممکن ہے کہ ان پر اعتراضات کی بوچھاڑ ہوئی ہو کیوں کہ بے لاگ رائے اور اظہار خیال کو ہضم کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں، سیاست کے ساتھ ساتھ ادب میں بھی مفاد پرست، موقع شناس اور کچھ نہ ہونے کے باوجود ادب کی تاریخ میں اپنا نام شامل کروانے والوں کی تعداد کم نہیں ہوتی لہٰذا یہ سلسلہ بند ہو گیا مگر دوبارہ پھر یہ سلسلہ شروع ہوا "رفتار" کے عنوان سے اور خلیل صاحب دوبارہ لکھنے لگے لیکن ایسا معلوم ہونے لگا جب کسی آدمی کے جذباتی بہاؤ کو روک دیا جائے یا رکاوٹ ڈال دی جائے تو وہ پھر مستقل طور پر گھٹتی رہتی ہے لہٰذا پھر اس کالم میں وہ تازگی، وہ نیاپن، بے باکانہ اسلوب، متوازن انداز نہیں ملتا تھا جس کی وجہ نفسیاتی ہی تھی جس کا میں نے ابھی اظہار کیا ہے کہ وہ اپنے مخالفین میں گھرے ہوئے تھے اور محتاط انداز اختیار کرنا پڑا پھر بھی وہ چوکتے نہیں تھے اور یہ صاف گوئی اور بے باکی تو آخر عمر تک ان کے ساتھ رہی۔ ان کی کتاب "ترقی پسند ادبی تحریک" اس کی بہت بڑی اور واضح مثال ہے، ایسا بھرپور جائزہ اور تجزیہ اور ایسا معروضی انداز بہت کم نقادوں کے یہاں ملے گا۔ معروف اور غیر معروف ادبی رسائل، کتابیں، ڈائری، تجزیے، رپورتاژ وہ سب کچھ انہوں نے لیا اور ایسا مواد پیش کیا ہے کہ باوجود اختلافی ہونے کے کسی بھی طرح فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ یہ کتاب نہیں بلکہ ایک ادبی تاریخ ہے ●

جاوید ○ افتخار امام صدیقی

افتخار۔ خلیل الرحمٰن اعظمی اپنی تنقیدی تحریروں سے ایک منفرد مقام پا سکے اور انہوں نے جس طرح کے تنقیدی رویوں کو اپنایا وہ قابل قبول بھی ہوا اور جیسا کہ ابھی آپ نے دوران گفتگو کہا کہ انہوں نے سارے ضابطے توڑ دیئے تھے اور فارمولا بند تنقید کو نئی سمتیں دی تھیں تو اس تنقیدی رویئے کو قبول کب کیا گیا۔

جاوید یہ رویہ اس وقت قبول کیا گیا جب محمود ایاز نے "سوغات" کا اجرا کیا اور ان تمام لوگوں کو پلیٹ فارم مہیا کیا ورنہ اس وقت

تک تو ان کی تنقید کو اتنا قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا تھا جب ان تمام باتوں کی بازیافت کی گئی اور خلیل صاحب کے مضامین کی طرف لکھنے پڑھنے والے لوٹے اور انہوں نے دیکھا کہ دراصل ہمارے پاس آج کی جو تنقید ہے اس کی بنیاد وہاں پڑتی ہے یا وہاں قائم ہوتی ہے تو ان کے تمام تنقیدی رویوں کا اور تنقیدی حکم کا ایک طرح سے بعد کے آنے والوں نے احیاء کیا اور اسی بنا پر خلیل الرحمٰن اعظمی کو جدیدیت کے عمائدین میں یا اسی کی بنیاد قائم کرنے والوں میں شمار کیا جاتا ہے۔

افتخار۔ وہ جو تنقیدی رویہ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اپنایا تھا اور اس میں جو تازگی تھی اسے آج بھی محسوس کیا جاتا ہے بلکہ یوں کہا جائے کہ معروضی انداز میں تنقیدی رویہ بہت نمایاں انداز میں خلیل صاحبؒ کے یہاں ملتا ہے تو کیا بعد میں آنے والے نقادوں نے یا جو اب نقاد ابھر رہے ہیں انہوں نے اس تنقیدی رجحان کو اپنانے کی کوشش کی؟

جاوید۔ اس کا جو اصل ہے وہ یقیناً ان کے پاس ملتا ہے لیکن یہ کہ غالب رجحانات دوسرے ہیں۔ شمس الرحمٰن فاروقی کی جو تنقید ہے وہ زیادہ تر ہیئتی تنقید ہے اور وہ زیادہ تر ہیئتی مسائل میں دلچسپی لیتے ہیں۔ جس قسم کی شاعری وہ کرتے ہیں اس طرح کی شاعری کو وہ [illegible] بھی کرتے ہیں اور ان ہی کی وجہ سے آج ادب میں دوبارہ ناسیئیت کا دور شروع ہوا ہے۔ وارث علوی ویسے تو لکھنے والے بہت پرانے ہیں لیکن درمیان میں ایک تعطل آ گیا تھا ان کی اپنی زندگی میں اور اب جو مضامین آئے ہیں تو وہ کلاسک پر زور دیتے ہیں اور کلاسیکی رویوں کو پسند کرتے ہیں اور ہر چیز کی اصل کو اس کے مرکز کو اپنے مضامین میں ابھارنے کی کوشش کرتے ہیں۔ بقیہ ناقدین تو ترقی پسند ناقدین ہی ہوتے ہیں جیسے محمد حسن ہوں یا قمر رئیس ہوں۔ اب باقر مہدی صاحب کا تو یہ ہے کہ انہوں نے مسلسل تنقید لکھی نہیں ہے۔ حال ہی میں جو ان کی کتاب آئی ہے "تنقیدی کشمکش" اس کتاب کے مضامین سے ان کی سیاسی فکر کا اندازہ تو ہوتا ہے لیکن ایک متوازن رویہ یا ایک متوازن بصیرت اور اس کا تسلسل یا ارتقاء نظر نہیں آتا ہے جب ہم اس کتاب کو پڑھتے ہیں۔

افتخار۔ آپ ایک جدید شاعر ہیں اور ایک متوازن تنقیدی شعور بھی رکھتے ہیں تو یہ بتائیے کہ ایک طرف تو ہم خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید کو پسند کرتے ہیں، سراہتے ہیں اور اسے ہم نے کسی خانے میں نہیں رکھا ہے نہ تو وہ ترقی پسند تنقید کے خانے میں آئے اور نہ ہی جدیدیت کے خانے میں گئے تو کیا وجہ ہے کہ اسی طرح کے تنقیدی رویوں کو پسند بھی کرتے ہیں اور خلیل صاحب کی انفرادیت کو بھی تسلیم کرتے ہیں اس کے باوجود اس طرح کی تنقید کا رواج نہیں ہوا؟ اس کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟ اگر اس طرح کی تنقید کا رواج نہیں ہوا تو اس کی وجہ کیا شخصیت پرستی ہے یا محض پسند کر کے چھوڑ دیا گیا یا یہ کہ اب اس کی کوئی اہمیت نہیں رہی؟

جاوید۔ شخصیت پرستی کا رجحان تو ہمیشہ سے ہمارے یہاں رہا ہی ہے۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی تنقید کے مزاج کو اگر ہم پیش نظر رکھنا چاہیں افہام و تفہیم کی خاطر کسی اور مقصد کے لئے نہیں تو ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ وہ ایک طرح کی تاثراتی تنقید ہے لیکن وہ اس تاثراتی تنقید میں جہاں کہیں تاثرات پیش کرتے ہیں اس کے پورے نفسیاتی عوامل کو اس شخص میں اس کے فن میں اور معاشرے میں تلاش کرتے ہیں اور اس کو ایک قاعدہ، ایک ضابطہ یا ایک نظریہ دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ بعد میں جو لوگ آئے ہیں وہ کچھ اپنی افتادِ طبع کے حساب سے الگ الگ خانوں میں بٹ گئے ہیں۔ خلیل کے ساتھ یہ بھی ہوا کہ فی الفور ان کی تنقید کو اتنی اہمیت نہیں ملی، وہ زمانہ کچھ اور شور و زور کا تھا کچھ اور رویئے، کچھ اور باتیں زیادہ مقبولِ عام تھیں، زیادہ حاوی تھیں یہ تو بعد میں جب "سوغات" کا اجرا ہوا یا "شب خون" شائع ہونا شروع ہوا اور ایک پلیٹ فارم ان نئے لکھنے والوں کو ملا اور ان کے پاس ان کے اپنے یہ دو آرگن رہے تو ان لوگوں نے اپنا ایک تنقیدی محاکمہ تیار کرنے کے لئے جب غور کیا تو پتہ چلا کہ ہم کو خلیل سے کافی کمک مل سکتی ہے۔ ●

آغا ظفر احمد ○ افتخار امام صدیقی

افتخار۔ ظفر صاحب! آپ کی ملاقات خلیل مرحوم سے زیادہ پرانی نہیں ہے ان دنوں جب وہ شدید بیمار ہو کر سری نگر آئے تھے اور آپ سے ملاقاتیں

خلیل الرحمٰن اعظمی نمبر ۱۹۸۰ء

قریب رہی تھیں تو یہ بتایئے کہ ایک حساس فنکار اور سخت علیل شخص کے رویئے، فکر اور گفتگو میں خلیل صاحب کو کیسا پایا؟

ظفر۔ خلیل صاحب سے میری ملاقات ان کی وفات سے کوئی ایک برس قبل ہوئی تھی۔ یکم مئی ۱۹۷۷ء کو وہ سرینگر آرہے تھے، کمال صاحب نے مجھے بھی ایرپورٹ چلنے کے لئے کہا۔ آپ شاید اندازہ نہ کرسکیں کہ ان سے مل کر میرے ذہن کو کس قسم کا دھچکا لگا۔ ان کی بیماری کے بارے میں پہلے سے تو علم تھا مگر جس چلتے پھرتے ہڈیوں کے پنجر سے ایرپورٹ پر ملاقات ہوئی تھی اس کا مجھے وہم و گمان بھی نہ تھا اور جب وہ ڈھانچہ بے حس و حرکت میری کار کی پچھلی سیٹ پر ڈھیر ہوگیا تو میں بے حد پریشان ہوا مگر کمال صاحب تمام صورت حال سے واقف تھے انہوں نے کچھ ڈھارس بندھائی۔ بس کے بعد خلیل ایک ہفتہ بستر سے نہ اٹھ سکے ان دنوں میں اکثر ان سے ملنے جایا کرتا اور پھر میں بہت جلد ان سے بے تکلف ہوگیا۔

خلیل صاحب کی گفتگو بے حد دلچسپ ہوا کرتی تھی، جتنا ان کا جسم لاغر تھا اتنا ہی چست اور توانا ان کا ذہن تھا۔ وہ چند مہینے سرینگر رہے اور اس دوران مجھے طویل، طویل ملاقاتوں کا شرف حاصل ہوا، ہر اتوار کو ہم کلب جایا کرتے تھے اور چمکیلے رنگوں کے گلابوں کی کیاریوں کے بیچ بیٹھ کر جیئر BEER کا دور بھی چلتا اور ڈھیروں باتیں بھی ہوا کرتیں۔

افتخار۔ بیماری کے دوران خلیل صاحب نے بیئر پی حالانکہ انہوں نے شراب چھوڑ دی تھی۔

ظفر۔ جی ہاں یہ صحیح ہے مگر ایک دلچسپ بات یہ ہوئی کہ پہلی بار جب بیئر منگائی گئی تو خلیل صاحب نے بڑی بے چارگی سے اس کی طرف دیکھا مگر کمال صاحب ہنس کر بولے، خلیل یہ تو تمہاری دوا ہے۔ خلیل صاحب کا چہرہ کھل اٹھا اور انہوں نے بیئر پینے کا آغاز کر دیا پھر ایسا لگا کہ جیسے اس کی سب زردی غائب ہو رہی ہے اور آس پاس کھلے ہوئے گلابوں کا رنگ ان پر چڑھ رہا ہے یہ محض نظر کا دھوکا نہیں تھا، سری نگر میں خلیل صاحب جتنی تیزی سے صحت یاب ہونا شروع ہوگئے تھے وہ کسی معجزے سے کم نہ تھا۔ تمام پرہیز ختم ہوگئے تھے، جسم اور چہرے کی ہڈیوں پر گوشت چڑھنا شروع ہوگیا تھا اور آنکھوں میں بلا کی چمک پیدا ہونے لگی تھی، روزانہ تین میل پیدل سیر کرنا بلکہ پہاڑوں پر چڑھنا بھی شروع کر دیا تھا، پہلے ان کے بدن میں نیا خون نہیں بنتا تھا اور تقریباً پندرہویں دن TRANSFUSSION کی ضرورت پڑتی تھی مگر یہاں تازہ خون بننا شروع ہوگیا تھا تعجب خیز بات یہ ہے کہ جتنے عرصے وہ سری نگر رہے خون دینے کی ضرورت نہیں پڑی، احتیاطاً چلتے وقت کچھ خون لے لیا تھا۔

اُن سے گفتگو تو ہر موضوع پر ہوا کرتی تھی مگر مجموعی طور پر جو ایک تاثر میرے ذہن پر مرتب ہوا وہ یہ تھا کہ خلیل صاحب نیکی اور بدی کی تفریق کے قائل تو تھے مگر یہ بات ہرگز نہیں مانتے تھے کہ کوئی شخص یا تو بالکل فرشتہ ہوتا ہے یا پھر شیطان، ان کے نظریئے کے مطابق ہر شخص ان دونوں کا مجموعہ ہوتا ہے یہ اور بات ہے کہ کبھی ایک عنصر غالب ہوتا ہے تو کبھی دوسرا مگر کسی انسان کا کردار نہ بالکل سیاہ ہوتا ہے نہ بالکل سفید اور یہ فیصلہ کرنا بھی نہایت مشکل ہے کہ نیکی کہاں سے شروع ہوتی ہے اور بدی کہاں سے شروع ہوتی ہے یہ تو تھا ایک عام انسان کے ذہنی رویوں کا مجموعی رنگ اب ایک فن کار کی حیثیت سے مجھے ایسا لگتا ہے اور جو میں نے ان کی گفتگو سے محسوس کیا کہ خلیل صاحب اردو شاعری، اس کے مقاصد اور خاص طور پر اس کے عروض، بحور، ہیئت اور مواد کے متعلق اپنی رائے کو قطعی اور حتمی سمجھتے تھے اور اس میں کسی طرح کی تبدیلی و ترمیم کے لئے کبھی آمادہ نہیں ہوتے تھے شاید اردو کا معلم ہونے کی وجہ سے ان کی طبیعت کا میلان ایسا رہا ہو اس معاملے میں وہ میری رائے کو ایک LAYMAN کی رائے سمجھتے تھے شاید وہ اپنی رائے میں حق بجانب بھی ہوں۔

افتخار۔ ایک عام انسان اور اس میں سمائے ہوئے فن کار کے مستقل ذہنی رویوں کے متعلق آپ نے خلیل صاحب کے بارے میں بتایا اب مجموعی طور پر ایک مریض کی ذہنی کیفیت اور وہ بھی ایسا مریض جو بلا کا حافظہ رکھتا ہو، شاعر اور نقاد بھی ہو اس کے متعلق بتایئے کہ خلیل صاحب کا مزاج کس طرح کا ہوگیا تھا۔

ظفر۔ مجھے یہ تو معلوم نہیں کہ بیماری سے قبل یا پھر اسی دوران علی گڈھ میں ان کا مزاج کیسا تھا مگر میں نے سرینگر میں دیکھا کہ بذلہ سنجی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ ایک بار ایسا ہوا کہ کمال صاحب موڈ میں نہیں تھے اور بیئر کی محفل بدمزا ہو رہی تھی آخر بڑے اصرار کے بعد معلوم ہوا کہ بھابی سے کسی بات پر جھگڑا ہوا ہے اس پر خلیل صاحب بولے کہ بھائی پیغمبروں کی بیویاں بھی ان سے جھگڑتی تھیں، پھر ایک دلچسپ لطیفہ سنایا خود بھی خوب ہنسے اور ہم دوسروں کو بھی ہنسایا اور محفل کا رنگ ہی بدل دیا۔

ایک مرتبہ بیئر کی محفل میں گفتگو پہلے سے کچھ زیادہ دلچسپ تھی وہ اپنے لڑکپن کے ایک واقعے کا ذکر کر رہے تھے جب دلی میں فسادات ہو رہے تھے اور ٹرین میں سفر کرتے وقت چند فسادیوں نے انہیں ٹرین سے باہر پھینک دیا تھا، اس کے بعد کے واقعات اور کئی دلچسپ اور متنوع قسم کی باتیں جس میں کمال صاحب کی شاعری بھی شامل تھی نتیجہ یہ ہوا کہ کلب کا کچن بند ہو گیا جو عموماً دس بجے بند ہو جایا کرتا تھا۔ باتوں میں کھانے کا آرڈر دینے کا خیال ہی نہ رہا تھا۔ کمال صاحب بولے کوئی بات نہیں گھر چل کر کھانا کھائیں گے گھر پہنچے تو معلوم ہوا کہ سب لوگ کھانا کھا چکے ہیں، باورچی خانہ دیکھا تو اس میں رات کی بچی ہوئی دال اور کچھ ترکاری کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ ہم تینوں بری طرح بھوکے تھے، بازار جانے یا وہاں سے کچھ منگوانے کا انتظار کون کرتا ہم لوگ دال ہی پر ٹوٹ پڑے۔ خلیل صاحب انتہائی سنجیدہ صورت بنا کر بولے "بیئر کے بعد دال، اسے کہتے ہیں گناہ بے لذت" انہوں نے یہ جملہ کچھ اس انداز سے کہا کہ کمال اور ہم بے اختیار کھلکھلا کر ہنس پڑے اب بھی جب کبھی گناہ بے لذت کا لفظ ذہن میں آجاتا ہے تو خلیل صاحب یاد آجاتے ہیں اور یا تو ہنسی آنے لگتی ہے یا پھر طبیعت بے حد اداس ہو جاتی ہے یا پھر دلوں وہ مریض جسے میں اپنی کار کی پچھلی سیٹ پر ڈال کر جکڑا یا تھا، وہی مریض رفتہ رفتہ زندگی کی طرف آرہا تھا اپنی تمام تر خواہشات کے ساتھ بھر رہا تھا اور جس رفتار سے صحت مند ہو رہا تھا اس سے یہ گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ اسی مریض کی زندگی کا آخری سال ہوگا۔

ہم جب ۱۹۷۷ء میں انہیں سری نگر ایرپورٹ لینے کے لئے جا رہا تھا مجھے کیا معلوم تھا کہ ان کی زندگی کا ہوائی جہاز کسی دوسرے انجانے ایرپورٹ کی طرف پرواز کر گیا ہے۔ ●

عمیق حنفی ○ افتخار امام صدیقی

افتخار۔ عمیق صاحب! خلیل مرحوم سے آپ کی دوستی اور قربت بے حد شدید تھی آپ نے انہیں بہت ہی نجی طور پر بھی دیکھا، سمجھا اور محسوس کیا ہوگا۔ آپ مختصراً ان کی شخصیت اور فن کے متعلق اپنے تاثرات شاعر کے قارئین کو بتائیے۔

عمیق۔ جی ہاں! خلیل صاحب میرے بہت قریبی اور عزیز دوست تھے۔ ان سے میری ملاقات ۱۹۶۰ء میں دلی میں ہوئی تھی۔ ان کی شرافت، متانت، خلوص اور وضعداری نے مجھے ان کا دلدادہ بنا دیا تھا۔ دوستداری اور اخلاص، انکسار دلکیت، مروت اور شرافت کے باوجود وہ کھرے اور منہ پر کہہ دینے والے آدمی تھے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا اور ان کا ذاتی کتب خانہ بہت قیمتی تھا۔ مقدمہ کلام آتش کے علاوہ جوش ملیح آبادی جیسی سرکش اور خود غلط شخصیت کی شاعری پر جس دلیری اور انصاف کے ساتھ انہوں نے لکھا تھا وہ اپنے آپ میں نہایت اہم تنقیدی کارنامہ تھا۔ جدید اردو شاعری (تاریخی پس منظر پر) کا کام دستاویزی نوعیت اور اہمیت کا حامل ہے۔ ان کا تحقیقی مقالہ "ترقی پسند تحریک" کا عمدہ تذکرہ ہے۔

بہ حیثیت شاعر کے خلیل صاحب نو کلاسیکی نقطۂ نگاہ کے قائل تھے انہوں نے کلاسیکی رکھ رکھاؤ، زبان کی پاکی اور صفائی، قوافی کا اہتمام اور موزونیت کے کلاسیکی تصور کو ہمیشہ گلے سے لگائے رکھا۔ اپنے احساسات، افکار اور خیالات کے اعتبار سے البتہ وہ جدید تھے۔ ان کے یہاں ابہام اور ترسیل کے مسائل نظر نہیں آتے۔

خلیل صاحب اپنے ذاتی شعری عوامل کو صرف اپنے لئے محفوظ کئے ہوئے تھے اور ان کے سبق نہیں تھے۔ وہ معری، آزاد، نثری، علامتی اور ABSURD شاعری تک کو ہمدردی اور خلوص کے ساتھ پڑھنے اور APPRECIATE کرنے کی کوشش کرتے۔ جدید شاعری اور جدیدیت کے زبردست ہمنوا تھے۔

اپنی عمر کے آخری دور میں (پچاس کی عمر کوئی عمر ہوئی) وہ مذہب کی طرف رجوع ہوئے تھے۔ اپنے ذاتی مکان "اردو باغ" کی تطہیر اور داخلے کی تقریب کے طور پر ۲۴ر مارچ ۷۵ء کو صبح کے دس بجے انہوں نے میری طویل نظم صلصلۃ الجرس کو مجھ سے پڑھوایا تھا اور اس جلسے

میں پروفیسر آل احمد سرور، ڈاکٹر نذیر احمد، پروفیسر اسلوب احمد انصاری، ڈاکٹر وحید اختر، ڈاکٹر شمیم حنفی، شہریار، سید احمد سورتی، ڈاکٹر مہدی حسن، ڈاکٹر توصیف نقوی، مولانا ظہیر عباس، ڈاکٹر محمد لیسین، ڈاکٹر غفار شکیل، ڈاکٹر اخلاق احمد، ڈاکٹر محمد عمر، ڈاکٹر مہدی انصاری، پروفیسر مسعود الحسن، عیاذ انصاری اور وقار حسین وغیرہ نے شرکت کی تھی یہ ایک نئے ڈھنگ کی تقریب تھی۔

خلیل صاحب یاروں کے یار تھے۔ وہ جتنے اچھے شاعر، نقاد اور عالم تھے اتنے ہی اچھے دوست، انسان اور ہم نشین تھے، آنا جانا تو دنیا کے ساتھ لگا ہوا ہے، لوگ آئیں گے اور جائیں گے۔ لیکن خلیل صاحب کا بدل ہم کہاں پائیں گے۔

خلیل صاحب کا قرض مجھ پر باقی ہے جو چند سطور آپ کی نذر کی ہیں وہ تو اس قرض کا سود بھی نہیں جیسے تعلقات ان سے میرے تھے ان کا بدلا ایک کتاب لکھ کر بھی نہیں دیا جا سکتا۔

خلیل مرحوم پر یادوں فیچر کئی حیثیتوں سے بے حد اہم ہو گیا ہے۔ وہ گوشے اور باتیں جو اس نمبر کے مضامین میں نہیں آسکی تھیں گفتگو کے دوران آگئی ہیں کسی شخصیت پر شاید اپنی نوعیت کی یہ پہلی کوشش ہے۔

محدود صفحات میں دیئے گئے اس فیچر کے متعلق چند ضروری باتیں اور کہنی ہیں تاکہ فیچر کو پڑھنے کے دوران ابھرنے والے متوقع سوال خاطر خواہ جواب پا سکیں۔ فنکاروں سے کئے گئے سوال تقریباً یکساں ہیں جو کسی شخصیت کے فن کا مطالعہ کرنے کے لئے ایک حد تک مناسب بھی ہیں۔

اتفاقی طور پر کہیں کہیں میں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے تاکہ گفتگو کو نئے موڑ دیئے جا سکیں حالانکہ مباحث کے امکانات قدم قدم پر موجود تھے لیکن چونکہ اس فیچر سے خلیل مرحوم کے متعلق ان کے ہم عصروں کے تاثرات جاننا مقصود تھا لہٰذا ہر طرح کے مباحث سے پہلو تہی کی گئی ہے۔

گفتگو اور تحریر میں جملوں کی ساخت اور لہجے میں بڑا فرق ہوتا ہے اس فیچر میں خصوصیت سے یہ خیال رکھا گیا ہے کہ جس شخص نے جیسی گفتگو کی ہے اسے لہجے کی گا دو بست کے ساتھ کاغذ پر اتار لیا جائے تاکہ جذبے کی شدت اور تاثر جوں کا توں برقرار رہ سکے اس لئے تحریر کی فضا کم اور بات چیت کا انداز حاوی ہے۔ محمد افتخار

ظ - انصاری
۳۲ - شیرین - ۳۱ کولابہ روڈ - بمبئی - ۵

اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک

کوئی کچھ کہے، اتنا تو ضرور ہوا، ادب میں ترقی پسند تحریک اتنا تو ضرور کر گئی کہ لکھنے والوں کو رجعت پرستی کے لفظ اور مُبہم تصور سے گھن آنے لگی؛ کوئی بھی اپنے آپ کو رجعت پرست کہنے یا ماننے پر آمادہ نہیں۔

ویسے دُور تک پھیلا کر دیکھیے تو وہ، جنھیں آنکھوں کی راہ سے مِیٹھی ہوئی خلش اور لہو کی گردش قلم چلانے پر مجبور کرتی رہی ہے، وہ اگلے اپنے زمانے کی رجعت پرستی میں مبتلا ہوئے بھی ہوں تو دیر تک مبتلا نہیں رہتے۔ نکل آتے ہیں، اس سے دست و گریباں رہتے ہیں اور یوں وقت کے ترقی پسندانہ خیالات اور اکساوے ہر زمانے میں اہلِ قلم کو، اہلِ فن کو قبلہ رو رکھتے ہیں۔ کسی ناگہانی کے مارے بہ ناگہ۔ بلند نہ بول سکے تب بھی

تڑپے ہے مُرغِ قبلہ نما آشیانے میں

اختلاف وہاں آکے پڑتا ہے جہاں الفاظ اور اصطلاحوں میں "ترقی پسندی" کا مفہوم سکہ بند کرنے کی کوشش کی جائے۔ سکہ بندی میں رائج الوقت، خانہ ساز، چہرہ شاہی اور الگ الگ ٹھپوں کے سبب رسّہ کشی ہوتی ہے۔ رُوحِ عصر چُپ چاپ تماشا دیکھتی رہتی ہے لہٰذا حقیقت — جو عموماً سطح پر نہیں تیرتی، پوری طرح کسی کی گرفت میں آئے بغیر غوطہ کھا جاتی ہے۔ ہر دَور کو اس صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اُردو میں ترقی پسند ادبی تحریک کو بھی۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی قابلِ قدر تصنیف انھی دُبکیوں کا ایک مکمل ریکارڈ ہے۔

خوش قسمتی کہ مجھے مرحوم خلیل الرحمٰن اعظمی سے اختلافِ اتفاق کے ساتھ ذاتی تعارف بھی حاصل تھا۔ وہ اُردو شاعری کے سوز و گداز، احتیاط و احترام، نرم آواز، دھیمے لہجے اور متوازن انداز کا جیتا جاگتا نمونہ نظر آتے تھے۔ باہر سے بھی، اندر سے بھی۔ نہ سخت جان تھے، نہ تلخ زباں۔ ابتدا اُن کے شعور کی اُن ترقی پسندانہ ادبی خیالات اور ادب کے جھونکوں میں ہوئی جو کمیونسٹ تحریک کی چڑھتی دھوپ کے ساتھ گرم ہوتے جاتے تھے۔ مولویوں کے ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ کم عمری ہی میں اُردو کا پورا کلاسیکی قدح چڑھا گئے، اُسے بغیر چھَن کیے بغیر گلے اتار لینے سے معدے میں کیڑے بھی پڑ جاتے ہیں! اور پھر تربیت علی گڑھ کی! پہلے ۱۹۴۷ء اور ۱۹۵۰ء کے بُرے دنوں میں۔ اچھا خاصا ہونہار آدمی ماضی پرست ہو کر رہ جائے، ہائے وہ عہدِ زرّیں، ہائے وہ دِلی، وہ لکھنؤ کہہ کر چھاتی پیٹا کرے۔ مگر بھلا ہوا کہ انھیں رشید احمد صدیقی اور مجنوں گورکھپوری جیسے دو صاحب نظر رہنما بیک وقت میسر آئے۔

.... رشید صاحب کی ایک قابلِ ذکر اور قابلِ قدر خصوصیت یہ ہے کہ وہ ایک مخصوص ادبی مسلک کے پابند ہوتے ہوئے بھی اپنے شاگردوں پر اسے عائد کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے۔ چنانچہ میں نے جب یہ کام شروع کیا تو انھوں نے فرمایا کہ اس مقالے کی ترتیب و تحریر میں کامل طور پر آزاد ہوں، البتہ تحقیق کے اصول اور ادب سے غفلت نہ برتوں۔ مقالے کی تکمیل کے بعد رشید

صاحب نے اپنا قیمتی وقت صرف کر کے اس کا ایک ایک لفظ پڑھا اور اپنے قلم کا استعمال صرف اس حد تک کیا کہ طرزِ بیان کی ناہمواریاں دور ہو جائیں .....

۸ جون ۱۹۷۱ء ص ۴۳

خود پروفیسر موصوف نے اس مقالے کی کتابی اشاعت کا جو تعارف لکھا ہے، وہاں اپنا مسلک ظاہر کر دیا ہے ان لفظوں کے ساتھ:

.... اردو کو ایک ایسی تحریک سے سابقہ ہوا جس میں اردو کے لیے کچھ کم انقلابی امکانات مضمر نہیں ہیں، اس لیے نہ صرف ایک منطقی تقاضا تھا بلکہ ایک روایت بھی تھی کہ ایسی اہم تحریک کا جائزہ علی گڑھ ہی کے ایک اردو اسکالر کے حصے میں آئے۔ گو ترقی پسندی کی تحریک اور علی گڑھ تحریک میں بڑا فرق یہ ہے کہ اول الذکر کا اساس بیرونی، سیاسی اور تبلیغی ہے اور موخر الذکر کا اندرونی، ادبی اور تہذیبی۔ دوسرے یہ کہ ترقی پسند تحریک سے بہت پہلے اردو ادب کے مزاج میں سیاسی اور سماجی شعور کا داخلہ شروع ہو گیا تھا .....

اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ:

چنانچہ میرا خیال ہے کہ اگر انجمن ترقی پسند مصنفین کی بنیاد ۱۹۳۵ء میں نہ پڑتی جب بھی اردو شاعری موجودہ موضوعاتِ سخن سے دوچار ہوتی۔

(ص ۸ رپورٹ کے اقتباسات)

لیکن مقالے کی تیاری، ترتیب اور اندازِ تنقید کا رُخ یہ نہیں ہے، بلکہ یہ ہے کہ بنیاد کا پس منظر کیا تھا۔ کن حالات میں انجمن بنی، کن حالات کی ہمنوائی سے تحریک چلی، آگے بڑھی، کیوں اور کن افراد کے خیالات میں فرق رہا اور فتور آیا، اور کیسے یہ تحریک اپنا تاریخی رول انجام دے کر ختم ہو گئی۔

کم و بیش ۲۵ برس کی تمام معتبر تحریروں، تصنیفوں، تقریروں اور بحثوں کو سامنے رکھ کر، منطقی نتیجے نکال کر مقالے کا مصنف بالآخر اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ:

"... نئی نسل کے نوجوان لکھنے والوں کے ذہنی تقاضے اور تھے۔ وہ جماعتی سیاست اور جماعتی آداب کے تنگ دائرے سے نکل کر فکری آزادی کی فضا میں سانس لینا چاہتے تھے اس لئے ترقی پسند تحریک کا ادبی مسلک انھیں متاثر کرنے میں ناکام رہا۔ ترقی پسندی ایک فلسفۂ حیات کے طور پر تو شاید اب بھی بعض لوگوں کے لئے قابلِ قبول ہو لیکن طے شدہ منصوبوں اور پروگراموں کا با جماعت ادب اب اپنی ساکھ اس قدر کھو چکا ہے کہ اس پر اعتبار کرنے والے ابھی بہت دنوں تک ہمارے یہاں پیدا نہ ہو سکیں گے۔"

ص ۲۴۸

یہ علمی مقالہ [.Ph.D کے لئے] ۱۹۵۷ء میں لکھا گیا اور ۱۹۷۲ء میں کتابی شکل میں شائع ہوا۔ یہ چودہ برس، نہ صرف اردو کی ترقی پسند تحریک کے تنظیمی انجام کے لئے، بلکہ دوسری ادبی تحریکوں، خیالوں اور آوازوں کی اُٹھان کے لئے بھی نہایت اہم تھے۔ انھی برسوں میں توبہ ٹوٹی، ٹکے بندھے ضابطوں پر آوازے کسے گئے، بغاوت ہوئی، صحن میں ٹوٹے ہوئے پیالوں کا ڈھیر لگا، اور انھی برسوں میں خود مصنف نے، جو اپنی فطرت سے ایک شاعر تھا، اپنی شاعری کا رنگ اور رُخ بدل ڈالا — جو ظاہر ہے کہ اس تحقیقی مقالے کی تیاری میں جنریٹ (Generate) ہونے والی جرأت کا لازمی نتیجہ تھا۔ خلیل صاحب کے جدا جدا مضامین سے تو یہ تازہ تصور ٹپکا پڑتا ہے لیکن اس کتاب میں کمی رہ گئی۔

تحقیقی مقالے، جو کسی ڈگری یا منصب کے لئے لکھے جاتے ہیں، سبھی نہیں مگر کافی تعداد میں علمی اداروں کی طرف سے شائع بھی ہوتے رہتے ہیں — البتہ کتابی اشاعت کے وقت خصوصاً تصنیف اور اشاعت کے درمیان بڑا وقفہ ہو تو — دو باتیں لازم ٹھہرتی ہیں:

(۱) نظرِ ثانی کرنے میں لب و لہجہ مدھم یا اونچا کرنا، رنگ ہلکا یا گہرا کر دینا،

(۲) غیر ضروری حوالوں اور سندوں کو خارج کر کے اُن کے بجائے

بعد کے حالات وواقعات کا جائزہ لینا۔

یہاں اُس مجلد میں یہ کمی رہ گئی۔ چنانچہ موجودہ صورت میں چند پیش گوئیوں کے باوجود، ۱۹۳۲ء اور ۱۹۵۷ء کے درمیان اُردو کی ترقی پسند ادبی تحریک کا یہ ایک بھرپور اور قابل اعتبار جائزہ ہے۔ زبان علمی، شہادت مستند، لہجہ متوازن اور اشارے معنی خیز — یعنی وہی خوبیاں جو آخری بیس برس خود مصنف کی زندگی اور تحریروں کی خصوصیات بن کر ابھری ہیں۔

کتاب تین حصوں میں تقسیم ہے، (۱) ت پ م۔ تحریک — (تاریخی ارتقا) (۲) ت پ ادبی سرمائے کا جائزہ، (۳) ت پ تنقید (ایک تجزیاتی مطالعہ)۔ ظاہر ہے کہ مصنف نے ترقی پسند تنقید کو زیادہ اہمیت دی اور اس طرح دَور کا سرا تھام لیا۔ زیر نظر کتاب میں اس پر تقریباً ڈیڑھ سو صفحے صرف ہوئے ہیں۔ حق یہ ہے کہ ترقی پسندی تمام اعلان ناموں، کانفرنسوں اور بیٹھکوں کے باوجود تنظیم کی صورت کبھی اختیار ہی نہ کر سکی، وہ تحریک کی صورت میں اُبھری تنظیم میں بکھری رہی اور جب کبھی تنظیم پر زور دیا گیا مختلف وجہوں سے تحریک پر جا کر ضرب پڑی[1]

بڑی وجہ اس کی ترقی پسند مکتب فکر کی طرف سے لکھی جانے والی تنقیدیں یا تنقیدی رائیں تھیں۔ (الف) نقطۂ نظر کی پیچیدگی، (ب) افراد اور ان کی ادبی کارگزاری (ج) سیاسی حالات کی اُتھل پُتھل اور (د) افراد کی ادبی اور غیر ادبی مصلحتیں اِس تحریک کو دائیں بائیں گھماتی نچاتی رہیں اور اس تحریک کے عروج و زوال کی تہہ میں اُترنے کے لیے یہی دَور تھامنی بھی چاہیے۔

خیال اور اس سے پیدا ہونے والی تحریر و تصویر کی سوانح عمری میں، آپ چاہیں، نہ چاہیں، سیاسی تاریخ کے بعض ہنگامہ خیز موڑ فیصلہ کن اہمیت رکھتے ہیں۔

دوسری جنگِ عظیم سے آٹھ نو سال پہلے جو خطروں کے بادل گھرنے شروع ہوئے تھے (جرمنی کی جنگی صنعت کاری اور یورپ کے مختلف مقامات پر انقلابی لہروں کے اُٹھنے اور دبنے کے ساتھ) مغرب کے دانشوروں میں ترقی پسند تحریک کا فروغ اُنھی کے خلاف لام بندی کا ایک اعلان تھا۔ اسپین کی خانہ جنگی کے وقت (۱۹۳۵ - ۳۶ء) باقاعدہ محاذ کھل گیا اور جب معاہدۂ میونخ نے بات کھول دی کہ نازی جرمنی کی جارحانہ قوت کو چیکوسلاویکیہ کی طرح سامراجی رشوت دے دلا کر بھی ہولناک خونریز جنگ ٹالنے کی پالیسی ناکام رہی اور جنگ عظیم سر پر کھڑی ہے تو قدرتی طور پر ہندستان میں قومی آزادی کی لہر تیز ہوتی تھی۔ اور اسی کے ساتھ ترقی پسند ادبی تحریک میں ایک عمومی اُبال بھی آنا تھا سو آیا۔

۱۹۳۵-۳۶ء سے ۱۹۴۰ء تک آپ دیکھیں گے کہ ادب اور زندگی کے تعلق سے مختلف خیالات رکھنے والے بیشتر روشن خیال اور نمایاں لوگ بلا تکلف اس خیمے کے اندر باہر آ گئے۔ جواہر لال نہرو اور پریم چند سے لے کر مولوی عبدالحق، حسرت موہانی اور کنھیا لال منشی تک سبھی۔ یہ تحریک گویا قومی بیداری کی ادبی علامات میں شمار ہوتی۔ تب تک نظریے پر اتنا زور نہیں تھا جتنا قوم کی ذہنی بیداری پر۔ اور اس کی بھی دو شقوں پر :

(۱) اپنی اپنی قدیم ادبیات میں نئے حالات کے ماتحت چھان پھٹک کی جائے۔

(۲) سائنسی عقلیت پسندی کو شہ دی جائے۔

لیکن جون ۱۹۴۱ء میں جب ہٹلری فوجوں نے روس پر ناگہاں یلغار کیا اور زخم خوردہ برطانوی فرانسیسی طاقت بے دلی کے ساتھ روس کی اتحادی بن گئی — تب سے اگلے دو برس میں ترقی پسند ادبی صفوں میں اختلاف کی لکیر پڑی — جنگ میں بالواسطہ برطانیہ کی حمایت اور مخالفت کے نام پر۔ جوشؔ و ساحرؔ، کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا کے زیر اثر [سامراج دشمن مگر] اتحادیوں کی حمایت میں، حیات اللہ انصاری، علی جواد زیدی، شمیم کرہانی اس کی مخالفت میں۔

ایک اور اختلاف بھی اُبھرا — وہ تھا نئے ادب اور ترقی پسند ادب کا۔ اس میں یہ صداقت تو کھُل کر آئی اور چیخ چیخ کر کہی جانے لگی کہ آج ہر تحریر جو نیا ادب ہے، لازماً ترقی پسند نہیں، مگر معاملے کا دوسرا رُخ صاف ٹال دیا گیا کہ آج ہر تحریر جو ترقی پسند ہے، لازماً نیا ادب نہیں۔ وہ سارے نعروں اور دعووں کے باوجود کرم خوردہ کاغذا

---

[1] اِس خاکسار نے یہی بات انجمن کی چھٹی کل ہند کانفرنس (۲۷ مارچ ۱۹۵۳ء) دہلی کے اجلاس میں کہی تھی اور عملاً اس کی تائید کی گئی تھی — ظ ا
شاعر۔ بمبئی

کے ورثے میں جگہ پانے قابل ہے۔ بحث اور تجزیے کے دونوں رُخ ہوتے تو تنقیدی گفتگو گھوم پھر کر ادبی دائرے میں سمٹ آتی۔ ایسا نہیں ہوا اور جیسا کہ زیرِ نظر تصنیف کے حوالوں سے ظاہر ہو جاتا ہے، ادب کی بحث غیر ادبی معیاروں سے طے پانے لگی۔ بنیادی پتھر ترچھا ہو گیا۔ جنگ کے غیر معمولی حالات اور فوراً بعد قومی تحریک کے اُبال اور سیاسی ہیجان کے ہنگامے میں منظوم نعرے بھی کانوں کو بھلے لگتے ہیں اور یہاں تو شاعرانہ افسانوں اور فسوں ساز شاعری کے پیچھے دو دو صداقتیں کارفرما تھیں، ایک تازہ دم عالمی نظر کی ہمک، دوسرے چولا بدلتی ہوئی دنیا۔ جس کے اُفق پر بچھڑے ہوئے ملکوں کی آزادی کی کرنیں پھوٹی پڑتی تھیں۔

ہندوستان کی تقسیم شدہ آزادی اور بعد کی قتل و غارت گری میں جو تین زبانوں کے سینے پر لکیر کھنچی ان میں اُردو سب سے زیادہ لہولہان اور خانماں برباد تھی۔ ابھی اسے گھر سنگوانا اور چین سے بیٹھنا نصیب نہ ہوا تھا کہ سرحد کے دونوں طرف کمیونسٹ تحریک اپنی ناوقت سرگرمیوں کے سبب معتوب ہو گئی۔ کچھ لکھنے والے پکڑے گئے، کچھ چھپ گئے اور باقی محتاط ہوئے یا اپنے خول میں سمٹ گئے۔

انھی دنوں ترقی پسند ادیبوں کی ایک نام نہاد[1] آل انڈیا کانفرنس بمبئی میں طلب کی گئی جو بھیمڑی (مضافاتِ بمبئی) والی پانچویں کل ہند کانفرنس کے نام سے مشہور اور مطعون ہوئی۔ یہاں سے جو اعلان نامہ شائع ہوا، وہ پچھلے مینی فسٹو کی اسپرٹ کے برخلاف "قبول" کے بجائے "رد" کے جذبے سے لبریز تھا۔

زیرِ نظر کتاب میں اس اجلاس کی، اس کے اعلان نامے اور اس کے اثرات کی ضروری تفصیل ص۱۰۱ سے ص۱۱۳ تک دی گئی ہے اور علمی احتیاط کے باوجود سب و لہجہ سے پھوٹا پڑتا ہے کہ مصنف، جو خود بھی اسی تحریک کے سائے میں پروان چڑھے تھے، تبھی بدمزہ ہوئے اور اس تحریک کے بلند بانگ نقیبوں سے ہمیشہ کے لیے بیزار ہو گئے۔

> ترقی پسند ادب کی تحریک میں اب تک جو رنگارنگی اور تنوع تھا، وہی اس کی سب سے بڑی طاقت اور اس کی سب سے بڑی جیت تھی ... لیکن افسوس ہے کہ اس زمانے میں اس نے اپنی یہ خصوصیت کھو دی جس کے نتیجے میں ایک طرف تو یہ تحریک یک سرے پن کا شکار ہو کر سمٹ گئی، دوسرے اس دور میں جو ادب تخلیق کیا گیا اس کی بے اثری اور کم وقعتی بہت جلد ظاہر ہو گئی .....
>
> نئے منشور کی اشاعت کے بعد بیزاری اور برہمی کا سب سے پہلا اظہار سردار جعفری کی طرف سے ان شاعروں پر ہوا جو اپنے آرٹ میں رمزیت اور تغزل کے قائل ہیں۔

خلیل الرحمٰن اعظمی نے یہاں سردار جعفری کے اس مضمون کا ایک اہم اقتباس دے دیا ہے۔ ہمارے لیے صرف اشارہ کر دینا کافی ہوتا لیکن یہ خاص اقتباس اور اس کے متعلقات کتاب میں تین جگہ بے ربط واقع ہوئے ہیں اس لیے ہم پورا قضیہ نقل کیے دیتے ہیں۔ "ترقی پسند ادب کے بعض بنیادی مسائل" کے عنوان سے جعفری نے فیض کی تازہ نظم پر تبصرے کی آنکھ کے تاروں کو عبرت دلائی ہے

> فیض نے اپنی پندرہ اگست کی نظم میں استعاروں کے کچھ ایسے پردے ڈال دیے ہیں جن کے پیچھے پتہ نہیں چلتا کہ کون بیٹھا ہے۔ اس کا پہلا شعر ہے:
>
> یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
> وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں
>
> اور آخری مصرع ہے کہ
>
> چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی
>
> لیکن یہی بات تو مسلم لیگی لیڈر بھی کہہ سکتے ہیں کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" کیونکہ انھوں نے پاکستان کے لیے چھ صوبوں کا مطالبہ کیا تھا لیکن انھیں ملے مغربی پاکستان میں ساڑھے تین صوبے اور مشرقی پاکستان میں پون صوبہ۔ پھر کیوں نہ ترقی پسند عوام کے بجائے مسلم لیگ کے نیشنل گارڈ اسے اپنا قومی ترانہ بنا لیں اور ڈاکٹر ساورکر اور گاڈسے بھی یہی کہتے ہیں کہ "وہ انتظار تھا جس کا یہ وہ سحر تو نہیں" کیونکہ اکھنڈ ہندوستان نہیں ملا جسے وہ بھارت ورش اور آریہ ورت بنانے والے تھے۔ پوری نظم میں اس کا کہیں پتہ نہیں چلتا کہ سحر سے مراد عوامی آزادی کی سحر ہے اور منزل سے مراد

---

[1] نام نہاد کا لفظ بھی اس اجلاس کے لیے ایک رعایت ہے کیوں کہ اول تو اس کے پسِ پردہ ذہنی ادیبوں کا ہاتھ نہیں تھا، دوسرے اس کی کوئی ذہنی یا آل انڈیا تیاری نہیں ہوئی تھی، نتیجہ یہ کہ نمائندگی نہیں ہوئی۔ تیسرے یہ کہ اس پر بیشتر وہ لوگ حاوی رہے جنھیں ادب کے ساتھ جینا مرنا نہیں تھا۔

عوامی انقلاب کی منزل۔ اس نظم میں داغ داغ اُجالا ہے، شب گزیدہ سحر ہے، حیثیتِ نور کا عالم ہے، تنہا کا دشت ہے، تاروں کی آخری منزل ہے، نگارِ صبا ہے، چراغ سر رہ ہے، پکارتی ہوئی بانہیں اور جلتے ہوئے بدن ہیں۔ یہ سب کچھ ہے لیکن نہیں ہے تو عوامی انقلاب اور عوامی آزادی، غلامی کا ذور اور اس درد کا مداوا۔ ایسی نظم تو ایک غیر ترقی پسند شاعر بھی کہہ سکتا ہے۔ اگر ہمیں فیض کی ترقی پسندی کا علم نہ ہو تو ہم اس نظم کا کوئی مفہوم نہیں نکال سکتے۔ یہ شاعر کے سماجی مقصد سے انکار اور ہیئت پرستی کا نتیجہ ہے۔"

ترقی پسندی کے بعض بنیادی مسائل

سردار جعفری۔ شاہراہ (۱)

"اس مضمون میں سردار جعفری نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ فیض اور جذبی کی طرح کے شاعر صحیح معنوں میں ترقی پسند نہیں بلکہ ترقی پسند شاعری کا اعلیٰ نمونہ ان کی کیفی اعظمی اور جاں نثار اختر کی شاعری ہے جس کا ایک نمونہ یہ شعر بھی ہے:

شہر میں بل کھا رہی ہے سُرخ فوج
سُوئے برلن جا رہی ہے سُرخ فوج

اس مضمون کا فیض پر کوئی اثر نہیں ہوا البتہ نئی نسل کے وہ شاعر جنہوں نے نیا منشور پڑھ کر شاعری شروع کی تھی اُن کے ذہنوں میں یہ مسئلہ اُلجھ گیا۔ فیض کو جب راولپنڈی سازش کے مقدمے میں گرفتار کر لیا گیا تو چند خوبصورت نظمیں رضیہ سجاد ظہیر کے پاس بھیجیں اور خط میں لکھا:

"آپ کی فرمائش پر بنّے (سجاد ظہیر) نے میری نئی اور "فضول سی" نظم غالباً آپ کو بھیج دی ہے۔ میں نے تو منع کیا تھا کہ مت بھیجنا، کہیں علی سردار کی نظر پڑ گئی تو مجھ پر تنزّل پسندی کا فتویٰ لگا دے گا۔ یوں بھی لوگ کہیں گے کہ ہمیں جیل میں بیٹھ کر محض گل و بلبل کی سوجھ رہی ہے، حالانکہ لکھنے کو اور اتنی باتیں رکھی ہیں۔ بہرصورت آپ باتیں بناتے رہیے۔ ہمارا جیل میں اگر عاشقانہ شعر لکھنے کو جی چاہے گا تو ہم ضرور لکھیں گے۔"

فیض کے خطوط۔ ہمارا ادب (گورکھپور) جولائی ۵۴ء
اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک ص۱۱۰ تا ص۱۱۱

سعادت حسن منٹو، حسن عسکری، حیات اللہ انصاری، خواجہ احمد عباس اور ساغر نظامی تو پہلے ہی جلالی شان سے ترقی پسند مصنفین بدر کر دیے گئے تھے۔ اب فراق گورکھپوری کی باری آئی جنھوں نے "نقوش" (لاہور) کے مدیر کے نام خطوں میں اپنی نجی زندگی اور تہہ بر تہہ رکھے ہوئے خیالات کی پوٹلی کھول کر رکھ دی تھی۔ انہوں نے اپنے ذوقِ ہم جنسی کا نہ صرف اعتراف کیا بلکہ اس کا جواز نکالا اور معذرت کے لہجے میں وہ لطیف نکتہ بھی نثر میں کہہ گئے جس پر غزل کی زبان کا پردہ پڑا تھا۔ بات کا آغاز یہاں ہوا:

"میری ذاتی زندگی بہت حد تک جنسیت زدہ رہی ہے اور ہے۔ جنسیت سے چھٹکارا پانے کے بدلے میں نے اسے شعوری اور وجدانی طور پر گہرا بنانے کی کوشش کی ہے۔ میری جنسی زندگی کو اس بات سے نہیں سمجھا جا سکتا کہ کن کن سے میرے تعلقات ہیں [بلکہ یہ کہ] ان تعلقات کو میں نے کس طرح ہضم کیا ہے، جنسیت کو کتنا لطیف بنا سکا ہوں، جنسی جذبات اور تجربات کو کتنا لطیف اور رنگین بنا سکا ہوں ......" ص۱۵۳

یہ دراصل وہی بات تھی جو فراق کی ان غزلوں میں نہایت لطافت و رنگینی کے ساتھ کئی بار آ چکی تھی جن پر ترقی پسند اساتذہ (مع سجاد ظہیر) سر دھنتے تھے۔ مثلاً ؎

تُو ایک تھا، مرے اشعار میں ہزار ہوا
اِس اِک چراغ سے کتنے چراغ جل اُٹھے

یہاں بھی، جیسا کہ ہم جانتے ہیں، 'تھا' اور 'تھی'، 'ہوا' اور 'ہوئی' کے درمیان کوئی حدِّ فاصل نہیں ہے۔ لیکن ان خطوں کا چھپنا تھا (اگرچہ خطوں میں کہیں ترقی پسند نظریات کی بحث موجود نہ تھی) کہ سردار جعفری نے ایک پُرشور مضمون ماہنامہ "شاہراہ" میں شائع کرایا۔[1]

یہ ترقی پسندی نہیں ہے

فراق نے اس کا ترکی بہ ترکی جواب دیا۔ جذبی نے نہ صرف برہمی کا

---

[1] ان سطروں کا لکھنے والا اُس زمانے میں شاہراہ کا اڈیٹر تھا اور چوں کہ مضمون کے دو چار آخری پیراگراف تکمیل کی خاطر اسی خاکسار نے بڑھا دیے تھے، فراق صاحب آج تک مجھی کو قصوروار گردانتے ہیں۔ غصے میں چند ہجویہ شعر بھی شائع کرا دیے تھے۔ خیر۔ بر سرِ فرزند آدم .... ظ ا

اظہار کر دیا، بلکہ قلم روک لیا۔ سجاد ظہیر بہت جزبز ہوئے اور ممتاز حسین نے اسی "شاہراہ" کے صفحات پر "صورت و معنی" کے بے مزہ سے عنوان کے تحت لکھا:

مخدوم کی نظم "انقلاب" کا یہ بند دیکھیے:

اے جانِ نغمہ جہاں سوگوار کب سے ہے
ترے لیے یہ زمیں بے قرار کب سے ہے
ہجومِ شوق سرِ رہگذار کب سے ہے
گذر بھی جا کہ ترا انتظار کب سے ہے

میرا خیال ہے کہ مخدوم کے اس بند کو مسیح موعود کا انتظار شوق سمجھ کر کوئی بھی مسلمان پڑھ سکتا ہے۔ لیکن اسلیے اس بند کے حسن میں کوئی کمی واقع نہیں ہوتی۔ اس طرح فراق گورکھپوری کے بعض اشعار ہر جماعت اپنے اپنے موقع پر پڑھ سکتی ہے، جو زندگی، انقلاب، تبدیلی، تغیر کے تصورات کو استعمال کرنا چاہتی ہے مگر موقع پرستی سے ان اشعار میں کوتاہی پیدا نہیں ہوتی۔ شعر و ادب انسانی زندگی اور عوام ان کے بارے میں ہوتے ہیں اور اگر ان کی زندگی کی کروٹ اور تڑپ کو کوئی جماعت استعمال کرے تو وہ قصور نہ تو شاعر کا ہے اور نہ شعر کا، وہ قصور اس طبقے یا جماعت کا ہے جو زبردستی شاعر کے مافی الضمیر کو اپنے ذاتی مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہتی ہے یا اپنے تصورات میں اسیر کرنا چاہتی ہے۔ فراق کے اشعار کو بہت سے مسلم لیگی رہنما اپنی تقریروں کو زیب دینے کے لئے استعمال کر سکتے ہیں تو کیا اس کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ فراق نے مسلم لیگ کو مدنظر رکھ کر اشعار لکھے ہیں میں خود علامہ اقبال کے مختلف اشعار کو استعمال کرتا ہوں حالانکہ جس شعور اور اغراض کے ماتحت انھوں نے اشعار لکھے ہیں وہ میرے شعور اور اغراض سے مختلف ہیں۔ شعر میں اتنی ہمہ گیریت اور آفاقیت ہو کر وہ انسانوں کی اکثریت کی زبان پر چڑھ جائے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اس سے ہماری طبقات بندی پر حرف آتا ہے۔ اکثر ہمارے اشعار کو ہمارے دشمن بھی گنگناتے ہیں خواہ وہ چھپ کر ہی کیوں نہ گنگنائیں۔

صورت و معنی

ممتاز حسین۔ شاہراہ ۱۹۵۴ء

سجاد ظہیر اور ممتاز حسین، اب یہی دو ایسے دانشور اس تحریک کے پاس ثابت قدم رہ گئے تھے جو نظریے کی استواری کے ساتھ فنی قدروں کی یاددہانی کراتے رہتے تھے اور جن کی لب کشائی رائگاں بھی سمجھی جاتی تھی۔

اس طرح اُردو کی ترقی پسند تحریک، جسے آگے چل کر کل ہند تنظیمی شکل اختیار کرنی تھی، صرف بارہ تیرہ سال کی مختصر مدت میں آپا دھاپی کا شکار ہو گئی۔ ماضی کے ادب عالیہ کی چھان پھٹک کے بجائے "اپنوں" کی چھان بین اور عقلیت پسندی کے بجائے خود پسندی اور خودسازی کی مشین چل پڑی۔ نتیجہ ظاہر تھا۔

۱۹۵۶ء میں سوویت یونین میں کمیونسٹ پارٹی کی ۲۰ ویں کانگرس کے پلیٹ فارم سے خروشچیوف کے لرزہ خیز انکشافات سے جو ایک سیلاب پوری دنیا کے "ہم خیالوں" کے سروں پر آیا اس نے یہاں تحریک کی زمین ہی دھنسا دی کہ وہ شروع سے پھوکی تھی۔ اگر انجمن کے پلیٹ فارم پر محض ادبی کارگزاری اور روشن خیالی، بلکہ تھوڑے بہت طبقاتی شعور کے رشتے سے مختلف رجحانوں، طبیعتوں اور حیثیتوں کے اہلِ قلم شروع سے جمع رہے ہوتے، تو سیاسی زلزلوں کا لایا ہوا انتشار ان کی ادبی رفاقت میں خلل نہ ڈال سکتا۔ لیکن رفاقت کے تنگ نظر معیاروں نے ہی بس کی گانٹھ بو رکھی تھی۔ اس کے بعد، تحریک کے ذریعے انجمن کو نہیں بلکہ تنظیم کا روپ دے کر تحریک کو پھر سے زندہ کرنے کی جتنی کوششیں کی گئیں وہ دو تین ہنگامی اجلاسوں اور ایک آدھا اختتامیہ مشاعرے سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ یہ سلسلہ ۱۹۵۹ء تک چلا۔ اب بھی کچھ مروت کچھ مصلحت کی خاطر چلا جاتا ہے، لیکن بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تحریک اپنا تاریخی رول انجام دے چکی۔ سائن بورڈ البتہ سلامت رہ گیا ہے۔ گڈول کے گاہک بھی سلامت ہیں۔

ہم نے اوپر کہا تھا کہ مصنف نے ترقی پسند تنقید کو اہمیت دے کر دودھ کا ایک سرا تھام لیا تو اس کا اندازہ کرنے کے لیے، بلکہ آئندہ

کی آگاہی کے لیے بھی لازم ہے کہ صاحبِ نظر اور بالآخر ترقی پسند مصنفین
کے درمیان اختلاف کے پہلوؤں پر نظر ڈال لی جائے۔

یہ تصنیف پس منظر دینے کے بعد اُردو دنیا تک خود کو محدود
رکھتی ہے اور مصنف کا یہ ریمارک برحق ہے کہ:

اس تحریک کی بدولت اُردو تنقید کو ایک نیا ذہن، ایک
نیا مزاج اور ایک منفرد کردار نصیب ہوا... اسی دَور
میں ایسے ادیب پیدا ہوئے جن کے ادبی کارناموں میں
تنقید ذیلی یا ضمنی نہیں بلکہ بنیادی حیثیت رکھتی ہے۔

ص ۹-۲۸۹

اس میں اوّل نام اختر حسین رائے پوری کا آتا ہے جنھوں نے
نہ صرف یہ کہ ادب کو ایک سماجی عمل قرار دے کر ادیب کو انسانیت
کے سامنے ذمہ دار ٹھہرایا، بلکہ قدیم ورثے کی ناپ تول کے پیمانے بھی
جتائے۔ ان کا تتمہ اقبال کو فاشسٹ قرار دینے پر ہوا اور پھر وہ
خود آئے دن کی رسہ کشی سے تنگ آکر ایک طرف ہو رہے۔

پھر ڈاکٹر عبدالعلیم ہیں جو مصنفین کی اس کل ہند انجمن کے بانی
اور بڑے عالم ہونے کے باوجود تصنیف کی جانکاہی میں مبتلا نہیں
ہوئے۔ حیرت ہے کہ انھوں نے شخصیت کا ایسا کیا طلسم کھڑا کر لیا تھا
جو باقاعدہ مصنف رہے بغیر (چند جستہ جستہ مضامین کے سہارے
کوئی کتنے دن مصنف کے سنگھاسن پر ٹھہر سکتا ہے!) برسوں ایسے
اثر و نفوذ کے مالک رہے کہ ان کی ہر تحریر۔۔۔ بلکہ تقریر سند کا درجہ
رکھنے لگی تھی۔ ادیب ہونے کا دعویٰ کیے بغیر وہ ترقی پسند ادیبوں کے
رہنما بنے رہے اور جب پیچھے کی صفیں چھٹنے لگیں تو انھوں نے
رہنمائی کا طرّہ و دستار بھی لپیٹ کر رکھ دیا۔

احمد علی اُردو اور انگریزی کے افسانہ نگار تھے۔ تقسیم سے ذرا پہلے
ہمسروں سے نوک جھونک اور ہمعصروں سے اختلاف نے انہیں انجمن
کی ٹکسال سے باہر کر دیا۔ ان کے پچھلے مضامین صرف حوالوں کے کام
کے رہ گئے۔ پھر مجنوں گورکھپوری، اختر انصاری، فراق، احتشام حسین،
عزیز احمد، آل احمد سرور، سجاد ظہیر، ممتاز حسین اور سردار جعفری کے
نام آتے ہیں جن کے وقتاً فوقتاً مضامین اور تبصروں کے اقتباس ان
کے اندازِ نظر کی شہادت دینے کے لیے کافی ہیں۔ "ترقی پسند تنقید کے
پیچ و خم" پر پورا ایک باب صرف کرتے ہوئے مصنف نے باری باری
سب کا جائزہ لیا ہے، مثلاً:

اختر حسین رائے پوری:

ترقی پسند تحریک کے پہلے باضابطہ تنقید نگار ہیں... کئی زبانوں
پر مہارت رکھنے اور خاصے وسیع المطالعہ ہونے کے باوجود ان کی تنقید پر
قبل از بلوغ کی جذباتیت چھائی ہوئی ہے۔

سجاد ظہیر

تحریک کے بانیوں میں ہیں... جو چند مضامین اُن کے قلم
سے نکل گئے ہیں وہ ان کی سلامتیِ طبع کے گواہ ہیں... راجندر سنگھ بیدی
نے اپنے ایک خطبۂ صدارت میں میر کی شاعری کو قنوطی اور فراری کہا
تھا اور اس کے مطالعے کو اس عہد کے ادیبوں کے لیے بے سُود قرار دیا
تھا'... ہنس راج رہبر نے [مثنوی زہرِ عشق کے جیسے] تنقیدی
مطالعوں کو اس لیے بے معرف قرار دیا تھا کہ یہ مثنوی جاگیردارانہ
تمدن کی یادگار ہے' پیٹ بھرے نوابوں اور رئیسوں کے عشق عاشقی
کی داستان سناتی ہے.... اسی نوع کی خام ترقی پسندی کا تصور
ظ انصاری نے اپنے ایک مضمون میں پیش کیا تھا.... (ان کے توڑ
پر سجاد ظہیر نے مقالے لکھے) سجاد ظہیر کی خوش ذوقی اور تنقیدی دیانت
داری کی ایک اور دلیل فیض احمد فیض کی شاعرانہ حیثیت اور ان کی ترقی
پسندی کا اعتراف ہے...."

ص ۵۴-۲۵۱

مجنوں گورکھپوری

ادب میں اجتماعیت و انفرادیت، ماضی کے ادبی اکتسابات
کے سلسلے میں صحت مند رویہ، ہنگامی ادب کی نوعیت، فن میں رمز و
ایما کی ضرورت وغیرہ سے متعلق مجنوں کے یہاں ایک متوازن اور سُلجھا
ہوا اندازِ فکر ملتا ہے.... ادب کی ادبیت کو قربان کرنے کے لیے تیار
نہیں.... وہ اپنے عالمانہ وقار کو برقرار رکھتے ہوئے تنقید کو ادب ہی
کی ایک شاخ سمجھتے ہیں۔ ان کے اسلوب میں قوت و توانائی اور انشائی
کیفیت کا امتزاج ملتا ہے....

ص ۲۶۰

آل احمد سرور

... سرور صاحب کے تنقیدی اندازِ فکر کو اگر ایک لفظ میں ظاہر کرنا
مقصود ہو تو "توازن" سے بڑھ کر کوئی اور صفت ان کے لیے موزوں

نہیں معلوم ہوتی ....

سرور صاحب اکہری شاعری کے بجائے پہلودار اور بلیغ شاعری کے دلدادہ ہیں .....

[ان کا] یہ اسلوب ان کی قوت بھی ہے اور ان کی کمزوری بھی۔ قوت ان معنوں میں کہ ان کے تنقیدی مضامین اپنی تازگی اور حسن برقرار رکھتے ہیں اور ان کی انشا پردازی نثر میں ایک تخلیقی شان پیدا کر دیتی ہے، مگر یہ اسلوب ان کے تجزیاتی مطالعے کی راہ میں حائل ہوتا ہے ....

ص ۱۴ ـ ۳۶۱

احتشام حسین

شعر و ادب کے علاوہ تاریخ، سیاست، اقتصادیات، عمرانیات اور دیگر سماجی علوم پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ مارکسزم اور جدلیاتی مادیت کے فلسفے کو انہوں نے بہت سوچ سمجھ کر قبول کیا ہے ....

دراصل احتشام صاحب کے مزاج کو تاریخ و سیاسیات جیسے علوم سے بڑی مناسبت معلوم ہوتی ہے۔ ان کا ذہن علمی اور منطقی زیادہ ہے، تخلیقی اور جمالیاتی کم ......

[ان کا] طریق کار یہ ہے کہ وہ اعلیٰ اور اوسط، شاعر اور متشاعر ادیب اور خطیب، سب کے ساتھ ایک ہی قسم کا خلوص برتتے ہیں، کیوں کہ ان کے پاس صرف ایک کسوٹی ہے اور وہ ہے سماجی یا سیاسی نقطۂ نظر۔

ڈاکٹر عبدالعلیم

....ان کی نثری تحریروں میں ایک سائنسی طریق کار ملتا ہے۔ اپنی افتاد طبع اور مخصوص مزاجی ساخت کی بنا پر ادبیات سے ڈاکٹر علیم کی دلچسپی بطور ایک فن لطیف کے کم ہے۔

ص ۲۷

اختر انصاری

ترقی پسندی کے مسلک کو قبول کرنے اور اس تحریک کا ساتھ دینے میں اختر انصاری نے اپنے ذہن و شعور اور فکر و بصیرت کو کبھی خیرباد نہیں کہا بلکہ قدم قدم پر اخلاقی جرأت کا ثبوت دیا ہے۔

عام طور پر ان کے ادبی کارناموں سے بے اعتنائی برتی گئی۔ اس کیفیت نے ان کو آہستہ آہستہ ادب کے جدید رجحانات سے عملی طور پر بے تعلق کر دیا۔

شاعر، بمبئی

عزیز احمد

نے مغرب کے سائنسی اور تجزیاتی طریق کار کو تنقید میں برتنے کی کوشش کی ہے، یعنی وہ ایک خاص ترتیب و تنظیم کے ساتھ موضوع زیر بحث کے ایک ایک پہلو اور اس کی جزئیات سے متعلق مواد فراہم کرتے ہیں، پھر کسی نتیجے پر پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ....

ترقی پسندی کی تعریف، حقیقت نگاری اور ادب میں انقلاب کے تصور کو مغربی ادب کے پورے پس منظر میں رکھ کر واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ ص ۹۲ ـ ۳۸۸

ممتاز حسین

واقعہ یہ ہے کہ ترقی پسند فکر نے جس مسئلے کو اختر حسین رائے پوری کے یہاں ادبی دہشت پسندی کی شکل اختیار کر لی (؟) اور اُسے سلجھانے میں احتشام حسین اور ڈاکٹر عبدالعلیم بھی کامیاب نہ ہو سکے اسے ممتاز حسین کی ادبی اور تنقیدی بصیرت نے خود مارکسی نقطۂ نظر سے حل کرنے میں بے مثال نکتہ رسی کا ثبوت دیا ہے.... ص ۲۹

سردار جعفری

بہت ذہین، طباع اور باصلاحیت ادیبوں میں ہیں۔ اس تحریک سے وابستہ ادیبوں میں کم لکھنے والے ایسے ہوں گے جنھوں نے افسانہ، ڈرامہ، تنقید، ترجمہ اور صحافت جیسی مختلف اور متنوع اصناف میں طبع آزمائی کی ہے .... اصلاً وہ شاعر ہیں اور شاعری ہی ان کی شخصیت کے اظہار کا موزوں ترین وسیلہ ہے .....

وہ بہت اچھے مقرر اور خطیب ہیں اور انھیں اپنی بات کو پُرزور اور مؤثر انداز میں کہنے کا ڈھنگ آتا ہے، اس خصوصیت نے ان کی نثر میں صلابت اور توانائی پیدا کر دی ہے۔

جعفری کو اپنی حدود کا احساس تو ہوگا مگر انسانی ذہن بڑا کافر ہے۔ واماندگیِ شوق اپنی پناہیں تراشنے میں مصروف رہتی ہے اور اپنی انا کا بُت اپنی ہی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو جاتا ہے... پکا ہی خود فریبی کے لیے جواز فراہم کرتا ہے۔ جعفری کی تنقیدی نگارشات دراصل اسی سعیِ جواز کی داستان ہیں ....

ان کی ساری ذہانت و فطانت اس بات میں صرف ہوئی کہ اپنی شاعری کو پہلے ترقی پسند فرض کر لیں اور اسی کو صحیح معنوں میں ترقی پسندی کا نمونہ مانیں .... اسے اس نوع کی شاعری کی واحد پہچان

تلاش کریں اور پھر اس کی سطح اور معیار کو بھی اعلیٰ شاعری سے تعبیر کریں ...
ص ۲۹۸-۹۰

یہاں مصنف خلیل الرحمٰن اعظمی نے پورے تیرہ۱۳ صفحوں میں تنقید کے ساتھ ساتھ سردار جعفری ("اکھڑی طبیعت") کی شاعری کو بھی ہدف بنا ڈالا ہے (جو یہاں بے محل ہے) تاہم یہ درست ہے کہ بلا استناد و حوالہ کوئی رائے زنی نہیں کی گئی اور تمام اس پر کیا گیا ہے کہ

ترقی پسند ادیب اگر جماعت کو ہی سب کچھ سمجھتے تھے اور فرد کی انفرادیت کو شک کی نظر سے دیکھتے تھے تو حلقے والوں (حلقۂ اربابِ ذوق) نے فرد کو ہی سب کچھ سمجھا اور جماعت کے تقاضوں کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ ترقی پسند ہیئت پر مواد کو فوقیت دیتے تھے اور "موادی ادب" تصنیف کرتے تھے تو حلقے والوں نے ہیئت کو مواد پر فوقیت دینے کو اپنا مسلک ٹھیرایا ....

یہ نتیجہ فارمولائی شکل میں بھی ادھوری سچائی ہے اور دراصل اسے اس تصنیف کا نچوڑ یا نتیجہ نہ ہونا چاہیے تھا۔ معاملہ محض مواد اور ہیئت کا نہیں رہ گیا تھا اور نہ یہ محض مواد والے، وہ ہیئت والے۔ نہیں، اس قضیے کی گہری جڑیں محض افراد کی طبیعتوں یا جماعتی رشتوں تک جا کر نہیں ٹھیر گئی تھیں۔ یہ کشمکش تو ہر ایک زندہ اور ہمکتی ہوئی زبان کو، اس کے مصنفین کو تاریخ کے کسی نہ کسی دور میں ضرور پیش آئی ہے، اور پھر وہ زبان ان مباحث میں غوطہ زن ہو کر، توانا تر برآمد ہوتی ہے۔ دستوئیفسکی کے تصنیفی عروج سے لے کر مایاکوفسکی تک ساٹھ۶۰ برس کا فاصلہ ہے۔ یہ ساٹھ برس روسی نثر و نظم میں سخت رسہ کشی اور توانائی حاصل کرنے کی داستانِ مسلسل سناتے ہیں۔ تحریکیں بنتی ہیں، ٹوٹتی ہیں، نئی شکل اختیار کرتی ہیں، زندہ تر ہو جاتی ہیں۔ اشتراکی انقلاب ۱۹۱۷ء کے نغمہ خواں کرہیلی جوان یسے نن اور پھر مایاکوفسکی مین اس وقت خودکشی بھی کر لیتے ہیں جب انقلاب کا سیل پتھروں سے ٹکرا کر پاش پاش، مگر آگے کی طرف رواں ہے۔ تو کیا اسٹیج پردے کے پیچھے آگ لگ گئی؟ کھیل غارت ہو گیا؟ نہیں۔

پھر اردو میں ایسا کیوں ہوا؟

کیا اس زبان پر سیاسی سماجی ادبار کا اثر تھا کہ اس کی یہ ترقی پسند اور وہ پسند تحریکیں چند افراد کی الماریوں کے خانے میں جا چھپیں اور وہیں دھری رہ گئیں؟

کیا اس زبان نے عصری حسیت کے جذب و اظہار کے نئے وسیلے، برہم وسیلے تلاش نہیں کیے، یا ان سے نباہ نہیں کیا؟

کیا اردو کی ترقی پسند تحریک محض چند مجاوروں اور متولیوں کی مدعولہ ہو کر صرف اس لیے رہ گئی کہ ہمارے یہاں تخلیقی اور تصنیفی کشمکش کھلے میدان میں آنے سے شرماتی ہے اور بہت کم سخن ہے؟ یا سیاسی وابستگیوں نے وابستگی کے کسی تصور کو ہمیشہ کے لیے بچھاڑ دیا ہے اور پورم پور وابستگی کے بغیر کوئی ادبی حلقہ بھی تبلیغی ذریعوں کا بار نہیں اٹھا سکتا؟

یہ سب تو ہے ــــ مگر اس کے سوا بھی کچھ ہے جس کا اشارہ تو زیر نظر تصنیف سے ملتا ہے ــــ جواب کھل کر نہیں ملتا۔

صحیح معنوں میں جدید ہندوستان کے ایک دانشور ایم این رائے نے ایک تک انقلابی جد و جہد کے بعد، یہ سوچ کر کہ ہندوستان میں ہر ایک پارٹی پالی ٹکس بالآخر پاور پالی ٹکس بن جاتی ہے اپنی آل انڈیا سیاسی پارٹی کو توڑنا پسند کیا اور اسے ایک ذہنی تحریک میں بدل ڈالا جس نے ریڈیکل ہیومنزم نام پایا۔ ترقی پسند تحریک بھی ایک ذہنی تحریک، روشن خیالی، سیکولرزم اور ہیومنزم کی لہر (چاہیں تو اسے سوشلزم کہہ لیں) بن کر اور زیادہ پھیل سکتی تھی، اب بھی پھیل سکتی ہے۔ لیکن جب اس تحریک کو عہدوں کی تقسیم اور عیارانہ تنظیم کے لیے تنظیمی شکل دی جانے لگتی ہے تو وہی صورت پیش آتی ہے جو سیاسی پارٹیوں کو فی الحال درپیش ہے کہ ادبی رنگ منچ پر پاور پالی ٹکس فیصلہ کن حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ زیر نظر تصنیف کا گہرا مطالعہ بھی اسی نتیجے پر پہنچاتا ہے۔

آخری بات یہ کہ یہاں ادب کی ہر ایک صنف میں ترقی پسند تحریک کے اثر و نفوذ کامیابی و ناکامی سے بالتفصیل بحث کی گئی ہے یہاں تک کہ ترجمہ، ڈائری اور رپورتاژ کو بھی شامل کیا گیا ہے اور یہ کافی اہم پہلو ہے کتاب کا۔

ہم نے اپنے تبصرے کو تنقیدی اتار چڑھاؤ، نظر اور نظریئے اور اس کے تفصیلی مطالعے تک محض یوں محدود رکھا کہ اس مقالہ کی ہی نہیں بلکہ اس تحریک کی جان بھی وہی ہے اور اس حیثیت سے یہ مقالہ انگشت نمائی بھی کرتا ہے اور چشم نمائی بھی۔ OO

ــــ شاعر، بمبئی۔

شکستگی اور روحانی کرب کے سارے شعری مظاہر کا شاہد اور عارف ہو۔ خلیل الرحمٰن اعظمی کی غزلیہ اور نظمیہ شاعری ایرانی روایت سے بقدرِ ضرورت استفادہ کرتے ہوئے بھی شعوری طور پر عجمی روایت اور ہنگامی عصریت کے تسلط سے اردو شاعری کو بچا کر ایک نئی ہمہ گیر روایت سے ہمکنار کرتی ہے جس کی رگ و پے میں پورے کلاسیکی اردو شعری ادب کا شعور، قدیم ہندی روایت، مغرب اور بالخصوص انگریزی کے جدید شعرا کی تخلیقات کا تازہ خون رواں دواں ہے۔

اپنی اس خود شناسی وسیع المشربی، روشن نظری، تخلیقی زرخیزی اور شعری تازہ کاری کے باعث خلیل الرحمٰن اعظمی آہستہ آہستہ نئی نسل کے ذہنی مسیحا بن گئے۔ ان کی متوازن، پرمغز اور فکر انگیز تنقیدی نگارشات آج بھی فیض گاہ ہیں جو ان کی شدید تخلیقی حسیت اور مجتہدانہ فکری صلابت کے خوشگوار امتزاج کے واضح اور روشن ترین اظہار ہیں۔ ان کے اندر آخری عمر تک کسی موضوع پر نئی بات سوچنے اور نئے تنقیدی لہجہ کو قبول کرنے کی بلند حوصلگی تھی جس کا بیّن ثبوت ان کے اہم مضامین جدید تر غزل، اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ اور نئی نظم کے سفر کا دیباچہ ہے۔ انہوں نے مقدمۂ کلام آتش سے لیکر مضامین نو تک ہمیشہ اپنی تنقیدی تحریروں کو پیشہ ور کتبی نقادوں، مختلف تحریکوں اور پارٹیوں کے یتیم الدماغ ڈھنڈورچیوں اور درسی تنقید کی چلتی پھرتی پرچھائیوں کے روایتی اور میکانکی انداز سے بلند و بالا رکھا۔ خلیل صاحب کے تشکیلی دور کی تنقیدی تحریریں آج کی ہی طرح بیشتر ذکی میکانکیت گزیدگی ROBO - PATHOLOGY کو شکار تھیں ان کا انداز نظر قطعاً میکانکی ہوتا تھا۔ اس دور کی بیشتر کج بج پھوندی تنقیدی تحریروں کے آئینہ خانہ میں تین قسم کے میکانکیت گزیدہ ناقدین ROBO - PATHCRITICS اپنی پلکیں جھپکاتے نظر آتے ہیں۔ کچھ تو کلاسیکیت پسند ماضی پرست ناقد تھے جو حنوط شدہ شعر اور شعری آثار قدیمہ کے دلدادہ تھے۔ کچھ تو مستقبل پرست ترقی پسند ناقد تھے جو ایک خاص نوعیت کے پولٹ بیوائی نظام کے پنجہ میں مبتلا تھے اور کچھ حلقۂ ارباب ذوق کے کتبی اور غیر کتبی نقاد تھے جو اپنے حلقہ گوشوں کی تفہیم میں کرم خوردہ نفسیاتی معتقدات کو زیادہ برتتے تھے اور عصری زندگی، زندہ آدمی اور سلگتے مسائل کو نظر انداز کرتے تھے۔ ہر میکانکیت زدہ ناقد فنی تخلیقات کے چہرہ پر اپنے مستعار نظریات، تاثرات اور تعصبات کو گوبر کی طرح تھوپ کر بغلیں بجاتا تھا۔ خلیل الرحمٰن اعظمی نے اس دور میں (عسکری اور کلیم الدین احمد کے بعد) زیادہ سلجھے، رچے ہوئے متوازن انداز میں زندگی کے مسائل کا سوچتے ہوئے ذہن اور کھلی آنکھوں سے سامنا کیا اور حسب توفیق فنی اور حقائق سے بھی جوجھنے کی کوشش کی۔ وہ دوسرے اپنے معاصر ناقدین کے مانند تہذیبی پسماندگی CULTURAL LAG کا شکار نہیں ہوئے اور نہ خواب پرستوں کے مانند مستقبل میں بے محابا قند بھرا۔ وہ نہایت تنقیدی ہوشمندی، عصری شعور اور تخلیقی حسیت کے ساتھ پرانے اور نئے شاعروں کے روشناس نہیں بلکہ روح شناس کہنے میں کامیاب ہوئے۔ ان کے تنقیدی مجموعہ فکر و فن میں شامل ظفر، غالب، درد، مومن، جوش، مجاز، جذبی، اور جمیل مظہری کے تنقیدی مطالعات فنی اور فکری سطح آشنائی کے بلکہ تہہ شناسی کے ذہنی فہم و رانہ اسپرٹ کے امین ہیں۔ ان کا اپنا مخصوص دلکش تنقیدی اسلوبی نظام ہے جو بیک وقت رُو شناسی اور روح شناسی پر قادر ہے۔ زاویۂ نگاہ میں بھی معدودے چند نظریاتی اور عملی تنقید کے سنجیدہ، حساس اور فکر انگیز شہ پارے موجود ہیں۔ اردو تنقید کے مسائل، اختر الایمان، اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ، سرسید کے ادبی تصورات شعر و ادب میں علی گڑھ کا حصہ، ابوالکلام کے مکاتیب مجھ کو اس وقت بے اختیار اپنے معروضی انداز نظر کی وجہ سے یاد آرہے ہیں۔ ان تمام رشحات فکر میں ان کے تخلیقی اور اجتہادی مزاج کے ساتھ ذہنی توازن، عدم تعصب اور سلاست روی کے روشن زاویے نمایاں ہوئے ہیں۔ آخری مجموعۂ مضامین نو، جس کو انھوں نے ازراہ عنایت مجھ کو بھیجا تھا۔ اس میں جدید ادبی مسائل اور شخصیتوں پر اچھے جائزے اور نرم و گرم تبصرے شامل ہیں۔ ان کی معرکہ آرا کتاب "اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک" ہے۔ اس حقیقت افروز تجزیاتی خواصی کی وجہ سے وہ ہمیشہ ترقی پسند شاعری اور تنقید کے سرخ ایوان میں معتوب رہے۔ لیکن ان کے اس ناقابل تسخیر باغیانہ رویہ نے نئی نسل کے لئے ان کے گرد ایک ہالہ سا بنا دیا تھا۔ اس میں دوسرے ترقی پسند اکابرین کی کٹھ ملائیت، رد عمل ذہنیت، قطعیت، جارحیت اور نظریہ و عمل کی دوئی پر خارا شگاف تنقید کی ہے اور صحیح تناظر میں ترقی پسند تحریک کے صحیح ادبی اور شعری تقاضوں کو خصوصی

اہمیت و معنویت اور افضلیت عطا کی ہے۔ یہ ہوشمندانہ انحراف اس دور میں غیر معمولی اخلاقی جرأت کا متقاضی تھا۔ اس سے ان کی بے پایاں خود اعتمادی، ذہانت اور خاموش گر مہم درانہ طبیعت کا پتہ چلتا ہے اسی وجہ سے ان کے تنقیدی محاسبوں میں فکری تذبذب اور کشمکش کے بجائے دو ٹوک کی کیفیت پائی جاتی ہے۔ ان کے اسلوب شیشہ آسا شفافی اور ہیرے کی کنی سا تیکھا پن ایک خاص لطافت کے ساتھ ملتا ہے جو اس کڑوے کسیلے دور میں نایاب ہے۔ انھوں نے ترقی پسندوں کی بدترین فرقہ پرستی اور عصبیت زدگی کے باوجود اکیلے اپنا راستہ بنانے کے خطرات مول لئے اور نئے اور پرانے ادب کا ہر لوہیت کے تعصبات سے بالاتر ہو کر محاکمہ کیا اور اپنے مخصوص نظریات کے اندرونی فیضان پر اردو تنقید کو خوب سے خوب تر کی طرف گامزن ہونے کا حوصلہ عطا کیا

خلیل الرحمٰن اعظمی جتنے اچھے اور سچے شاعر تھے اتنے ہی اچھے اور سچے نقاد تھے۔ ان کی تنقید میں صحیح معنوں میں کسی بھی ادبی فرقہ پرور حصار کی دریوزہ گری یا متعفن ہونے کے بجائے وسیع فلسفیانہ معنوں میں صداقت خیز اور حسن کے آفاقی معیاروں سے (عصری مسائل کا سامنا کرتے ہوئے) اپنے ڈانڈے ملا دیتی ہیں اور مشرق اور مغرب کے اعلیٰ ترین ماخذوں سے کسب فیض کرتے ہوئے اپنے روح کے زندہ تابندہ اور پائندہ عناصر کو اور زیادہ منور کر دیتی ہیں۔ البتہ یہ مسئلہ متنازع فیہ ہو سکتا ہے کہ وہ بڑے ناقد تھے۔ اردو میں ابھی تک کوئی بڑا ناقد پیدا ہی نہیں ہوا ——————

—————— یقیناً حالی،

متوسط صلاحیت کے اچھے اور سچے ناقد تھے۔ باقی ماندہ کچھ تو بڑے ناقد بننے کے خبط میں زندہ درگور ہو گئے۔ بعد میں انکشاف ہوا کہ وہ کاغذ، کینچی اور گوند سے بنے باون گز کے راون تھے۔ کاغذ، کینچی اور گوند بھی مغرب یا مشرق سے مستعار تھا۔ مُردوں کے ٹیلے سے دو چار اچھے اور سچے ناقد زندہ بچ نکلے ہیں۔ اسی پر قناعت کیجئے آج کے کئی ناقدین بھی تشکیلی مراحل میں ہیں بڑا ہونے سے پہلے تو "ہونا" ناگزیر ہے۔ اس کے لئے خواب غفلت سے چونک کر جاگنا ضروری ہے۔ میں چھوٹا کون ہے؟ عالمی ادب کے تناظر میں جب خود اردو ادب اوسط درجہ کا ہے تو اس میں ناقد کہاں سے بڑا پیدا ہو جائے گا؟ خود ہندوستان کے چودہ زبانوں کے ادب میں اس کو نمبر دو کے شہری کی حیثیت حاصل ہے۔ یہ ایک سفاک حقیقت ہے کہ یہاں تو اچھا اور سچا ناقد ہونا ہی ہر ایک کا مقدر نہیں۔ اس کے لئے بیکراں کرب و ضبط کے پل صراط سے گزرنا پڑتا ہے۔ مختلف باڑوں کے ہرکارے ناقد کہلانے کے مستحق نہیں ہوتے۔ اردو ادب کو آج بھی ایک بڑے ناقد کا انتظار ہے جس کی تشکیل و تعمیر میں یہ تمام اچھے اور سچے ناقدین خام مواد کا کام کریں گے البتہ ان کے اس احسان کا کوئی ناسپاس ہی منکر ہو سکتا ہے یا دل جلا، تاہم یہ ایک طرح کی احسان ناشناسی ہوگی OO

شاعر کا آئندہ شمارہ

شمارہ نمبر —— ۷

مقالات

بارہویں تیرہویں صدی عیسوی کی ہندوستانی موسیقی		عتیق حنفی
ادب کی سماجی معنویت		مجیب اختر
اردو تدریس اور تخالفی لسانیات		مناظر
میں کیسے ادیب بنا	(انگریزی)	ملک راج آنند
		ترجمہ ڈاکٹر یوسف کمال

کہانیاں

تین چہرے۔ تین آوازیں	صالحہ عابد حسین
استطاعت	فیروز عابد
مایاجال	سمیع الحق

سفرنامہ

خواب خواب سفر	(تیرہویں قسط)	رام لعل

تلاش و تجزیہ

"انقلاب" ایک مطالعہ	ڈاکٹر سلیمان اطہر جاوید

انشائیہ

بیماری سے عیادت تک	احمد جمال پاشا

ڈرامہ

خبیث	ابراہیم یوسف

منظومات

براج کومل۔ حسن نعیم۔ مظہر امام۔ بشیر بدر۔ محمد فضل۔ حمید الماس۔ سلطان اختر۔ پرکاش فکری۔ وہاب دانش۔ کیف احمد صدیقی۔ مادیس احمد دوراں۔ رفعت سروش۔ وسیم بریلوی۔ اسعد بدایونی۔ ابوالحسن۔ حکیم منظور۔ اسلم عمادی۔ ماجد الباقری۔ مظفر ایرج۔ سرور عثمانی۔ علی منیر۔ شاہین بدر۔ منظر سلطان پوری۔ سلطان رضوی۔ سلیمان خمار۔ پرویز رحمانی۔ امریک سنگھ یونی

مکاتیبِ مشاہیر

خلیل الرحمن اعظمی کا خط رشید احمد صدیقی کے نام

گزٹ کے سلسلے میں حالیہ فردِ جرم کے پیشِ نظر میں نے خود اپنے لئے ایک سزا تجویز کی ہے۔ وہ یہ کہ مجھے اس ملازمت سے سبکدوش فرمایا جائے۔

یہ اقدام آپ کے لئے بھی مفید ہوگا اور میرے لئے بھی۔ آپ گزٹ کے لئے ایک معقول ایڈیٹر تلاش کر سکیں گے اور میں اپنے لئے ایک بہتر ملازمت۔

میں نے محض آپ کے حکم کی بجا آوری کے طور پر گزٹ کی ایڈیٹری کا بار سنبھالا تھا لیکن ایک سال کے تجربے کے بعد یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میں اور گزٹ کی ایڈیٹری گول خانے میں چوکھنٹی چیز کے مترادف ہیں۔

میں نے اس یونیورسٹی سے فرسٹ کلاس فرسٹ ایم اے کیا ہے اور اپنے زمانۂ طالب علمی ہی میں شعر و ادب کے حلقوں میں تھوڑا بہت روشناس ہو چکا تھا چنانچہ امتحان کے بعد ہی کئی جگہ سے خطوط آئے کہ میں وہاں جا کر لکچرر شپ کے فرائض انجام دوں۔ لیکن کچھ تو آپ کا مشورہ اور حکم اور کچھ یونیورسٹی کی خدمت کا جذبہ جس نے مجھے ڈیڑھ سو روپئے ماہوار (جس میں مہنگائی الاؤنس وغیرہ کچھ نہیں) کی ملازمت پر مجبور کیا۔

میں نے ہر ممکن کوشش کی کہ گزٹ کو اچھے سے اچھا بناؤں چنانچہ میں نے اسے خاص بلیٹن کی حدوں سے نکال کر ایک علمی و ادبی اخبار بنایا اور صرف سرکاری گزٹ کے بجائے اس میں تھوڑی بہت شئے لطیف کی آمیزش بھی کی۔ اس کا اعتراف علی گڑھ کے ارباب اقتدار کریں یا نہ کریں لیکن ہندوستان کے مشاہیر علم و ادب نے کیا ہے جس کا ثبوت ان کے تبصرے، رائیں اور خطوط ہیں جو مختلف اوقات میں میرے نام آتے رہے ہیں۔

لیکن میں نے جو کچھ کیا شاید وہ آپ لوگوں کی نگاہوں میں زیادہ مستحسن نہ ٹھہرا۔ اس لئے اس کے متعلق ہمیشہ کچھ نہ کچھ چہ میگوئیاں ہوتی رہیں۔ اصل میں گزٹ کا اب تک یہ ڈھرّا رہا ہے کہ اس میں صرف رجسٹرار آفس کے کاغذات، نوٹسیں اور ضرورت ہے، کے کام چھپا کرتے تھے۔ اس کی روایات میں میں نے جو تبدیلی کی وہ برابر کھٹکتی رہی۔ مجھ سے ہمیشہ کہا گیا کہ گزٹ ویسا نہیں نکلتا جیسا ہم چاہتے ہیں لیکن اس "ویسے" کی کبھی تفسیر نہ کی گئی اور نہ ہی مجھے کبھی نمونے کے طور پر کوئی پرچہ مرتب کر کے دکھایا گیا کہ میں سمجھ لیتا یہی اس کا معیار ہے۔ ان حدود سے آگے یا پیچھے رہنا ٹھیک نہیں۔

اصل میں گزٹ کے ارباب اقتدار بھی حق پر ہیں۔ ان کو جس طرح کا گزٹ چاہئے ویسا گزٹ نکالنے کے لئے مجھ جیسے ایڈیٹر کی ضرورت نہیں ——

اسی لئے میری خواہش ہے کہ مجھے گزٹ کی خدمت سے سبکدوش فرمایا جائے۔ اس کام کو معمولی لیاقت کا تھرڈ کلاس بی اے پاس آدمی بھی کر سکتا ہے بلکہ وہی اس کا زیادہ موزوں ایڈیٹر ہوگا۔ ڈاکٹر ضیاء الدین صاحب کے زمانے میں بھی ہمیشہ ایک کلرک نما ایڈیٹر، رجسٹرار آفس کی نوٹسیں وغیرہ لیکر بے چون و چراں شائع کر دیا کرتا تھا۔ ایسے روایتی ایڈیٹر سے اب بھی یہاں کے لوگ مطمئن ہوں گے۔ اس کے لئے ڈیڑھ سو روپئے بہت کافی ہیں اور وہ اپنے کام سے یونیورسٹی والوں کو خوش بھی رکھ سکے گا۔ موجودہ صورت میں تو ایک طرف میں بیزار کہ میری تنخواہ میرے لئے ناکافی، دوسری طرف ارباب یونیورسٹی نالاں کہ یہ ایڈیٹر گزٹ میں نہ جانے کیا کیا خطرناک گولیاں رکھ دیا کرتا ہے۔

امید ہے کہ میری گذارش شرفِ قبولیت حاصل کرے گی۔

نیاز مند

خلیل الرحمن اعظمی ایڈیٹر "مسلم یونیورسٹی گزٹ"

۲۷ اپریل ۵۲ء

رشید احمد صدیقی کا جواب خلیل الرحمن اعظمی کے نام

اعظمی صاحب!

یہ تحریر واپس کرتا ہوں جس کا موقع آپ نے کھو دیا ورنہ میرے نزدیک

مناسب نہیں۔ میرے کہنے پر آپ نے جو تحریر بھیجی تھی وہ چونکہ ضابطہ پری کرتی تھی اس لئے اسے رکھ لیا گیا۔ یونیورسٹی کیا فیصلہ کرے گی یہ اس کا حق ہے۔ ممکن ہے پرو وائس چانسلر صاحب آپ کو بلا کر اس سلسلے میں خود کچھ کہیں۔ آپ کو جو کچھ کہنا سننا ہوگا آپ ان سے کہہ سن لیجئے گا۔

آپ کے اور صرف آپ کے نفع کی خاطر خلوص و محبت کی بنا پر میرے دل میں جو بات آئی تھی وہ میں آپ سے کہہ دیا کرتا تھا۔ میں نے محض کہنے سننے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جہاں تک ہو سکتا تھا آپ کے لئے کچھ کرتا دھرتا بھی رہتا۔ آپ نے ہمیشہ اس کا بڑے خلوص سے اعتراف بھی کیا۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ باوجود خلوص و محبت کے میری رائے یا میرا نقطۂ نظر غلط ہو سکتا ہے۔ لیکن میرے لئے تو میری اپنی رائے اور اپنا ہی نقطۂ نظر سب کچھ ہیں۔ میں دوسری بات کیسے کہوں جس پر نہ میری عقل گواہی دے نہ میرا ایمان۔ یہ میری عادت ہے کہ میں اپنی بات کہہ کے یا اپنی سعی کر کے علیحدہ ہو جاتا ہوں اس پر اصرار نہیں کرتا نہ اس کے پیچھے پڑتا ہوں۔ اپنے نقطۂ نظر کو آپ پر واضح کرنے اور آپ کو اپنے بتائے ہوئے راستہ پر چلنے کا مشورہ دینے میں میرا خود کا کیا فائدہ تھا اس پر بھی آپ نے غور کیا؟ میں آپ سے اپنے لئے کسی طرح کا نفع نہیں چاہتا تھا۔ غالباً اس کا آپ کو یقین ہوگا۔ میں تو آپ کی خاطر تھوڑی بہت رسوائی بھی مول لینے پر تیار رہتا تھا۔ ممکن ہے اس حد تک آپ میرا یقین نہ کرتے ہوں۔ آپ تو آپ بہت سی باتوں میں میری بیوی بچے تک میرا کہا نہیں مانتے۔ مجھ پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا اور بے لوث خیراندیشی اور خیرطلبی کا میرے لئے یہ سب سے بڑا انعام ہے۔ خدا اب تک وہ دن نہیں لایا اور شاید اب لائے بھی نہیں جب میں اپنی غرض اور اپنے نفع کے خاطر کسی کو مفید مشورہ دوں۔ بہرحال آپ میری باتوں پر نہ چلیئے۔ کیجئے وہی جس کو آپ بہتر سمجھتے ہوں۔ موجودہ معاملہ میں خواہ مخواہ عجلت سے کام نہ لیجئے۔ تھوڑا سا تامل اور صبر کرنا بھی سیکھئے۔

خیر طلب رشید احمد صدیقی

۲۹ر اپریل ۵۲ء

اعجاز صدیقی کا خط خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام

۱۔ نومبر ۵۶ء

محبی خلیل الرحمٰن اعظمی ــــــ سلام مسنون

سالہا سال کے بعد آپ کا محبت نامہ پا کر بے حد مسرت ہوئی۔ آپ کی صحت و سلامتی کے لئے دعاگو ہوں۔ جی ہاں آپ کی خاموشی اور بیگانہ روشی کا احساس تو بار ہا ہوا لیکن "ہم اپنی وضع کیوں چھوڑیں" کے مصداق میں نے کبھی "شاعر" بند نہیں کیا۔ اس خیال سے "شاعر" بھیجا کہ کم از کم اسے دیکھ کر میری یاد تو تازہ ہو جایا کرے گی۔ میں نے تو "شاعر" کے قلمی اعانت کے لئے بھی آپ کو لکھنا چھوڑ دیا۔ یوں بھی کسی رسالے میں آپ مدت سے نظر نہیں آئے۔ گمان گذرا کہ جذبی کی طرح آپ بھی میدان چھوڑ بیٹھے۔ لیکن آپ کے خط سے یک گونہ اطمینان ہوا کہ آپ کا تخلیقی عمل جاری ہے۔ اردو شعر و ادب میں جو خلفشار اور بھونچال آیا ہوا ہے اس سے آپ واقف ہیں معتبر اور متوازن آوازیں کم ہی رہ گئی ہیں۔

ممنون ہوں کہ آپ نے "شاعر" کے ہم عصر اردو ادب ... "مٹی کا گیت" ... بھیجی۔ شہریار نے اچھا کیا کہ آپ سے ... فضا، پھیلاؤ اور لفظیات کے اعتبار سے پسند آئی اس میں میاں نظموں کا سا بھولا پن اور سادگی ہے "الفاظ" میں وحید اختر کی بھی "مٹی کی صدا" نظر سے گذری تھی۔ کیا بات ہے؟ مٹی کی ... کے مختلف روپوں کی طرف علیگڑھ والے بہت متوجہ ہیں ... مصرعوں کی طرف آپ کو توجہ دلانا چاہتا ہوں۔

۱۔ مٹی کے سب مسجد گرجا مٹی کے سب دیوی دیوتا

(دیوتا پورا کا پورا بحر سے خارج ہے)

مصرع کے دونوں ٹکڑوں کی تقدیم و تاخیر سے کچھ فرق پیدا ہو جاتا ہے۔

مٹی کے سب دیوتا دیوی، مٹی کے سب گرجا مسجد

نظم کا صوتی حسن بھی مجروح ہو رہا ہے اور چونکہ شروع سے آخر تک بحر و وزن کا التزام ہے اس لئے احتیاط ضروری ہے۔

۲۔ مٹی کا بازار لگا ہے کورے کورے برتن ہیں

اس کی دو صورتیں مصرع کو زیادہ خوبصورت اور چست بنا دیتی ہیں

مٹی کا بازار لگا ہے، کورے کورے ہیں برتن

" " " " " " سب برتن

یہ دوسری صورت زیادہ بہتر ہے۔

۳۔ سرسبز سرسبز سرک رہے ہیں سب سب شانے مٹی کے

" " " " سارے " " "

"سب سب" میں تنافر لفظی کا واضح احساس ہوتا ہے۔

"چولھے پر ناچے" = پر ناچے میری نظر سے نہیں گذرا۔ اس کے معنی بھی مجھے معلوم نہیں ہیں۔ محض اپنی لاعلمی کی بنا پر پوچھ رہا ہوں۔ ہم عصر اردو ہم عمر اردو ادیبوں اور شاعروں کی تخلیقات کے سلسلے میں علمی ذہنی اور ... اثر

تبادلۂ خیال ہوتا رہتا ہے۔ برا نہ مانئے گا۔

"رقصانہ" اجتماعی رقص کے لئے بہت اچھا لفظ ہے۔ پسند آیا
کوئی وجہ نہیں ہے کہ ہم اس طرح کے الفاظ وضع اور قبول نہ کریں۔

"شاعر" کا ہم عصر اردو ادب نمبر ایک بہت ہی اہم نمبر ہے۔ جنوری کے آخر تک
... کا نظم ... کتابت کسی بھی دوسرے رسالے کو نہ بھیجئے گا۔ نظموں کی
... خاص طور پر اس نظم کے مسودے پر سرخ قلم سے لکھ دیجئے کہ "شاعر"
ہم عصر نمبر کے لئے بھیجی گئی ہے۔ یہ احتیاط بہت ضروری ہے۔ اس نمبر کی تمام
نظمیں و تخلیقات تازہ و غیر مطبوعہ ہوں گی۔

یہ تو مجھے کسی نے بتایا تھا کہ آپ کی صحت اچھی نہیں ہے۔ ہاں یہ معلوم
نہ تھا کہ کئی سال سے آپ جگر کی خرابی میں مبتلا ہیں۔ میں نہیں سمجھتا کہ علیگڑھ میں
معقول علاج ہو سکے گا۔ دہلی میں یونانی اور ایلوپیتھی دونوں طریقہ ہائے
علاج کے ماہرین موجود ہیں۔ کیوں نہ آپ دہلی جا کر حکیم عبدالحمید صاحب اور حکیم
کوثر چاند پوری کو دکھا دیں۔ ضرورت ہو تو نرسنگ ہوم میں چند دن رہ لیجئے گا۔
میرا ذاتی تجربہ ہے کہ جب کوئی مرض بہت پرانا ہو جاتا ہے تو ایلوپیتھی علاج کام
نہیں کر سکتا۔ عام طور پر بایوٹیک ادویات خون میں [illegible] کی قوت
کو ختم کر دیتی ہیں۔ ایسی حالت میں یونانی اور ہومیوپیتھی معالجہ سودمند ہوتا
ہے۔ اگر آپ بمبئی آسکیں تو سب سے بہتر ہوگا۔ یہاں تمام امراض کے اسپیشلسٹ
موجود ہیں اور مریضوں پر بے پناہ توجہ دیتے ہیں۔ یہاں کے چوٹی کے ڈاکٹروں سے
ہمارے دوستانہ مراسم بھی ہیں۔ کسی صورت آپ کو جگر کی تکلیف سے نجات ملنی
چاہئے۔ میں سمجھتا ہوں کہ تنہا جگر ہی کی خرابی نہ ہوگی اور بھی کچھ خرابیاں ہوں گی

میں پندرہ سال سے چار چار لاعلاج امراض کا شکار ہوں۔ دہلی، حیدرآباد
اور بمبئی کے چوٹی کے معالجین کی خصوصی توجہ حاصل رہی ہے۔ میڈیکل انسٹی ٹیوٹ
میں بھی دکھایا تھا۔ کئی بار بمبئی کے سب سے بڑے پرائیویٹ اسپتال بمبئی ہاسپٹل
میں بھی رہا۔ ہزاروں روپئے برباد ہوئے۔ مگر لاحاصل۔ پیچیدگی یہ ہے کہ چاروں
تکلیفیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ ایک کے لئے دوا دی جاتی ہے تو تین تکلیفیں
جان لیوا حد تک بڑھ جاتی ہیں۔ ایلوپیتھی، یونانی، اور ہومیوپیتھی تینوں طریقہ
ہائے علاج ناکام ہو چکے ہیں۔ اور اتنی نازک صورت حال ہے کہ ڈاکٹر اور حکیم دوا دیتے
ہوئے ڈرتے ہیں۔ دعا اور دوا دونوں بے اثر ہو چکی ہیں بس اپنی قوت ارادی
سے زندہ ہوں اور زندہ بھی کیا یوں سمجھئے کہ بس جی رہا ہوں ہر روز مرتا ہوں اور جیتا
ہوں ہمہ وقت کا تڑپنا مقدر بن چکا ہے۔ ٹانگوں کی جلد تلووں سے لیکر پنڈلیوں
اور ہتھیلیوں تک ہمہ وقت جلتی رہتی ہے۔ بیت الخلاء سے آکر مچھلی کی طرح تڑپتا ہوں

ہر روز میں جی لیتا ہوں، مر لیتا ہوں
الزام حیات اپنے سر لیتا ہوں
وہ عالم خواب ہو کہ ہو بیداری
سانسوں کا مگر حساب کر لیتا ہوں

یہ ایک تازہ تاثر ہے اور مجھے ہر روز دیکھنے والے میری اس کیفیت
کے شاہد ہیں۔ عید سے دس دن پہلے ایک سخت ترین دماغی دورہ پڑا تھا میں دو دن
سکتہ کا عالم رہا۔ (کار و افکار کے بوجھ سے) اس سے نجات ملی تو اکتوبر کے
شروع میں ایک سال کے بعد گردہ کی تکلیف بڑھ گئی۔ پیشاب لانے اور
اس تکلیف کو کم کرنے کے لئے ادویات دی گئیں تو دماغ اور سینہ جکڑ گیا
پھر ۱۵ اکتوبر سے اس نے شدید انفلوئنزا کی صورت اختیار کر لی۔ ۱۰ ر
نومبر تک سخت بے حال رہا ہوں۔ ابھی پوری طرح افاقہ نہیں ہوا ہے
انفلوئنزا کے لئے دی گئی گرم دواؤں نے پھر گردوں کی تکلیف بڑھا دی
ہے۔ کمزوری بے حد و بے انتہا ہے کاموں کا زبردست نقصان ہوا
ہے۔ ذاتی اور ضروری ڈاک کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں۔ ۲۲ ر اکتوبر کو چند نہایت
ضروری کاموں کے سلسلے میں دہلی جانا تھا۔ مگر اب تک سفر کے قابل نہیں ہو
سکا ہوں۔ نومبر بھی نکلا جا رہا ہے۔ میرے لئے ۱۲۔۱۴ گھنٹے بلکہ اس سے بھی
زیادہ وقت تک کام کرنا لازمی ہے۔ اکتوبر اور نومبر میں برائے نام ہی لکھ
پڑھ سکا ہوں۔ اب ہاتھ بھی کچھ کانپتا ہے اور پہلے کی طرح اچھا اور تیزی
کے ساتھ نہیں لکھا جاتا۔ ۴۶ سال مسلسل قلم چلایا ہے۔ عمر کا ۶۵ واں سال
ہے مسلسل حادثات اور سانحات نے بے دم کر دیا ہے۔ نہ جانے کتنے مخلص
دوست اور عزیز و اقارب بچھڑ گئے۔ جاں نثار اختر بھی ان ہی میں سے ایک
تھے۔ آپ نے تو پھر اپنی نظم و نثر سے کچھ چھپوا لیا ہے۔ یہاں تو آج تک اس کا
موقع ہی نہیں ملا۔ اشاعتی اداروں اور اکاڈمیوں کے اصرار کے باوجود اپنی
نظم و نثر پر نظر ثانی اور ترتیب کے لئے وقت نہیں نکال سکا ہوں یہ سب کچھ
بکھرا ہوا ہے۔ کاغذوں پر یا رسائل میں۔ اب تک جتنا لکھا پڑھا ہے اس سے
بھی زیادہ لکھنے پڑھنے اور تخلیقی کام کرنے کی زبردست تمنا ہے۔ مگر یہ
کسی طرح پوری ہوتی نظر نہیں آ رہی ہے۔ سب سے زیادہ گھٹن اسی بات
کی ہے۔ والد مرحوم علامہ سیماب کے سلسلے میں بھی بہت کام کرنے ہیں اور
دوسروں سے کرانے ہیں۔ سیماب اکاڈمی تو قائم ہو گئی۔ وہ شمارہ آپ کی
نظر سے گذرا ہو گا جس میں آپ کے بھائی صاحب جناب پرواز اصلاحی کا بھی
مضمون تھا۔ اور اکاڈمی کی روداد وغیرہ تھی۔

شاعر۔ بمبئی

دیکھئے قوتِ ارادی کہاں تک ساتھ دیتی ہے اور کب تک اعصاب کام دیتے ہیں آپ بھی مایوس اور پریشان نہ ہوں۔ انشاء اللہ اچھے ہو جائیں گے۔ اتنا تفصیلی خط محض آپ کی تسکینِ خاطر کے لئے لکھ رہا ہوں۔

جب تک رخصت پر ہیں اور گھر میں آرام کر رہے ہیں جس حد تک بھی ہو سکے اپنے ذخیرۂ نظم و نثر کو اشاعت کے قابل بنا لیجئے۔ جاں نثار اختر مرحوم پر مضمون کی پسندیدگی اور اکیڈمی کے ایوارڈ پر مبارکباد کا شکریہ۔ میں نے اپنے بچھڑنے والے دوستوں پر جب بھی کچھ لکھا ہے بتا نہیں سکتا کہ مجھے کس عالم سے گزرنا پڑا ہے۔ میری ایسی تحریروں سے عام طور پر ادبی حلقے ہمیشہ متاثر ہوئے ہیں۔ جاں نثار اختر والی تحریر کے اثرات کچھ زیادہ ہی ہوئے ہیں۔ زیرِ طبع شمارہ کے مکتوبات سے اندازہ لگا لیجئے گا۔

نہ آپ نے پتے کی تبدیلی کے لئے کبھی لکھا اور نہ کسی دوسرے نے۔ شاعر پرانے پتے ہی پر جاتا رہا۔ معلوم نہیں "شاعر" کے کون سے شمارے آپ کو نہیں پہنچے۔ اب پتا تبدیل کرا دیا ہے۔

کبھی کبھی مجھے اور "شاعر" کو یاد کر لیا کیجئے۔

آپ کی صحت و سلامتی کی دعاؤں کے ساتھ۔ آپ کا

اعجاز صدیقی

خلیل الرحمٰن اعظمی کا جواب اعجاز صدیقی کے نام

اردو باغ، سر سید نگر، علی گڑھ

۲۴ر نومبر ۱۹۷۶ء

محبِ گرامی، سلام مسنون

آپ کا بہت مفصّل خط ملا۔ جس شفقت اور محبت سے آپ نے میرے معاملات میں دلچسپی لی ہے اور جو مشورے دیئے ہیں ان کے لئے بےحد ممنون ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ آپ جیسے بزرگوں سے بڑی تقویت رہتی ہے۔ آپ نے اپنی بیماریوں کی تفصیل لکھی، تو میں اپنی بیماری بھول گیا۔ آپ کی ہمت اور حوصلے کی داد دیتا ہوں کہ اتنی تکلیفیں برداشت کر رہے ہیں اور "شاعر" بھی نکالے چلے جا رہے ہیں۔

میں نے اپنی بیماری کے سلسلے میں بھی یونانی اور ہومیوپیتھی علاج کئے لیکن یہ بات صحیح ہے کہ معاملہ صرف جگر کا ہی نہیں ہے اور بھی کئی پیچیدگیاں ہیں۔ تلّی بھی بڑھی رہتی ہے۔ گردے میں بھی کچھ خرابی ہے جس کی وجہ سے پیشاب میں جلن ہو جاتی ہے اور اس زمانے میں رات کو کمر میں درد بھی رہتا ہے۔ گزشتہ سال تو میرا بھی پیشاب بند ہو گیا تھا اور تقریباً ڈیڑھ دن تک بند رہا جس کی وجہ سے بےحد تکلیف ہو گئی تھی۔ اب اتنی تکلیف تو نہیں ہوتی لیکن بعض اوقات پیشاب میں تھوڑی سی جلن ہو جاتی ہے۔ بہر حال ڈاکٹری علاج سے مجھے کافی فائدہ ہوا ہے۔ بھوپال کے مشہور ڈاکٹر انصار صاحب نے بھی مجھے دیکھا ہے اور ان کا مشورہ بھی شامل ہے۔ حالیہ رپورٹ کے مطابق جگر کا فعل اب نارمل ہو چکا ہے۔ تلّی بھی کم ہوئی ہے اب خون بھی بننے لگا ہے ڈاکٹر خاصے مطمئن نظر آتے ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ آرام اور غذا کا خاص طور پر خیال رکھوں تو بہت جلد صحت یاب ہو جاؤں گا۔ بہر حال آپ لوگوں کی دعاؤں کی ضرورت ہے۔

نظم "مٹی کا گیت" میں جن مصرعوں کی آپ نے نشاندہی کی ہے ان میں بحر کے لچکدار ہونے کی وجہ سے مصرعے ادھر اُدھر ہو گئے ہیں۔ برتن والا مصرع تو میں نے اصلاً ویسا ہی لکھا تھا یعنی

"مٹی کا بازار لگا ہے کورے کورے برتن"

پھر نہ جانے کیوں صاف کرتے ہوئے اس میں غیر شعوری طور پر "ہیں" کا اضافہ ہو گیا۔ بقیہ دو مصرعوں میں آپ نے جو اصلاحیں کی ہیں وہ بجا ہیں۔ آپ ان کو درست کر دیں میں اس طرح کی ترمیم و اصلاح کا برا نہیں مانتا۔ آپ کو تو میں بزرگ اور استاد سمجھتا ہوں مجھ سے کم عمر دوست اور ساتھی بھی شبہ ظاہر کرتے ہیں تو میں درست کر لیتا ہوں۔ ویسے بھی مجھے نظم یا غزل لکھنے کے بعد اطمینان نہیں ہوتا۔ انہیں چھپنے کے لئے دیر سے بھیجنے کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ یہ نظم میں نے بطور خاص شاعر کے لئے ہی بھیجی ہے اور کہیں بھیجنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ دوسری چیزیں بھی دیکھ بھال کر آپ کی نذر کروں گا۔

شاعر کا وہ شمارہ جس میں سیماب اکیڈمی کی بابت لکھا گیا ہے اور بھائی صاحب کی تصویر ہے مجھے نہیں ملا۔ غالباً ڈاک میں کھو گیا اگر ممکن ہو تو نئے پتے پر دوبارہ بھجوا دیں۔

سرور صاحب ابھی شملہ میں ہیں۔ غالباً نومبر کے آخر تک علیگڈھ واپس آ جائیں گے۔ انہیں جموں یونیورسٹی نے پروفیسر شپ آفر کی ہے غالباً دسمبر میں وہاں چلے جائیں گے۔

مہاراشٹر کی نصابی کتابوں میں نئے ادیبوں اور شاعروں کی شمولیت واقعی بڑا اہم کارنامہ ہے میری بھی ایک نظم اور ایک غزل شامل ہے کتابیں میرے پاس آئی ہیں۔ انتخاب اور پیشکش دونوں قابلِ تقلید ہیں اللہ تعالیٰ آپ کو جلد از جلد صحت یاب کر دے اپنا مجموعہ کلام کسی

طرح مرتب کر ڈالئے اس کا بہت انتظار ہے۔

آپ کا مخلص خلیل الرحمٰن اعظمی

رشید احمد صدیقی کے خطوط خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام

۴ر جولائی ۱۹۶۷ء

اعظمی صاحب مکرم تسلیم

آپ کے کرم کا بہت بہت شکریہ ، مرسلہ تینوں کتابیں واپس کرتا ہوں۔ کام چل گیا ان میں حصہ مہرا زوز... بے ضرورت تھی اس کا شکر گزار ہوں۔ ازراہ اخلاص آپ نے اس کو احتیاطاً بھیجا۔ باد و باراں کا جو عالم ہے امید ہے کہ اس کے مطابق آپ سب اس سے لطف اندوز ہوتے ہوں گے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے میگھ دوت پورب ہی اٹھا لائے ہوں۔

مخلص رشید احمد صدیقی

۲۹ر ستمبر

خلیل صاحب مکرم! آداب

حسب ذیل مضمون کے جن شعرا نے جو مصرعہ یا شعر کہا ہو اسے لکھ بھیجیں

۱ کچھ سی زبان دکنی

۲ اردو زبان کو ہمیں جانتے ہیں داغ

۳ میر نے کہا ہے

۴ غالب ۔ ریختہ کو رشک فارسی

۵ انیس نے کہا زمین سخن کو آسمان بنا دیا

حال کے کسی معتبر شاعر نے کچھ کہا ہو تو وہ بھی لکھ بھیجیں

سرسید کی تصانیف کی فہرست زیدی صاحب کے زمانے میں یونیورسٹی لائبریری سے شائع ہوئی تھی آپ کے پاس ہو تو تھوڑی دیر کے لئے عنایت فرمایئے۔ ورنہ حیات جاوید ہی مل جائے گی وہ بھیج دیں۔ دیکھ لوں گا۔

مخلص رشید احمد صدیقی

علیگڈھ ۸ر اگست ۱۹۶۵ء

اعظمی صاحب مکرم یہ خط ملاحظہ فرمائے۔ اس میں جو COMPLEMETS پیش کئے گئے ہیں وہ تو میں نے حاصل کر لئے۔ اس کی ذمہ داری آپ قبول کیجیئے!

شاعر۔ بمبئی

ان کو لکھ دیا ہے کہ آپ سے عرض معروض کریں۔ میں خود اس طرح کے کاموں سے مستکش ہو چکا ہوں۔ اس غریب کے لئے کچھ کر دیجئے تعجب اور افسوس اس کا ہے کہ سندھ یونیورسٹی کے صدر شعبہ صرف مقالے کا عنوان تجویز کر کے امیدوار کو دوسروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں گے ______ آخر وہ خود کس مرض کی دوا ہیں؟

بہر حال آپ اپنا میرا اور علی گڈھ سب کا خیال کر کے ان صاحب کو ایک ہدایت نامہ لکھ کر بھیج دیجئے سب کی طرف سے میں آپ کا شکر گزار رہوں گا۔

مخلص رشید احمد صدیقی۔

۳ر جنوری ۱۹۶۳ء

خلیل صاحب کرم تسلیم

شہریار صاحب سے دریافت فرما کر مطلع کیجئے گا کہ میرا مضمون (دہلی) میگزین میں کب تک شائع ہو سکے گا۔ مجھے اس کی فکر نہیں ہے کہ کب شائع ہو سکے گا مشکل یہ آن پڑی ہے کہ ایک رسالے کے ایڈیٹر صاحب بہت مصر ہیں کہ وہ مضمون شائع ہونے کے لئے ان کو دیدوں۔ ایسا تو نہیں کہ اشاعت کے مقدم یا موخر ہو جانے سے یونیورسٹی میگزین گھاٹے میں رہے؟ یہ ایڈیٹر صاحب لاہور کے ہیں اور خیال یہی ہے کہ شاید وہ میگزین وہ نومبر سے پہلے چھاپ دیں۔ شہریار صاحب کو یہ صورت حال بتا دیجئے۔ کروں گا وہی جو وہ چاہیں گے

مخلص رشید احمد صدیقی

نیاز فتحپوری کے خطوط خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام

لکھنؤ ۲۵ر نومبر

مکرمی تسلیم!

آپ جب لکھنؤ تشریف لائے تھے تو آپ نے کہا تھا کہ آپ کا مقالہ حسرت پر نصف تیار ہو چکا ہے اور آپ جلد پورا کر کے اسے بھیج دیں گے۔ میں نے آپ کو یاد دہانی بھی کی لیکن اس وقت تک نہ مقالہ پہونچا نہ آپ نے کوئی جواب دیا آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ میں نے آپ کے نام کا اعلان کر دیا ہے اور مجھے سخت تکلیف ہو گی اگر آپ کا مقالہ شائع نہ کر سکا۔ جواب کا منتظر ہوں۔

مخلص نیاز

لکھنو ۲۶ر اکتوبر

عزیزی! آئندہ سالنامہ نگار اقبال نمبر ہوگا

آپ اس کے رنگ تغزل پر ایک مقالہ لکھ کر ۱۵ر نومبر تک مجھے بھیج دیجئے فلسفہ ولسفہ درکار نہیں یہ میری درخواست نہیں بلکہ حکم ہے۔

دعاگو — نیاز

لکھنؤ ۲۰ جون

مکرمی تسلیم! مقالہ کا شکریہ میں نے فاروقی صاحب کا مضمون اس لئے شائع کیا تھا کہ کوئی اس کا جواب لکھے سو آپ نے ترقی پسند ادیبوں کی طرف سے بطور فرض کفایہ اس پر توجہ کر کے اس فریضہ کو ادا کر دیا۔ یہ مقالہ اگست میں شائع ہوگا۔ کیونکہ جولائی کا نگار تقریباً تیار ہے۔

مخلص
نیاز

خلیل الرحمٰن اعظمی کے خطوط سہیل عظیم آبادی کے نام

سہیل بھائی! کتنے دنوں سے آپ کا کوئی خط نہیں آیا یقین تو نہیں آتا کہ آپ بھول گئے ہوں۔ ہاں اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ آجکل کوئی زبردست مشغولیت ہے۔ خدا کرے یہ مشغولیت ہم لوگوں کو کچھ دے سکے میرا مطلب تخلیقی کام سے ہے۔ آپ کے ناتمام ناول، آپ بیتی، سفرنامے، شخصی مطالعے، کہانیاں اور ساری ادھوری چیزوں کو اب مکمل ہو جانا چاہئے خاص طور پر ایسی فضا میں کہ جب آپ کو سکون بھی حاصل ہے اور رہنے کی جگہ بھی وہ ہے جسے ہندوستان کا سوئٹزرلینڈ کہتے ہیں۔ سہیل بھائی آپ کے جو تجربات ہیں ان کا آدھا بھی میرے حصے میں آیا ہوتا تو میں ٹالسٹائی بن کر لوگوں کو دکھا دیتا۔ نیلی دھرتی، معلوم نہیں اب کس منزل میں ہے؟ لکھئے۔

ادھر عرصے سے میں نے بھی آپ کو خط نہیں لکھا تھا۔ بات یہ ہے کہ میں قریب دو مہینے سے سخت بیمار تھا۔ یرقان کا سلسلہ ایسا تھا کہ ختم ہی نہیں ہوتا تھا خدا خدا کر کے اب نجات مل گئی ہے لیکن کمزوری بے حد ہے اس دوران میں آپ کی یاد برابر آتی رہی۔ کئی بار تو میں زندگی سے مایوس ہوگیا تھا لیکن جینے کی ہوس پہلے بھی تھی اور اب بھی ہے۔ نہ جانے کیوں ابھی مرنے کے خیال سے دل کانپ جاتا ہے۔ حالانکہ زندگی کے حالات کچھ اس قسم کے ہیں کہ مرنے کی تمنا کرنا ہی زیادہ مناسب ہے لیکن سہیل بھائی نہ جانے کیوں مجھ سے یہ نہیں ہوتا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میں نے اپنے دوستوں سے عزیزوں سے اور دنیا کے اچھے لوگوں سے جی بھر کر محبت نہیں کی ہے۔ محبت اور پیار کی خواہش مجھے جینے کے لئے مجبور کرتی ہے۔

کشمیر میں آپ نے جس لڑکی سے میری قسمت کا ستارہ وابستہ کرنے کی کوشش کی تھی معلوم ہوتا ہے کہ ادھر سے کچھ زیادہ گرمجوشی نہیں ہے اس لئے کہ پھر اس کے بعد نہ تو اس کا ذکر چلا اور نہ آپ نے اس کی تصویر بھیجی۔ بھائی کم از کم تمناؤں کا کھلونا تو میرے ہاتھ میں رہنے دیجئے۔ گرمیوں میں اگر کشمیر آنے کا پروگرام بنا تو پھر اس مسئلے پر اور زیادہ سنجیدگی سے غور کیا جائے گا۔ میں تو اس معاملے میں سنجیدہ

شاعر، بمبئی

ہوں لیکن میرے حالات میرے پاؤں میں زنجیر باندھ دیتے ہیں۔ میری عارضی ملازمت میرے لئے سوہان روح ہے۔ آجکل کی اسسٹنٹ لیڈرشپ کی درخواست دی تھی اس کا بھی کچھ پتہ نہ چل سکا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ کشمیر میں میرے لئے کوئی موقع نکالنے کی کوشش کریں۔ وہاں کے کسی کالج میں لکچررشپ یا کسی اور محکمہ میں ایک اوسط درجے کی ملازمت بھی مل جائے تو میں وہاں رہنا پسند کروں گا۔ آپ کو اس لئے لکھ رہا ہوں کہ کسی اور سے اس قسم کی باتیں نہیں کہہ سکتا اور نہ کوئی اور اپنے احباب کے لئے اتنی دوڑ دھوپ کر سکتا ہے جتنی کہ آپ کر سکتے ہیں۔ میں آپ کے مزاج کی اس خصوصیت سے واقف ہوں۔

۵ ر دسمبر کو مجاز بے چارہ ہم لوگوں سے ہمیشہ کے لئے رخصت ہوگیا۔ اس حادثے کا ہم لوگوں پر جو اثر ہوا اس کا اظہار ناممکن ہے۔ کئی دن تک میں اس اطلاع کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہیں تھا۔ علی گڈھ اور لکھنؤ میں ماتمی جلسے ہوئے اور لوگوں نے تقریریں کیں۔ اب سنا ہے کہ ان کی یادگار قائم کرنے کی تجویزیں پاس ہو رہی ہیں۔ ان پر ہنسی آتی ہے۔ شاعر اور ادیب جب زندہ ہوتا ہے تو اس سے لوگ نظریں بچاتے ہیں جب مر جاتا ہے تو اس پر رسالوں کے نمبر نکالے جاتے ہیں اور لوگ مضامین اور نظمیں لکھتے ہیں۔ ابھی پچھلے سال جب مجاز یہاں آئے تھے تو مجھ سے کہنے لگے کہ خلیل! اب میں آوارہ گردی کی زندگی سے اکتا گیا ہوں اب تو یہی جی چاہتا ہے کہ سو ڈیڑھ سو روپئے کی کہیں ملازمت مل جائے اور نارمل زندگی گزار دوں۔ نارمل زندگی گزارنے کے لئے ترس گیا ہوں۔ لیکن بہت کوشش کے بعد نارمل زندگی کے لئے یہاں کے بڑے بڑے لوگ اس کو موقع نہ دے سکے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین، قاضی عبدالغفار، رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور سب سے کہا گیا کہ انجمن ترقی اردو یا یونیورسٹی لائبریری وغیرہ کہیں کھپا دیں لیکن کسی کے کان پر جوں تک نہ رینگی۔ لیکن اب یہی لوگ اس کی موت پر تقریریں کرتے ہیں۔ زمانہ بھی کس قدر ستم ظریف ہے۔

کنور صاحب آپ کو بہت یاد کرتے ہیں برابر پوچھتے رہتے ہیں کہ سہیل بھائی کا خط آیا کہ نہیں میں کہہ دیتا ہوں بھائی وہ بڑے من کے موجی ہیں خاموش ہیں تو یوں خاموش ہیں۔ خط لکھنے پر آئیں گے تو پھر بھرمار شروع کر دیں گے۔ چوپال کو بند کر دینا پڑا کیونکہ بقول آپ کے اس میں اچھا خاصا صرفہ تھا اور مفت پڑھنے والوں کی تعداد زیادہ تھی۔

کمال کا کیا حال ہے ان سے میرا سلام کہئے۔ اپنی خیریت سے جلد مطلع کیجئے آپ کی تحریر کے لئے ترس گیا ہوں۔

ہمیشہ آپ کا
خلیل

کنور لاج۔ امیر نشان علی گڈھ۔ ۲۷ ر دسمبر ۵۵ء

بسم اللہ محل،
میرس روڈ ۔ علی گڑھ
۴ر دسمبر ۱۹۵۶ء

بھائی جان!

آپ کا تفصیلی خط ملا۔ میرے لئے یہ ایک قیمتی تحفہ تھا کیونکہ اس میں آپ نے اپنے بارے میں کئی باتیں صاف صاف لکھی تھیں۔ ناکوں کے بارے میں آپ نے جو اسکیم بنائی ہے اس سے میں اور قیوم صاحب دونوں بہت خوش ہوئے۔ کاش یہ کام آپ کر ڈالیں۔ آپ چاہیں تو بغیر کسی کاوش کے قلم برداشتہ یہ چیزیں لکھ سکتے ہیں۔

ذرا آپ دہلی آجائیں تو بہت سے منصوبوں کے بارے میں سوچا جائے۔ میں خود آپ پر ایک کتاب لکھنے کے لئے عرصے سے دل میں ایک خیال پال رہا ہوں جس کا اظہار ابھی تک آپ سے نہیں کیا تھا کہ پھر آپ "خاکساری" پر اتر آئیں گے اور مجھے لکھ ڈالنے لگیں گے لیکن سچی بات یہ ہے کہ میں ایمانداری سے سوچ رہا ہوں کہ آپ کی زندگی اور مختلف شعبوں میں آپ کی سرگرمیوں سے متعلق اور پھر آپ کا نظریۂ فن اور افسانوی ادب کا جائزہ ان تمام باتوں سے متعلق سلیقے سے ایک کتاب لکھ ڈالوں لیکن یہ کام اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ آپ پورا پورا تعاون کریں۔ آپ کے حالات زندگی پر کبھی سر جوڑ کر باتیں کر دوں گا اور نوٹس لوں گا۔ پھر آپ کی تحریروں کا ایک ایک سطر اکٹھا کرنی ہے چاہے اس میں اخبارات کے اڈیٹوریل اور رسالوں کی ترتیب ہی کیوں نہ ہو آپ کے رسالے "ہندوستانی" اور "تہذیب" کی مکمل فائلیں بھی مہیا کرنی ہوں گی۔ افسانوی مجموعوں کے بعد رسالوں میں جتنی چیزیں چھپی ہیں ان کی کٹنگ بھی یکجا ہو جائے۔ آدی باسیوں میں اردو کی تحریک کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ کیا ہے اس کی رپورٹ اور اس کے متعلق اگر لٹریچر ہو تو وہ بھی جمع کیا جائے۔ آپ نے احباب کی خاطر جو ریڈریں شائع کی ہیں وہ سب بھی میرے پاس ہونی چاہئیں۔ بہرحال بات آپ کے کانوں میں اس لئے ڈال رہا ہوں کہ آپ اس نقطۂ نظر سے کچھ نہ کچھ چیزیں اکٹھی کرتے رہیں

"فکر و فن" میں نے آپ کے پاس رجسٹری کے ذریعہ بھیجی ہے آتش والی کتاب جنوری میں چھپ جائے گی۔ اس کی کتابت و طباعت انجمن ترقی اردو کے زیر اہتمام ہو رہی ہے۔

کنور صاحب آپ کو عنقریب خط لکھنے کے لئے سوچ رہے ہیں۔ دیکھئے یہ رسم کب شروع ہوتی ہے۔ علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر (چیف ایڈیٹر) قمر رئیس شاہ جہاں پوری صاحب۔ آپ کو لکھا ہوگا۔ یہ وہی صاحب ہیں جو پریم چند پر کام کر رہے ہیں۔ آپ فوراً کچھ بھیج دیجئے کیونکہ کتابت شروع ہو گئی ہے۔

آپ کی نئی کہانیوں کا بڑا انتظار ہے۔

قیوم صاحب اپنے مطلوبہ تحفے کے لئے پیشگی شکریہ ادا کرتے ہیں آجکل شام کو خوب بیٹھک رہتی ہے اور دنیا بھر کے مسائل چھڑتے ہیں روز دعا کرتا ہوں کہ آپ جلد سے جلد دہلی آجائیں۔ دہلی آجائیں گے تو پھر آپ کو گھیر گھار کر زبردستی کچھ نہ کچھ کام لیا جائے گا۔

آپ کا
خلیل

بسم اللہ محل ۔ میرس روڈ ۔ علی گڑھ
۲۹ر مارچ ۱۹۵۷ء

سہیل بھائی! آپ کا خط کئی دن پہلے ملا تھا۔ پچھلے ہفتے علی گڑھ ہسٹری آف اردو لٹریچر، کی کانفرنس ہو رہی تھی جس میں ہندوستان کے تقریباً تمام تحقیقی و تنقیدی کام کرنے والے شریک ہوئے۔ قاضی عبدالودود، مالک رام، نجیب اشرف ندوی، مجنوں گورکھپوری، ڈاکٹر عابد حسین، اختر اورینوی، رام بابو سکسینہ، ڈاکٹر زور، عبدالقادر سروری، ڈاکٹر اعجاز حسین سب موجود تھے۔ اردو زبان کی مستند تاریخ پانچ جلدوں میں تیار کی جائے گی اور اسے ہندوستان کے سارے ادیب مل کر لکھیں گے یعنی جس عہد یا جس مصنف پر کسی شخص نے خصوصی مطالعہ کیا ہے وہ اس باب کو لکھے گا۔ تہذیبی و سماجی پس منظر کے لئے ڈاکٹر اشرف، ڈاکٹر یوسف حسین پروفیسر مجیب اور ڈاکٹر عابد حسین وغیرہ کام کریں گے۔ غرض یہ کہ یہ کام تکمیل کو پہنچ گیا تو بہت بڑا کام ہوگا۔ روپیہ گورنمنٹ آف انڈیا نے دیدیا ہے۔ خیال ہے کہ دو سال میں پوری تاریخ چھپ کر تیار ہو جائے گی۔

آپ میری شادی کے معاملے میں ابھی تک سست رفتاری سے کام لے رہے ہیں۔ دیکھئے ان گرمیوں میں میرا معاملہ کہیں نہ کہیں انجام کو پہنچا دینا ہے۔ آپ لکھنو خط لکھ کر جلد سب باتیں طے کر لیجئے اور اگر آپ کہیں اور چاہتے ہیں تو اس کے بارے میں بھی معاملات ختم کر دیجئے۔ میں اس زندگی سے بہت گھبرا گیا ہوں۔

کنور صاحب وسط اپریل میں شاید ایک ماہ کے لئے اپنے عزیزوں سے ملنے کے لئے بلرام پور جائیں گے۔ میری شادی مئی کے آخر میں ہو جانی چاہئے یا جون کے شروع میں۔ ریڈیو کشمیر کا مشاعرہ بھی اگر آپ اسی زمانے میں کریں تو بہتر ہے۔ چھٹیوں میں سب لوگ آسانی سے آسکتے ہیں ورنہ جولائی میں یونیورسٹی کھلنے کے فوراً بعد کسی لمبی چھٹی کا ملنا مشکل ہے۔ علی گڑھ کے نوخیز شعرا میں آپ امین

اشرف کو ملائیں تو زیادہ اچھا ہے کیونکہ امین اشرف ہی اس وقت یہاں سب سے اچھی غزلیں کہتے ہیں دوسرے یہ کہ پڑھتے بھی بہت اچھا ہیں۔

ہمارا اسکول کے ادب پر آپ کی ریڈیو تقریر قومی آواز میں پڑھی آپ نے اچھا خاصا مواد جمع کر دیا ہے۔ اس مضمون کو ذرا اور پھیلا دیجئے تو اچھا ہے۔

دلّی اسکے سلسلے میں آپ کی کوششیں کہاں تک پہنچیں۔ علی جواد زیدی صاحب کا ایک خط دلی سے آیا تھا۔ جواب ذرا دیر سے دیا ہے کہیں وہ سرینگر تو نہیں پہنچ گئے ہیں۔ اگر پہنچ گئے ہوں تو ان سے کہہ دیجئے کہ ان کے مضامین کو نقل کرانے کا میں انتظام کر رہا ہوں۔ اطمینان رکھیں۔

کنور صاحب کی طبیعت ادھر خراب ہو گئی ہے۔ گلے میں تکلیف ہے اور کچھ ہاضمے کی بھی شکایت ہے۔ علاج یونانی ہو رہا ہے اور تھوڑا بہت افاقہ بھی ہے۔

قیوم صاحب امتحان کی تیاری میں مصروف ہیں۔ ۵ر اپریل سے ان کے امتحانات شروع ہو جائیں گے

آپ کا خلیل الرحمن اعظمی

ل قیوم خاور

آنند بھون، سول لائنس۔ علی گڑھ

۱۹ر نومبر ۱۹۵۷ء

بھائی جان! ہم لوگ اتوار کی شب میں ۳ بجے جہاں آباد سے واپس آ گئے۔ اب کی بار یہ سفر بہت خوشگوار رہا کیونکہ ابا جان، امی اور سب بھائی بہنوں سے ملنے کا صحیح معنوں میں اسی بار موقع ملا۔ مجھے بہت خوشی ہے کہ نہ صرف مجھے راشدہ ایسی بیوی ملی ہے جو میری زندگی کو سنوار دے گی بلکہ یہ پورا خاندان شرافت اور محبت کا ایسا نمونہ ہے جس کی اس دور میں مثال نہیں مل سکتی۔ سچ تو یہ ہے کہ جہاں آباد کی مٹی میں مجھے وہ سکون ملا ہے جو مجھے اپنے وطن کی مٹی نہ دے سکی تھی اور عمر بھر کے پیاسے انسان کو ایک ایسا سرچشمہ مل گیا ہے جہاں ماں باپ اور بھائی بہن کا خلوص اپنے رسمی نہیں بلکہ اصلی معنوں میں موجود ہے۔ راشدہ آپ کو بہت یاد کرتی ہے اور ہم لوگ ہر وقت سہیل بھیا کی باتیں کر کے خوش ہوتے ہیں۔ ہم لوگوں کو امید ہے کہ آپ کی شفقت سے ہم لوگ ہمیشہ زندگی کے سفر میں توانائی اور مسرت محسوس کریں گے۔ راشدہ میرے مزاج سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے۔ کوئی اعلیٰ تعلیم یافتہ عورت میرے لئے اتنی باعث راحت نہ ہو سکتی تھی اور میں سمجھتا ہوں پہلی شادی کا منسوخ ہوتا اور اس نئے رشتے کی بنیاد میں خدا کی ...

کہ زبردست مصلحت کارفرما تھی۔ بعض ناکامیاں ایک بہتر کامیابی کا پیش خیمہ ہوتی ہیں۔

آپ ابا جان کو جہاں آباد برابر خط لکھتے رہا کریں۔ ان کی شرافت اور انسانیت مزاج کا تحمل اور سنجیدگی نے مجھے بہت متاثر کیا ہے۔ لطیف میاں کو ضرور علی گڑھ بھیجئے۔ ہم لوگوں کو بہت خوشی ہو گی۔ بھائی جان جب دلی جائیں گی تو میں اور راشدہ دو دنوں کچھ دنوں کے لئے آپ کے پاس آئیں گے راشدہ آداب کہتی ہے اور کنور صاحب سلام عرض کرتے ہیں۔

آپ کا اپنا خلیل

آنند بھون، سول لائنس علی گڑھ

بھائی جان! آپ بڑا ستم کرتے ہیں۔ دعویٰ تو کرتے ہیں کہ بڑے بھائی ہیں لیکن آپ نے اب تک مجھے نہ پہچانا۔ میں طبعاً کاہل آدمی ہوں کسی کو جی لگا کر خط لکھنے کے لئے سوچتا ہوں تو ہفتے لگ جاتے ہیں۔ جن سے نئی نئی ملاقات ہوتی ہے اور ابھی بے تکلفی نہیں ہوتی اس کے خطوں کا جواب دفعۃً سے بطور فریضہ کے دیتا ہوں۔ بے تکلف دوست اور عزیز ترین لوگوں کے ساتھ یہ رویہ نہیں ہوتا۔ آپ سے جتنا ہی قریب ہوتا گیا میں نے اپنی کاہلی پر عمل ہونا شروع کیا لیکن اسے آپ میری بے التفاتی اور تبدیلی سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں کارڈ لکھنے کا زیادہ عادی نہیں ہوں خاص طور پر احباب کو لیکن آپ نے آج ایسی ڈانٹ پلائی کہ لفافے کی عدم موجودگی میں فوراً کارڈ ہی لکھنے بیٹھ گیا۔ آپ کو خط لکھنے میں کوئی دقت نہیں ہوتی کیونکہ آپ صبح چار بجے اٹھ جاتے ہیں میں دیر تک بستر پر پڑا رہنے والا آدمی۔ اٹھ کر یونیورسٹی بھاگنے کی فکر رہتی ہے ڈھائی بجے واپس آتا ہوں اور کھانے کے بعد پھر لیٹنے کو جی چاہتا ہے۔ شام کو بیٹھک بازوں سے نجات نہیں ملتی۔ یہ علی گڑھ کا عام ڈھرا ہے ایسے میں اگر میں خطوں کی طرف سے لاپرواہی برتوں تو اس کا کچھ اور مطلب نہ نکالا کیجئے۔

کنور پرسوں پاکستان کے لئے روانہ ہو گئے۔ اپنے بڑے بھائی کو دیکھنے گئے ہیں۔ پندرہ روز بعد واپس آئیں گے۔ رشیدہ نے آپ کو علیحدہ خط لکھا ہے۔

خلیل

آنند بھون، سول لائنس، علی گڑھ

۲۹ر دسمبر ۱۹۵۸ء

سہیل بھائی! آپ کا خط ملا تھا۔ ادھر کچھ ادھر ادھر کی بے معنی مصروفیات کا شکار رہا اس لئے آپ کو خط لکھنے کا سلسلہ ملتوی رہا۔ آپ نے

شاذ[1] کے بارے میں جو رائے قائم کی ہے وہ ..... کی اختراع ہے شاذ معقول آدمی ہے اس کے بارے میں ایسی رائیں ہرگز قبول نہ کیجئے دوسرے یہ کہ وہ بے حد حساس ہے آپ جیسے بزرگ جب ان مسائل کو چھیڑیں گے تو اس کا دل دکھے گا۔ اس نے اپنے خط میں بڑی زیادتی کی ہے۔

آپ اپنا ناول مکمل کرنے کے لئے چھٹی لینے والے ہیں یہ خبر دل خوش کرنے والی ہے لیکن اس پر یقین نہیں آتا۔ اب تو میں آپ کی طرف سے مایوس ہو چلا ہوں نہ جانے آپ نے کیا سوچ رکھا ہے۔ ادب غالباً آپ کی زندگی میں اب ثانوی حیثیت اختیار کر چکا ہے۔

علی گڑھ آنے کا بس مژدہ ہی سناتے رہتے ہیں۔ اس معاملے میں بھی آپ نرے افسانہ نگار ہی ہیں اور وہ بھی رومانوی حالانکہ میں آپ کو حقیقت نگاری کے اولین پرستاروں میں سمجھتا تھا۔

شفیق میاں اور سہیل میاں کا کیا حال ہے۔ دونوں کو دعا سلام، بھابی جان کو تسلیمات، کنور اور رشی آداب کہتے ہیں۔ ۸ رجنوری سے یہاں اردو ہفتہ منایا جا رہا ہے جس میں پچھلے دس سال کے ادب کا جائزہ لیا جائے گا۔ جی چاہے تو آپ اس موقع پر آجائیں۔

غلیل

خلیل الرحمٰن اعظمی کے خطوط مظہر امام کے نام

آنند بھون سول لائنس، علی گڑھ

۳۰ رمئی ۶۰ء

بھائی مظہر امام صاحب! آپ کا خط مل گیا تھا۔ میں ادھر امتحانات کی کاپیوں میں الجھا ہوا تھا اس لئے جواب میں تاخیر ہوئی۔ امجد نجمی صاحب کے کلام پر اپنی اور سرور صاحب کی رائیں بھیج رہا ہوں۔ پورا مجموعہ سامنے ہوتا تو شاید رائے میں اور بھی تیقن ہوتا پھر بھی "نمونہ کلام" اور آپ کی گفتگو سے جو اندازہ لگایا ہے اسے اختصار سے لکھ دیا ہے۔ اختصار سے اس لئے کہ یہ رائے فلیپ کے لئے ہے۔ بہرحال امجد صاحب کے مجموعے کا انتظار رہے گا۔

"آثار" میں جو خط شائع ہوا ہے اس کے کاتب کوئی فرضی شخص ہیں۔ اس خط کو بھی اسی طرف سے سمجھئے لیکن اسے پڑھنے کے بعد بڑی ہنسی آئی۔ اس لئے کہ موصوف نے شاید "آثار" کا وہی ایک شمارہ دیکھا جس میں امین اشرف کا خط چھپا تھا اور انہیں اصل بحث کا بالکل پتہ نہیں انہیں شاید یہ دھوکہ رہا کہ شہزاد منظر اور مظہر امام دونوں نے مل کر شہریار[2] کی شاعری پر حملہ کیا ہے اور ان کی مدافعت میں علی گڑھ والوں نے "ادب اور بہاریت" کا چکر چلایا ہے۔ خیر مجھے اس خط پر کوئی افسوس نہیں۔ افسوس تھا تو "آثار" والوں کے اناڑی پن پر ہے۔ ادنیٰ تو ہر ایرے غیرے کا خط چھاپنا درست نہیں۔ صرف ادیبوں کے وہ خطوط شائع کرنے چاہئیں جن میں کوئی اہم ادبی مسئلے سے بحث ہو۔ دوسرے یہ کہ اگر مراسلہ نگار کسی غلط فہمی کا شکار ہے۔ یا دانستہ غلط فہمی پھیلا رہا ہے تو ادارے کو نوٹ دے دینا چاہئے کہ اصل واقعہ یہ ہے۔ اسی خط پر ادارے کو لکھنا چاہئے تھا کہ شہزاد منظر نے کیا لکھا تھا اور مراسلہ نگار اسے کیا سمجھ رہے ہیں اور بحث بہار والوں کی مرعوبیت کی تھی۔ شہریار کی شاعری یا ہنس راج رہبر کی افسانہ نگاری یا قمر رئیس کی ادبی حیثیت کی نہیں تھی اسی طرح بعض مرتبہ غزلوں اور نظموں میں کتابت کی فاش غلطیاں ہوتی ہیں۔ معلوم ہوتا ہے اس حصے کی جو صاحب کتابت دیکھتے ہیں ان میں موزونیت کی بے حد کمی ہے اب اگلے ہی شمارے میں کوئی صاحب اس غلطی کو مصنف سے منسوب کر کے یہ لکھیں کہ فلاں شعر کھٹکتا ہے یا فلاں شعر غلط ہے تو ادارے کو نوٹ دینا چاہئے کہ یہ غلطی ادارے کی ہے اس کی ذمہ داری مصنف پر نہیں بلکہ کاتب یا پروف دیکھنے والے پر عائد ہوتی ہے۔ خیر "آثار" والوں کو آپ ہی سمجھا سکتے ہوں تو سمجھا دیجئے۔ ان کو لکھنا اس لئے بے کار ہے کہ وہ میرا خط بھی شائع کر دیں گے اور کسی اور نے بالکل متضاد باتیں لکھیں تو بڑے خلوص کے ساتھ اسے بھی کتابت کے لئے دے دیں گے۔ ان سے یہ پوچھئے کہ ان کے دفتر میں کوئی ردی کی ٹوکری ہے یا نہیں اس لئے کہ میرا اندازہ یہی ہے کہ ان کے یہاں جو کچھ بھیجا جاتا ہے وہ اسے آنکھ بند کر کے شائع کر دیتے ہیں۔

آپ سے مختصر اور تشنہ ملاقات کا واقعی افسوس ہے آپ اتنی دور ہیں کہ اس کے مواقع بھی جلد میسر نہیں آسکتے بہرحال یار زندہ صحبت باقی۔

آج کل بیوی بچے جہاں آباد چلے گئے ہیں۔ میں جون کے پہلے ہفتے میں عید کرنے وہیں جاؤں گا اور آٹھ دس روز بعد واپس آجاؤں گا امجد صاحب اور دوسرے احباب کو میرا سلام کہیں، شہریار صاحب امین اشرف صاحب اور شہاب وغیرہ سلام عرض کرتے ہیں

آپ کا

خلیل الرحمٰن اعظمی

---

[1] شاذ تمکنت [2] سہیل صاحب کے چھوٹے صاحبزادے

شاعر بمبئی

۳۴۔ ذاکر باغ، علی گڑھ

۲۱ ستمبر ۱۹۷۳ء

محبی مظہر امام صاحب! سلام مسنون

آپ کا ۷ ستمبر کا لکھا ہوا خط مجھے کئی روز پہلے ملا تھا۔ میں ادھر ایک ماہ سے صاحب فراش ہوں۔ جگر کی بیماری کا سلسلہ تو اس وقت بھی چل رہا تھا جب آپ سے دہلی کے مشاعرے میں ملاقات ہوئی تھی مگر ۱۸ اگست سے بخار بھی آنا شروع ہوا اور معاملہ خاصا سنجیدہ ہو گیا۔ ڈاکٹروں نے یونیورسٹی سے طویل رخصت لینے اور باقاعدہ علاج کا مشورہ دیا اور یہ کہ اس اثنا میں مکمل آرام کروں۔ خدا کے فضل سے اب حالت بہت بہتر ہے اگرچہ کمزوری اب بھی باقی ہے۔ میری چھٹیاں ۵ اکتوبر تک ہیں۔

آپ لوگ جس محبت سے پٹنہ کی پروفیسر شپ کے لئے کہہ رہے ہیں اس سے میں بہت متاثر ہوا ہوں اگرچہ علی گڑھ میں بقول رشید احمد صدیقی ہم لوگ جڑ پکڑ چکے ہیں اور کسی نئی جگہ کے راس آنے کے امکانات بہت کم ہیں مگر پٹنہ بلکہ بہار کے لوگوں کے خلوص اور ان کی مہمان نوازی کا میں ہمیشہ سے قائل ہوں اس لئے کئی روز کے سوچ بچار کے بعد اپنے ذہن کو اس کے لئے آمادہ کر سکا ہوں کہ کم از کم درخواست تو دیدی جائے۔ تقرر کا ہونا نہ ہونا اللہ کی مرضی پر ہے۔

آپ لوگوں کی ہمدردیاں اور دعائیں میرے ساتھ ہیں۔ یہ سہارا میرے لئے کافی ہے۔ تقرر ہو جائے تو علی گڑھ سے دو سال کی رخصت لی جا سکتی ہے۔ دو سال میں وہاں کے ماحول کا اندازہ بھی ہو جائے گا۔

بہرحال آپ درخواست کا فارم بھیج دیں۔

قمر رئیس نے میری کتاب پر جو تبصرہ پٹنہ ریڈیو سے نشر کیا ہے اس کی ایک نقل بھجوا سکیں تو عنایت ہوگی۔

احباب اور پرسان حال کو میرا سلام پہنچا دیں قبلہ اختر اورینوی صاحب کی صحت سے متعلق لکھیں ہو سکے تو میرا سلام پہنچا دیں۔

آپ کا خلیل

اردو باغ، سر سید نگر، علی گڑھ

۔ اگست ۷۵ء

مکرمی مظہر امام! کیا بتاؤں، سخت شرمندہ ہوں کہ آپ کو دو تین ... خط لکھنے کی توفیق نہیں ہوئی۔ میری صحت پچھلے دو برس سے ایسی بگڑی ہے کہ لکھنے پڑھنے کا ہر سلسلہ ختم سا ہے۔ آپ کا مجموعہ ملا تھا، پڑھ ڈالا تھا، سوچا تھا اطمینان سے اظہار خیال کروں گا مگر یہ اطمینان آج تک نصیب نہ ہوا۔ "رشتہ گونگے سفر کا" آپ کی شاعری کا ارتقائی قدم ہے۔ افسوس ہے کہ مجموعہ اس وقت شائع ہوا جب ۱۹۶۰ء والی جدیدیت اپنے آخری نقطے پر پہنچ گئی ہے اور نئی سمتیں ابھی تک وجود میں نہیں آئی ہیں۔ اس "وقفے" میں شعری تخلیقات کی قدر و قیمت متعین کرنے میں دشواریاں ہو رہی ہیں۔

میں ماڈریشن کے سلسلے میں ۹ اگست کو گیا آ رہا ہوں۔ پٹنہ آنے کو دل چاہتا ہے مگر صحت اجازت نہیں دیتی کہ سفر در سفر کی ہمت کر سکوں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ آپ ۱۰ اگست کو ایک دن کے لئے پٹنہ سے گیا آ جائیں۔ اتوار کا دن ہے۔ آپ کو الگ سے چھٹی نہیں لینی پڑے گی۔ گیا کے احباب وہاب اشرفی اور کلام حیدری وغیرہ کے ساتھ آپ کی آمد میں تھوڑا "ادبی عیش" رہے گا۔

ڈاکٹر نرمدیشور پرشاد کی وفات کی خبر اندوہناک ہے۔ جب یہ خبر پڑھی ہے دل پر عجیب کیفیت طاری ہے۔ تفصیلات معلوم نہیں ہو سکیں۔ وہاں آ کر کچھ پتہ چلے گا۔

آپ کے نئے عہدے اور دہلی کے تبادلے کی خبر سنی تھی، پھر نہ جانے کیا ہوا کہ آپ نے ابھی تک جوائن نہیں کیا۔ کب تک ارادہ ہے میری مبارکباد قبول کیجئے۔ دہلی آئیں گے پھر اکثر ملاقاتیں رہیں گی۔ علی گڑھ بھی گھر آنگن ہو گا۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے

آپ کا خلیل الرحمٰن اعظمی

اردو باغ، سر سید نگر۔ علی گڑھ

۱۳ اکتوبر ۷۷ء

بھائی مظہر امام صاحب!

آپ کا خط ملا، مجھے بڑی شرمندگی ہے کہ یہاں آنے کے بعد آپ کو کوئی خط نہ لکھ سکا، حالانکہ ارادہ روز کرتا رہا۔ دراصل یہاں آنے کے بعد ملنے والوں کا سلسلہ شروع ہو گیا ہے۔ پہلے عیادت کرنے والے اسپتال میں آتے تھے، اب صحت کی مبارکباد دینے کے لئے لوگ گھر آنے لگے جس کا سلسلہ ابھی تک جاری ہے۔ خیر خدا کا شکر ہے کہ یہاں آنے کے بعد میری صحت پر کوئی برا اثر نہیں پڑا بلکہ مجموعی طور پر حالت بہتر ہے۔ یکم ستمبر سے یونیورسٹی

ونٹمنٹ کرلی تھی۔ کلاسیں برابر لے رہا ہوں اور شعبے کے سب کام نارمل طور پر کر رہا ہوں۔ اس درمیان میں دوبار دہلی کا سفر بھی کیا ایک جامعہ کی میٹنگ کے سلسلے میں اور ایک ریڈیو پروگرام کے سلسلے میں

آپ نے کتابوں کا جو بنڈل میرے حوالے کیا تھا اس کا عجیب قصہ ہوا۔ کتاب کا وہ پیکٹ جو میں نے اپنے ساتھ لایا تھا وہ تو میں نے قاسمی[1] کے سپرد کر دیا لیکن جو بنڈل شمیم احمد شمیم[2] کے ذریعہ بھیجا تھا وہ آج تک نہیں پہنچا۔ ۱۴ر اگست کو جب میں سرینگر سے دہلی پہنچا تو معلوم ہوا کہ شمیم آئے تھے۔ انہوں نے اطلاع دی کہ کتابوں کا بنڈل وہ یہاں لانے کے لئے اپنے ساتھ ایرپورٹ تک لائے تھے لیکن ان کی موٹر میں وہ بنڈل رہ گیا۔ اسے اپنے سامان کے ساتھ رکھنا بھول گئے۔ اب وعدہ کر گئے ہیں کہ اگست کے آخر میں وہ دوبارہ دہلی آئیں گے تو بنڈل لیتے آئیں گے لیکن وہ بنڈل ابھی تک دہلی نہیں پہنچا کیونکہ اس درمیان میں مجھے دو مرتبہ دہلی جانے کا اتفاق ہوا۔ ایک بار ۲۴ر ستمبر کو اور دوسری بار ۱۰ر اکتوبر کو۔ اب آپ شمیم سے معلوم کریں کہ کیا بات ہوئی۔

میرے مضامین کا مجموعہ ابھی تک کتابت کی منزل میں ہے آدھی سے زیادہ کتابت ہو چکی ہے۔ ونڈ اتنک سے شائع ہو رہا ہے اس کی کتابت سوائے ریاض احمد (الہ آباد) کے اور کوئی نہیں کرتا اور ان کے پاس کام بہت رہتا ہے "الفاظ" کا پچھلا شمارہ لیتھو سے ہی شائع کرنا پڑا۔ بہرحال کتاب شائع ہوتے ہی آپ کی خدمت میں پہنچے گا

سرینگر کی صحبتیں بہت یاد آتی ہیں۔ آپ نے اور بھابی نے جس طرح میرے ایسے بیمار اور پریشان حال شخص کی مہمان نوازی اور دلدہی کی، اس کے لئے دل سے دعا نکلتی ہے۔

ابھی میں دہلی گیا تھا تو زبیر رضوی نے بتایا کہ ان کی پوسٹنگ سری نگر ہو رہی ہے اور اس کے لئے آرڈرس آچکے ہیں۔ معلوم نہیں آپ کی نئی پوسٹنگ کے آرڈر پہنچے یا نہیں۔

علی گڈھ کا موسم اب قدرے خوشگوار ہے ویسے جو بھی موسم ہو یہاں دل لگتا ہے۔ میری صحت خدا کا شکر ہے کہ روز افزوں ترقی پر ہے۔ میرے ڈاکٹر اس درمیان میں آئے تھے۔ دواؤں میں کچھ رد و بدل ہوئی ہے۔ ہومیوگلوبین کے بڑھنے کے لئے دوا دی ہے۔ اس سے فائدہ پہنچا ہے۔ اب کمزوری بالکل نہیں ہے۔ لکھنے پڑھنے کا کام معمول کے مطابق ہو رہا ہے۔

بھابی کو میرا بہت بہت سلام کہیں۔ ان کی یاد بہت آتی ہے۔ دونوں بچوں کو دعائیں۔ آپ کی بچی کی گڑیا کی شگفتہ چٹکیاں اور دلچسپ ریمارکس یاد آتے ہیں۔

امید ہے کہ خیریت سے ہوں گے۔ کبھی کبھار خط لکھا کیجئے۔

آپ کا خلیل الرحمٰن اعظمی

مشاہیر کے خطوط خلیل الرحمٰن اعظمی کے نام

۱۴ر فروری

محبی تسلیم! عرصہ ہوا کہ آپ سے اندھیرے میں ملاقات کی مسرت حاصل ہوئی تھی۔ اس کے بعد ادھر چند ہفتوں سے آپ کے قلم کی رفتار سے مستفید ہو رہا ہوں۔

اللہ کرے زور قلم اور زیادہ

اس عرصہ میں آپ کی دو کتابیں بھی شائع ہوئی ہیں اور میں ادارہ کی طرف سے ان کو منگوا رہا ہوں پھر بھی میری خواہش تھی کہ آپ کم از کم ایک ایک نسخہ نوائے ادب میں ریویو کے لئے بھیجئے۔

لغت سے متعلق متعدد مراسلے شائع ہو رہے ہیں۔ ۲۲ر جنوری کے پرچے میں جو دو مراسلے شائع ہوئے ہیں ان میں لغت کو مونث استعمال کیا گیا ہے البتہ ۸ر فروری کے صدق جدید کے اقتباس میں لغت مذکر ہے میرا خیال ہے کہ لغت مذکر ہے اور پہلے پرچے میں طباعت کی غلطی ہے۔

ارادہ ہے کہ علی گڈھ آؤں اور کچھ دن وہاں کے کتب خانہ سے استفادہ کروں۔

امید کہ مزاج گرامی بعافیت ہوں گے۔

آپ کا نجیب اشرف ندوی

۱ر نومبر ۶۲ء

جناب مکرم سلام مسنون

آپ نے "نقوش" کراچی کا جوش نمبر (دوسرا ایڈیشن) ملاحظہ فرمایا؟ اس میں میرا مضمون بھی ہے اور جوش صاحب کا ۲ صفحے کا جواب بھی۔ جواب الجواب کے لئے میں نے ساقی کے جوش نمبر کا اعلان نومبر کے ساقی میں کر دیا ہے میں چند روز کے لئے دلی گیا تھا۔ وہاں سے جوش نمبر کے لئے کچھ مواد لے آیا ہوں۔ ایک صاحب نے بتایا کہ آپ نے اپنی کتاب "فکر و فن" میں جوش صاحب کی شاعری پر مضمون لکھا ہے جسے اس خاص نمبر میں شریک ہونا چاہئے۔ میں نے آپ

شاعر بمبئی ۱۔ ابوالکلام قاسمی ۲۔ سابق ممبر پارلیمنٹ، مدیر آئینہ، سرینگر

کا وہ مضمون نہیں پڑھا۔ کیا یہ ممکن ہے کہ مجھے آپ اس کی نقل برائے اشاعت بھیج دیں؟ جوش نمبر تین مہینے بعد شائع ہوگا۔ اس کے لئے مضامین کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کچھ بھجوا سکیں تو کرم ہوگا۔ گنجینۂ گوہر کی چند جلدیں پبلشر سے اب ملی ہیں۔ ملاحظہ فرمایئے۔

امید ہے کہ آپ مع الخیر ہوں گے۔

خاکسار شاہد احمد دہلوی

نشیمن، ۷ منٹو روڈ، الہ آباد

عزیزی خلیل الرحمٰن صاحب! آج کل باقر مہدی صاحب الہ آباد آئے ہوئے ہیں۔ جب ملاقات ہوتی ہے تو آپ کا تذکرہ ضرور آتا ہے آپ کے حالات و خصوصیات سن کر آپ کی قدر و محبت کئی گنا بڑھ گئی ہو سکے تو کبھی بھول کر الہ آباد بھی آجائیے تاکہ لب تشنہ تقریر نہ رہ جائے۔

کارواں کا خاص نمبر جون میں شائع ہو رہا ہے۔ آپ اس نمبر کے لئے کوئی مضمون عنایت کریں۔ اس خاص نمبر کی کتابت شروع ہو گئی ہے۔ لہٰذا جلدی توجہ فرمایئے گا۔

اعجاز

(ڈاکٹر اعجاز حسین) ۸ رمئی

۱، نور اللہ روڈ، الہ آباد

در دسمبر ۶۶ء

عزیزی تسلیم! مبارک ہو۔ مجھے خبر ہی نہ تھی کہ آپ کا انتخاب بھی ہو گیا۔ وہ تو اتفاق سے تین دن ہوئے ایک صاحب نے بتایا۔ خوشی ہوئی آپ ہر حیثیت سے اس کے اہل ہیں۔ ادھر اتفاق سے علی گڈھ بھی آنا نہیں ہوا۔ میں نے نیا عہد نامہ پر ریڈیو سے اردو اور انگریزی دونوں میں تبصرہ کیا تھا۔ ذرا فرصت ملے تو نقلیں بھجوا دوں۔ "زاویۂ نگاہ" البتہ ابھی نہیں دیکھی کلام نے لکھا تھا کہ بھیج رہا ہوں، پھر یاد دہانی کے باوجود نہیں بھیجی۔ خیر آجائے گی۔

شہریار بھی کام سے لگ گئے، بہت اچھا ہوا۔ ان کا خط آیا تھا

ادھر میری صحت برابر خراب رہی، اب کچھ بہتر ہوں

خیر طلب احتشام (سید احتشام حسین)

پٹنہ

۱۱ نومبر ۱۹۶۵ء

برادرم رعایتیں! تمہاری خاموش رہنے کی عادت مرض کی صورت [illegible] ہی ہے۔ مانا کہ اس لائق نہیں ہوں کہ تم مجھے خط لکھو لیکن جواب کا مستحق تو ہوں۔ اگر اس لائق بھی نہیں سمجھتے تو تم کو حق ہے۔ کچھ ہی دن پہلے ایک خط شاعر، بمبئی

لکھ چکا ہوں۔ "اشارہ" کے سلسلے میں۔ اور وہاں نے تو جواب دیا لیکن تم خاموش ہو۔

اب ایک دوسری بات سنو۔ لکھنا بھول گیا تھا کہ بچوں نے ایک پریس قائم کر لیا ہے اور اس کے ساتھ ہی ایک پبلشنگ ہاؤس بھی قائم کیا ہے ابھی کوئی کتاب شائع نہیں ہوئی لیکن ۱۹۶۶ء میں کم سے کم چھ کتابیں شائع کرنی ہیں۔ تم یہ بتاؤ کہ تمہارا مقالہ "ترقی پسند ادب" کس حال میں ہے۔ کیا نظر ثانی کر چکے۔ اور تم اسے شائع کرنے کو دے سکتے ہو۔ یہ تمہیں پہلے بتا دوں کہ پریس میں کافی سرمایہ لگ گیا ہے اور جو بھی کتابیں شائع کی جائیں گی وہ رائلٹی پر۔ یک مشت رقم ادا کرنا ممکن نہیں۔ ہر چھ ماہ پر حساب کر کے رائلٹی کی رقم ادا کر دی جائے گی۔

ترقی پسند ادب کے علاوہ کیا اور کسی کتاب کا مسودہ تمہارے پاس تیار ہے؟۔

بچوں کے لئے کتابیں شائع کرنے کا بھی پروگرام ہے۔ کیا وہاں ایسے لوگ ہیں جو بچوں کے لئے لکھیں بہرحال تم اور مشورے دو۔

لطیف سلمہ لا کالج میں، شان سلمہ بیچلرز کا امتحان دیں گے پچھلے سال بیمار ہو گئے تھے چند پرچے دینے کے بعد۔

رشی اور شہریار کو دعا کہہ دو۔ بچوں کو پیار

خیر طلب سہیل عظیم آبادی

پٹنہ کالج

۷ دسمبر ۵۶ء

برادر عزیز و مکرم! سلام و نیاز کے ساتھ بہت سی دعائیں، کتاب ملی۔ آپ نے زمین کی خاک نہیں بلکہ چولھے کی راکھ کو اپنے ہاتھوں سے اٹھا کر آسمان پر اچھالنے کی کوشش کی ہے لیکن زمین کی کشش اور پستی کی محبت اگر اسے اب بھی کھینچے رہے تو ذمہ داری آپ کی نہیں۔ غرور کا وہ دیا جو زندگی کی دلیل ہے میرے ضمیر میں کب کا بجھ چکا تھا آپ نے اس میں کافی سے زیادہ روغن دے دیا۔ اب بھی روشن نہ ہو تو آپ کا کیا قصور۔ یہ دیا بجھا کیسے داستان لمبی ہے۔ مجملاً میرے اس شعر کی زبانی سن لیجئے ؎

یہ میری آگ یوں جلا نہ جاتی میرے سینے میں

اگر اس آگ کو بھی تاپنے والے ملے ہوتے

آپ کی محبت کا شکریہ ادا کرنے کے لئے الفاظ کہاں سے لاؤں۔ آپ کی قدرت فنکاری کا ایک شمہ مجھے مل جائے تو شاید یہ فرض ادا ہو سکے ورنہ خاموشی ہی بہتر ہے۔ یوں آنسوؤں کی زبان نے آپ کی اس محبت کا اعتراف جس طرح کیا ہے

جس کی گواہی آپ کے مقالے کے وہ اوراق دیں گے جنہیں میرے آنسوؤں نے جگہ جگہ سے داغدار بنا دیا ہے۔ میں آپ کو اس غائبانہ خلوص کا صلہ کیا دوں؟ میرا ایک چھوٹا بھائی جس نے میری ادبی زندگی کو کسی نہ کسی طرح باقی رکھا۔ اب یہ محسوس کر رہا ہوں کہ میرا ایک چھوٹا بھائی اور بھی ہے۔ لیکن کیا آپ سگ باش برادر خورد مباش کے اس خواہ مخواہ کے تعلق کو پسند کریں گے؟

آخر میں مجھے اتنا کہنے کی اجازت دیجیے کہ اپنے اس مضمون میں آپ نے ٹیلے کو پہاڑ سے نہ ٹکرایا ہوتا تو بہتر ہوتا۔ پہاڑ کو میں بہرحال پہاڑ سمجھتا ہوں یہ اور بات ہے کہ اس کے شکم میں صرف جواہرات ہی نہیں کوئلے کی کانیں بھی ہوتی مولانا رزاق ملیح آبادی کے رسالے سوغات میں میری ایک طویل نظم زیادہ شائع ہوئی ہے یہ میری ان معدودے چند نظموں میں سے ہے جو مجھے بھی پسند ہیں۔ کیا آپ کی نظر سے گذری ہے؟ عزیزی شہاب جعفری آج کل کہاں ہیں اگر وہیں ہوں تو

سو دعائیں ان کو شوق کی سلام ان کو شوق کا

بہرحال میں آپ کا بندۂ احسان

جمیل مظہری

شعبۂ اردو، مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۵ رجون

محبی خلیل صاحب! آتش پر مقالہ بھیج رہا ہوں۔ بہتر ہے اگر اسے صاف کرا لیجیے۔ شہریار یہ کام کر سکتے ہیں۔

اس کے لکھنے میں واقعی بڑی تاخیر ہو گئی۔ آپ سے شرمندگی ہے۔ اس لئے اب عہد کیا ہے کہ کسی کی کتاب پر مقدمہ نہ لکھوں گا۔ اپنے کام میں دیر ہو تو اس کی ذمے داری صرف مجھ پر آتی ہے۔ لیکن دوسرے کے کام میں میری طرف سے رکاوٹ نہ ہونا چاہیئے۔ میں نے آپ کے مقالے کو کل دوبارہ پڑھ ڈالا۔ گو جیسا کہ آپ کا خیال ہے بعض نقوش اور نمایاں کئے جا سکتے ہیں۔ مگر مجموعی طور پر بہت اچھا مطالعہ ہے اسے ایسے ہی چھپنے دیجیے۔ پھر کبھی الگ سے کچھ اور لکھیے گا۔

میرے مضمون کا عنوان، پیش لفظ یا مقدمہ جو چاہیں رکھ لیجیے تعارف کی ضرورت نہیں۔

تاخیر کے لئے دوبارہ معذرت خواہ ہوں۔ میری ادھر چھ مہینے سے جو ذہنی کیفیت ہے وہ کسی کو بتا نہیں سکتا اگر بتاتا تو شاید کسی کو شکایت نہ ہوتی بلکہ ہمدردی ہوتی۔ یہی کیا کم ہے کہ بکھرے ہوئے ہوش و حواس کو مجتمع کر کے کچھ نہ کچھ کئے جاتا ہوں۔ یہ اور بات ہے کہ یہ سب کچھ نہ میرے حوصلے کے مطابق

شاعر، بمبئی

ہے نہ وقت کی ضرورت کو پورا کرتا ہے۔

مخلص آل احمد سرور

۴/۸، بینک روڈ، الٰہ آباد

۵ جنوری ۶۱ء

محبی! خط اور مضمون کی نقل کے لئے دلی شکریہ! "آپ صبا" والے مضمون کے قریب میں آ گئے۔ اختر حسن نے میرے خلاف جو کچھ لکھا ہے اس سے وہ خود مطمئن نہیں ہیں۔ اس رسالہ بازی کا مقصد صرف یہ ہے کہ کئی جواب آئیں کچھ سنسنی پیدا ہو اور زیادہ لوگ رسالہ میں دلچسپی لینے لگیں۔ اس مضمون کو بالکل نظرانداز کر کے آپ مجھ پر کچھ لکھیں تو البتہ وہ ایک چیز ہوگی۔ یہ وضعیر اسلوب احمد انصاری کو "گلِ نغمہ" دے آیا تھا۔ وہ اس پر بسیط تبصرہ لکھ رہے ہیں۔ یہ کارڈ لیکر آپ ان سے ملیں اور طے کر لیں کہ وہ کب تک پانچ چھ ہفتوں کے لئے "گلِ نغمہ" آپ کو دیں گے تاکہ اپنے مخصوص انداز میں آپ مفصل تبصرہ لکھ سکیں۔ "گلِ نغمہ" کی ایک جلد بھی میرے پاس نہیں ہے ورنہ فوراً آپ کو بھیج دیتا۔ آپ اپنا تبصرہ آج کل، دلی اور صحیفہ لاہور کو آخر مارچ ۶۱ء تک بھیج دیں تو اچھا ہے۔ اردوئے معلیٰ کی نثر والی مجلس میں انتہائی مجبوریوں کی وجہ سے میں نہیں آ سکتا نہ مضمون تیار کر سکتا ہوں جس کا دلی قلق ہے میں چند اہم انتظامات میں مصروف ہوں جن کا ادب سے کوئی تعلق نہیں لیکن یہ روٹیوں سے ہے۔ دو تین ماہ بعد امید کرتا ہوں مجھے فرصت ہو فرصت ہوگی۔ یوں تو فرصت اس زندگی میں ایک جنس نایاب ہے۔ ہاں یہ تو لکھیے کہ شہاب جعفری نے میرے انٹرویو کی اشاعت کے متعلق کیا کیا؟ شہریار کو بھی میری طرف سے دعا کہیے۔ میرا انتخاب انجمن ترقی اردو علی گڑھ سے کب تک شائع ہو جائے گا؟ سرور صاحب اسے بتا سکیں گے۔ امید ہے کہ مجنوں صاحب بہت اچھی طرح ہوں گے

آپ کا فراقؔ

بمبئی

۲۵ فروری

خلیل! تم کانفرنس ضرور کرو، ایسے نیک کام میں بھلا میں کیسے رکاوٹ کھڑی کر سکتا ہوں۔ دیکھو بمبئی سے ۴ مارچ کو دہلی جاؤں گا اور وہیں سے تمہیں مفصل تار بھیجوں گا کیونکہ شادی ۹ مارچ کو ہوگی۔ میری طرف سے آس نہ توڑو۔

مخلص تمہارا اپنا کرشن چندر

۸، کولہن ٹولہ اسٹریٹ الہ آباد ۳

۱۴؍جون ۵۱ء

خلیل بھائی! تمہارے خط کا جواب دینے میں تین دن کی تاخیر ہوگئی میرے حلق کے غدود (TONCILS) بے حد خراب ہیں اور ان کی وجہ سے میں مستقل طور پر بیمار رہتا ہوں۔ پچھلے سال آپریشن کے لئے لکھنؤ بھی گیا لیکن لمبی باتیں رہیں۔ آیڈمیں کر آپریشن نہیں ہو سکا اس سال جاڑوں میں یقیناً اس کا تصفیہ کرنا ہوگا۔ اس کے علاوہ اور کوئی چارہ نہیں ہے۔ تمہارے خط کا جواب اسی مرض کی نذر ہو گیا۔

بھائی جو خط گم ہو گیا اس میں میں نے یہ لکھا تھا کہ کتابت وغیرہ یہاں اچھی اور بہ آسانی ہو سکتی ہے۔ اور اگر سرور صاحب آمادہ ہوں تو اس عرصے میں وہ کتاب کا اشتہار چھاپتے رہیں۔ کسی نہ کسی طرح اس کا جلد فیصلہ کرو تم سے بزنس نما باتیں کرنا بہت گراں گزرتا ہے۔

تمہاری کتاب مل گئی تھی، شکریہ تو کیا ادا کروں۔

سلام کو مرکزی کردار بنا کر شمر قریشی (گورکھپور) نے ایک مختصر لیکن بے حد جامع رپورتاژ لکھا ہے جو اگلے ماہ کے "نکہت" میں چھپ رہا ہے تمہیں بھیجوں گا۔ سلام کی جملہ باتیں ظاہر ہو جائیں گی۔

آج کل میں BLANK VERSE میں ایک تجربہ کر رہا ہوں۔ نظم طویل ہوتی جا رہی ہے اس لئے طبیعت بہت پریشان ہے۔

یہاں کے مقامی ادیب تیزی سے گھاس چر رہے ہیں۔ ایسی ایسی باتیں ہو رہی ہیں کہ جنہیں سنایا جائے تو کچھ لوگ لطیفہ سمجھیں گے۔ اور کچھ لوگ برہم ہوں گے۔

تمہیں یونیورسٹی میں جگہ ملی یا نہیں؟ بھئی ان لوگوں کا زیادہ اعتبار نہیں کیا جا سکتا۔ ہر وقت ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ وعدے تو سب ہی کر لیتے ہیں

A. W. P. اور جذبی کے کیا کوائف ہیں؟

تمہارا تیغ الہ آبادی

معرفت ڈرامہ سکشن آل انڈیا ریڈیو، نئی دہلی

۱؍جولائی

ڈیئر خلیل! تمہارا ۳؍جولائی کا خط ملا۔ تم نے بہرحال یاد کیا خوشی ہوئی ہاں عمر کی اس منزل میں مجھے اپنی بچکانی فطرت پر قابو تو ضرور ہی پا جانا چاہئے۔ اس سلسلے میں تم نے جو کچھ لکھا ہے وہ حرف بہ حرف صحیح ہے۔ پہلا خط میں نے [illegible]

تمہیں بڑے بھروسے سے لکھا تھا۔ محترم سرور صاحب کو بھی لکھ دیا تھا کہ مجھے خلیل پر بھروسہ ہے وہی یہ کام کریں گے۔ پھر جب تمہارا جواب نہیں آیا تو میں چڑ سا گیا۔ غصہ بھی آ گیا۔ میں نے تمہیں لکھ دیا کہ اب یہ کام تم نہ کرنا اور سرور صاحب کو بھی لکھ دیا۔ پھر راہی نکہت سے سرور صاحب کا خط آیا کہ میں خود خلیل سے کہہ چکا ہوں۔ اب پروگرام بدلنا اچھا نہیں ہے" میں چپ ہو گیا پھر اس مسئلے کو بھولنے سا لگا۔ آج تمہارا خط آ گیا یہ محسوس ہو رہا ہے گویا کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔ مجھے یہ تو سوچ ہی لینا چاہئے تھا کہ اگر جواب میں تاخیر ہوئی تو اس کی کوئی وجہ ہو گی۔ میں تو بس جلدی سے ناراض ہو گیا۔ اب یہ احمقانہ بچپن نہیں تو اور کیا ہے۔ بہرحال اس دوسرے خط کے لئے معاف کر دو

میرے کہنے سے یقین کر لو کہ ۱۹۴۵ء کے بعد سے میری نظموں کا کوئی ریکارڈ خود میرے پاس نہیں۔ بیاض کبھی نہیں تھی، رسائل کے تراشے رکھنے کبھی عادت ہوئی، چھوڑ دیتے۔ میں خود نہیں جانتا کہ ۱۴۴ صفحوں کا یہ انتخاب کس طرح ہو گا اور۔۔ اور پھر اپنی پسند پر اب مجھے بھروسہ بھی نہیں ہے یہاں دلی میں تو میرا مذاق امریکن سا ہوتا جا رہا ہے۔ تم یہ ایک کام کر ہی ڈالو۔ جن نظموں کا تم نے حوالہ دیا ہے وہ تو شاید میں تمہیں بھیج دوں گا۔ "میرے نغمے" اور وسعتیں، ۱۹۴۵ء سے پہلے ہی نکل چکی تھیں۔ مسودے ادھر ادھر بکھر گئے۔ محترم شاہد احمد دہلوی نے کچھ مسودے خریدے تھے مگر انہیں پاکستان جانا پڑا اور شاید میری نظمیں گم ہو گئیں۔ بہرحال یہ ایک ایسی لمبی کہانی ہے کبھی بتاؤں گا یا لکھوں گا۔ ہاں مجھے بھی پتہ چلا ہے کہ انجمن کی طرف سے شائع ہونے والے ایسے انتخابات میں تعارف یا دیباچہ نہیں ہوتا تو پھر اسے جانے دو۔ البتہ انتخاب ضرور کر ڈالو اور جوابی ڈاک مجھے لکھو کہ میں کیا کروں کہ تمہیں اس انتخاب میں مدد مل جائے۔ کہو تو میں کسی سنیچر کو آ جاؤں؟

الغرض میرا یہ فیصلہ ہے کہ یہ کام تمہیں کو کرنا ہے۔ تم نے اپنے اس مختصر سے خط میں کئی نازک سے مسئلے چھیڑ دیئے ہیں۔ میرے کہنے سے صرف یہ کرو کہ کبھی ہمدردی کے ساتھ یہ بھی سوچو کہ اگر سلام میں یہ ساری کمزوریاں ہیں تو کیوں ہیں؟ تم اتنے سمجھدار ہو کہ جواب خود ڈھونڈ نکالو گے؟ اپنے تئیں میں صرف یہ جانتا ہوں کہ وہ حالات جن سے بچپن سے اب تک مجھے دوچار ہونا پڑا ہے وہ اردو کے دوسرے شاعروں اور ادیبوں سے بالکل مختلف تھے بلکہ ہیں۔ بہ ایں حالات اگر میں زندگی کی کچھ ذمے داریاں سلیقے سے پوری کر رہا ہوں تو یہی امر میرے لئے کافی تسلی بخش ہے۔ ایک فن کار کے ناطے بھی میری یہی کوشش ہوتی ہے کہ ابھی جمود میرے قریب نہ آنے پائے

بے شک اس کوشش میں میں قلم کے ساتھ کھیلنے بھی لگتا ہوں مگر ایسا بھی کیا کہ میں پچاس چیزیں لکھوں اور ان میں دس بھی کام کی نہ ہوں۔ پانچ دس تو نکل ہی آئیں گی۔ یہی کمزوری یا کمزوریاں تو برادر عزیز! میں ان کمزوریوں کو بھی اختر یا مجاز کی طرح کوئی رومانی تصور نہیں دے رہا ہوں مجھے معلوم ہے کہ یہ کمزوریاں صرف بیماریاں ہیں اور ان کا علاج ہونا چاہیے علاج کی کوشش بھی کرتا ہوں یہ اور بات ہے کہ پھر بیمار ہو جاتا ہوں۔ جو بھی ہو میں یہ مانتا ہوں کہ قصور صرف میرا ہے اور ۔ اور اگر مجھے کچھ ہو گیا تو ناقدوں کو بھی قصوروار مجھی کو ٹھہرانا چاہیے کام یا حالات کو نہیں

یہ بات ہمیشہ کے لیے مان لو کہ میں جذباتیت یا بچپن اسی کے ساتھ کرتا ہوں جس سے میری کوئی جذباتی تعلق ہوتا ہے۔ حریفوں، رقیبوں، دشمنوں اور خواہ مخواہ کے بڑے لوگوں کے ساتھ میرا کیا رویہ ہوتا ہے اس کا شاید تمہیں علم نہیں ہے۔ میں اگر کم رری قسم کی گہرائی اور نمائشی انداز کی بلندی پیدا کر سکتا تو یقیناً میری حیثیت آج سے کچھ مختلف ہوتی مگر شاید میرے اندر کا اسلام مر بھی چکا ہوتا۔ خیر چھوڑو یہ بڑی BORE سی باتیں ہیں اچھا اب تم کام کی باتیں کر دلو، جواب فوراً دو۔

تمہارا سلام

بمبئی

۱۷ر دسمبر ۶۶ء

عزیزی خلیل الرحمٰن! ۲۸ر دسمبر سے ۱ر جنوری تک ترقی پسند مصنفین کی چھٹی کل ہند کانفرنس دہلی میں ہو رہی ہے۔ یہ کانفرنس غالباً ہماری سب سے بڑی اور سب سے اہم کانفرنس ہوگی اور میں امید کرتا ہوں کہ اس کے مباحث اور فیصلوں کے بعد ہمارے اتحاد اور تنظیم کی بہتر صورتیں نکلیں گی ہندوستان کی تمام زبانوں کے تین چار سو ادیبوں نیز بیرونی ادیبوں کی آبزرور کی حیثیت سے آنے کی توقع ہے۔ ۳۱ر کی شام کو مشاعرہ بھی ہوگا۔

میری دلی خواہش ہے کہ تم اس کانفرنس میں شرکت کرو۔ بمبئی کے سب دوست عباس، ساحر، سردار، اخترالایمان، بیدی، کیفی، انور عظیم وغیرہ آ رہے ہیں۔

میں ۹ر کو یہاں سے حیدرآباد جا رہا ہوں۔ جشن مخدوم کے لیے ۱۴ر دسمبر تک دلی پہنچ جاؤں گا۔

اپنے آنے کی اطلاع فوراً دیں۔

تمہارا سجاد ظہیر

شاعر، بمبئی

برادرم تسلیم! آپ کا خط ملا، نظم ملی، دونوں کا شکریہ۔ ساتھ ہی شہریار کی نظم اور غزلیں بھی ملیں۔ اگر آپ دونوں کی تخلیقات نہ آتیں تو شاید "گفتگو" میں کچھ کمی رہ جاتی۔

آپ کا خیال صحیح ہے کہ میں اس رسالے میں مختلف الخیال ادیبوں اور شاعروں کو ایک مرکز پر جمع کرنا چاہتا ہوں اور خوشی کی بات یہ ہے کہ اس کوشش میں کامیابی ہو رہی ہے۔ یکسانیت زندگی میں ہو یا ادب میں ناگوار چیز ہے میری کہاوت ہے کہ اپنی محبتوں کا ذائقہ بدلتے رہنا چاہیے۔ ادب پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ میں ترقی پسند ہوں اور ہر اچھے ادیب کو ترقی پسند سمجھتا ہوں اس کے لیے زبان سے اعلان کی ضرورت نہیں ہے۔ خود تخلیق کی شہادت کافی ہے۔ اختلاف رائے تبادلۂ خیال کی بھی صورت اختیار کر سکتا ہے اور پسند اور ناپسند کی بھی۔ لیکن میں "گفتگو" میں کسی قسم کے "قفل نزاع" کو روا نہیں رکھوں گا۔ تبصروں میں بھی اس بات کی احتیاط کی جائے گی کہ وہ ذاتی نہ ہوں اور ایک طرفہ نہ ہوں۔ میرے پاس کچھ ایسی چیزیں آئی ہیں جو سخت بھی ہیں اور تلخ بھی اور دونوں طرف سے آئی ہیں اس فکر میں ہوں کہ انہیں رد کیے بغیر کس طرح توازن بنایا جائے کوئی راستہ نکال لوں گا۔

بعض اہم کتابوں پر خود تبصرہ کرنا چاہتا ہوں (وزیر آغا کی کتاب میں نے پڑھی ہے وہ یقیناً اہم کتاب ہے) لیکن پہلے پرچے میں اس کام کے لیے وقت نکالنا ممکن نہیں ہے۔

مضامین کی فراہمی، ترتیب اور کتابت اور طباعت کا انتظام، روپے کی فراہمی اور اشتہارات حاصل کرنے کی کوشش یہ سب اتنے سارے کام تھے ان کو پورا کرنے میں سارا وقت صرف ہوا تھا۔ پھر بھی پہلے پرچے میں ایک طویل اداریہ لکھ رہا ہوں۔ غلط فہمیاں، تلخیاں، حجاب، جاشکایتیں، بددلی، بے اطمینانی، اچھی اور بری تخلیق اور پھر لکھنے والے کی قابل قدر انا ان سب مراحل سے گزر رہا ہوں لیکن جب پرچہ نکل آئے گا تو ساری تلافی ہو جائے گی۔

علیگڑھ میں صرف ایک دن کے لیے آیا تھا۔ خیال تھا کہ اردو ڈپارٹمنٹ میں جاؤں گا اور سب سے ملاقات ہو جائے گی لیکن اس دن یونیورسٹی بند تھی۔ فرداً فرداً ہر ایک کے گھر جانے کا وقت نہ نکال سکا جس کا افسوس ہے۔ خیر یار زندہ صحبت باقی۔ پرچہ نکلنے کے بعد آپ کا تو ملنا ہو گا۔

میں نے سنا ہے کہ اردو ڈپارٹمنٹ ۔۔۔ ہے میں نئی شاعری پر کوئی سیمینار کر رہا ہے اگر آپ اس کا ایک رپورتاژ دوسری

دوسری اشاعت (مئی ۷۱ء) کے لئے لکھ دیں تو بہت اچھا ہے۔

اسی زمانے میں مجھے ایجوکیشن ڈپارٹمنٹ کے ایک سیمینار میں شریک ہونا ہے لیکن گفتگو کی طباعت شباب پر ہوگی اس لئے یقین سے نہیں کہہ سکتا۔ آسکوں گا یا نہیں۔

کوشش کر رہا ہوں یہ پرچہ آخر فروری تک آجائے۔

امید ہے کہ آپ بخیریت ہوں گے۔

آپ کا سردار جعفری ۱۱ر جنوری ۶۷ء

انفارمیشن آفیسر گورنمنٹ آف انڈیا سرینگر

۲ر جون ۱۹۵۷ء

برادرم سلام مسنون، آپ کا خط ملا۔ یکم جون کا ہماری زبان بھی ملا۔ اس میں رفتار کا کالم غائب تھا۔ بے انتہا ذہنی کوفت ہوئی۔ ۷ر جون کا شمارہ پھر دیکھوں گا۔ اگر اس میں بھی رفتار کا کالم نظر نہیں آیا تو اس ادبی آمریت کے خلاف احتجاج کے طور پر اس ہفت روزہ کی خریداری ہی سے توبہ کرلوں گا۔ یہ بھی کوئی بات ہوئی۔ میں نے آل احمد سرور صاحب کو خط لکھا تھا انہوں نے ابھی تک جواب دینے کی زحمت نہیں کی ہے وہ غالباً جواب دیں گے بھی نہیں کیونکہ وہ فیصلہ کر چکے ہیں یا فیصلہ کرنے پر مجبور کئے جا چکے ہیں۔ کن کن صاحبانِ بصیرت کے بارے میں باہر کی دنیا شدید غلط فہمیوں میں مبتلا ہے۔

اس خبر سے خوشی ہوئی کہ میرے مضامین کی نقل کا کام آپ نے شروع کر دیا ہے۔ خدا کرے وہ جلد پایۂ تکمیل کو پہنچ جائے۔ میں ان نقول کا بھیجنے سے منتظر رہوں گا۔

رشید صاحب نے خود نوشت حالات کا جو سلسلہ میگزین میں شروع کیا تھا اس کی کل کتنی قسطیں اب تک شائع ہوئی ہیں میں ان پر کچھ لکھنا چاہتا ہوں۔ جتنی قسطیں بھی شائع ہو چکی ہوں بھجوا دیں کیا مجھے کہیں سے مضامین رشید کا نسخہ مل سکتا ہے۔ یہاں دستیاب نہیں ہو رہا ہے۔

حج بیت اللہ مانع شادی تو نہیں۔ بہرحال دیر آید درست آید، تاریخ شادی سے مطلع ضرور کیجئے گا۔

میرا ارادہ ہے کہ "تعمیر میں جائزے" کے عنوان سے ایک سلسلہ جاری کردوں۔ کاش اب رفتار پھر لکھنے لگیں ؎

ہم سفیرو! اک ذرا آواز پر آواز دو۔

بھائی سہیل نے اپنا تبادلہ دہلی کا کرا لیا۔ اور ۴ر جون کی صبح کو ہوائی

شاعر بمبئی

جہاز سے بال بچوں سمیت یہاں سے چلے بھی گئے۔ لطیف اس سال ہائی اسکول میں ہے اس لئے اس کو یہیں بورڈنگ میں چھوڑ گئے ہیں۔ میں نے بہت کہا کہ میرے پاس چھوڑ جایئے مگر بچوں کو بزرگوں کی کڑی نگرانی سے نجات ملے اس سے بڑی تمنا ان کے تصور میں ہی نہیں آسکتی لطیف میاں مچل گئے اور وہ بورڈنگ میں داخل ہیں۔ سہیل ابھی تو پٹنہ اور رانچی وغیرہ جائیں گے۔ ۱۰ر جون سے دلی میں مستقل طور سے آجائیں گے۔ آپ سے قریب اور مجھ سے آپ ہی کی طرح دور ہو جائیں گے۔ یہاں سے شمیم احمد شمیم اور سہیل نے بھی سرور صاحب کو رفتار کے بارے میں خطوط لکھے تھے۔

اچھا بھائی اب اجازت چاہتا ہوں۔

آپ کا اپنا علی جواد زیدی

نصیر منزل، نیا گاؤں لکھنؤ

۷ر مارچ ۶۶ء

مجتبیٰ اعظمی صاحب اسلام علیکم آپ کا تحفہ "نیا عہد نامہ" شہریار صاحب کی معرفت کل موصول ہوا۔ آپ کی اس عنایت کا شکر گزار ہوں ویسے دس بارہ دن ہوئے ایک جگہ سے یہ تحفہ مجھے دستیاب ہو گیا تھا اور اس کا بیشتر حصہ میں نے پڑھ ڈالا تھا اور آپ کو خط لکھنے والا ہی تھا میں آپ کے کلام کے سوز اور نشتریت کا پہلے ہی سے قائل تھا یہ مجموعہ دیکھ کر اور بھی زیادہ گرویدہ ہو گیا۔ واقعی بڑی معنی خیزی اور بڑے بلیغ اشارے آپ کے کلام میں ملتے ہیں۔ جو اضطراب تشنگی اور بے چینی اس وقت تک آپ کی تخلیقات میں ہے خدا کرے وہ باقی رہے خواہ آپ ریڈر کیا پروفیسر ہی کیوں نہ ہو جائیں۔

آپ کی ہجویات بھی خاصہ کی چیزیں ہیں۔ شاید ۱۰ر مارچ کو ملاقات ہو، اگر ریزرویشن مل گیا۔

آپ کا خیر اندیش نور الحسن ہاشمی

۲۴۸، پونچھ روڈ سمن آباد لاہور

۵ر جولائی ۵۸ء

میرے بھائی اعظمی! میرا حال بھی اس روایتی حاجی کا سا ہے جو سارا سال تو دنیاداری میں بسر کرتا ہے اور گناہوں کا مرتکب ہوتا ہے اور پھر حج پر جا کر سمجھتا ہے کہ پچھلے سارے گناہ معاف ہو گئے۔ آج اسی طرح کے حج پر نکلا ہوں۔ اس وقت تک بارہ خط تحریر کئے ہیں۔ احباب کے پرانے شکوے دور کئے ہیں۔ آپ کا خط بھی قبولیت کے ایسے ہی لمحے میں وارد ہوا ہے کہ

جواب کی نوبت اس قدر جلد آگئی ہے۔ شکر ہے کہ کم از کم آپ کی ذات میں وہ تمام خرابیاں پاتا ہوں جو دوسروں میں دیکھ کر مجھے غصہ آتا ہے اور اپنے ہی دیکھ کر جواز ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ زندگی میں پہلی دفعہ آپ پر غصہ کی بجائے پیار آیا ہے۔ سبب شاید یہ ہے کہ اس دفعہ آپ کے عذر بڑے معقول دکھائی دیئے ـــــ جانِ وحید یہ خبریں جو آپ نے سنائی ہیں علی گڈھ سے یہاں بہت پہلے پہونچ چکی تھیں۔ آپ کے بعض شاگردوں نے بھی اس کی اطلاع دے دی تھی اس لئے یہ مار نے "جان لیوا" ثابت نہیں ہوئے اچانک نہیں تھے میں اس جواب کے لئے بڑی مدت سے تیار ہو رہا تھا۔ پچھلے دو دن آپ کی معیت میں گزر رہے۔ قدائے ظفر مل گئی تھی۔ آزاد صاحب کا خط بھی اس کے ساتھ ہی آیا اسے ختم کر کے دم لیا۔ ایک زمانے میں میں نے بھی کلیاتِ ظفر پر نشان کئے تھے اور مقصد میرا بھی انتخاب مرتب کرنے کا تھا لیکن اب اس سے بے نیاز ہو گیا ہوں۔ البتہ کسی وقت میں آتش کا انتخاب ضرور چھپے گا۔

اردو تنقید کا انتخاب اب کتابت کے مرحلوں میں ہے۔ خدا جانے کب اس کے چھپنے کی نوبت آئے بظاہر میری زندگی میں تو اس کے چھپنے کی نوبت نہیں آتی حالانکہ ۱۹۵۹ء ہی میں مسودہ ناشر کے حوالے کر دیا گیا تھا بہر حال مجھے بھی اس کے چھپنے کی اب جلدی نہیں ہے دام وصول ہو چکے اور پبلشر کی مرضی ہے چھاپے یا نہ چھاپے۔ شبلی کی حیاتِ معاشقہ ختم ہو چکی ہے ہندوستان میں اس کے دوسرے ایڈیشن کا اچھا انتظام ہو سکتا ہے۔

رفتار کا سلسلہ پھر سے جاری کرنے کی تدبیر کیجئے۔ مدیر ہماری زبان کو میں بھی اس سلسلے میں لکھوں گا۔ آپ اس کام کو کتابی شکل دیجئے بڑا اہم اور مفید کام ہوگا۔ "فکر و فن" سجاد باقر رضوی پڑھنے کے لئے لے گئے تھے۔ اس پر مضمون لکھنے کے لئے میں نے بعض نشان لگا رکھے تھے اور ـــــ کی تعداد بھی اوپر درج کر دی تھی۔ انہوں نے حال ہی میں اپنے ایک مقالے میں اس سے کچھ کام لیا ہے لیکن تفنن اور ظرافت کو زیادہ خوفناک بنا دیا ہے۔ میں یہی بات لکھتا تو اس کا انداز دوسرا ہوتا۔ مقدمہ کلام آتش جلد بھجوائیے تاکہ میں بھی اپنے کام کو مکمل کرنے کی تدبیر کروں۔ حال ہی میں "میر حسن" پر مقالہ مکمل کر لیا ہے، اندر جیت کی ست سئی پنوں بھی پریس میں جا چکی ہے۔

معاف فرمائیے جوشِ گفتار میں بات طویل ہو گئی۔ آپ کو اتنی فرصت کہاں۔ جس رومانی فضا سے آپ گزر رہے ہیں انتخاب سودا بھی ایسے ہی زمانے میں کیا گیا تھا ممکن ہے جذبات کی اس مماثلت کا بھی اس پسند میں ہاتھ ہو۔

آپ کے تحقیقی مقالے کا موضوع کیا تھا ـــ؟ کب تک چھپے گا؟

اچھا بھائی رخصت۔ بھابھی کو سلام کہیے گا۔

آپ کا وحید قریشی

۵۸، سول لائنز سرگودھا

۱۶ء

تسلیم و نیاز! برادرم اعظمی صاحب! تسلیم و نیاز! آپ کا خط پا کر بے حد مسرت ہوئی۔ اس لئے کہ میں حالیہ فسادات کی خبریں پڑھ کر بہت پریشان ہو گیا تھا۔ کئی بار سوچا کہ آپ کو ٹیلیگرام بھیجوں یا پھر ٹیلیفون پر بات کر کے خیریت دریافت کروں اسی اثنا میں آپ کا خط مل گیا شکر ہے کہ آپ لوگ خیریت سے ہیں۔ دل پر سے ایک بوجھ ہٹ گیا ہے۔

آپ کے ارشاد کی تعمیل میں اختر الایمان کی نظموں کا تفصیلی مطالعہ کیا اور ان میں کیسر کھو گیا نتیجہ ایک مضمون کی صورت میں اب میری میز پر موجود ہے۔ یہ مثال کے سلسلے کا آٹھواں مضمون ہے۔ ادبی دنیا کے آئندہ شمارے میں ملاحظہ کریں۔ نیز مجھے اختر الایمان صاحب کا پتہ بھی لکھ بھیجیں تاکہ انہیں وہ پرچہ بھجوایا جا سکے۔

ادبی دنیا کے آئندہ شمارے کے لئے ابکی بار آپ سے نظم کے علاوہ ایک مضمون کا بھی طالب ہوں۔ لیکن درخواست یہ ہے کہ آپ جلد از جلد روانہ کریں۔ ادبی دنیا یکم دسمبر تک ضرور چھپ جائے گا اور ہم لوگ بڑی عجلت میں ہیں۔

شہریار سے کہیں کہ وہ بھی دو تین نظمیں ایک ساتھ بھیج دیں۔

ہماری زبان میں خیال پارے پر آپ کب تبصرہ کریں گے۔

آپ کا وزیر آغا

یونیورسٹی پروفیسر، صدر شعبہ اردو، پنجاب یونیورسٹی
(پرنسپل اورینٹل کالج لاہور) ۹ جولائی ۱۹۷۶ء

مشفق اعظمی صاحب! گرامی نامہ ملا۔ آپ کے جذباتِ محبت کا شکر گزار ہوں۔ ایک زمانہ ہوا کہ آپ کے اور میرے مابین رسم مراسلت موجود تھی پھر معلوم نہیں کن وجوہ سے ترک ہو گئی۔ تاہم دل کی دنیا میں ربطِ باہمی کا احساس ہمیشہ رہا۔ میں خط کتابت میں سست تو نہیں ہوں مگر

نہ جانے اس معاملے میں کیوں سہل نگاری یا تساہل کا مرتکب ہوگیا۔ یہ تو خیر ہوا مگر ان سب باتوں پر آپ کی گنج محبت کو کون فراموش کر سکتا ہے۔

کہو آج رات کیسے گزاری کوئی آنچ کی رات ملنے بھی آیا۔ ایک ایسی گونج ہے جو دل کی وادیوں میں اکثر گونجا کرتی ہے۔

مجھے حکومت مغربی پاکستان نے "نقد مبرو" پر انعام دیا تھا یہ پچھلے سال کی بات ہے۔ اس سال حکومت پاکستان نے میرے مجموعی کام پر تمغائے فخر اور پانچ ہزار روپیہ انعام دیا ہے مجھے تو اس قسم کے اعزاز کی کوئی توقع نہ تھی کیونکہ

رہ و رسم فرماں روایاں شناسم
خراں بر سر بام و یوسف بہ چاہے

مگر کسی وجہ سے ہوگیا۔ اب لوگ مبارکباد کہتے ہیں اور میں متعجب ہوتا ہوں۔ بہرحال اعزاز شاہی کے لئے نہیں انعام خداوندی کے لئے شکر و سپاس ہوں۔

مقدمۂ آتش کا انتظار ہے۔ آپ کے مضامین جو نگار میں چھپے تھے نظر سے گزرے ہیں بہرحال شاید ان پر کچھ اضافہ ہوگا۔

نیازمند سید عبداللہ

۶۹ ہسی، ایوب ایونیو (فرسٹ فلور)
محمدپور ڈھاکہ ۷
۸ ر اکتوبر ۶۷ء

پیارے خلیل! تقریباً ایک ہفتہ ہوا کہ کتابوں کا پیکٹ کسٹم والوں کے تصرف سے نکل کر مجھ تک پہنچا۔ تم اندازہ نہیں کر سکتے اور میں بیان نہیں کر سکتا کہ میں ان کتابی تحفوں کے لئے تمہارا اور شہریار کا کتنا ممنون ہوں۔ میرے اور تم لوگوں کے درمیان سارے تعلقات خط و کتابت اور کتابوں کے تبادلے تک محدود رہے ہیں۔ گزشتہ بیس سال کے دوران میں کبھی سرسری ملاقات تک نہ ہو سکی اور آئندہ ملاقات بھی بڑی حد تک مشکوک ہے۔ ایسی صورت میں موجودہ تعلقات کو معدوم ہونے سے بچانا باہمی کوشش پر منحصر ہے۔

افسوس ہے کہ یہ خط خاصی تاخیر سے جا رہا ہے۔ ہر روز یہ سوچ کر خط لکھنا ملتوی کرتا رہا کہ کل اطمینان کے ساتھ مفصل خط لکھوں گا۔ نہ جانے کیونکر میں یہ بھول گیا کہ اطمینان کے انتظار میں نہ کوئی کام ہوا ہے نہ ہو سکے گا قدرت نے لکھنے پڑھنے کی تھوڑی سی صلاحیت تو ضرور عطا کی لیکن قسمت نے اس صلاحیت سے پورے طور پر مستفید ہونے کا موقع نہ دیا۔ زندگی ہمیشہ ناقابل برداشت مسائل کا شکار رہی ہے۔ برسوں کی جد و جہد کے بعد باپ کے دئے ہوئے چرکوں سے سنبھلنے کے قریب آیا تھا کہ شفیق نما استاد شادانی نے وہ چرکا دیا کہ ذہنی ترقی و تکمیل کے سارے امکانات ختم ہو کر رہ گئے۔ اپنی تقدیر کا ماتم یا کسی کی شکایت کرنا کوئی اچھی بات نہیں لیکن تم سے ایسے قریبی تعلقات رہے ہیں کہ تم سے بعض باتوں کا ذکر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

ادبی نقطۂ نظر سے میرا ملک کے اس حصے میں رہنا میرے حق میں کئی لحاظ سے بڑا نقصان رہ ثابت ہوا ہے اور ہو رہا ہے۔ چھپنے چھپانے کی وہ دشواریاں ہیں کہ بس بہرحال تمہیں یہ سن کر خوشی ہوگی کہ یہاں کی تمام طباعتی دشواریوں کے باوجود جس طرح میری دو کتابیں اتفاقی طور پر آج سے پہلے شائع ہو چکی ہیں اسی طرح بالکل غیر متوقع طور پر میری تیسری کتاب میرے خیال میں (تنقیدی مضامین کا مجموعہ) کی طباعت کی ایک صورت نکل آئی ہے اور ان دنوں یہ کتاب کتابت کے مرحلے سے گذر رہی ہے۔ امید ہے کہ اگر حالات بدستور رہے تو نومبر دسمبر تک کتاب شائع ہو جائے گی۔

اس خط کو کتابوں کی رسید جانو۔ شہریار کو بہت بہت پیار، بیرسٹان حال کو سلام و نیاز۔

تمہارا نظیر الدین صدیقی

۳، بھگوان اسٹریٹ، پرانی انارکلی، لاہور
۳ ر فروری ۱۹۵۱ء

پیارے بھائی! امید ہے کہ ہمایوں کا آخری نمبر تمہیں مل گیا ہوگا۔ ہمایوں بند ہوگیا ہے اور میں بیکار۔ تمہارے خط کے جواب میں اسی لئے تاخیر ہوئی۔ تمہارے شعر بہت پسند آئے مگر یاس نہیں بھی۔

ایک نئی خبر یہ ہے کہ میں اور انتظار حسین مل کر لاہور سے ماہنامہ خیال کا اجرا کر رہے ہیں۔ پہلا پرچہ اگلے ماہ میں چھپے گا۔ تم جلد سے جلد اس کے لئے اپنی نظم، دوہے وغیرہ بھیجو اور ایک مضمون بھی۔ مضمون کے سلسلے میں ایک عنوان سوجھا ہے "علی گڈھ سرسید کے بعد" اس مضمون میں زیادہ تر اپنی نسل کی باتیں ہوں۔ آج علی گڈھ میں نئی نسل کی ذہنی، ادبی اور مجلسی سرگرمیاں کیا ہیں؟ علی گڈھ ہمیشہ نئی تحریکوں کا مرکز رہا ہے۔ اگر واقعی زبان اردو و ادب کے لیے تمہارے ذہن میں کوئی نئی بات ہے تو کھل کر لکھو اور پرانی نسل کو للکارو اگر علی گڈھ میں اور کچھ نہیں تو پروا نہیں۔ میرے لئے تم ایک ہی کافی ہو۔ پھر ناموں کی

گنتی گنوانے کی چنداں ضرورت نہیں بات تو نئے احساس کی ہے تمہیں معلوم ہے کہ نئی نسل کا نعرہ سب سے پہلے انتظار نے بلند کیا پھر نئی پود اور نئی نسل میں ذرا فرق ہے بعض لوگ جنہیں تم ، وہ بیٹھے نہ ملنے کیا سمجھتے ہو وہ نئی نسل میں سے نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے لئے کوئی کام کر سکتے ہیں نئی نسل کی امتیازی خصوصیت گنتی نہیں بلکہ نیا مزاج ہے جو گذشتہ ہجرت کے بعد ظہور میں آیا ہے۔ نئی تحریروں میں اسلوب احمد انصاری صاحب کا مضمون بہت پسند آیا۔ انتظار صاحب کا بھی یہی خیال ہے۔ ہماری زبان میں تمہاری تحریریں شوق سے پڑھتا ہوں۔

بہرحال اپنے حلقۂ احباب بالخصوص ڈاکٹر محمد حسن ، ڈاکٹر محمد شاہد ، اسلوب احمد انصاری اور آل احمد سرور صاحب کو خیال کی طرف توجہ دلائیے ہمارا اور آپ کا پرچہ ہے۔ پہلے خط لکھو پھر اور باتیں ہوں گی۔ خیال کا دوسرا شمارہ غدر نمبر ہوگا جو جنوری میں نکلے گا۔ اس کے لئے ڈاکٹر صاحب سے ایک مضمون لکھوا دو "جل گیا آشیاں میں کیا کیا کچھ" یعنی غدر کے بعد مسلمانوں نے جو کچھ کھویا۔ انہیں الگ خط لکھا ہے۔ یہ بات لکھنی بھول گیا

تمہارا ناصر کاظمی

۱۷، بیچلرز کوارٹرز، حیدرآباد
۱۱ دسمبر ۶۵ء

برادرم تسلیم! کل آپ کے خط کے ساتھ شہریار کا خط بھی ملا جس محبت سے آپ نے اور شہریار نے خطوط لکھے ہیں اس سے میرا جی خوش ہو گیا۔

ادھر پانچ غزلیں مجھ سے سرزد ہوئیں۔ خورشید احمد صاحب کی فرمائش پر وہ غزلیں "نیا دور" کو بھیج دی تھیں۔ مجھے ابھی تک نیا دور نہیں ملا۔ غالباً انہوں نے ایک غزل چھاپی ہے اور ایک بعد کو چھاپیں گے وہ غزل بھی آپ کو پسند آئے گی۔ دو غزلیں "اردو ادب" کے تخلیق نمبر کے لئے بھیجی تھیں شہریار پڑھ چکے ہیں۔ ایک غزل اور ہے جو آپ کی نظر سے گزرے گی۔

آپ کی غزل میرے پاس محفوظ ہے۔ کشمیر نمبر کے بعد کے شمارے میں آئے گی۔ کیوں نہ آپ بھی چند غزلیں ، نظمیں اور اپنی شاعری اور شخصیت پر ایک مضمون یا مضمونچہ اگلے چند دنوں میں میرے پاس بھجوا دیں کہ اس طرح آپ کی کئی چیزیں اکٹھی قارئین "صبا" کو پڑھنے کو مل جائیں گی۔

آپ کے اور شہریار کے مجموعوں کے اشتہار "صبا" میں ضرور شائع ہونگے۔

شاذ تمکنت

"اسم اعظم" پر اگر شہریار پسند کریں تو میں انور معظم سے ریویو کرادوں۔ قاضی سلیم کا پتہ ہے "سلیم منزل ، منظور پورہ ، اورنگ آباد (مہاراشٹر)"
یہ چند سطریں شہریار کے لئے بھی ہیں۔ شہریار کو پیار

آپ کا مخلص سلیمان اریب

دلی کالج ، دہلی یونیورسٹی ، دہلی

جناب خلیل صاحب سلام شوق اس میں علی گڈھ گیا بھی لیکن والدہ صاحبہ کی علالت کی وجہ سے اتنا پریشان اور مصروف رہا کہ آپ تک نہ پہنچ سکا

سیمینار اکادمی کے مشاعرہ میں آپ کو بلانے کا چونکہ میں ذمہ دار تھا اس لیے جو تکلیفیں آپ کو ہوئی ہوں ان کی معذرت چاہتا ہوں۔ نمائش کے علاوہ مشاعرہ اور کانفرنس کا پورا انتظام سکریٹری سیمینار اکادمی کے سپرد تھا اور وہی حقیقتاً اس کے روح رواں ہیں اور اکادمی میں میری حیثیت بھی وہی ہے جو آپ کی یا کسی غیر آدمی کی۔

بزم ادب کا پروگرام ارسال خدمت ہے۔ میری خواہش یہ ہے کہ آپ اس کے دونوں جلسوں میں شرکت فرمائیں اور اپنی دونوں تقریروں کو پہلے سے لکھ لیں اور ان کی ایک نقل مجھے بھیج دیں یا آکر دیدیں ارادہ یہ ہے کہ ان کو چھپوایا جائے۔

مجھے یقین ہے کہ اس مرتبہ بھی آپ کو کچھ نہ کچھ زحمت ضرور ہوگی لیکن ساتھ ہی ساتھ اس کا بھی یقین ہے کہ آپ کا اخلاق اتنا وسیع ہے کہ ہم لوگوں کی معمولی فروگذاشتوں کو معاف کر دیں گے۔

سکنڈ کلاس کا کرایہ آپ کی خدمت میں پیش کیا جائے گا۔ براہ کرم لکھیے کہ آپ کس وقت اور کس گاڑی سے پہنچیں گے ، آپ کے خط کا مجھے انتظار رہے گا۔

نیازمند خواجہ احمد فاروقی

لکھنؤ

۱۰ اپریل ۶۱ء

برادر خلیل صاحب ، آداب! چند روز آپ لوگوں کے ساتھ اچھے گذرے۔ آپ کے ساتھ وقت ہمیشہ ہی اچھا گذرتا ہے بشرطیکہ آپ میسر آسکیں۔ اس مرتبہ آپ نے جو موقع فراہم کر دیا۔ وہ میرے لئے کئی معنوں میں باعث تسکین رہا جس کے لئے شکریہ ادا کرنا ایک رسمی بات ہو کر رہ جائے گی۔ اسے یاد رکھنا ہی زیادہ اچھا ہوگا۔

علی گڈھ میں آخری رات کو جلدی چلے گئے تھے۔ ہم لوگ سردار جعفری

کو اپنے کمرے میں گھیر گھار کر گفتگو کرنے کے لئے لائے تھے جس میں بلراج کومل، نارنگ اور قاسمی بھی شامل تھے۔ قاسمی نے آپ کے گزشتہ ۸ تعلق پر بہت ہی اچھی اور صاف صاف باتیں کہیں تھیں جن سے سردار ہر بار اپنا دامن بچا گئے۔ انہوں نے آپ کے دیباچہ (عہد نامہ) سے خاصا اختلاف ظاہر کیا جس سے میرا خیال ہے کہ انہوں نے نہ ٹھیک طرح سے پڑھا نہ ہی اسے سمجھا ہے۔ سردار سے آپ کی ملاقاتیں بھی رہی ہوں گی۔ ان کا پروگرام چند روز علیگڑھ میں رہنے کا تھا۔

آپ کا مخلص — رام لعل

رسالہ "فنون" ۴۷، انارکلی، لاہور (مغربی پاکستان)

یکم جنوری ۶۸ء

محب عزیز! سلام شوق! عنایت کا دلی شکریہ۔ یہ عرض کرتا ہوں گزشتہ پانچ برس میں میری تمنا ہی رہی کہ آپ بھی فنون میں شامل ہوں۔ آپ کی مصروفیتوں کا اندازہ تھا مگر جب دوسرے رسائل میں آپ کا کلام اور تنقید دیکھتا تھا تو "جلن" بھی محسوس ہوتی تھی اور حیرت بھی ہوتی تھی کہ آخر میرے ساتھ آپ نے یہ طرزِ عمل کیوں روا رکھا جبکہ آپ کے میرے مراسم تو خاصے پرانے ہیں اور پھر ہمارے پر خلوص روابط کو کبھی کسی غلط فہمی نے آلودہ نہیں کیا۔ بہرحال اب آپ نے کرم فرمائی کی تو میری سب شکایات کی تلافی ہو گئی۔

میرے متعلق طفیل صاحب اور دیگر احباب جو کتاب مرتب کر رہے ہیں۔ اس میں آپ کی شمولیت ضروری تھی۔ دراصل میری خواہش تھی کہ آپ میری شاعری کے بارے میں لکھیں۔ اردو کے بزرگ نقادوں نے شاعری کے سلسلے میں میرے ساتھ شدید بے انصافی کی ہے اور مجھے حیرت ہوتی ہے کہ یہ حضرات خود غور سے کسی کا کلام شاذ ہی پڑھتے ہیں بلکہ تنقید کی جو لائن ایک بار مقرر ہو گئی اسی کو مسلسل پیٹتے چلے جاتے ہیں میں لے لیجئے آپ کو اول و آخر شاعر قرار دیا ہو مگر اسی ضمن میں میری خاصی حق تلفی ہوتی رہی ہے اور ہو رہی ہے۔ آپ سے مجھے انصاف اور غیر جانبداری کی توقع تھی مگر آپ وقت نہ نکال سکے۔ اب برادر عزیز شہریار کے خط سے یہ معلوم کر کے کہ میری شاعری کے بارے میں آپ دونوں کے درمیان بعض حوصلہ افزا باتیں ہوئی ہیں پھر سے یہ حسرت بیدار ہوئی کہ کاش آپ وقت نکال سکتے محترم (اسلوب احمد صاحب انصاری کے مضمون کے بارے میں طفیل صاحب نے بتایا تھا۔ وہ اس مقالے کی تعریف کر رہے تھے

شاعر۔ بمبئی

میں ان کا دل سے ممنون ہوں۔ مضمون میں نے پڑھا نہیں (بلکہ اس زیر ترتیب کتاب کا کوئی مضمون نہیں پڑھا) کہ میں کتاب کی اشاعت سے پہلے خود اپنے بارے میں مضامین سے متعلق اس قدر اشتیاق کا مظاہرہ کروں۔

"نیا عہد نامہ" اور "زاویۂ نگاہ" مل گئے ہیں۔ ان کا بہت بہت شکریہ۔ تازہ اشاعت تو قریب قریب بالکل تیار تھی۔ اس میں آپ کی نظم اور غزل تو شامل کر لی مگر کتابیں پڑھنے اور تبصرہ لکھنے میں وقت لگے گا اس لئے آئندہ اشاعت (مارچ تک) یہ تبصرے ضرور شامل ہوں گے اور کوشش کروں گا کہ تبصرے میں ہی لکھوں یا کسی معقول دوست سے لکھواؤں۔ شہریار صاحب کے بارے میں جو تبصرہ چھپ گیا تھا اس کا مجھے ہمیشہ افسوس رہے گا۔ اگرچہ یہ ان کی شرافت اور وسیع القلبی ہے کہ انہوں نے زیادہ اثر نہیں لیا۔

ساقی فاروقی کا مجموعہ پریس میں ہے دو ہفتوں میں شائع ہو جائے گا۔ فہمیدہ کا مجموعہ چھپ گیا تھا۔ ساقی کا مجموعہ شائع ہو جائے تو ان دونوں کے علاوہ ظہور نظر کا مجموعہ "ریزہ ریزہ" اور احمد فراز کا مجموعہ "درد آشوب" بھی نذر کروں گا۔ ایک ہی پارسل میں۔ آپ کو جس بھی پاکستانی کتاب کی ضرورت ہو مجھے بلاتکلف لکھا کیجئے۔ میں فوراً حاضر کر دیا کروں گا اگر ہم لوگ ایک دوسرے کو کتاب کی سی سستی چیزیں بھی نہیں بھیج سکے تو یہ شرمناک بات ہے۔ آپ کے ریڈر بننے کی اطلاع سے بہت خوشی ہوئی۔ مستحق کو جب اس کا حق ملے تو ہر شخص کو خوش ہونا چاہئے۔ یہ اعزاز یقیناً آپ کا حق تھا۔ محبت کے ساتھ۔

آپ کا (احمد ندیم قاسمی)

۲۷ر فروری سنہ ۵ء

بھائی خلیل! خط ملا، اور نظم بھی ملی جو زیر طبع نمبر میں شائع ہو رہی ہے۔ افسوس کہ اس وقت آپ کا خط میرے پاس نہیں ہے ممکن ہے کہ کسی جواب طلب بات کا جواب نہ دے سکوں۔

کرشن یہاں سے ۳ر مارچ کو دہلی جا رہے ہیں۔ ۹ر مارچ کو سرلا کی شادی ہے اس کے بعد وہ علیگڑھ پہونچ سکتے ہیں۔ آپ دہلی شاہراہ کے پتہ پر ان کو خط لکھ کے تاریخ پوچھ سکتے ہیں اور ان کو مطلع کر سکتے ہیں

میرا آنا تو ظاہر ہے کہ مشکل ہے اور اگر کسی طرح پہونچ جاؤں تو کانفرنس میں حصہ نہ لے سکوں گا۔ لیکن مارچ کے آخر یا اپریل کے

شروع میں پہونچنے کا ارادہ ہے خیر اس کے متعلق بعد میں لکھوں گا۔

علیگڈھ کی رپورٹ دیکھی۔ آپ لوگوں نے بعض اہم مسائل پر بحث کی ہے یقیناً اس سے انجمن کو فائدہ پہونچا ہوگا۔ مگر افسوس ہے کہ فائدہ مقامی ہوگا۔ اگر ایسے مباحثے شائع کر دئے جائیں تو ان سے ہر ساتھی استفادہ کر سکتا ہے۔ آئندہ جب اپنی کوئی بحث ہو تو بھائی مہربانی کر کے اس کی رپورٹ محاذ میں ضرور بھیجئے کا مینی فسٹو پر غالباً آپ کے یہاں اچھی بحث ہوئی ہوگی اس میٹنگ کی رپورٹ تو ضرور آنا چاہئے تھی خیر۔

اب تک ہماری رپورٹیں جس طرح شائع ہوتی رہی ہیں ان سے فائدہ بہت پہونچا ہے لیکن اب وہ حرف بہ حرف والی رپورٹنگ فضول سی معلوم ہوتی ہے۔ میرا خیال یہ ہے کہ اگر کسی تخلیق یا کسی اہم مسئلے پر اہم بحث ہو تو اس کو پوری ذمہ داری سے مرتب کر کے شائع کر دینا چاہئے بعض وقت سکریٹری کی پوزیشن عجیب و غریب ہو جاتی ہے اس لئے ایسی رپورٹیں اب سکریٹری کی حیثیت سے نہیں محاذ کے نامہ نگار کی حیثیت سے بھیجا کیجئے تاکہ عام بحث کے ساتھ تنقید بھی شامل رہے۔

ایشیا میں جلیل قدوائی کا ایک مضمون چھپا ہے ممکن ہے آپ نے دیکھا ہو جی بھر کے آپ کو کوسنے دئے گئے ہیں۔ میں نے جواب لکھنے کے لئے ایشیا منگوایا لیکن بھائی اس مضمون کا جواب دینا وقت ضائع کرنا ہے ویسے اگر آپ جواب دینا ضروری سمجھتے ہوں تو کچھ لکھئے یا مشورہ دیجئے کہ جواب لکھا جائے۔

عصمت آپ لوگوں (یعنی آپ کی نظری صفائی اور پختگی سے) بہت متاثر ہو کے لوٹی ہیں۔ ابھی مجھ سے ملاقات نہیں ہوئی مگر ان کی رائے معلوم ہو گئی کہ علیگڈھ کی انجمن بڑی جاندار ہے۔ شاید وہ کچھ لکھیں بھی۔

بھئی ایک بہت ضروری کام۔ میری بیوی (شوکت) علیگڈھ میٹرک کرنا چاہتی ہیں اور اس سلسلے میں سب سے بڑا مرحلہ کورس کا ہے۔ وہ خود کئی دوستوں کو اور میں بھی ان کے اصرار پر بہتوں کو لکھ چکا ہوں مگر کوئی جواب ہی نہیں دیا۔ مجبوراً آپ کو تکلیف دیتا ہوں۔

اول تو امتحان کے قواعد و ضوابط درکار ہیں۔ دوم کورس اگر کسی طالب علم کے پاس پرانی کتابیں مل جائیں تو بہت اچھا ہے ورنہ بہر حال مہربانی کر کے لکھئے کہ پورے کورس کے لئے کتنے روپیئے درکار ہیں تاکہ پہلے بھیج دیئے جائیں اور آپ کورس بھجوا دیجئے۔ جواب محاذ کے پتے پر دیجئے گا۔

آپ کا

کیفی اعظمی

شاعر بمبئی

بنگلور ۵

۵ مارچ ۱۹۶۷ء

پیارے بھائی سلام شوق! آپ کی تہنیت عید ملی اس سے پہلے نیا عہد نامہ ملا۔ لیکن میں کمبخت دو بول شکر نہ لکھ سکا وجہ صرف یہ تھی کہ اپنوں کو خط لکھنے کے لئے جس ذہنی اور جذباتی سکون کی ضرورت ہوتی ہے وہ عنقا تھی روزنامہ میں نے صرف اس خیال سے نکالا تھا کہ روزی کمانے کے دوسرے ذرائع کی بہ نسبت یہ پیشہ اپنی طبیعت اور مزاج سے زیادہ قریب ہوگا۔ لیکن اس کے اجرا کے بعد پتہ چلا کہ کوئی بھی دوسرا کام اس سے زیادہ مہلک شعر و ادب کے لئے نہیں ہو سکتا۔ خواہی نخواہی سیاست میں بھی الجھنا پڑ گیا اور اب نتیجہ یہ ہے کہ میں کمبل کو چھوڑنا چاہتا ہوں لیکن کمبل مجھے نہیں چھوڑتا۔ اب تو بس یہ حالت ہے کہ دوست و احباب سے دعائے خیر کی درخواست کرتا پھرتا ہوں آپ سے بھی درخواست ہے۔

شعر و ادب سے اگر کوئی تعلق رہ گیا ہے تو صرف اتنا کہ اس دلدل میں بھی دو چار گھنٹے پڑھنے کے لئے نکال لیتا ہوں۔ نیا عہد نامہ پڑھ کر بہت لطف لیا۔ مصمم ارادہ کیا ضرور کچھ لکھوں گا لیکن پتہ نہیں کہ اللہ میاں کیوں بار بار اپنے آپ کو پہچواننے پر اتنے مصر ہیں کہ یہ ارادہ بھی فسخ العزائم کی نذر ہوا۔

شہریار کے مجموعے پر تفصیلی اظہار خیال کیا تھا لیکن میری بدنصیبی کہ وہ خط بھی انہیں نہیں ملا۔

نئے لکھنے والے مداریوں کے کرتب دکھا رہے ہیں دیکھ دیکھ کر عبرت حاصل کرتا ہوں۔ آپ کیا کر رہے ہیں؟ خدا کی قسم بڑا جی چاہتا ہے آپ سے ملنے کو اب کے دلی آؤں تو کم از کم ایک دو دن کے لئے علیگڈھ ضرور آؤں گا۔ علیگڈھ میں میرے لئے آپ کے اور شہریار کے علاوہ اور کوئی کشش نہیں ہے۔

کچھ اہل و عیال کی بھی خبر دیجئے۔ فیملی پلاننگ پر عمل ہے یا خیر الرازقین کے بھروسہ پر کام چل رہا ہے۔ ذرا تفصیلی خط لکھئے اپنوں میں سے کسی کا خط آ جائے تو بڑا سہارا ملتا ہے۔ شہریار کو سلام کہئے خدا کرے آپ بھی مزے میں ہوں۔

آپ کا

محمود ایاز

آل انڈیا ریڈیو اندور

یکم مارچ ۱۹۶۵ء

خلیل صاحب السلام علیکم! مدت ہے صاحب کہ خط لکھنا تو درکنار خطوں کا جواب دینا بھی آپ گوارا نہیں کرتے! ہندی میں اردو کی نئی نظموں کے انتخاب کے لیے نظمیں اور مختصر نوٹ مانگا تھا وہ بھی اب تک آ رہا ہے مصروفیت مجھے بھی رہتی ہے لیکن خلوص محبت اور دوستی کی پاسداری بڑی چیز ہے۔

"اظہار" والوں نے مجھ سے آپ پر ایک مضمون مانگا تھا۔ میں نے لکھ کر بھیج دیا۔ بہرحال بہت جلدی اور روا روی میں لکھا ہے پھر بھی خاصا ہے۔ بہت کچھ لکھا جا سکتا تھا مگر فرصت!۔

"سندباد" پر شہریار کا مضمون آپ کی نظر سے گزرا ہوگا۔ اسے پڑھنے کے بعد بھی کیا آپ کی رائے اس کی وحدت کے بارے میں وہی ہے جو آپ نے ایک نہایت مختصر خط میں لکھی تھی بے شک ہر تخلیق پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے اور ہونا چاہیئے اس نظم کے اکائی ہونے پر بلراج کومل، ظہور نظر، وزیر آغا، احمد ندیم قاسمی، شہریار، قاضی سلیم، اور خود مجھے کوئی شک نہیں۔ میں نہیں جانتا کہ "ویسٹ لینڈ" کی وحدت کے متعلق آپ کی رائے کیا ہے۔ کیا آپ ایک بار پھر نظم پر توجہ کریں گے۔ میں اس پر آپ کی تفصیلی رائے چاہتا ہوں۔

اختلاف رائے اپنی جگہ اور اس کا حق تسلیم مگر میری نظم پر آپ کا اختلاف رائے! آخر کیوں؟ میں نہیں سمجھتا کہ آپ نے "سندباد" کو مختلف نظموں کا سلسلہ یا مجموعہ قرار دینے کے پہلے نظم اور اس کی ٹیکنک پر جم کر غور کیا تھا۔ یہ ضرور جانتا ہوں کہ آپ کی رائے FIXED اور RIGID نہیں ہے کہئے کیا خیال ہے؟ ویسے میں آپ کی اس مختصر سی رائے کو بھی کتاب میں شامل کر کے خوش ہولوں گا۔

اور سنایئے؟ کیا مشاغل ہیں؟ پونم میں میرے والے نظر سے گزرے یا نہیں؟ میراجی پر "فنون" میں جو بحث وزیر آغا سے چھیڑ رکھی ہے دیکھی ہوگی ان کا جواب نظر سے گذرا ہوگا؟ اب اس شمارے میں میرا جواب الجواب آ رہا ہے میں اپنی طرف سے اس بحث میں اب مزید اور کچھ لکھنا فضول سمجھتا ہوں

اس بار جواب نہ آیا تو ۔۔۔ تو کیا خاک۔ ایک بار پھر لکھوں گا۔

شہریار کو سلام

آپ کا عمیق حنفی

شاعر۔ بمبئی

جانکیا پوری، نئی دہلی (انڈیا)

۱۹ر جون ۱۹۶۷ء

برادرم! "زاویۂ نگاہ" کی ایک جلد حاصل کرنے کے لئے مجھے گیا تک کا سفر کرنا پڑا۔ ع من از رحمت توگلہ دارم

علی گڑھ میں جشن ملک رام کا ذکر میں نے آپ سے کیا تھا۔ اس وقت نذر ملک رام کے لئے مقالات کا مرحلہ درپیش ہے۔ مندرجہ ذیل مقالے موصول ہو چکے ہیں۔

فارسی کا ہندوستانی لہجہ	امتیاز علی خاں عرشی
فارسی کی قدیم فرہنگوں میں ہندوستانی عنصر	ڈاکٹر نذیر احمد
REFLECTIONS ON SOME VERSES OF 'SURAT AD-DUHA'	پروفیسر ڈبلیو منٹگمری واٹ
INDIA AND THE NEAR EAST (DURING 13TH-15TH CENTURIES)	ڈاکٹر ضیاء الدین احمد ڈیسائی
علم تاریخ کی ترقی میں مسلمانوں کا حصہ	محمد حمید اللہ (پیرس)
اردو اور ہندی عروض کے مقامات اشتراک	ڈاکٹر گیان چند

اب ساتواں مقالہ آپ کی طرف سے آنا چاہئے۔ ظاہر ہے کہ آپ اتنا خشک تو نہ لکھ سکیں گے جتنا منٹگمری واٹ اور ڈاکٹر گیان چند لکھ سکتے ہیں لیکن ایسا رنگین موضوع بھی منتخب نہ کیجئے جیسے "جگر مرادآبادی" فراق گورکھپوری۔

اردو تنقید کے مسائل۔ اگر مطبوعہ مقالہ نہ ہوتا تو میں "نذر ملک رام" کے لئے یہی اڑا لیتا لیکن اب تو آپ خود ہی کچھ بھیجئے۔

پہلے تو یہ خط لکھئے کہ مقالہ آپ بھیجیں گے (تین ماہ سے زیادہ وقت نہ لیجئے گا)

خدا کرے آپ ہر طرح خیریت سے ہوں۔

جگن ناتھ آزاد

کاشانہ رسول لائنس، سلطان پور

۲۸ر دسمبر ۱۹۶۷ء

محب گرامی آداب! خط ملا اور دونوں کتابیں بھی۔ "زاویۂ نگاہ" میں اردو نظم کا نیا رنگ و آہنگ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی۔ سوغات کا متعلقہ نمبر میرے پاس نہیں تھا۔ اور عرصہ پہلے میں نے جب یہ مضمون پڑھا تھا اس وقت خیال آیا تھا کہ آپ اس سلسلے کو اگر اور آگے بڑھا سکیں تو بہت اچھا

چونکہ نئی شاعری پر بالعموم نظریاتی مضامین تول جاتے ہیں لیکن ہر مضمون کے علاوہ کہیں اور تاریخی تجزیے کی کوئی قابل قدر کوشش مجھے نظر نہیں آتی عمیق صاحب چاہتے تھے کہ آپ اس سلسلے کے دو ایک اور مضامین میں اب تک کے سرمایے کا احاطہ کر دیں تو یہ کام بے حد مفید ہوگا۔

کاغذی پیرہن آپ ابھی نہ بھجوایئے گا۔ اندور میں عمیق صاحب کے پاس اس کی ایک جلد ہے ان سے مستعار لے کر کام چلا لوں گا۔ تقریباً سال بھر پہلے میں نے نیا عہد نامہ سے متعلق تین چار صفحے لکھے تھے۔ آپ کی شاعری میں مجھے جو قوت ملتی ہے اس کا سب سے دلکش پہلو میرے نزدیک یہ ہے کہ روایت کا ایکسٹنشن ہونے کے باوجود یہ شاعری آج کی شاعری ہے۔ احساس نے لفظوں کی فضا بدل دی ہے۔ چنانچہ غزل کی مروجہ زبان اور اصطلاحات کے ساتھ آپ نے انکشافِ ذات اور فرار کائنات کی جو تصویریں پیش کی ہیں وہ نئی ہیں مگر نامانوس نہیں۔ معلوم نہیں آپ میری اس بات سے متفق ہوں گے یا نہیں کہ مجھے آپ کے مطالب و لہجے میں جمال ہم نشیں (آتش) کا اثر بہت واضح نظر آتا ہے۔ انشاء اللہ مضمون آپ کو پسند آئے گا۔

نئے نام کے بارے میں نے اپنی رائے فاروقی صاحب کو بھیجی تھی میرا خیال ہے کہ ہر انتخاب میں بعض معقول شاعروں کی بڑی نظمیں اور بڑے شاعروں کی اچھی نظمیں شامل ہو گئی ہیں چنانچہ مرتبین کے مذاق کی ایک تصویر ابھرتی ہے لیکن اس کی بنیاد پر ہر انتخاب میں شامل شعرا کا تجزیہ خطرے سے خالی نہ ہوگا۔ پھر اس میں بھر مار بھی بہت ہے۔ ہندوستان کے نئے شعرا کا شمار کیجیے تو دائیں ہاتھ کی انگلیوں کے سارے پور بھی پورے نہیں ہوتے لیکن کیا کیا جائے۔ یہ بدنصیبی ہماری زبان کی ہے جو شہرت اور امتیاز کی خلعت عطا کرنے کے معاملے میں ذرا وسیع القلب ہو گئی ہے۔

ڈاکٹریٹ کا بوجھ اتر جانے سے واقعی اب دنیا بہت پھیلی ہوئی نظر آتی ہے۔ اب اس کے بعض حصے اشاعت کے لیے بھیج رہا ہوں۔ آپ کو ایک اطلاع میں سب سے پہلے نہیں دے سکا تھا اگلے سال سے ہمارے یہاں ایم اے کے باقاعدہ کلاسز شروع ہو رہے ہیں۔ نصاب ہم نے اس سال مرتب کر لیا تھا اس میں تفصیلی مطالعے کے لیے آپ کا شاہ کار روالا انتخاب فراق بھی شامل ہے اور مقدمہ کلام آتش بھی۔ ایک پرچہ ہم نے جدید شاعری کا بھی رکھا ہے۔

شہریار کو سلام اور محبتیں وہ ان دنوں کچھ زیادہ خاموش ہیں۔

آپ کا
شمیم حنفی

شاعر۔ بمبئی

نئی سڑک لشکر گوالیار

۲۰ راگست ۶۴ء

محترمی اعظمی صاحب! بہت دنوں سے سوچ رہا تھا آپ کو خط لکھوں لیکن لکھوں تو کیا لکھوں۔ اسی کشمکش و پیچ میں الجھا رہا۔

آپ کو بہت دنوں سے پڑھ رہا ہوں۔ آپ میرے پسندیدہ شاعروں میں سے ہیں۔

مجھے آپ سے ایک کام آن پڑا ہے۔ میں ساہتیہ پبلیکیشن کے لیے میں نئی غزل کے نام سے ایک کتاب جلد ہی ایڈٹ کر رہا ہوں جس کے لیے مجھے آپ کی چار غزلوں کی ضرورت ہے۔ غزلیں صرف ہندی اسکرپٹ میں غیر مطبوعہ ہوں!

امید ہے کہ جواب جلد دیں گے۔ خدا کرے آپ اچھے ہوں۔ کبھی گوالیار کے راستے سے گزرنا ہو تو ضرور لکھیے۔

آپ کا
ندا فاضلی

زرِ سالانہ ختم ہونے کی اطلاع

اس حلقے میں سرخ نشان کے معنی یہ ہیں کہ آپ کا سال خریداری۔ اپریل، مئی، جون ۱۹۸۰ء کے شمارے کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ از راہ کرم سال آئندہ کے لیے مبلغ ۲۰ روپے جلد بھیج دیجیے۔ امید ہے کہ تجدید خریداری سے ضرور نوازیں گے۔ اگر منی آرڈر نہ بھیج سکیں تو ہمیں وی۔ پی بھیجنے کی ہدایت کریں۔

سگریٹ، تمباکو نوشی
سے پھیپھڑوں کا
سرطان ہو سکتا ہے
دل کی بیماریاں،
معدے کا پھوڑا،
گلے کا سرطان
اور دیگر اذیت ناک امراض۔
یہ مصدقہ طبی حقائق ہیں:
تمباکو نوشی سے صحت کو بہت سے خطرے لاحق ہوتے ہیں:
ان میں پھیپھڑوں و دیگر اعضا کے سرطان (کینسر) کے علاوہ
اور بھی کئی طرح کی بیماریاں شامل ہیں....
برانکائٹس، برانکائٹس اور سانس کے دیگر امراض
دل اور دوران خون کے دیگر امراض۔ یہ امراض تمباکو
نوشی نہ کرنے والے لوگوں کی نسبت تمباکو نوشی کرنے
والے لوگوں کو کثرت سے لاحق ہوتے ہیں۔
تمباکو نوشی کرنے والے لوگوں کی قبل از وقت موت یعنی 40 تا 50
سال کے درمیان مرجانے کا امکان زیادہ ہوتا ہے
نسبت ان لوگوں کے جو تمباکو نوشی نہیں کرتے ہیں۔
جو لوگ کمسنی میں ہی تمباکو نوشی کرنے لگتے ہیں ان کی
شرح اموات بھی خاص زیادہ ہوتی ہے۔
حاملہ عورتوں کے تمباکو نوشی کرنے سے پیٹ کے بچے
کو ضرر پہونچتا ہے۔
آپ کو صحت عزیز ہے یا تمباکو نوشی؟
فیصلہ آپ کے ہاتھ ہے۔
جاری کردہ:
سنٹرل ہیلتھ ایجوکیشن بیورو،
ڈائرکٹر جنرل ہیلتھ سروسز، نئی دہلی۔

انتخابِ کلام

مرتبہ :- شہریار

کاغذی پیرہن

آپ بیتی

(۱)

یوں تو مرنے کے لئے زہر سبھی پیتے ہیں
زندگی تیرے لئے زہر پیا ہے میں نے

شمع جلتی ہے پر اک رات میں جل جاتی ہے
یاں تو اک عمر اسی طرح سے جلتے گذری
کون سی خاک ہے یہ جانے کہاں کا ہے خمیر
اک نئے سانچے میں ہر روز ہی ڈھلتے گذری

کس طرح میں نے گذاری ہیں یہ غم کی گھڑیاں
کاش میں ایسی کہانی کو سنا بھی سکتا
طعنہ زن ہیں جو میرے حال پہ اربابِ نشاط
ان کو اک بار میں اے کاش رُلا بھی سکتا

میں کہ شاعر ہوں میں پیغامبرِ فطرت ہوں
میری تخیل میں ہے ایک جہانِ بیدار
دسترس میں مری نظارۂ گلہائے چمن
میرے ادراک میں ہیں کُن فیکون کے اسرار
میرے اشعار میں ہے قلبِ حزیں کی دھڑکن
میری نظموں میں مری روح کی دلدوز پکار

پھر بھی رہ رہ کے کھٹکتی ہے مرے دل میں یہ بات
کہ مرے پاس تو الفاظ کا اک پردہ ہے
صرف الفاظ سے تصویر نہیں بن سکتی
صرف احساس میں حالات کی تفسیر کہاں
صرف فریاد میں زخموں کی وہ زنجیر کہاں
ایسی زنجیر کہ اک ایک کڑی ہیں جس کی
کتنی کھوئی ہوئی خوشیوں کے مناظر پنہاں
کتنی بھولی ہوئی یادوں کے پُراسرار کھنڈر
کتنے اجڑے ہوئے، لوٹے ہوئے سنسان نگر
کتنے آتے ہوئے جاتے ہوئے چہروں کے نقوش
کتنے بنتے ہوئے مٹتے ہوئے لمحات کا راز
کتنی الجھی ہوئی راہوں کے نشیب اور فراز

(۲)

کیا کہوں مجھ کو کہاں لائی مری عمرِ رواں
آنکھ کھولی تو ہر اک سمت اندھیرے کا سماں
رینگتی اونگھتی مغموم سی اک راہ گذر
گردِ آلام میں کھویا ہوا منزل کا نشاں
گیسوئے شام سے لپٹی ہوئی غم کی زنجیر
سینۂ شب سے نکلتی ہوئی فریاد و فغاں

کاغذی پیرہن

کچھ ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ جیسے موسم بدل رہا ہے
اٹھوں اور اب اٹھ کے کیوں نہ اس گھر کے سارے دروازے کھول ہی دوں
میرے دریچوں پہ جانے کب سے دبیز پردے لٹک رہے ہیں
میں کیوں نہ ان کو الگ ہی کر دوں

مرا یہ تاریک و سرد کمرہ
بہت دنوں سے سنہری دھوپ اور نئی ہوا کو ترس رہا ہے
جگہ جگہ جیسے اس کی دیوار کی سپیدی اکھڑ گئی ہے
ہر ایک کونے میں کتنے جالے لگے ہوئے ہیں
میرے عزیزوں، میرے رفیقوں کی یادگاریں
یہ ساری تصویریں جیسے دھندلی سی پڑ گئی ہیں
یہ شیلف جس میں میری کتابیں ہیں
میز، جس پر میرے سبھی کاغذات بکھرے ہوئے پڑے ہیں
یہ سب کے سب گرد سے اٹے ہیں

میری کتابیں،
میں کیا بتاؤں کہ کس قدر ہیں عزیز مجھ کو
بہت سی ایسی ہیں جو مرے دوستوں نے تحفے میں مجھ کو دی ہیں
وہ دوست جو جاں نثار تھے میرے، کس قدر چاہتے تھے مجھ کو
میں ان کے ہاتھوں کی پیاری تحریر ان کتابوں پہ دیکھتا ہوں
کچھ ایسے الفاظ، ایسے فقرے
جو اُن کے ہاتھوں نے صرف میرے لئے لکھے ہیں
یہ میرے غم خوار، میرے دکھ درد کے امیں ہیں
میرے یہ سب کاغذات جو منتشر پڑے ہیں
مجھے یہ محسوس ہو رہا ہے میں ان سے بیزار ہو چلا ہوں
اگرچہ یہ جانتا ہوں کہ ان کے سوا ہے کیا کائنات میری

شاعر۔ بمبئی

میری تصانیف، میرے مضمون، میری نظموں کی ساری پونجی
وہ شئے کہ جس کی نہ کوئی قیمت ہے اور نہ جو میرے کام آئی
مری کتابیں، مری بیاضیں، مسودے میری فکر و فن کے
نہ جانے کتنے ہی ناشروں کے حسین فائل میں کچھ دنوں رہ کے
پھر دوبارہ اِس اجڑے گھر سے تہا آئے، بار ہو گئے ہیں

میں جس زمانے میں ان کتابوں کو لکھ رہا تھا
عجیب جنوں تھا
عجیب طوفان میرے دل میں امنڈ رہا تھا
نہ نیند آتی تھی رات کو اور نہ دن کو دم بھر کا سکون ملتا
کہ جیسے خود زندگی نے ہاتھوں کو میرے لوح و قلم دیا ہو
انہیں کتابوں میں
میرے دل کی تمام دھڑکن
مری تمنا
مرے ارادوں کی ساری گرمی
مری محبت کے سارے نشتر چھپے ہوئے ہیں
میں آج ان کاغذات کو الٹ کر جو دیکھتا ہوں
تو اپنے ہی دل سے پوچھتا ہوں
یہ میری لکھی ہوئی کتابیں ہیں؟
ایسے اشعار؟
ایسی نظمیں؟
کہ جن پہ خود مجھ کو رشک آئے
یہ سب مرے ذہن کا کرشمہ ہیں؟ (ہائے کیا ہیں!)
میں ان کو پہچانتا نہیں ہوں
یہ ساری تصویریں میری ایسی ہیں آج جو مجھ سے مختلف ہیں

●●

کنجِ محبّت

یہ سنسان راتیں، یہ ٹھنڈی ہوائیں، یہ پھیلی ہوئی تیری یادوں کی خوشبو
یہ چپ چاپ سے پیڑ، یہ غم کے سائے، یہ دل کی کسک، یہ محبت کا جادو

یہ سب جاگتے ہیں، یہ سب سوچتے ہیں، یہ سب کروٹیں لے کے ہیں آہ بھرتے
نئی منزلوں سے، نئے راستوں سے، نئے موڑ سے سب کے سب ہیں گزرتے

ہر اک موڑ پر جیسے کوئی کھڑا ہو، اشاروں اشاروں میں کچھ کہہ رہا ہو
سمجھ میں نہ آئے کوئی بات اس کی مگر جیسے چشمہ سا اک بہہ رہا ہو

کوئی جیسے بیٹھے مدھر گیت کے بول مدھم سروں میں یونہی گنگنائے
کوئی جیسے طوفاں دبائے ہو دل میں کسی سے مگر پھر بھی کچھ کہہ نہ پائے

کچھ الفاظ ایسے جو یوں دیکھنے میں پرانے سے ہیں اور کتنے ہی انساں
انہیں کے سہارے سے کہتے رہے ہیں، دلوں کی مرادیں، جوانی کے ارماں!

یہ ارماں، یہ آرزوئیں ہماری، یہ کچھ رسمساتے ہوئے پھول جیسے
جگائیں جنہیں آ کے جھونکے ہوا کے، جنہیں گدگدا جائیں آ آ کے بھونرے

خزاں کی ہواؤں کے چلنے سے پہلے ٹپکتے ہوئے پھول کے رس میں گویا
کوئی گیت سا بن لیا ہے بہاروں نے گاتے ہیں اب بھی جیسے باغ و صحرا

جو کنجِ محبت میں پیڑوں کی چھنتی ہوئی چاندنی کی زباں سے کہتا
کہو آج کی رات کیسی گزاری؟ کوئی آج کی رات ملنے بھی آیا ؟

غزلیں

○

نشاطِ زندگی میں ڈوب کر آنسو نکلتے ہیں / سنا ہے اب ترے غم کے نئے پہلو نکلتے ہیں
جنوں لیکر چلا ہے پاچواں اُس کے کوچے سے / لئے آغوش میں ہم نکہتِ گیسو نکلتے ہیں
تری بستی میں دیوانوں کو رسوائی ہی راس آئی / پھر اپنا چاک دامن لے کے اب ہر سُو نکلتے ہیں
وہی عارض وہی کاکل وہی کافر ادا آنکھیں / مگر ہر لحظہ پھر بھی کچھ نئے جادو نکلتے ہیں
محبت میں انہیں کو جاں دے دینا بھی آتا ہے / وہ جن کے واسطے لے کر غمِ ابرو نکلتے ہیں

○

ہر ذرہ گلفشاں ہے نظر چور چور ہے / نکلے ہیں میکدے سے تو چہرے پہ نور ہے
ہاں لو کہے تو جان کی پروا نہیں مجھے / یوں زندگی سے مجھ کو محبت ضرور ہے
اپنا جو بس چلے تو تجھے تجھ سے مانگ لیں / پر کیا کریں کہ عشق کی فطرت غیور ہے
نازک تھا آبگینۂ دل ٹوٹ ہی گیا / تو اب نہ ہو ملول ترا کیا قصور ہے
عارض پہ تیرے میری محبت کی سرخیاں / میری جبیں پہ تیری وفا کا غرور ہے

○

ہم اہلِ غم بھی رکھتے ہیں جادو بیانیاں! / یہ اور بات ہے کہ سنیں لن ترانیاں
شرمندہ کر نہ مجھ کو مرا حال پوچھ کر / لے دے کے رہ گئی ہیں یہی بے زبانیاں
کم کیا تھا ہم فقیروں کو آشوبِ روزگار / کیوں یاد آ رہی ہیں تری مہربانیاں
اہلِ زمانہ تم بھی بڑے وقت پر ملے / کچھ بار ہو چلیں تھیں مری شادمانیاں
تم نے بھلا دیا تو نئی بات کیا ہوئی / رہتی ہیں یاد کس کو وفا کی کہانیاں!
رکھ لو کہ زندگی میں کبھی کام آئیں گی / دیوانگانِ عشق کی بھی کچھ نشانیاں

○

اپنا ہی شکوہ اپنا گلا ہے / اہلِ وفا کو کیا ہو گیا ہے
ہم جیسے سرکش بھی رو دیئے ہیں / اب کچھ ایسا غم آ پڑا ہے
دل کا چمن ہے مرجھا نہ جائے / یہ آنسوؤں سے سینچا گیا ہے
یہ درد دل بھی تھا جان لیوا / کچھ اور بھی اب بڑھتا چلا ہے
بس ایک وعدہ کمبخت وہ بھی / مر مر کے جینا سکھلا گیا ہے
جرمِ محبت مجھ تک ہی رہتا / ان کا بھی دامن الجھا ہوا ہے
اک عمر ہی گزری ہے راہ تکتے / جینے کی شاید یہ بھی سزا ہے
دل سرد ہو کر ہی رہ نہ جائے / لہکے کچھ ایسی ٹھنڈی ہوا ہے

○

زندگی کو بھی یہاں کس کو ملی غم سے نجات
ختم ہوتا ہے کہیں سلسلۂ رقصِ حیات

آخری شمع ہوں میں میرا لہو جلنے دو
اب مرے بعد ملے گا نہ اندھیروں کو ثبات

صبح سے پہلے ہی برپا نہ کرو خیمۂ گل
کتنے گلچیں ابھی بیٹھے ہیں لگائے ہوئے گھات

ہم کہ میخانے کا میخانہ اٹھا کر پی جائیں!
تجھ سے چھٹ کر نہ کٹی ہم سے مگر ایک بھی رات

تشنگی محفلِ خوباں میں تو کیا خاک بجھی
پھر بھی بیٹھا ہوں کہ شاید ہو یہیں آبِ حیات

اتنا باہر نہ قدم سرحدِ ادراک سے رکھ
تجھ کو ڈس لیں نہ کہیں تیرے جنوں کے لمحات

صبحِ کاذب سے تو کیا چاک ہو ظلمت کی ردا
جگمگا اٹھیں گے اب خاک کے لاکھوں ذرات

○

تمام یادیں مہک رہی ہیں ہر ایک غنچہ کھلا ہوا ہے
زمانہ بیتا مگر گماں ہے کہ آج ہی وہ جدا ہوا ہے

سبک ہے کھلائے ہیں میں نے دو نرگس مگر نہ چاہت سے کوئی لوٹے
بجھے بجھے سے چراغ دل میں بھی ایک شعلہ چھپا ہوا ہے

کچھ اور رسوا کرو ابھی مجھ کو تا کوئی پردہ رہ نہ جائے
مجھے محبت نہیں جنوں ہے جنوں کا کب حق ادا ہوا ہے

میں اور خود مریں اور سرکش ہوا ہوں تلقینِ مصلحت سے
مجھے نہ اس طرح کوئی چھیڑے یہ دل بہت ہی دکھا ہوا ہے

لا جو اک لمحۂ محبت، یہ پوچھو اس کی ہے کتنی قیمت
اب ایسے لمحوں کا تذکرہ کیا، کبھی جو وہ بے وفا ہوا ہے

یہ درد ابھرا ہے عہدِ گل میں خدا کرے جلد رنگ لائے
نہ جانے کب سے سلگ رہا ہے نہ جانے کب کا دبا ہوا ہے

وفا میں برباد ہو کے بھی آج زندہ رہنے کی سوچتے ہیں
نئے زمانے میں اہلِ دل کا بھی حوصلہ کچھ بڑھا ہوا ہے

ہر ایک لے میری اکھڑی اکھڑی سی دل کا ہر تار جیسے زخمی
یہ کون سی آگ جل رہی ہے یہ میرے گیتوں کو کیا ہوا ہے

○

بس وہ کہ پابندیٔ آئینِ وفا ہم سے ہوئی
یہ اگر کوئی خطا ہے تو خطا ہم سے ہوئی

زندگی تیرے لئے سب کو خفا ہم نے کیا
اپنی قسمت ہے کہ اب تو بھی خفا ہم سے ہوئی

سر اٹھانے کا بھلا اور کسے یارا تھا
بس ترے شہر میں یہ رسم ادا ہم سے ہوئی

بارہا دستِ ستم گر کو قلم ہم نے کیا
بارہا چاک اندھیرے کی قبا ہم سے ہوئی

ہم نے اتنے ہی سرِ راہ جلائے ہیں چراغ
جتنی برگشتہ زمانے کی ہوا ہم سے ہوئی

بارِ ہستی تو اٹھا، اٹھ نہ سکا دستِ سوال
مرتے مرتے نہ کبھی کوئی دعا ہم سے ہوئی

کچھ دنوں ساتھ لگی تھی ہمیں تنہا پا کر
کتنی شرمندہ مگر موجِ بلا ہم سے ہوئی

○

بہت فسردہ ہیں ان کو کھو کر جگر فگاروں سے کچھ نہ کہنا
نہ جانے کیا ان کے دل پہ بیتے گی سوگواروں سے کچھ نہ کہنا

بہت ہی بھولے بہت ہی مفلس بڑے ہی آوارہ گرد ہیں ہم
بڑے ہی سرکش ہیں جانے کیا کہہ دیں غم کے ماروں سے کچھ نہ کہنا

کبھی نہ بھولیں گی ایسی گھڑیاں یہ سخت تنہائیوں کے لمحے
گزار لی ہجر کی یہ راتیں مگر ستاروں سے کچھ نہ کہنا

فغاں کہ ایسی فضا میں جینا پڑا ہے جس کا یہ مشورہ ہے
ستم سہے جاؤ لیکن اپنے ستم شعاروں سے کچھ نہ کہنا

یہ کس طرح کی وفا چمن سے ہے کچھ کہو میرے ہم صفیرو
خزاں سے بڑھ کر جو زہر آگیں ہوا ان بہاروں سے کچھ نہ کہنا

یہ مسکراتے ہیں میرے غم پر تو مری ڈھارس بندھا رہے ہیں
خلوص اک طرح کا ہے ان کو بھی غم گساروں سے کچھ نہ کہنا

شاعر نامہ

سوداگر

لو گجر بج گیا
صبح ہونے کو ہے
دن نکلتے ہی اب میں چلا جاؤں گا
اجنبی شاہراہوں پہ پھر
کاسۂ چشم لے لے کے ایک ایک چہرہ تکوں گا
دفتروں، کارخانوں میں، تعلیم گاہوں میں جا کر
اپنی قیمت لگانے کی کوشش کروں گا

میری آرامِ جاں!
مجھ کو اک بار پھر دیکھ لو
آج کی شام لوٹوں گا جب
بیچ کر اپنے شفاف دل کا لہو
اپنی جھولی میں چاندی کے ٹکڑے لئے
تم بھی مجھ کو نہ پہچان پائیں تو پھر
میں کہاں جاؤں گا ــــ ؟
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون تھا ــــــ
کس سے جا کر کہوں گا کہ میں کون تھا ــــــ

آنچل کی چھاؤں میں

آج ہر سمت سے آنچل کی ہوا آتی ہے
کیا کہوں اب کے یہ کس طرح کا آیا موسم
لمحے لمحے کی زباں پر ہے نئی فصل کا گیت
میری بستی، مرے کھیتوں کا عجب ہے عالم
ہنس رہے ہیں مرے معصوم سے ننھے پودے
جن کو ملتی رہی اب تک مرے غم کی شبنم
کوئی گوری لئے آئی ہے چھلکتی گاگر
جس طرح پہلے برستی تھیں یہ آنکھیں چھم چھم
رس بھرے ہونٹوں سے راتوں کے اندھیرے بھیگے
اس اندھیرے میں کوئی چھیڑ دے جیسے سرگم
منزلیں اب مرے پاؤں میں بچھی جاتی ہیں
جانے کس سمت لئے جاتا ہے ایک ایک قدم
مجھ سے کہتی ہے مری پیاس یہ جیون بھر کی!
اور کچھ اور کہ یہ نشہ ابھی ہے کم کم
رکھ کے سینے پہ مرے ہاتھ کوئی کہتا ہے
اتنے پاگل نہ بنو ہوش میں آؤ بالم
دیکھو اب جاگ اٹھو، رات کٹی، بھور ہوئی
سینے کے گجروں میں باقی نہ رہا کوئی غم
چل کے پھلواری میں سورج کو نکلتے دیکھیں
چل کے دیکھیں کہ کلی کھلتی ہے کیسے تھم تھم
میرے بالوں میں سجا دو کوئی ہنستا ہوا پھول
چل کے ہاتھوں پہ مرے کھاؤ محبت کی قسم

اپنے بچّے کے نام

اے مرے سِن و سال کے حاصل
میرے آنگن کے نو دمیدہ گلاب
میرے معصوم خواب کے ہم شکل
میری مریم کے سایۂ شاداب
صبح تخلیق کا سلام تجھے
زندگی تجھ کو کہتی ہے آداب

اے مقدس زمیں کے شعلۂ نو
تو فروزاں ہو اُن فضاؤں میں
میرے سینے کی جو امانت ہیں!
جو مری نارسا دعاؤں میں!
اِس طرح مسکراتی ہیں جیسے
نغمگی درد کی صداؤں میں

مجھ کو اجداد سے وراثت میں
وہ خرابے ملے کہ جن میں رہا
عمر بھر پائمال و خاک بسر
میرا حصہ رہا غمِ فردا
مجھ کو میرے لہو میں نہلا کر
جس نے قیدِ حیات میں رکھا

اے مری روحِ فن کے عکسِ جمیل
تجھ کو میری سی زندگی نہ ملے
جو نہ میں ہو سکا وہ تو ہو جائے
کاش تو میرا جانشیں نہ بنے
میں تصور میں بھی جہاں نہ گیا
اُن دیاروں میں تیرا نام چلے

سلسلے سوالوں کے

دن کے ہنگاموں میں بھی رات کا سناٹا
رات کی خاموشی میں جیسے دن کے ہنگامے
جاگتی ہوئی آنکھیں نیند کے دھندلکوں میں
خواب کے تصور میں اک عذابِ بیداری
روز و شب گذرتے ہیں قافلے خیالوں کے
صبح و شام کرتے ہیں آپ اپنی غمخواری
ہم کہاں ہیں! ہم کیا ہیں؟ کون ہیں؟ کیوں ہیں؟
ختم ہی نہیں ہوتے سلسلے سوالوں کے

چشمۂ ہدایت ہے علم کے صحیفوں میں
فن کے شاہکاروں میں اک چراغِ عرفاں ہے
مرحمت کے ساماں ہیں ان کی بارگاہوں میں
مفت جو لٹاتے ہیں اب بھی اپنی دانائی
رزم گاہِ ہستی میں اپنوں اور غیروں نے
جس سے روشنی پائی، جو عمل کی راہوں میں
کتنے کم نگاہوں کی مشکلوں میں کام آئی

ہم نے ان چراغوں کو، ہم نے اِن صداؤں کو
اپنی خواب گاہوں میں بارہا بلایا ہے
حال سب سنایا ہے اپنی آرزوؤں کا
اپنے دل کے زخموں کا بھید سب بتایا ہے
دو قدم مگر چل کر داغ کچھ نئے اُبھرے
پھر خلائے بے پایاں پھر وہی اندھیرے تھے
ہر چراغ سے روشن تھی جیسے اپنی بینائی
ہر صدا پہ غالب تھی جیسے اپنی تنہائی

تنہائی سے آگے

اور یہ سب بحثیں جو گھس پٹ کے پرانی ہو جائیں
جب کوئی بات نہ ہو دہرائی ہوئی باتوں میں
مضمحل رو میں خموشی کا سہارا ڈھونڈیں
جب کوئی لطف نہ رہ جائے ملاقاتوں میں

جب نہ محسوس ہو کچھ گرمیٔ آداب و سلام
جی نہ چاہے کہ کوئی پرسشِ احوال کرے
دور تک پھیلی ہوئی دھند ہو سناٹے ہوں
سب کے سب بیٹھے ہوں اور کوئی نہ ہو کچھ نہ سہے

ان خلاؤں سے نکل کر کہیں پرواز کریں
آؤ کچھ سیر کریں ذہن کی پنہائی میں!
کیوں نہ دریافت کریں ایسی گزرگاہوں کو
بات کرتی ہیں مسافر سے جو تنہائی میں

غزلیں

ہے عجیب چیز مۓ جنوں، کبھی دل کی پیاس نہیں بجھی
مگر اب ملا کے تو دیکھ لوں ذرا ایک قطرۂ آگہی!

مری خامشی، مری بے حسی، یہی میرا رازِ فسردگی
کبھی سو گیا ہوں تو جاگ اٹھی ہے یہ دل کی چوٹ دبی دبی

ہے یہ کیسی صحبتِ مے کشاں کہ ہر ایک جام لہو لہو
یہی روشنی ہے تو اے خدا مجھے راس آئے نہ روشنی

ہے طول مجھ سے دعائے موت کہ میں ساتھ اس کا نہ دے سکا
مرے راستے میں جو آگئی یہی زندگی، یہی زندگی

یہی ساتھ ساتھ مرے رہا میں اسی کا پا نہ سکا پتا
کبھی ہر قدم پہ مجھے ملا، یہی آدمی یہی آدمی

مرے ساتھ ساتھ چلے تھے سب مرا ساتھ کوئی نہ دے سکا
مرے ہم سفر، مرے ہم نظر، مری خود سری، مری سرکشی

مری سمت اور بھی سا قیا! وہ جو بوند بوند میں زہر تھا
جسے اور کوئی نہ پی سکا، وہ شراب میرے ہی منہ لگی

میں شہیدِ ظلمتِ شب سہی، مری خاک کو یہی جستجو
کوئی روشنی، کوئی روشنی، کوئی روشنی، کوئی روشنی

○

تری صدا کا ہے صدیوں سے انتظار مجھے
مرے لہو کے سمندر ذرا پکار مجھے

میں اپنے گھر کو بلندی پہ چڑھ کے کیا دیکھوں
عروجِ فن! مری دہلیز پر اتار مجھے

ابلتے دیکھی ہے سورج سے میں نے تاریکی
نہ راس آئے گی یہ صبحِ زرنگار مجھے

کہے گا دل تو میں پتھر کے پاؤں چوموں گا
زمانہ لاکھ کرے آ کے سنگسار مجھے

وہ فاقہ مست ہوں جس راہ سے گزرتا ہوں
سلام کرتا ہے آشوبِ روزگار مجھے

○

وہ رنگِ رخ وہ آتشِ خوں کون لے گیا / اے دل ترا وہ رقصِ جنوں کون لے گیا
زنجیرِ آنسوؤں کی کہاں ٹوٹ کر گری / وہ انتہائے غم کا سکوں کون لے گیا
دردِ نہاں کے چھین لیے کس نے آئینے / نوکِ مژہ سے قطرۂ خوں کون لے گیا
جو مجھ سے بولتی تھیں وہ راتیں کہاں گئیں / جو جاگتا تھا سوزِ دروں کون لے گیا
کس موڑ پر بچھڑ گئے خوابوں کے قافلے / وہ منزلِ طرب کا فسوں کون لے گیا
جو شمع اتنی رات جلی کیوں وہ بجھ گئی / جو شوق ہو چلا تھا فزوں کون لے گیا

○

میں دیر سے دھوپ میں کھڑا ہوں / سایہ سایہ پکارتا ہوں
سونا ہوں کرید کر تو دیکھو / مٹی میں دبا ہوا پڑا ہوں
لے مجھ کو سنبھال گردشِ وقت / ٹوٹا ہوا تیرا آئینہ ہوں
یوں ربط تو ہے نشاط سے بھی / در اصل میں غم سے آشنا ہوں
صحبت میں گلوں کی میں بھی رہ کر / کانٹوں کی زباں سمجھ گیا ہوں
دشمن ہو کوئی کہ دوست میرا / ہر ایک کے حق میں میں دعا ہوں
کیوں آبِ حیات کو میں ترسوں / میں زہرِ حیات پی چکا ہوں!
ہر عہد کے لوگ مجھ سے ناخوش / ہر عہد میں خواب دیکھتا ہوں

○

دل کی رہ جائے نہ دل میں یہ کہانی کہہ لو / چاہے دو حرف لکھو چاہے زبانی کہہ لو
میں نے مرنے کی دعا مانگی وہ پوری نہ ہوئی / بس اسی کو مرے جینے کی نشانی کہہ لو
تم سے کہنے کی نہ تھی بات مگر کہہ بیٹھا / اب اسے میری طبیعت کی روانی کہہ لو
وہی اک قصہ زمانے کو مرا یاد رہا / وہی اک بات جسے آج پرانی کہہ لو
ہم پہ جو گذری ہے بس اس کو رقم کرتے ہیں / آپ بیتی کہو یا مرثیہ خوانی کہہ لو

○

اتنی لمبی ہے کہانی کہیں دم ٹوٹ نہ جائے / حالِ دل اور لکھیں گے یہ قلم ٹوٹ نہ جائے
ہم چھپاتے ہیں پریشانیٔ خاطر اُن سے / طبعِ نازک پہ کبھی کوہِ الم ٹوٹ نہ جائے
ہم نے خود جس کو تراشا ہے بڑی محنت سے / اب ہمیں ہے یہ خیالوں کا صنم ٹوٹ نہ جائے
اب ٹھہرتا نہیں اس گھر میں کوئی اور چراغ / قطرہ قطرہ ترا اے دیدۂ نم ٹوٹ نہ جائے
کسی قیمت کسی بازار میں ملتا نہیں دل / لو سنبھالو کہ یہ پیمانۂ جم ٹوٹ نہ جائے
ذرا آہستہ چلو رہگذرِ ہستی میں / کہیں یہ سلسلۂ نقشِ قدم ٹوٹ نہ جائے

○●○

زندگی اے زندگی

نیا آدمی

اور پھر یوں ہُوا
جو پرانی کتابیں، پرانے صحیفے
بزرگوں سے ورثے میں ہم کو ملے تھے۔
انہیں پڑھ کے ہم سب یہ محسوس کرنے لگے۔
اِن کے الفاظ سے مطلب نکلتا نہیں ہے۔
جو تعبیر و تفسیر
انھوں نے کی تھی
معانی و مفہوم
جو ان پہ چسپاں کیے تھے
اب ان کی حقیقت کسی واہمے سے زیادہ نہیں ہے۔
اور پھر یوں ہُوا
چند لوگوں نے یہ آکے ہم کو بتایا
کہ اب اِن پرانی کتابوں کو
تہہ کرکے رکھ دو
ہمارے وسیلے سے
تم پر
نئی کچھ کتابیں اتاری گئی ہیں
انہیں تم پڑھو گے
تو تم پر
صداقت نئے طور سے منکشف ہوگی
بوسیدہ و منجمد ذہن میں
کھڑکیاں کھل سکیں گی
تمہیں علم و عرفان اور آگہی کے
خزینے ملیں گے۔

اور پھر یوں ہُوا
اِن کتابوں کو
اپنی کتابیں سمجھ کر
انہیں اپنے سینے سے ہم نے لگایا
ہر اک لفظ کا ورد کرتے رہے۔
ایک اک حرف کا رس پیا
اور ہمیں مِل گیا
جیسے معنی و مفہوم کا
اک نیا سلسلہ
اور پھر یوں ہُوا
اِن کتابوں سے
اک دن
یہ ہم کو بشارت ملی
آنے والا ہے دنیا میں
اب اک نیا آدمی
لے کے اپنے جلو میں نئی زندگی
ہم اندھیری گپھاؤں سے۔
اوہام کی تنگ گلیوں سے نکلیں گے
ہم کو ملے گی نئی روشنی
اور پھر یوں ہُوا
لانے والے کتابوں کے
اور وہ بھی جو ان پہ ایمان لائے تھے
سب اپنے اپنے گھروں سے
نکل کر

کسی سمت کو چل پڑے
ایسے اِک راستے پر
جدھر سے نیا آدمی
آنے والا تھا
یا ہم کو اس کا یقیں تھا
کہ وہ آئے گا اور اسی سمت سے
بس اسی سمت سے آئے گا۔

اور پھر یوں ہُوا
دیر تک ہم نئے آدمی کے رہے منتظر
دیر تک شوقِ دیدار کی
اپنی آنکھوں میں مستی رہی دیر تک
اس کی آمد کا ہم گیت گاتے رہے
دیر تک اس کی تصویر
ذہنوں میں بناتے رہے۔
دیر تک
اِس خرابے میں اِک جشن ہوتا رہا

اور پھر یوں ہُوا
دیر تک
اور بھی دیر تک
جب نہ ہم کو ملا
آنے والے کا کوئی پتہ
اس کے قدموں کی کوئی نہ آہٹ ملی
ہم نے پھر زور سے اس کو آواز دی
"اے نئے آدمی!
اے نئے آدمی!!"
اور یہ آواز اونچے پہاڑوں سے ٹکرا کے
بے نام صحراؤں سے لوٹ کر
پھر ہماری طرف آ گئی

اور پھر یوں ہُوا
چند لوگوں نے سوچا کہ شاید نیا آدمی
آئے گا اور ہی سمت سے
دوسرے چند لوگوں نے سوچا
کہ شاید نیا آدمی
آئے گا اور ہی سمت سے
اور پھر ہر طرف قافلے قافلے
اور پھر ہر طرف راستے راستے

اور پھر یوں ہُوا
دیر تک اس نئے آدمی کی
رہی جستجو
اُس کو آواز دیتے رہے
چار سو
کو بکو، قریہ قریہ
اسے ہم بلاتے رہے
منزلوں منزلوں
خاک اُڑاتے رہے،

اور پھر یوں ہُوا
سب کے چہرے اسی خاک میں اٹ گئے
سب کی آنکھوں میں اک تیرگی چھا گئی
سب کو ڈسنے لگی راہ کی بے حسی
اور پھر سب وہ اک دوسرے کے لئے
اجنبی ہو گئے
اور پھر سب کے سب
دُھند میں کھو گئے

اور پھر یوں ہوا
ہم نے پھر گھر پہ آ کر
کتابوں کے اوراق کھولے
انہیں پھر سے پڑھنے کی خاطر اٹھایا
ہر اک سطر پہ غور کرتے رہے دیر تک
اور ہر لفظ کو
دوسرے لفظ سے جوڑ کر
سلسلہ حرفِ نغمہ کا
صوت و صدا کا ملاتے رہے۔

شاعر۔ بمبئی۔

اور پھر یاس و اُمید
یاس و اُمید کے درمیاں
ڈھونڈھتے ہی رہے
اس نئے آدمی کا نشاں
اور ہمیں بس ملیں
اپنی آواز کی
زرد سوکھی ہوئی پتیاں
اور پھر یوں ہوا
ہم سے سورج کئی روز روٹھا رہا
آسمانوں سے اُٹھتی رہیں
تہہ بہ تہہ بدلیاں
کالی کالی نظر آئیں سب وادیاں
کالے گھر، کالی دیواریں، کالی چھتیں
کالی سڑکوں پہ چلتی ہوئی کالی پرچھائیاں
یہ زمیں
کالے ساگر میں
ٹوٹی ہوئی ناؤ کی طرح سے
ڈگمگانے لگی
موت کی نیند آنے لگی
اور پھر یوں ہوا
ہم نے اپنے گھروں میں
جلائے خود اپنے دیئے
ہم نے بکھرے ہوئے خواب
ٹوٹے ہوئے آئینے
پھر سے جوڑے
بجھے جسم کی راکھ سے
سر اُٹھاتے ہوئے ایک ننھے سے شعلے کو
اور اپنے چہرے میں
اک اور چہرے کو دیکھا
پھر اپنے لہو کی صدائیں سنیں
اور اپنے لئے آپ اپنی کتابیں لکھیں ●●

شاعر، بمبئی

میں گوتم نہیں ہوں

میں گوتم نہیں ہوں
مگر میں بھی جب گھر سے نکلا تھا
یہ سوچتا تھا
کہ میں اپنے آپ کو
ڈھونڈھنے جا رہا ہوں
کسی پیڑ کی چھاؤں میں
میں بھی بیٹھوں گا
اک دن مجھے بھی
کوئی گیان ہوگا
مگر
جسم کی آگ
جو گھر سے لے کر چلا تھا
سلگتی رہی
گھر کے باہر ہوا تیز تھی
اور بھی یہ بھڑکتی رہی
ایک اک پیڑ جل کر ہوا راکھ
میں ایسے صحرا میں اب پھر رہا ہوں
جہاں میں ہی میں ہوں
جہاں میرا سایہ ہے
سائے کا سایہ ہے

اور دُور تک
بس خلا ہی خلا ہے ●●

کتبہ

(۱)

خدایا ! نہ میں نے کہیں سر جھکایا
نہ دنیا میں احسان اب تک کسی کا اُٹھایا
مرے سر پہ جب دھوپ ہی دھوپ تھی
اس گھڑی بھی نہ ڈھونڈھا کہیں کوئی سایا ،
تو اب تو ہی آ کر مری آبرو کو بچا لے ۔
یہی ایک تحفہ ہے ۔
جو میں ترے پائے اقدس پہ رکھ دوں گا ۔
اور یہ کہوں گا
یہی میری پونجی یہی ہے کمائی
مجھے اور کچھ بھی عطا کر نہ پائی
یہ تیری خدائی
خدایا
مری نذرِ بے مایہ کو دیکھ کر
جس خزانے میں اس کی جگہ ہو
اب وہاں پر اسے ڈال دے

کتبہ

(۲)

یہ کتبہ فلاں سن کا ہے
یہ سن اس لئے اس پہ کندہ کیا
کہ سب وارثوں پر یہ واضح رہے ۔
کہ اس روز برسی ہے مرحوم کی
عزیز و اقارب ، یتامیٰ ، مساکین
ضیافت سے اپنی نوازیں ، سبھی کو بلائیں ،
کہ سب مل کے مرحوم کے حق میں دستِ دعا کو اُٹھائیں
زباں سے کہیں "اپنی مرحوم کی مغفرت ہو"
بزرگِ مقدس کے نامِ مقدس پہ بھیجیں درود و سلام
سبھی خاص و عام
افسانہ (کسی اور کاپئیس سے لکھا ہوا)
مگر یہ بھی ملحوظِ خاطر رہے ۔
عزیز و اقارب کا شرب و طعام
اور اس کا نظام
الگ ہو وہاں سے
جہاں ہوں یتامیٰ ، مساکین ، اندھے بھکاری
پھٹے اور میلے لباسوں میں سب عورتیں اور بچے
کئی لولے لنگڑے ، مریض اور گندے
وہی جن کو کہتے ہیں ہم سب عوام
وہاں ہوگا اک شور و غل ، اژدہام
یہ کر دیں گے ہم سب کا جینا حرام ۔

خلیل الرحمن آسمابنز

غزلیں

خود اپنا عکس ہوں کہ کسی کی صدا ہوں میں
یوں شہر تا بہ شہر جو بکھرا ہوا ہوں میں

میں ڈھونڈنے چلا ہوں جو خود اپنے آپ کو
تہمت یہ مجھ پہ ہے کہ بہت خود نما ہوں میں

مجھ سے نہ پوچھ نام مرا روحِ کائنات
اب اور کچھ نہیں ہوں ترا آئینہ ہوں میں

لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے میں اپنا ہمنوا
خود اپنے ہر خیال سے ٹکرا چکا ہوں میں

اے عمرِ رفتہ میں تجھے پہچانتا نہیں
اب مجھ کو بھول جا کہ بہت بیوفا ہوں میں

○

ہر گھڑی عمرِ فرومایہ کی قیمت مانگے
مجھ سے آئینہ مرا میری ہی صورت مانگے

دور رہ کر ہی جو آنکھوں کو بھلے لگتے ہیں
دلِ دیوانہ مگر اُن کی ہی قربت مانگے

پوچھتے کیا ہو اِن آنکھوں کی اداسی کا سبب
خواب جو دیکھے وہ خوابوں کی حقیقت مانگے

اپنے دامن میں چھپا لے مرے اشکوں کے چراغ
اور کیا تجھ سے کوئی اے شبِ فرقت مانگے

وہ نگہ کہتی ہے بیٹھے رہو محفل میں ابھی
دل کی آشفتگی اُٹھنے کی اجازت مانگے

زہر پی کر بھی جیوں میں یہ الگ بات مگر
زندگی اس لبِ رنگیں کی حلاوت مانگے

زیب دیتے نہیں یہ طرّہ و دستار مجھے
میری شوریدہ سری کنگ ملامت مانگے

○

پھر مری راہ میں کھڑی ہوگی
وہی اک شئے جو اجنبی ہوگی

شور سا ہے لہو کے دریا میں
کس کی آواز آ رہی ہوگی

پھر مری رُوح مرے گھر کا پتہ
میرے سائے سے پوچھتی ہوگی

کچھ نہیں میری زرد آنکھوں میں
ڈوبتے دِن کی روشنی ہوگی

رات بھر دل سے بس یہی باتیں
دِن کو پھر درد میں کمی ہوگی

بس یہی ایک بوند آنسو کی،
میرے جینے کی مے کشی ہوگی

پھر مرے انتظار میں مری نیند
میرے بستر پہ جاگتی ہوگی

جانے کیوں اک خیال سا آیا
میں نہ ہوں گا تو کیا کمی ہوگی

○

اس پر بھی دشمنوں کا کہیں سایہ پڑ گیا
غم سا پرانا دوست بھی آخر بچھڑ گیا

جی چاہتا تو بیٹھتے یادوں کی چھاؤں میں
ایسا گھنا درخت بھی جڑ سے اُکھڑ گیا

غیرِ دِل نے مجھ کو دفن کیا شاہراہ پر
میں کیوں نہ اپنی خاک میں غیرت سے گڑ گیا

خلوت میں جس کی نرم مزاجی تھی بے مثال
محفل میں بے سبب وہی مجھ سے اکڑ گیا

بس اتنی بات تھی کہ عیادت کو آئے لوگ
دِل کے ہر ایک زخم کا ٹانکا اُدھڑ گیا

یاروں نے جا کے خوب زمانے سے صلح کی — میں ایسا بد دماغ یہاں بھی بچھڑ گیا
کوتاہیوں کی اپنی میں تاویل کیا کروں — میرا ہر ایک کھیل مجھی سے بگڑ گیا
اب کیا بتاؤں کیا تھا خیالوں کے شہر میں — بسنے سے پہلے وقت کے ہاتھوں اجڑ گیا

O

سوتے سوتے چونک پڑے ہم خواب میں ہم نے کیا دیکھا — جو خود ہم کو ڈھونڈ رہا ہو ایسا اک رستا دیکھا
دور سے اک پرچھائیں دیکھی اپنے سے ملتی جلتی — پاس سے اپنے چہرے میں بھی اور کوئی چہرہ دیکھا
سونا لینے جب نکلے تو ہر ہر ڈھیر میں مٹی تھی — جب مٹی کی کھوج میں نکلے سونا ہی سونا دیکھا
سوکھی دھرتی سن لیتی ہے پانی کی آوازوں کو — پیاسی آنکھیں بول اٹھتی ہیں ہم نے اک دریا دیکھا
چاندی کے سے جن کے بدن تھے سورج کے سے مکھڑے تھے — کچھ اندھی گلیوں میں ہم نے ان کا بھی سایا دیکھا
رات وہی پھر بات ہوئی نا ہم کو نیند نہیں آئی — اپنی روح کے سناٹے سے شور سا اک اٹھتا دیکھا

O

بہت بنائے سے رستوں کا سلسلہ نکلا — نیا سفر بھی بہت ہی گریز پا نکلا
نہ جانے کس کی ہمیں عمر بھر تلاش رہی — جسے قریب سے دیکھا وہ دوسرا نکلا
ہمیں تو راس نہ آئی کسی کی محفل بھی — کوئی خدا کوئی ہمسایۂ خدا نکلا
ہزار طرح کی مے پی ہزار طرح کے زہر — نہ پیاس ہی بجھی اپنی نہ حوصلہ نکلا
ہمارے پاس سے گذری تھی ایک پرچھائیں — پکارا ہم نے تو صدیوں کا فاصلہ نکلا
اب اپنے آپ کو ڈھونڈیں کہاں کہاں جا کر — عدم سے تا بہ عدم اپنا نقش پا نکلا

O

رخ پہ گرد ملال تھی، کیا تھی — حاصل ماہ و سال تھی، کیا تھی
ایک صورت سی یاد ہے اب بھی — آپ اپنی مثال تھی، کیا تھی
میری جانب اٹھی تھی کوئی نگہ — ایک مبہم سوال تھی، کیا تھی
اس کو پا کر بھی اس کو پا نہ سکا — جستجوئے جمال تھی، کیا تھی
صبح تک خود سے ہم کلام رہا — یہ شب جذب و حال تھی، کیا تھی
دل میں تھی پر لبوں تک آ نہ سکی — آرزوئے وصال تھی، کیا تھی
اپنے زخموں پہ اک فسردہ ہنسی — کوشش اندمال تھی، کیا تھی
عمر بھر میں بس ایک بار آئی — ساعت لازوال تھی، کیا تھی
خون کی پیاسی تھی یہ زمین وطن — ایک شہر خیال تھی، کیا تھی
باعث رنجش عزیزاں تھی — خوئے کسب کمال تھی، کیا تھی
اک جھلک لمحۂ فراغت کی — ایک امر محال تھی، کیا تھی
کوئی خواہاں نہ تھا کہ جنس ہنر — ایک مفلس کا مال تھی، کیا تھی

OOO

پرنٹر پبلشر مالک تاجور نعمان صدیقی نے یونیورسل فائن آرٹ لیتھو پریس ۲۳، نور روزجی اسٹریٹ ٹھاکردوار بمبئی ۲ میں چھپواکر دفتر سے شائع کیا

Regd. No. B. Y. W. 28 Issue No. 4, 5, 6, 1980

The "SHAIR" (Monthly) Bombay-8.

'KHALIL-UR-REHMAN AZMI NUMBER'

51 Years of Publication (Publishing Date 27 28) Telephone No- 35 99 04

Registered with the Registrar of Newspapers at R. N. No. 14482 57